نعمان نیرّ کلاچوی

صراطِ دانش

تحقیقی و تنقیدی مضامین

نعمان نیئر کلاچوی

نام کتاب	صراطِ دانش
مصنف	نعمان نیئر کلاچوی
کاتب	نعمان نیئر کلاچوی
مرتب	نعمان نیئر کلاچوی
سرِورق	نور گرافکس، قصہ خوانی بازار، پشاور
ناشر	مرشد پبلی کیشنز، کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان
طابع	نور پرنٹرز، قصہ خوانی بازار، پشاور
مطبوعہ اشاعت	نومبر، 2020
پی ڈی ایف ایڈیشن (ترمیم واضافہ)	دسمبر، 2021
آئی ایس بی این	978-969-2228-00-8

ترسیل:

مرشد پبلی کیشنز، چشتی میخانہ محلہ کمال خیل، تحصیل کلاچی، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان خیبر پختونخواہ۔

☆☆☆☆☆☆☆

انتساب

ہراُس سچے کھوجی کے نام جو خالی الذہن ہو کر حقائق کی کھوج کیلئے یک تنہا نکل پڑتا ہے۔

فہرستِ مضامین

☆☆☆☆☆☆☆

ما فی الضمیر

اُردو کی ایک قدیم ضرب المثل ہے کہ "علم بڑی دولت ہے" اب اس دولت کا پرچار ایک ایسے معاشرے میں کرنا جہاں لوگ مطلق دولت کو ہی بڑی دولت سمجھتے ہوں اندھوں کے شہر میں آئینے بیچنے کے مترادف ہے۔ میں اکثر و بیشتر سوچتا رہتا ہوں کہ منصبِ آگہی زیادہ اہم ہے یا اوجِ معیشت کیونکہ علم و معیشت میں ہمیشہ ایک زبردست کشمکش جاری رہی ہے اور اکثر و بیشتر ذہین مفلسی میں گزر جاتے ہیں اس کے برعکس اکثر آسودہ حال انتہائی سطحی ذہن کے حامل ہوتے ہیں گویا علم اور پیسہ بیک وقت نہیں کمایا جاسکتا البتہ پہلے سے موجود پیسہ کی بنیاد پر علم ضرور کمایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے زیادہ تر ذہین اور قابل شخصیات کے خاندان معدودے چند ایک کو چھوڑ کر صاحبِ ثروت و عز و جاہ کے حامل تھے۔

حقیقی علم حاصل کرنا اس قدر مشکل ہے کہ اس کے آگے پیسہ کمانا کوئی وقعت ہی نہیں رکھتا لیکن پھر بھی پیسہ اپنی حیثیت کبھی بھی نہیں کھوتا۔ ایسا ممکن نہیں کہ آپ علم اور پیسہ ایک ساتھ حاصل کر سکتے ہیں بلکہ آپ کو ان میں سے کسی ایک ہی کا انتخاب کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ دو بالکل مختلف اور الگ الگ راستے ہیں پس اگر آپ باپ دادا کی اچھی خاصی ثروت کے حامل نہیں ہیں اور خالصتاً علم کے حصول کی جستجو لئے نکل کھڑے ہیں تو یہ کبھی نہ بھولئے گا کہ ذہانت مفلسی پر منتج ہوتی ہے۔ صوفی فقیر کہتے ہیں کہ دین اور دنیا کبھی ایک نہیں ہو سکتے جبکہ میں کہتا ہوں کہ علم اور پیسہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے اگر آپ نے واقعی جاننا ہے تو پھر ڈھیر سارا پیسہ کمانے کی جستجو ترک کر دیں اور جاننے کے سفر یعنی صراطِ دانش کے راہی بن جائیں۔ صراطِ دانش آپ کو کوئی جسمانی آسودگی یا عز و جاہ تو نہیں دے پائے گا مگر انسان خدا اور اس کائنات کی حقیقت آپ پر ضرور وا کر دے گا ہاں اگر آپ کیلئے یہ سب جاننا ضروری نہیں تو پھر آپ پیسہ کمانے میں مگن رہئے۔

حصولِ علم اپنی اصل میں حتمی لاعلمی کے مقام تک پہنچنے کا سفر ہے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک روشن ضمیر کی لاعلمی اور ایک عام انسان کی لاعلمی برابر ہے سو اس لحاظ سے حصولِ علم ایک لایعنی عمل ٹھہرا، قطعاً نہیں۔ ہیرا اپنی اصل میں ایک کوئلہ ہے مگر ہر کوئلہ ہیرا نہیں ہوتا کوئلے سے ہیرا بننے کا طویل ترین اور اندوہ ناک سفر ہی دراصل ایک کم قیمت کوئلے کو انمول ہیرا بناتا ہے ورنہ بباطن ہر کوئلے میں ہیرا بننے کی صلاحیت موجود ہے۔

میں نے حصولِ ثروت کے برعکس حکمت کا انتخاب کیا اور آج میں ایک لاعلم حکیم ہوں ۔میری لاعلمی سڑک کے نکڑ پر بھُٹے بیچنے والے جیسی پُرسکون تو نہیں مگر اس لاعلمی میں ایک گہرا اطمینان یہ ضرور حاصل ہو گیا کہ جاننے کی ہر تگ و دو فی اصل میں کارِ عبث مگر حرزِ جاں ہے ۔میں نے کوشش کی کہ دنیائے علم و حکمت کے قریباً ہر اہم موضوع کے متعلق اصلی حکمت تلاش کرلوں پس میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو پایا یہ فیصلہ معزز قارئین پر چھوڑ تا ہوں ۔

فقیر

نعمان نیئر کلاچوی، اکتوبر 2020، کلاچی

☆☆☆☆☆☆☆

سبع المعلّقات

روزنامہ پاکستان 11 اکتوبر 2020

علمائے عجم نے جہاں فقہ، تفسیر، حدیث اور علم الکلام جیسے نادر علوم دنیا کو دیئے تو وہاں ایک علمی زیادتی کا ارتکاب کرتے ہوئے زمانہ قبل از اسلام کو قطعی طور پر دورِ جاہلیت سے تعبیر کر دیا۔ بعینہٖ یہی مثال ہمارے ہاں زمانہ قبل از قیامِ پاکستان کے ضمن میں موجود ہے حالانکہ جس عرب معاشرے میں امرؤ القیس، زہیر اور لبید جیسے ذہین شعراء موجود ہوں وہ معاشرہ بھلا کیونکر جاہلیت کا استعارہ ہوسکتا ہے۔

انسانی جذبات کا بھی کوئی حال نہیں۔ انسان جب عقیدت پر اُتر آئے تو پتھر کو خدا بنا کر پوجنے لگتا ہے اس کے برعکس جذبہ تنفّر پر قائم ہوجائے تو ہر سچائی کو مروڑ کے رکھ دیتا ہے۔ سبع المعلّقات دراصل وہ سات شعری مجموعے ہیں جو زمانہ قبل از اسلام خانہ کعبہ کے دیواروں پر آویزاں تھے۔ صَرف، نحو، صنائع معنوی و بدائع لفظی، استعارات، مجازِ مرسلات اور ندیر تشبیہات کا مرقع ہیں اور جو آج بھی کلاسیکل عربی سے واقف اصحاب کیلئے وظیفہِ دانش و جمال اور توشہِ رموزِ التفات ہیں۔ قریباً ڈھائی سال تک میں یہ سات شعری مجموعے عربی اَدب کے شائقین کو آن لائن پڑھاتا رہا اور گزشتہ سولہ سال کی مسلسل وابستگی کے باوجود میری دانش آج بھی سبع المعلّقات کی خیال آفرینی، ندرتِ بیان اور عجائباتِ لغات کے کماحقہ ادراک سے معذور و مجبور ہے۔

ہمارے وقت میں تو یہ کتاب صَرف اور نحو کے بعد مدارس میں پڑھائی جاتی تھی۔ آج کا علم نہیں کیونکہ اب تو عربی ادب کے علماء بھی ڈھونڈنا آسان نہیں رہا۔ علمائے اَدب اِمرؤ القیس کو سلطان التشبیہات کہتے ہیں۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں سبع المعلّقات کے تمام ساتوں شعراء کے قصائد کا نہایت مختصر نمونہ اس مضمون میں شامل کرتا لیکن صرف ایک ہزار الفاظ کی پابندی پر موقوف اس مضمون میں آخر کتنی کوئی تفصیل بیان ہوسکتی ہے۔ پس اگر میں مضمون ہذا کو ایک سیریز کی شکل دے کر دو تین حصص میں کھینچ لوں تو پھر یہ میری طبع کیلئے قریباً ناممکن اَمر ہے کہ میں نے ہمیشہ طبیعت کی اطاعت کی ہے اور طبیعت پر اب اتنا بھروسہ نہیں رہا کہ وہ آئندہ بھی اس قدر خوشگوار ہوگی کہ عربی ادب کے جلیل القدر شعراء کے کلام پر کچھ لکھنے کی متحمل ہوسکے اِس لئے جتنا بھی لکھ سکا اِسی پر اکتفا کریں۔

سبع المعلّقات کے سات شعراء میں اِمرؤ القیس، طرفہ بن عبد، زہیر بن ابی سلمیٰ، لبید بن ربیعہ، عمرو ابن کلثوم، عنترہ بن شداد اور حارث بن حلزہ شامل ہیں۔ کوئی بھی قاری اِن تمام مذکورہ شعراء کو گوگل کر کے ان کے علم و فضل سے آگاہ ہو سکتا ہے اور پھر اِن کی علمی استعداد کو پرکھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا قطعاً مشکل نہیں رہتا کہ زمانہ قبل از اسلام جاہلیت پر مبنی تھا یا حکمتِ عامہ پر۔ سبع المعلّقات کا پہلا شاعر امرؤ القیس اپنے قصیدہ میں بیان کرتا ہے۔ ع

قفا نبك من ذكرى حبيب و منزلِ
بسقط اللوى بين الدخول فحوملِ

"اے میرے دونوں دوستو ٹھہرو! ٹھہرو تا کہ ہم اپنی محبوبہ اور اُس کے اِس گھر کو یاد کر کے رو لیں جو ریت کے ٹیلے کے آخر پر مقامِ دخول اور فحومل کے درمیان واقع ہے"۔ قصیدہ بہت طویل ہے۔ میں صرف تین اشعار عرض کروں گا پھر زہیر اور لبید کا کچھ نمونۂ کلام پیش کروں گا اور شاید پھر اس کے ساتھ ہی مضمون تمام ہو جائے۔ ع

ترى بعر الارام في عرصاتها
وقيعانها كانها حب فلفلِ

"سفید ہرنوں کی مینگنیاں اس مکان کے میدانوں اور ہموار زمینوں میں ایسی پڑی ہیں جنہیں دیکھ کر سیاہ مرچوں کا گمان ہوتا ہے"۔ یہ ہے اِمرؤ القیس کی رفعتِ تشبیہ۔ مجھے شدید قسم کی حیرت ہوتی ہے جب میں اچھے خاصے محقق علماء کے منہ سے بھی یہ جملہ سنتا ہوں کہ اصطلاح اللہ خالصتاً ایک اسلامی اصطلاح ہے جبکہ یہ اصطلاح اسلام سے چھ دہائیاں قبل اِمرؤ القیس المتوفیٰ 544ء اپنے ایک بیت میں اعتقادِ حلفیہ کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ ع

فقالت يمين الله مالك حيله
وما ارى عنك الغوايه تنجلِ

اِمرؤالقیس جب اپنی محبوبہ عنیزہ کے خیمے میں گھسا تو عنیزہ امرؤالقیس کو دیکھ کر چونک اُٹھی اور کہنے لگی کہ اللہ کی قسم اب تیرے پاس کوئی عذر نہیں اگر میرے اقارب نے تجھے میرے خیمہ میں دیکھ لیا پس اب میں تجھے ٹوک نہیں سکتی کہ تُو آخری درجے کا خطرہ مول لیکر یہاں پہنچا۔ پورے قصیدے میں اِمرؤالقیس کا یہ شعر ہر لحاظ سے عمدہ ہے۔ اس شعر کے فنی محاسن بیان کرنے کیلئے الگ سے ایک مضمون کی حاجت ہے۔ تشبیہ کی ایک اور مثال کس قدر دقیق اور عمدہ ہے بلکہ اگر اِسے ایک نادر تشبیہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیں۔ ع

كأني غداة البين يوم تحمّلوا
لدى سمرات الحيّ ناقف حنظلِ

"جدائی کے دن صبح جب وہ (محبوبہ کے ہمراہ) روانہ ہوئے تو آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ پڑے جیسا قبیلہ کے ببول کے درختوں کے نزدیک اندرائن توڑنے والا تھا"۔ اِمرؤالقیس اس بیت میں نہایت دقیق تشبیہ استعمال کرتے ہیں۔ حنظل اُردو میں اندرائن کو کہتے ہیں۔ اِسے ہم سرائیکی میں کڑتمہ بھی کہتے ہیں جسے توڑتے وقت بے اختیار آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ بیت میں اِمرؤالقیس نے ایک اصطلاح "بین" استعمال کی ہے جو اضداد میں سے ہے اور جسے بیک وقت یعنی موقع کی مناسبت کے حساب سے وصل اور جدائی دونوں کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تشبیہ کا کمال یہ ہے کہ جس طرح اندرائن توڑتے وقت آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں بعینہٖ محبوبہ سے جدائی کے وقت بھی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

زمانہ قبل از اسلام کے عرب شعراء کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اس قدر قادر الکلام ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو کلامِ مدحت سے کسی بھی ضعیف المرتبہ کو سلطان الحشم بنا دیں اور کلامِ ہجو سے کسی بھی باوقار کو صاحبِ ذل۔ یہی وجہ ہے کہ عرب غیر عرب کو عجم یعنی گونگا کہا کرتے۔ کلام کی قدرت زہیر اپنے قصیدہ میں کچھ اِس طرح بیان کرتے ہیں۔ ع

وقد قلتما ان ندرك السلم واسعا
بمال و معروف من القول نسلم

"اور بلاشبہ تم دونوں سرداروں نے بہت عمدہ بات کہی کہ اگر ہم کامل صلح بذریعہ مال اور کلامِ مستحسن پالیں گے تو ہم آپس کی خونریزی سے مامون ہو جائیں گے"۔ زہیر کے بعد میں ایک بیت لبید کے قصیدے میں سے عرض کر دیتا ہوں۔ زہیر طبعی میلان یعنی اپنی نفسیاتی کیفیت کو اِس عمدہ صناعی سے الفاظ میں پروتا ہے۔ ع

تبصر خلیلی هل تری من ظعائن
تحملن بالعلیاء من فوق جرثم

"اے میرے دوست! نظر جما کر دیکھ۔ کیا تُو ان ہودج نشین عورتوں کو دیکھتا ہے جو جرثم سے اُوپر بلند مقام میں اونٹوں پر سوار ہو کر جا رہی ہیں"۔ اِس بیت میں زہیر اپنی نفسیاتی کیفیت بیان کر رہا ہے کہ میری محبوبہ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ کجاوؤں میں سوار یہاں سے جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرثم کی بلندی سے گزر رہی ہے۔
یہ تصور دراصل زہیر کی غایتِ مدہوشی ہے ورنہ محبوبہ تو یہاں سے کب کی جا چکی۔ میری خواہش تھی کہ میں یہاں پانچ اور شعراء کا بھی ایک ایک بیت پیش کر دیتا لیکن سر دست مضمون اس کی اجازت نہیں دیتا اور ویسے بھی طویل ترین قصائد میں سے ایک ایک بیت کسی بھی طور شاعر کی فنی اَوج کو بیان نہیں کر سکتے۔ پس اگر عربی زبان کی حقیقی وسعت اور اس کی دل آویز وضع اور متعجب لغوی صناعی سے کماحقہ مستفید ہونا ہے تو بہت ضروری ہے کہ سبع المعلّقات کے تمام قصائد کو بغور پڑھا اور سمجھا جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اَپو دیپو بھاؤ

روزنامہ پاکستان 24 ستمبر 2020

دنیا کے ہر مذہب یا دین کی انتہائی بنیاد ایمان اور عقیدہ پر کھڑی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد ایمان یا عقیدہ پر قائم نہ ہو مگر دنیا کا ایک ایسا اکلوتا مذہب بھی ہے جس کی بنیاد اَنبھو (تجربہ) پر کھڑی ہے۔

گوتم بدھ نے فرمایا تھا کہ مانو مت۔ جانو۔ جب جان لو گے تو پھر منوانے کی ضرورت خود بخود ختم ہو جائے گی اس کے برعکس اگر بنا جان کر مانا تو یہ پاکھنڈ ایک نہ ایک دن آپ کے سامنے ضرور آ کھڑا ہو گا کہ آپ صرف ایک توہّم کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

بدھ کہتے ہیں کہ شردّھا (ایمان) ٹھونسی نہیں جاتی اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے گیان پراپت کیا جائے یعنی آگہی کارخ کیا جائے چنانچہ جب آگہی پیدا ہو جائے گی تو اس کا منطقی نتیجہ ایمان ہی ہوگا۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں اس مضمون کو خطِ نستعلیق اُدھار لیکر خالص سنسکرت میں تحریر کروں لیکن چونکہ ہمارے ہاں کبھی سنسکرت پر کام ہی نہیں ہوا اور نہ ہی ہمارے قارئین سنسکرت سے کوئی خاطر خواہ علاقہ رکھتے ہیں اس لئے مجبوراً اُردو میں لکھنا پڑ رہا ہے تاکہ قارئین سمجھ سکیں۔

بدھ مانش جاتی کے وہ پہلے دھارمک وِکتی ہیں جنہوں نے اپنے دھرم کی سنگھٹن شردھا اور بھگتی کی بجائے انبھو اور گیان پر رکھی۔ بدھ دھرم دنیا کا پہلا وِگیانک دھرم ہے حالانکہ عام طور پر ایمان اور سائنس میں ہمیشہ تصادم رہا ہے لیکن بدھ وہ پہلے مذہبی رہنما ہیں جنہوں نے لوگوں سے ایمان اور سپردگی کی بجائے جستجو اور تجربہ کا مطالبہ کیا۔ دنیا میں ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ جب بھی کوئی مذہبی رہنما انسانی معاشروں میں رونما ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے لوگوں سے تیقن اور ایمان کا مطالبہ کرتا ہے بعد میں پند و نصائح اور طرزِ حیات کا درس دیتا ہے مگر بدھ نے ایسا نہیں کیا۔

بدھ ایمان اور تیقن کی مبادیات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اگر وہی کچھ کرتے جو آپ سے قبل مذہبی رہنماؤں نے کیا تھا تو پھر بدھ اور دیگر مذہبی زعماء میں کوئی فرق باقی نہ رہ جاتا۔ بدھ نے کہا کہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اس کی یہ زندگی ہے اور یہ زندگی بہر طور دکھ ہے۔ آپ نے کہا سروم دکھم۔ یعنی زندگی دکھ ہے۔ اِس دکھ کی ایک وجہ ہے۔ وہ وجہ دور کرلو۔ باقی جو بچ جائے گا وہ اصل یعنی زندگی ہے۔ اِسے بدمت مت میں چار آریہ ستو کہتے ہیں۔

بدھ کون تھے اور وہ کس طرح اس جدید مذہب کے بانی بنے یہ ایک الگ اور نہایت طویل داستان ہے جو اس مختصر سے مضمون میں نہیں بیان ہوسکتی۔ یہاں پر میرا مقصد صرف بدھ کی بنیادی تعلیم اَپو دیپو بھاوَ یعنی اپنے دیئے خود بنو پر چند الفاظ رقم کرنے ہیں۔ دنیا میں سچ کو جاننے کے اب تک صرف تین طریقے رائج رہے ہیں۔ ایک اہلِ دانش کا طریقہ، دوسرا انبیاء کرام کا اور تیسرا صوفیوں کا۔

اہلِ دانش جنہیں ہم فلسفی کہتے ہیں وہ تو آج تک متفق نہ ہوسکے کہ حتمی سچ کیا ہے۔ انبیاء کرام کی تعلیم چونکہ خالص ایمان اور تیقن پر مبنی ہوتی ہے لہٰذا اس پر کلام کی حاجت نہیں کیونکہ کلام کیلئے بنیادی شرط کسی بھی معاملے کا دائرہِ کلام میں پایا جانا لابدی ہے ورنہ کنفیوژن کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ چنانچہ مذہب جب بھی کلام یا فلسفہ کی بھینٹ چڑھا اپنا مقصدِ اصلی ہی کھو بیٹھا۔ تیسرا طریقہ صوفیوں کا طریقہ ہے جس کی ابتداء تو دانش سے ہوتی ہے مگر انتہاء تربیتِ ذات پر آ کر رک جاتی ہے۔ پس بدھ اس تیسری کیٹا گری کے آدمی ہیں۔

بدھ دنیا کے وہ پہلے مذہبی رہنما ہیں جو ایمان اور دانش سے اوپر اُٹھ کر بھی خالص مذہبی رہے۔ اب اس طرح کا جدید تجربہ یقیناً دنیا کیلئے حیرت انگیز تھا کہ ایک شخص بغیر ایمان کے کیسے مذہبی ہوسکتا ہے مگر بدھ نے یہ تجربہ کر کے دکھایا کہ ایک شخص بغیر ایمان کے کیسے سچا اور کھرا مذہبی بن سکتا ہے۔ جو لوگ خدا کو مانتے بدھ اُن سے کہتے رک کیوں گئے ہو۔؟ آگے چلو اس کے برعکس جو لوگ خدا کو نہ مانتے بدھ اُن سے کہتے کہ ہٹ دھرم نہ بنو رک جاؤ۔

جبکہ جو لوگ ان دونوں کیفیات سے اُوپر اُٹھ جاتے بدھ اُنہیں اپنی ذات کی راہ دکھا دیتے۔ بدھ کہا کرتے کہ سب کچھ تمہارے پاس ہے کچھ بھی کہیں نہیں گیا مگر یہ جاننے کیلئے تمہارا اپنے بارے جاگنا ضروری ہے تا کہ تم باہر نہ بھٹکتے پھرو۔ خارجی دنیا میں کسی بھی ذات یا تصور کو تھامے یوں ایک دم خالی ہو کر اپنی ذات کا رخ کرنا یقیناً ہندوستانیوں کیلئے ایک عجیب وغریب عمل تھا پس سناتن دھرم کے حاملین نے جس قدر بدھ اور متبعین بدھ کے ساتھ ناروا سلوک کیا اس کی مثال شاید ہی کہیں تاریخ میں موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں بدھ دھرم کے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ بدھ کہتے ہیں کہ جاگو۔ ہوش پُرَوک جیو کیونکہ بنا ہوش سادھے صرف دکھ ہی دکھ سامنے آئے گا۔

بدھ کا ایک معروف قول ہے کہ ایک شخص جو جنگل میں شکار کر رہا تھا اچانک کہیں سے ایک تیر آ کر اُس کے سینے میں پیوست ہوگیا سو اب دو ہی لائحہ عمل ہیں یا تو تیر مارنے والے کا پتہ لگایا جائے اور زخمی کو تڑپتا چھوڑ دیا جائے یا پھر اس

سے قطع نظر کہ تیر کس نے مارا فوری طور پر زخمی کا علاج شروع کر دیا جائے۔

بدھ کہتے ہیں کہ زخمی ہم انسان ہیں اور تیر یہ ہماری زندگی ہے۔سو اب ہم اس زندگی کو کیسے تیر کی طرح ایسے نکال لیں کہ کم سے کم درد ہو۔ یہ ہے بدھ کا طرزِ حیات۔اس کے علاوہ بدھ کے نزدیک سب دھوکہ اور پاکھنڈ ہے۔بدھ کہا کرتے کہ ہوش میں آؤ کچھ بھی ماننے کی ضرورت نہیں جو ہے وہ ہوش میں آنے کے بعد خود ہی سامنے آجائے گا اس لئے بہت ضروری ہے کہ جاگو۔اپنے بجھے ہوئے ہوش کے دیئے کو جلاؤ اور اس کی روشنی میں جیو۔ بدھ کہا کرتے کہ کوئی بھی شخص جو جاگ چکا اس کی روشنی آپ کے کسی کام کی نہیں تبھی بدھ نصیحت نہیں کرتے نہ ہی کوئی مذہبی عمل بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تم اپنے دیئے خود بنو۔کسی کا دیا تمہارے اندر روشنی نہیں کرسکتا اس لئے کسی کی نصیحت یا نیک عمل سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچنے والا۔کسی کا گیان یا انبھو تمہارے کسی کام کا نہیں۔جو جاگ گئے وہ صرف اپنے لئے جاگ گئے۔ تم بھی جاگو۔تم بھی ہوش سنبھالو ورنہ جیون کا اندھکار تمہیں لے ڈوبے گا۔پس اپو دیپو بھاؤ یعنی اپنے دیئے خود بنو۔

☆☆☆☆☆☆☆

زنا بالجبر اور اسلامی قانون

روزنامہ پاکستان 17 ستمبر 2020

زنا بالجبر جسے انگریزی اصطلاح میں Rape کہا جاتا ہے دراصل کسی عورت کی منشا (Consent) کے بغیر سرانجام دیا گیا جنسی عمل ہے۔میں نے جان بوجھ کر لفظ زبردستی استعمال نہیں کیا کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر جنسی عمل جو عورت کی منشا کے بغیر سرانجام دیا جائے Rape ہی میں شمار ہوگا۔البتہ اِس عمل کے لئے زبردستی سے پیش آنا الگ سے ایک جرم ہے جس کیلئے فی الحال نہ تو اُردو میں کوئی اصطلاح موجود ہے اور نہ ہی انگریزی میں۔

زنا بالرضا یا Fornication کے معاملے میں تو قرآن سے مستنبط قانون موجود ہے جس کی تفسیر علمائے فقہ کرتے رہے ہیں لیکن زنا بالجبر کا معاملہ انتہائی پیچیدہ ہے۔نہ صرف پیچیدہ ہے بلکہ قرآن اور احادیث ِمتواترہ میں اِس کا کوئی واضح اور دوٹوک قانون بھی موجود نہیں ہے۔ریپ کے حوالے سے عموماً جو ایک دو روایات بیان کی جاتی ہیں ان کے متن میں اختلاف کے تو موجود ہے ہی علاوہ ازیں یہ روایات ہیں بھی حسن درجے کی۔اصحابِ سنن امام ابوداؤداور امام ترمذی اپنی کتب میں یہ روایت نقل کرتے ہیں جس پر علامہ البانی کی جرح بھی موجود ہے لیکن یہ روایات اِس نوعیت کی نہیں ہیں کہ اِن کی بنیاد پر Rape کا باقاعدہ قانون بنایا جاسکے۔

درسِ نظامی کے حصول کے دوران ہمیں اساتذہ نے حدِ قذف کے متعلق تو تفصیل سے سمجھا دیا تھا لیکن زنا بالجبر کے حوالے سے اساتذہ کی خاموشی اور اس خاموشی کے پیچھے چھپی حکمت مجھے آج بھی یاد ہے جو میں یہاں بیان کرنے کے لئے یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔

دراصل اسلام میں زنا بالرضا اور زنا بالجبر یعنی Rape کی سزا کا قانون صرف ایک ہی نوعیت کا ہے اس میں کوئی تخصیص موجود نہیں اور دونوں کو ثابت کرنے کے لئے وہی چار گواہ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے فعل ہوتا ہوا دیکھا ہو درکار ہوتے ہیں۔اب میں یہاں پر زنا بالجبر کے حوالے سے اُن فطری مجبوریوں کا ذکر کروں گا جن سے بہر طور کسی بھی صورت چھٹکارا ممکن نہیں۔

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ زنا بالجبر یا Rape کی شکار خاتون جب عدالت کے پاس اپنا مقدمہ لے کر جاتی ہے تو اُس

کے پاس اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے کیا دلائل اور ثبوت موجود ہوتے ہیں؟ یاد رکھیں کہ قانون کی بنیاد حکمت، دلیل اور ثبوت پر مبنی ہوتی ہے عدالت اگر لوگوں کے جذبات اور غوغا پر فیصلہ دینے لگے تو پھر عدالت قانون کی بجائے ایک جذباتی دھما چوکڑی کی پیروکار بن جائے گی۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ عورت اپنی حقانیت ثابت کیسے کرے گی؟، جبکہ اس کے پاس شریعت کو مطلوب چار گواہ تو کسی صورت بھی نہیں ہوں گے کیونکہ چار لوگوں کی موجودگی میں تو یہ فعل ممکن ہی نہیں۔ یقیناً پھر صورت زنا بالرضا ہی کی کیوں نہ ہو دنیا کا کوئی بھی اخلاقیات سے گیا گزرا مسلمان بھی چار لوگوں کی موجودگی میں یہ فعل سرانجام نہیں دے سکتا۔ لامحالہ اس کی پھر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ فاعل خود عدالت کے سامنے پیش ہو کر اپنے فعل کا اقرار کرلے اور ایسا ہوا بھی ہے جیسا کہ بعض آثار (احادیث) سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ (ملاحظہ کریں سنن ابو داوٗد کی حدیث نمبر 4379 اور سنن ترمذی کی حدیث نمبر 1454)

حقیقت یہ ہے کہ زنا بالجبر کا معاملہ تو زنا بالرضا سے بھی پیچیدہ ہے اور لوگ اس پر ایسے بحث کر رہے ہوتے ہیں کہ جیسے شریعت اِسلامی سے یہ مسئلہ کہیں چُوک گیا ہو۔ ایسا بالکل بھی نہیں کہ اس مسئلے کی بابت فقہاء نے غور نہیں کیا یا اس مسئلہ کو قرآن وسنت میں اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یقینا ہے لیکن اس مسئلے کی حساسیت اور پیچیدگی کے پیش نظر اس پر وہی قانون لاگو کر دیا گیا جو زنا بالرضا کے ضمن میں واقع ہوا۔ قانون کی بات تبھی ہو سکتی ہے جب آپ ایک جرم کو ثابت کر لیتے ہیں پھر چاہے وہ معاملہ شریعت کا ہو یا پھر خالص سیکولر قوانین کا ہر دو صورتوں میں پہلے جرم کو ثابت کرنا لابدی ہے۔ اس ضمن میں قانون سازی کا مسئلہ اُس وقت تک لایعنی عمل ہے جب تک کہ جرم کو ثابت کرنے کا کوئی ٹھوس وسیلہ نہیں پیدا ہو جاتا کیونکہ عدالت گواہ اور ثبوت کی بنیاد پر فیصلے کرتی ہے۔

پرانے زمانے میں عموماً مخالفین ایک دوسرے کو سماجی اور اخلاقی طور پر زیر کرنے کے لئے عورت کا استعمال کیا کرتے جیسا کہ روایات میں درج ہے کہ حضرت موسیٰ پر ایک عورت نے زنا بالجبر کا الزام لگایا تھا یا جیسا کہ زلیخا نے حضرت یوسف کو متہم ٹھہرایا۔ چنانچہ یہ کوئی نئی بات نہیں اب اگر جدید طبی سہولیات میسر آ گئی ہیں تو ڈی این اے کا وسیلہ ثبوت کے طور پر استعمال کرنے میں یقینا کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ البتہ اصل مسئلہ اب بھی جوں کا توں موجود ہے کہ عورت سچ بول رہی ہے یا جھوٹ، یہ ثابت کیسے ہوگا؟۔

کیاایسا ممکن نہیں کہ کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ زنا بالرضا کرنے کے بعد عدالت کے پاس چلی جائے اور مذکورہ شخص پر مقدمہ درج کردے کہ اِس شخص نے میرے ساتھ زنا بالجبر کیا ہے اور پھر عدالت ڈی این اے کے ذریعہ سے فعل ثابت بھی کردے اور فاعل پر جرم ثابت ہو بھی جائے تو جرم ثابت ہونے کے بعد جو زیادتی قانونی طور پر فاعل کے ساتھ ہوگی اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ یا آپ یہ کہہ دیں کہ مذکورہ بالا صورت تو کسی طور بھی ممکن نہیں ۔قطعاً نہیں،ایسی صورت بالکل ممکن ہے پس ایسی صورت کا میں خود چشم دید گواہ ہوں جو میرے ایک انتہائی قریبی دوست کے ساتھ پیش آئی ۔لیکن چونکہ بعد میں دوست نے اپنی مدعی خاتون کو کسی طور راضی کرلیا تھا اس لئے یہ معاملہ اُسی وقت رفع ہوگیا تھا ورنہ دوست کے توصحیح معنوں میں اوسان خطا ہو گئے تھے ۔زنا بالجبر کے ضمن میں یقیناً یہ ایک انتہائی اہم اور خطرناک مسئلہ ہے۔

اب اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہر عورت اس طرح کی اخلاقی گراوٹ کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زنا بالجبر کے ضمن میں جرم کو ثابت کرنے کے لئے جو درکار وسائل موجود ہیں وہ نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ ان میں زبردست فریب اور کذب بیانی کا بھی احتمال بدرجہ اتم موجود ہے ۔پس بہت ضروری ہے کہ اس ضمن میں قانون سازی سے قبل تعیین جرم کے لئے درکار کافی ثبوت اور مدعی مفعولہ کے اخلاق اور کردار پر جرح کے معقول وسائل پیدا کئے جائیں ورنہ پھر یہ کسی بھی مرد کی عزت سرعام نیلام کرنے کا ایک مستقل قانونی حربہ بن جائے گا۔

قوانین انسانی جذبات یا معاشرتی دباؤ کی بنیاد پر قائم نہیں کئے جاتے ۔ ہر قانون کے پیچھے ایک گہری حکمت کارفرما ہونی چاہئے تبھی وہ صحیح معنوں میں مفید ہوسکتا ہے ورنہ طاقت کی بنیاد پر قانون سازی انسانیت کے لئے کبھی فائدہ مند نہیں رہی ۔قانون جہاں ایک طرف مظلوم کو انصاف فراہم کرتا ہے تو وہاں دوسری طرف مجرم کو اس کے جرم کی معقول سزا بھی دیتا ہے ۔علاوہ ازیں قانون نافذ کرنے والے اداروں پر یہ اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اِس اَمر کا مسلسل جائزہ لیتے رہیں کہ کوئی بھی شاطر قانون کا سہارا لے کر کسی بھی بے گناہ کے ساتھ زیادتی نہ کرلے۔

☆☆☆☆☆☆☆

نصابِ تعلیم کی مبادیات

روزنامہ پاکستان 15 ستمبر 2020

ریاستِ پاکستان میں آئے دن کوئی نہ کوئی سیاسی و عوامی شغل میلہ لگا رہتا ہے چنانچہ پچھلے چند دنوں سے یکساں قومی نصاب کی دھما چوکڑی بھی خوب لگی۔ اب کچھ آرام تو ہے لیکن کیا معلوم ریاست یکساں قومی نصاب سے کہیں سے زیادہ ضروری اُمور میں مبتلا ہو۔

ریاست یعنی عربی زبان کی یہ اصطلاح استعمال کرتے وقت عجیب سی اجنبیت ذہن میں سرایت کر جاتی ہے لیکن افسوس اس اَمر کا ہے کہ وہ اجنبیت یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ نصاب یا جسے انگریزی میں سلیبس کہہ لیں دراصل نظمِ تعلیم کا وہ اساسی ڈھانچہ ہوتا ہے جو کسی بھی ریاست کی ذہنی نشو و نما کیلئے ترتیب دیا جاتا ہے۔ علمائے حکمت کا قول ہے کہ اگر کسی ریاست کے اذہان کو ایک ہی جست میں پرکھنا ہو تو اُس ریاست کا تعلیمی نصاب کھنگال لو۔ نصاب تیار کرنے سے بہت پہلے یہ جان لینا انتہائی ضروری ہوتا ہے کہ علم و تعلیم فی نفسہٖ ہے کیا۔ اس کا اساسی اور اضافی دائرۂ کار کیا ہے۔ اساسی دائرہ سے مراد یہ ہے کہ وہ کونسے علوم و فنون ہیں جن کا جاننا اور سیکھنا لابدی اور کونسے ایسے علوم یا فنون ہیں جن کا جاننا یا سیکھنا طالب علم کی اختیاری صوابدید پر مبنی ہے۔ مثلاً تاریخ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس کو اساسی نوعیت کا مضمون سمجھا جاتا ہے اسی طرح آج کل کمپیوٹر سائنس کا مضمون بھی اساسی نوعیت اختیار کر چکا ہے۔

یکساں نصابِ تعلیم ایک انتہائی خوبصورت نظمِ تعلیم ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری یہ اَمر ہے کہ نصاب تیار کرتے وقت ہماری ترجیحات کس نوعیت کی ہیں۔ برصغیر میں انگریز کے آنے سے قبل یہاں کوئی باقاعدہ تعلیمی نصاب رائج نہیں تھا۔ عام لوگ مختلف مذہبی علماء کے ہاں انفرادی طور پر زانوئے تلمذ طے کرتے جبکہ خواص کیلئے یہ اہتمام ان کے گھروں میں ہی کر دیا جاتا تاپس سکول، اکیڈیمی اور یونیورسٹی کا تصور برصغیر میں کچھ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو ہمارے ہاں دنیا کی قدیم ترین تعلیمی درسگاہ تکشِشلا یونیورسٹی کی تاریخ بھی موجود ہے جہاں آج سے چھبیس سو سال قبل نیچرل فلاسفی یعنی فزکس، ریاضی اور طب جیسے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔ انگریز نے یہاں آکر سب سے پہلے وہی کام کیا جس کیلئے اس کی طبیعت رواں تھی۔

چنانچہ اس نے سب سے پہلے یہاں کے تعلیمی ڈھانچے پر نظر جمائی اور لارڈ میکالے جیسے دانشور کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ ہندوستانیوں کیلئے یکساں تعلیمی نصاب کا بندوبست کرے پس کلکتہ یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج اور فورمین کرسچن کالج جیسے جدید تعلیمی ادارے گوروں ہی کے توسط سے قائم ہوئے۔ یکساں تعلیمی نصاب بلا شبہ ایک شاندار تعلیمی نظم ہے بشرطیکہ اس کی بنیاد اضافی اور غیر ضروری مضامین کی بہتات پر مبنی نہ ہو بلکہ ایسے تمام تر مضامین کو طلبہ کی ذہنی ساخت اور اختیاری اُپج پر چھوڑ دیا جائے۔

اگر ہم آج کی جدید دنیا کے تعلیمی نصاب پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آج کی جدید دنیا کا تعلیمی نصاب ایک خالص سیکولر نصاب بن چکا ہے تو کیا ہم اس نا قابل مسترد حقیقت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر نصابِ تعلیم مساوی ہو یا غیر مساوی فی الحقیقت افادہِ اصلی سے منہا ہے۔ اگر آپ بضد ہیں کہ اخبارِ آحاد اور سنن ترمذی و نسائی ہر مسلمان کیلئے پڑھنا ضروری ہیں تو پھر یہ بھی یاد رہے کہ ایک الیکٹریکل انجینئر کیلئے روایت صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع کی وہی حیثیت ہوگی جو ایک فزیشن کیلئے قطب نما اور دوربین کی ہوتی ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ آج تہتر سال گزرنے کے بعد بھی ہم کوئی چار پانچ اعلیٰ ترین اور زرخیز دماغ بھی نہ پیدا کر سکے۔ جھوٹ، منافرت، فرقہ واریت اور منافقت پر مبنی نصاب مختلف ہو یا یکساں قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق تو تب پڑتا ہے جب آپ کھری اور صاف ستھری تعلیم و تربیت کا انتظام کریں۔

ہمارے ہاں عموماً جو تاریخِ پاکستان پڑھائی جاتی ہے پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ اگر سب کو مساوی طور پر پڑھا دی جائے یا کسی مخصوص سوشل کلاس کو۔ علمائے عجم نے جس طرح عرب پر یہ ظلم کیا کہ زمانہ قبل از اسلام کو دورِ جاہلیت سے تعبیر کر دیا بعینہٖ ہمارے ہاں بھی تاریخ قبل از قیامِ پاکستان کو بھی دورِ جاہلیت سمجھ کر ترک کر دیا گیا حالانکہ اس ناروا امساک سے ہم اپنی شاندار علمی و تمدنی روایت سے ٹوٹ کر رہ گئے۔ پس ایسی اندوہ ناک صورتحال میں سوال یہ نہیں پیدا ہوتا نصاب یکساں ہو یا غیر یکساں بلکہ اصل مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ نصاب کی موجودہ ہیئت کس قدر مستند ہے۔ ذہانتِ اصلیہ اور دانش عالمیہ آج جدید وقت کی انتہائی اہم اور لابدی ضروریات بن چکے ہیں مگر ہم آج بھی مفروضات و تصورات کی دنیا میں کھوئے ہوئے ساری دنیا سے الگ کسی لایعنی انانیت کی گھمن پھیری میں پھنسے ہوئے ہیں۔ قحط الخلق کے ساتھ ساتھ جس عجیب و غریب قحط الفکر کا شکار آج ہماری جدید طبع اور قدیم دماغ ہو چکا ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں موجود ہو۔

تزکیہ، محاسبہ اور مناقشہِ ذات سے محروم ہم لوگ آج بھی اپنے غیر مفید اور لایعنی تصورات دنیا پر تھوپنے کے خواہاں ہیں ۔ہمیں سب سے پہلے تربیتِ ذات اور اپنے نظمِ تعلیم کی مبادیات پر توجہ دینا ہوگی اور اس میں جوہری تبدیلیاں لانا ہوں گی ورنہ جس طرح گزشتہ تہتر سال شغل میلہ میں گزر گئے آنے والا لامحدود وقت بھی اسی طرح مضرت رساں غفلت میں گزر جائے گا۔ہمیں سب سے پہلے جس انتہائی اہم اور بنیادی تعلیمی مسئلہ کی جانب توجہ دینا ہوگی وہ ہے تاریخ قبل از قیامِ پاکستان کو بغیر کسی تعصب کے نصاب میں شامل کرنا،اور جس کا صحیح معنوں میں ادراک حاصل کرنے کے بعد ہی ہماری موجودہ اور نئی نسل کی ذہنی ساخت میں جوہری انقلاب رونما ہو سکے گا۔

کیا ہمارا طالب علم بابائے سیاست و معیشت دادا بھائی نوروجی سے واقف ہے؟ کیا ہم اپنی دھرتی پنجاب کے فقید المثل ماہرِ تعمیرات بابائے لاہور گنگا رام اگروال کے نام سے واقف ہیں؟ ۔کیا ہم نے ابھی تک اپنے طالب علم کو پڑھایا کہ علم و حکمت کسی عقیدہ کے ہاں گروی نہیں پڑی ہوتی؟ کیا ہم نے اپنے طالب علم کو یہ تعلیم دی کہ قیامِ پاکستان سے قبل کا ہر عالم، فاضل، سائنسدان اور ریاضی دان صرف اور صرف ہمارا ہے اور ہم اُس سے بہر صورت سیکھیں گے اور اُسے اپنی دھرتی کا سپوت مانیں گے ۔؟

کیا ہم نے اپنے طالب علم کو برصغیر کے عظیم ریاضی دان شری نواس رامانوجن اور ماہرِ طبیعیات، حیاتیات اور نباتات جگدیش چندر بوس اور ماہرِ ادویات و بدنیات اور نوبل پرائز انعام یافتہ ہرگوبند کھرانا جو ہماری ہی دھرتی رائے پور ملتان کا باسی اور ہماری قدیم تعلیمی درسگاہ گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی سے پڑھ کر آگے پہنچا، کے بارے میں پڑھایا؟ یقیناً نہیں، تو پھر آپ نصاب یکساں ترتیب دے لیں یا پھر غیر مساوی فی الحقیقت کوئی فرق نہیں پڑ نا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ایمانداری اور سمجھداری

روزنامہ پاکستان 05 ستمبر 2020

ساہوکار گورکھ ناتھ کا جب مرنے کا وقت قریب آیا تو اُس نے اپنے بیٹے کو بُلا کر کہا کہ دیکھو بیٹا میری دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنا کیونکہ میرے بعد یہ دکان تم ہی نے سنبھالنی ہے۔ایک ایمانداری دوسری سمجھداری۔ایمانداری یہ ہے کہ ہمیشہ دوسروں سے بھلائی کرتے رہنا کیونکہ یہی ہماری دھرم شِکشہ ہے۔بیٹے نے کہا کہ پتا شری سمجھداری کیا ہے گورکھ بولے دیکھو بیٹا بھول کر بھی کسی سے بھلائی نہ کرنا کیونکہ تم جس سے بھی بھلائی کروگے وہی تمہیں نقصان پہنچائے گا۔

کہنے کو تو یہ ایک لطیفہ ہے مگر اس لطیفہ میں ہم سب کی زندگیوں کا راز چھپا ہے۔ہم جس قدر بھی نیک سیرت کیوں نہ بن جائیں لوگ ہمیں ہماری اچھی خصلتوں سے متنفّر کر ہی دیتے ہیں۔میں اکثر ایسے نیک سیرت اور انسانیت کے ہمدرد لوگوں کو جانتا ہوں جو مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو چکے ہیں صرف اِس بنا پر کہ لوگ بے ایمانی کی عادت سے باز نہیں آتے۔ پشتو زبان میں ایک مشہور کہاوت ہے کہ "شہ مہ کوہ بد نشتہ" بھلائی نہ کرو تو آپ کے ساتھ برائی نہیں ہوگی۔مگر صرف اتنا کہہ دینے سے مسئلہ حل تو نہیں ہو جاتا کہ بھلائی نہ کرو اور بات ختم۔ہم چاہ کر بھی خود کو اچھائی سے دور نہیں کر سکتے۔

شاید یہی وہ بنیادی انسانی دوئی کی کشمکش تھی جسے پاک زرتشت نے یزداں اور اہرمن کے اسماء سے اپنی تعلیم میں پیش کیا۔یزداں جو آپ کو خیر کی جانب کھینچتا رہتا ہے اور اہرمن جو برائی کی قوت ہے جس سے آپ بہر صورت پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔اسلامی عقیدہ کے مطابق اچھائی اور برائی کی قوت خدا کی جانب سے ہے جیسا کہ ایمانِ مفصل کی عبارات میں درج ہے کہ **والقدرِ خیرہٖ وشرہٖ من اللہ تعالیٰ** یعنی خیر و شر کی اقدار خدا کی جانب سے ہیں۔اسلامی عقیدہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ خیر اور شر کا موسس اعلیٰ خود خداوند ہے چنانچہ ہمیں اپنے مفاد کے حصول کی خاطر اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے اعلیٰ اخلاقی اقدار کو پامال نہیں کرنا چاہئے۔لیکن انسان آج بھی اپنے انفرادی مفادات پر ہر نوعیت کے اخلاقی اصولوں کو پامال کر رہا ہے۔اب اسے ایمان اور عقل کی باہمی کشمکش میں عقل کی ظاہری فتح کہیں یا پھر ایمان کا ضعف کوئی ایک رائے تو بہر صورت قائم کرنی ہی ہے۔

برائی جو خدا کی جانب سے ہے انسانی عقل کو بلاشبہ اس مخمصے میں جلد یا بدیر بہر طور ڈال ہی دیتی ہے کہ جب نوبت زیادہ

برے اور کم برے تک پہنچ جائے تو پھر کونسا آپشن اختیار کرنا چاہیئے ۔ دراصل مقابلہ اچھائی یا برائی کا سرے سے ہے ہی نہیں ۔مقابلہ برائی اور کم برائی کا چل رہا ہے پھر انسانی عقل کی یہ عنایت بھی کچھ کم نہیں کہ وہ کم برائی کو اختیار کرلے ۔

اب اس سے بھی ایک درجہ اُوپر کا معاملہ ہے مسئلہِ تحکیم ،یعنی جب معاملہ خالصتاً حکم کا آجائے تو پھر اچھائی یا برائی کو دیکھا جائے یا پھر حکم کی تعمیل کی جائے؟ ۔

جگر مراد آبادی صوفی منش انسان تھے ۔ایامِ شباب سے لیکر آخری عمر تک مسلسل شراب نوشی کرتے رہے ۔آخری عمر میں خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے معروف صوفی بزرگ حکیم شاہ محمد اختر صاحب کی صحبت اختیار کرلی تھی اور ہمہ وقت یہی فکر لگی رہتی کہ کسی طریقے سے اس بری لت سے جان چھوٹ جائے لیکن چونکہ آپ کے گُردے الکوحل کو جذب کرنے کے عادی ہو چکے تھے اس لئے اطباء نے مشورہ دیا کہ ترکِ شراب نوشی آپ کیلئے مہلک ثابت ہوسکتی ہے ۔چنانچہ کچھ عرصہ بادلِ ناخواستہ یہ عادت جاری رکھی مگر پھر جب شاہ صاحب سے شراب نوشی کی ممانعت کے متعلق حکمِ خداوندی کی علت جان لی تو پھر ایک دم سے شراب نوشی ترک کردی اور پھر اسی سبب آپ کا انتقال بھی ہوگیا ۔

مجھ سے اکثر آزاد منش نوجوان پوچھتے رہتے ہیں کہ قبلہ ہم تو شراب پی کر کوئی ہلڑ بازی یا غیر اخلاقی حرکات میں مبتلا نہیں ہوتے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ شراب نوشی کی ممانعت کا اصلی فلسفہ کیا ہے؟ اس موقع پر میرا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ شرط جب حکم ہو تو منطق کے اُصول کے مطابق شرطِ حکم کا صلہ نہیں پوچھا جاتا ورنہ پھر نفسِ حکم کی انفرادی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی ۔زمانہِ طالبعلمی میں اساتذہ ہمیں عربی زبان میں ایک دعا سکھایا کرتے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا طَیِّبًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا "یعنی اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں نفع مند علم ،حلال رزق اور مقبول عمل کا ۔ پھر ہمارے ایک ہم جماعت فوری سپاٹ لہجے میں بول پڑتے کہ حضرت علم نافع سے کیا مراد ہے؟ ۔کیا ہمیں کوئی زبردست قسم کی سرکاری نوکری ملے گی پس پوری جماعت اِس سوال پر ہنس پڑتی ۔

اصل میں یہ بات اُس وقت سچ نہیں تھی لیکن آج بالکل سچ ہو چکی ہے کیونکہ آج علم نافع صرف وہی ہے جو آپ کو سولہ یا سترہ گریڈ کی سرکاری نوکری دلوا دے ۔حالانکہ علم نافع کا حقیقی مطلب یہ تھا کہ جب احکام کا معاملہ آجائے تو بجائے عقل کو بروئے کار لا کر انتشار پیدا کیا جائے ،احکام کی تعمیل کی جائے کیونکہ حکم فی نفسہٖ بالا از فکرِ نیک و بد اور درکِ موزوں ہے ۔میری عمر بمشکل اکیس سال ہی ہوگی جب میں نے غیر رسمی طور منطق میں تخصص جسے پی ایچ ڈی کہا جاتا

ہے کرلیا تھا۔مطلق منطق تو مدارس میں پڑھائی ہی نہیں جاتی بلکہ اب تو علم الکلام بھی برائے نام پڑھایا جاتا ہے۔

ہمارے وقت میں علامہ محمد زمان صاحب علم الکلام کے کہنہ مشق اُستاد تھے اور شرح العقائد جیسی دقیق کتب پڑھایا کرتے۔منطق پڑھنے کے بعد میرے اندر ہمیشہ سے سمجھداری اور ایمانداری کی کشمکش جاری رہتی اُس وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ شاید کلام جیسا دقیق علم پڑھنے کی وجہ ہی سے مجھے یہ مسئلہ پیش ہو رہا ہے مگر بعد میں جب شعور نے بھر کیاں ماریں تو معلوم ہوا کہ یہ تو سب کا مسئلہ ہے۔لیکن بامراد ہوا وہ شخص جس نے سمجھداری کو پیچھے چھوڑ کر ایمانداری کی راہ اختیار کرلی ورنہ علم پھر وسیلہِ فساد کے علاوہ تو کوئی معانی ہی نہیں رکھتا کیونکہ منطق زیادہ تر بے ایمانی کے حق میں ہی دلائل گھڑتی رہتی ہے پس ایمانداری کو کلام کی کیا حاجت۔لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی ایک کڑوا سچ ہے کہ دکانداری میں ایمانداری مطلق غیر ضروری اور ہمیشہ خسارے پر ہی منتج ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

آسباقِ لسانیات

روزنامہ پاکستان 01 ستمبر 2020

شبد تو کورے پنے ہیں پھر اِن سے نکالنے والے اپنی مرضی کا اَرتھ نکال لیتے ہیں۔ جی ہاں اگر تو آپ سمجھ گئے ہوں تو یہ ہماری اپنی زبان یعنی سنسکرت ہے۔شبد یعنی (الفاظ،عربی) کورے مطلب (صاف،عربی) پنے یعنی (کاغذ،فارسی) اَرتھ،(مطلب،عربی) نکال سکتے ہیں،(اپنی زبان یعنی سنسکرت)،پنجابی،سرائیکی،سندھی،بلوچی،براہوی،مارواڑی، بنگالی،کانہڑہ،بھوجپوری،تمل،ملیالم،تلگو اور پالی اِن سب زبانوں کا تخمِ اصلی سنسکرت ہے چنانچہ لہجہ تبدیل ہونے کے سبب مذکورہ زبانوں کے الفاظ کی بُنت اور صوتی وتحریری تشکیلا ت میں فرق پیدا ہوگیا۔
دنیا میں کسی بھی زبان کی ترویج کا ماخذِ اصلی صوتی علامات ہیں جن کے سبب وہ زبان آگے جا کر رسمِ تحریر کی صورت اختیار کر لیتی ہے چنانچہ کسی بھی زبان کو سیکھنے کے دنیا میں صرف تین اسلوب ہی رائج رہے ہیں۔ایک سادہ اسلوب تو یہ ہے کہ وہ زبان آپ کے گھر کی زبان ہو۔دوسرا وہ زبان آپ کے معاشرے کی زبان ہو۔اس کے علاوہ تیسرا اسلوب انتہائی پیچیدہ اسلوب ہے یعنی وہ زبان آپ اُس زبان کے قواعد کے وسیلہ سے سیکھیں۔
دنیا میں اِس وقت چار بڑی زبانیں رائج ہیں یعنی انگریزی زبان جو رومن یا لاطینی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔دوسری چائینز زبان جو چائنہ ہی کے قدیم رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔تیسری بڑی زبان عربی ہے جو آرامی رسم الخط جسے جدید اصطلاح میں عربی رسم الخط بھی کہا جاتا ہے میں لکھی جاتی ہے۔اس کے علاوہ دنیا کی چوتھی بڑی زبان سنسکرت یعنی ہماری دھرتی کی زبان جو قدیم ہندی رسم الخط دیوناگری میں لکھی جاتی ہے۔دیگر زبانوں کا تذکرہ تو خیر کسی اور مضمون میں کروں گا۔اِس وقت میں اپنی زبان یعنی سنسکرت پر تھوڑی روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں۔
سنسکرت اِس وقت دنیا کی قدیم ترین زبان ہے جس کے متعلق ایک عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ دیوتاؤں کی زبان تھی اور اِسی لئے یہ زبان دیوتاؤں کے رسمِ تحریر دیوناگری میں لکھی جاتی رہی۔سنسکرت ایک خاص وقت تک یعنی قریباً چار ہزار سال قبل تک اپنی اصل حالت میں مستعمل رہی،بعد میں یہ زبان اپنی اصل حالت سے بھرشٹ (مخرب) ہو کر پراکرتوں اور اَپ بھرنشوں کی صورت اختیار کرتی گئی۔

چنانچہ سب سے پہلی پراکرت پالی زبان تھی جو قدیم بدھوں اور جینیوں کی زبان تھی۔ بدھ مت کی دھم پدھ اور گاتھائیں جبکہ جین مت کی اگھم بھی اِسی پالی زبان میں تحریر کی گئی ہیں۔

پراکرتوں اور اَپ بھرنشوں کا رسم الخط بھی دیونا گری تھا۔ بعد میں اِنہی پراکرتوں کی مختلف شکلیں وقت کے ساتھ ساتھ بھرشٹ ہوتے ہوئے پورے ہندوستان میں رائج ہوتی رہیں۔

سنسکرت کی معروف بولیوں میں سندھی، پنجابی، بنگالی، اور تمل نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ یہ تمام بولیاں دیونا گری رسم الخط میں لکھی جاتی رہیں۔ چنانچہ پنجابی کے لیے دیونا گری ہی کے بطن سے پیدا شدہ رسم الخط گورمکھی اور شاہ مکھی خطوط بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ یہاں پر میں ایک انتہائی اہم مسئلہ اُردو کے متعلق ضرور بیان کروں گا کہ اُردو یا ریختہ فی الاصل کوئی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں بسنے والے اہلِ اسلام کا عربی کے رسم الخط میں سنسکرت لکھنے کے اسلوب کا نام ہے برج بھاشا، اُردوئے معلیٰ، ریختہ یا محض اُردو۔

اُردو ترکی زبان کی اصطلاح ہے جس کے معنی لشکر کے ہوتے ہیں۔ اُنیسویں صدی کی ابتداء میں اُردو شعراء کے ہاں شعر و ادب کی محافل میں اس کا رواج عام ہوا۔ سب سے پہلے اصطلاح اُردو شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ادبی حلقوں میں متعارف کرائی۔ مرزا اسداللہ خان غالب اِسے ریختہ کہا کرتے۔ مغل دربار پہنچی تو اس کا نام اُردوئے معلیٰ پڑ گیا۔

پس آج ہم اُردوئے معلیٰ ہی استعمال کرتے ہیں۔ اُردو اپنی اصل میں ہندی زبان ہے جس میں سنسکرت کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کی تراکیب شامل ہوتی گئیں اور پھر اُردو شعراء نے اسے دیونا گری رسم الخط میں لکھنے کی بجائے عربی رسم الخط نسخ میں لکھنا شروع کر دیا۔ اِسی طرح بعد میں یہ ترقی کر کے فارسی خطوط یعنی خطِ نستعلیق اور خطِ کشیدہ میں ڈھل گئی۔ چنانچہ آج اُردو کے اَن گنت خطوط پیدا ہو چکے ہیں مثلاً اُردو نسخ ایشیاء ٹائپ جو بی بی سی اُردو کا سرکاری خط ہے۔ نفیس ویب نسخ، نوری نستعلیق، جمیل نوری نستعلیق، علوی نستعلیق، فیض نستعلیق، القلم وغیرہ۔

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں اُردو ادب کے ایک کہنہ مشق پروفیسر رہے ہیں کافی دیرینہ یارانہ رہا ہے اُن سے۔ ایک رات کال کر کے پوچھتے ہیں حضرت میں آج کافی پریشان ہو گیا ہوں جب میں نے اپنے بیٹے سے یہ پوچھا کہ آج بیڈمنٹن کھیلنے باہر کیوں نہیں گئے تو وہ بولے کہ چھوڑیں بابا آج Muggy Weather ہے۔

بیٹے کا یہ جملہ سن کر میری اہلیہ مجھ سے مخاطب ہوئیں کہ یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے۔ ویدر تو مطلب موسم یہ مگو کونسا موسم ہوتا ہے؟۔

میں نے مسکرا کر تصحیح کی مگو نہیں Muggy۔اب وہ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ اسے ہم اُردو زبان میں کیا کہتے ہیں۔ میں ایک منٹ خاموش ہوا پھر بولا کہ اُردو میں تو فی الحال نہیں معلوم البتہ سرائیکی میں اسے ہم گھمہ کہہ سکتے ہیں۔

بعد میں آنجناب مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ تو اُردو، فارسی، عربی، سنسکرت، پشتو اور انگریزی زبان جانتے ہیں انگریزی کی اس اصطلاح کیلئے ہم عربی فارسی کے علاوہ کوئی خالص اُردو کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں اگر تو وہ موجود ہے؟ میں نے فوری قہقہہ لگا کر عرض کیا کہ پروفیسر صاحب آدھی زندگی اُردو پڑھاتے گزر گئی اور آپ اتنی معمولی تحقیق کی زحمت بھی نہ کر سکے کہ عربی فارسی اور سنسکرت کو اُردو میں سے نکال دیں تو پیچھے صرف ایک اُدھار رسم الخط ہی باقی بچتا ہے پھر اسے آپ نستعلیق کہہ لیں یا نسخ۔کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی زبان جب تک فی نفسہ زبان نہیں ہے وہ کلام کیلئے کسی بھی دوسری زبان کی بہر صورت محتاج رہتی ہے۔ چنانچہ پنجابی برصغیر کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ یہ ایک مکمل اور ہر لحاظ سے ایک منظم زبان ہے لیکن اس کا تخم سنسکرت ہے جیسا کہ انگریزی زبان کا تخم لاطینی زبان ہے۔ پنجابی سنسکرت کا ایک مقامی لہجہ ہے بالکل اسی طرح سرائیکی اور سندھی بھی سنسکرت ہی کے مختلف لہجے ہیں پس یہ بھائی، بہن، اماں، ابا، ماسا، ماسی سب پنجابی اصطلاحات سنسکرت سے پنجابی میں انتہائی معمولی ردوبدل کے ساتھ در آئیں۔

اب لسانیات کے ضمن میں ایک انتہائی بنیادی نکتہ یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ کوئی بھی زبان بغیر کسی منظم تہذیب کے وقوع پذیر ہی نہیں ہو سکتی چنانچہ گوروں نے بہت کوشش کی کہ انگریزی برصغیر میں ایسے رائج ہو جائے جیسا کہ انگلینڈ میں تھی مگر ایلیٹ کلاس کے علاوہ یہ زبان آج بھی برصغیر کی سیکینڈری لینگویج ہے۔ بالکل یہی کوشش گوروں سے قبل مغل بھی فارسی کو برصغیر میں رائج کرنے کے ضمن میں کر چکے ہیں مگر آج چند چیدہ چیدہ اُدھیڑ عمر ہی فارسی زبان سے کما حقہ واقف ہیں۔عربی، فارسی اور انگریزی تینوں مکمل زبانیں ہیں، منظم تہازیب کی گود میں سر رکھے ہوئیں۔مگر جب بات اُردو، ریختہ، ہندی یا برج بھاشا کی آتی ہے تو معاملہ خاصا گھمبیر ہو جاتا ہے کیونکہ یہ مذکورہ زبانیں نہیں بلکہ رسوم الخط ہیں۔دنیا کی کسی بھی زبان کو آپ منظم تہذیب سے مفرور نہیں دیکھیں گے سوائے یتیم و مسکین اُردو کو جو سرے سے کسی تہذیب کی گود میں کبھی پنپ ہی نہ سکی۔پس یہی وجہ ہے کہ آج سالوں گزرنے کے بعد بھی اُردو ہماری قومی زبان نہ بن سکی۔اشرافیہ کل بھی انگریزی کو ترجیح دیتی تھی اور آج بھی۔

غریب غرباء پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، اور سرائیکی پر ہی گزر بسر کر لیتے ہیں۔ البتہ ایوانوں میں کبھی انگریزی تو کبھی لولی لنگڑی اُردو بول لی جاتی ہے۔ پس تہذیب اور زبان کے معاملے میں ہم آج بھی ایک زبردست کنفیوژن کا شکار ہیں۔ عربی پر توجہ دیں تو بدوؤں کے غلام۔ فارسی کو اوڑھنا چاہیں تو ایرانی ہونے کا طعنہ۔ انگریزی اپنائیں تو یہود ی ونصاریٰ کے ایجنٹ۔ اُردو میں بات کریں تو مہاجر ہونے کا پیغور۔ سنسکرت میں تو بات ہی نہیں کر سکتے ورنہ معاملہ آخری درجے میں سنگین ہو جائے گا۔ لسانی عظمت اور تہذیبی شناخت سے یہ زبردست محرومی نہ معلوم کتنا عرصہ اور اس قوم کو جھیلنا پڑے گی۔ زبانوں کا تخم تہازیب ہوتی ہیں مگر ہم دنیا کی سب سے مضبوط گنگا جمنی تہذیب کو تیاگ کر ایک ایسے دوراہے پر آ کھڑے ہیں کہ عربی اور فارسی تہذیب کا ایک عجیب وغریب ملغوبہ بن چکے ہیں۔ تہذیبی بحران صرف ایک لسانیات تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ درآمدہ اقدار سے لیکر تمدن اور تاریخی شعور کے سنگین تعصب تک پہنچ چکا ہے اور جس کا ہمیں ادراک بھی نہیں۔

میں سُتی پئی نوں جگایا ماہی

روزنامہ پاکستان 28 اگست 2020

ہمارے ہاں تصوف میں جذبہِ محبت کو دو بنیادی درجات میں منقسم کر دیا گیا ہے ایک درجہ عشقِ مجازی تو دوسرا درجہ عشقِ حقیقی کا ہے۔ عشقِ مجازی سے مراد یہ ہے کہ انسان کا جذبہِ محبت کسی بھی قائم الوجود شے سے متعلق ہو جائے پھر چاہے اس میں خود انسان کی ذات ہو یا پھر اس کائنات میں سے کوئی بھی وجود رکھنے والی چیز ہو جبکہ عشقِ حقیقی خاص فی الذاتِ العین ہے جسے میں نے اپنی کتاب عشق کی سائنس میں عشقِ روحانیہ سے تعبیر کیا۔ عشقِ مجازی تو آپ کائنات کے کسی بھی وجود سے کر سکتے ہیں مگر عشق حقیقی ذاتِ حق کے علاوہ ممکن نہیں گو کہ یہ ذاتِ حق اپنے آخری درجے میں قائم الوجود کے مرتبہ پر آ کھڑی ہوتی ہے لیکن اس کی ابتدء ذاتِ حق کی طلب سے ہی ہوتی ہے۔

چلیں یہ تو ہو گئے تصوف کے دقیق مسائل جن کو سمجھنے کے لئے کم از کم سالک ہونا لابدی ہے۔ میں بات کرنا چاہ رہا تھا آج کل کے انتہائی معروف سرائیکی لوک گیت کے بارے جس کو معروف سرائیکی گائیک شفاء اللہ خان روکھڑی نے گایا اور جس کے انتہائی عمدہ بول معروف موسیقار او رنغمہ نگار جناب افضل عاجز صاحب نے لکھے ہیں۔

یہ وہی افضل عاجز ہیں جنہوں نے لالہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے مشہورِ زمانہ لوک گیت مینوں کر نہیں ساڑھ کے کولا، وے ڈھولا سیانڑا تھیویں ہا، کے بول لکھے تھے اور جس کی مدھر موسیقی آج بھی کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ یوں تو یہ گیت بالکل سادہ اور عام بولوں پر مبنی ہے مگر پچھلے دنوں جب ایک اُردو داں دوست نے اس پر غور کرنے کا عرض کیا تو میرے ذہن میں فوری طور پر قبلہ ِعالم سیدنا پیر مہر علی شاہ صاحب کی غزل گھومنے لگی جس کے بول کچھ یوں ہیں۔ ع

وہاں سوئے پڑے تھے خوش
عدم کی نیند میں بے خود
جگا کر جلوہ دکھلایا
ہمیں مظہر دیوانن میں

تصوف میں ہمیشہ جذبہِ مجاز حقیقت کی بنیادی سیڑھی کے طور مستند رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے مجاز کا ترجمہ غیر حقیقی کیا ہے جبکہ

یہاں مجاز سے مراد جائز صورت ہی پیشِ نظر ہے یعنی دنیا کی کسی بھی شے سے محبت بالکل جائز ہے نہ صرف جائز بلکہ یہ تو معرفتِ حق کی بنیادی سیڑھی ہے پھر چاہے وہ کسی عورت سے اظہارِ محبت ہو یا کسی بھی دوسرے جاندار سے پس جذبہِ مجاز کی ہر صورت جائز ہے۔ یہی جذبہِ مجاز آگے چل کر مجرد طور پر حق کی جستجو پیدا کر دیتا ہے۔افضل عاجز صاحب کے گیت کے بول انتہائی عمدہ اور خوبصورت ہیں۔ع

میں ہاموں جئیں خواب اِچ آیا ماہی

میں سُتی پئی نوں جگایا ماہی

میں پُچھیا جو پھیرا کینویں پایئ

خیال اَج میرا کینویں آیئ

یہ دوبیتہ دراصل محبتِ مجازی پر مبنی ہے۔محبوبہ رات کو اُٹھ کر اپنے محبوب سے کہتی ہے کہ میں حیران ہوں کہ مجھ جیسی عام سی بندی کے خواب میں آپ آگئے چنانچہ آپ کی آمد اس قدر تعجب انگیز تھی کہ میں فوری اُٹھ کر جاگ گئی اور خواب ٹوٹ گیا۔تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ سرکار کو میری یاد کیسے آئی اور کس غرض سے اس عام بندی کے پاس تشریف لائے؟۔ سرائیکی دوبیتے لکھنے میں مرحوم فاروق روکھڑی صاحب اور افضل عاجز صاحب واقعی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔یقیناً یہ دوبیتے عام لوگوں کے لیے لذت ِوصل پر مبنی ایک لطف آور بول ہوں گے مگر میں نے جب اس دوبیتے پر غور کیا تو مجھے قبلہ عالم سیدنا پیر مہر علی شاہ صاحب کا وہ اُردو میں دوبیتہ یاد آگیا جس کا ذکر میں اُوپر کر چکا ہوں۔

تصوف کی اصطلاح میں تنویم یعنی سویا پڑا رہنا ایک عامیانہ کیفیت ہے جس میں ایک انسان عرفانِ حق سے غافل نیند میں مستغرق رہتا ہے اس کے برعکس جو شخص جاگ گیا یا جسے جلوہ محبوبِ مطلق نے جگا دیا تو وہ سالک بن جاتا ہے۔

ان پوری کیفیات کو سلطا العارفین سائیں سلطان باہو نے اپنی معروف کتاب عقلِ بیدار میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے صوفیاء کی نگارشات اس بیداریِ جذبات پر موجود ہیں جنہیں سالکین اپنے درجہ کے مطابق ڈھونڈ کر پڑھ سکتے ہیں۔تصوف کا ابتداء ہی سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ دین، مذہب اور دھرم کا تعلق معقولات سے نہیں انسانی جذبات سے ہے مگر بہت سارے ذہین آج بھی اس بدیہی حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں اور اس حقیت کے خلاف نت نئی منطق گھڑنے کی کوشش میں ہیں۔

دنیا میں جتنے بھی مذاہب اس وقت موجود ہیں تمام تر کی بنیاد اسی جذبہِ سپردگی پر قائم ہے۔اس وقت کسی مذہب کا بانی دنیا میں موجود نہی جس کے گرد بیٹھ کر ہم اپنی عقل کو سیراب کرسکیں پس وہ جو اس وقت بیٹھے ہیں وہ بھی ہمیں ٹھیک اُسی طرف لے جاتے ہیں جہاں سوائے والہانہ سپردگی کے کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔میں اکثر کہتا رہتا ہوں کہ محبت کبھی حقیقی یا غیر حقیقی نہیں ہوتی ہاں مجازی محبوب فنا ہو جاتا ہے اور حقیقی بہرصورت قائم رہتا ہے۔ یہ فرق ضرور ہے۔

انسان سے محبت ہی تو دراصل مذہب میں جانے کا سب سے آسان اور بنیادی رستہ ہے۔ایک انگریز محقق مہارشی رمن کے پاس آیا اور اُن سے کہا کہ مجھے دوٹوک الفاظ میں خدا کا رستہ بتا دیں۔آپ نے سوال کیا کہ تم نے کبھی محبت کی۔ انگریز محقق ہنس پڑا کہ میں اور محبت۔نہیں کبھی نہیں۔مہارشی رمن بولے پھر آپ یہاں آئے ہی کیوں ہیں۔آپ اس راہ کے بارے کبھی جان ہی نہیں سکتے کیونکہ آپ اُس بنیادی کلیہ سے ناواقف ہیں جس کے ذریعہ سے میں آپ کو آگے لے کر جاتا۔حضرت رومی، سرمد سرمست، کبیر داس، مِیرا بائی، خانِ خاناں عبدالرحیم خاں، رس خان، بلھے شاہ، شاہ حسین، سچل سرمست، بابا فرید ان تمام عشاق کرام نے صرف یہی بتایا کہ خدا تک پہنچنے کا صرف ہی ایک راستہ ہے اور وہ ہے محبت و عشق۔علاوہ ازیں صرف لفاظی یا لایعنی توہمات ہیں جن کو سمجھنا تو ایک طرف اِن کی صحت ہی مضحکہ خیز ہے۔

محبت واحد حقیقت ہے جو بیک مذہب، عقائد، رنگ، نسل اور ذات پات سے ماوراء ہے۔اس کے علاوہ دنیا کی کوئی بھی سچائی ایسی نہیں ہے جو اس قدر مطلق آزاد اور مضبوط ہو۔محبت ناقابل شکست ہے۔محبت انسان کی بے راہرو عقل اور بوسیدہ اور ویران تدبر کا اکلوتا سہارا ہے۔محبت فاتح عالم ہے۔محبت کی ہر صورت چاہے وہ مجازی ہو حقیقی یا پھر قرینہ لمس پر مبنی نا صرف قابل قبول ہے بلکہ حتمی طور پر قابل تعظیم بھی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

غایتِ علم و تعلیم

روزنامہ پاکستان 21اگست 2020

دو باتیں ہیں یعنی پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسے نہیں مرنا کچھ جاننا کچھ سیکھنا کچھ پڑھنا اور کچھ کرگزرنا ہے۔دوسری بات بہت ہی آسان اور سادہ ہے کہ کچھ بھی نہیں کرنا صرف خوش رہ کر مرجانا ہے۔بھلے علم وتعلیم کے اَن گنت فوائد ہوں مگر یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ذہانت حیاتِ انسانی کو تہس نہس کر کے رکھ دیتی ہے۔

محبت وعشق کی آفرینش کا مقصد ہی یہی تھا کہ اس کے وسیلے سے انسان ایک پرُسکون اور پرُ جوش زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے مگر ذہین لوگوں نے محبت وعشق کو بھی نطق کی بھینٹ چڑھادیا۔چنانچہ اب سننے میں آتے ہیں صرف فلسفہ ہائے عشق ومحبت جبکہ فی الواقع ایک عملی محبت چراغ لیکر بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔صرف دو نسلیں پیچھے ہمارے پورے خاندان میں کوئی بھی شخص قرآن سے واقف نہیں تھا مطلب ہمارے گھروں میں قرآن صرف رحمت و برکت کے واسطے ایک نہایت ارفع مقام پر پڑا رہتا چنانچہ جب کوئی دکھی یا پریشان ہوتا تو غلافِ قرآن کو چومتے ہی وہ دنیا جہان کے دکھ درد بھول کر ایک دم پرُسکون ہو جاتا۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ہمارے گھروں میں پیتل کے کٹورے پڑے ہوتے جن کے کناروں پر سورہ یٰسین کندہ ہوتی اور جب کوئی بھی پریشان حال ہوتا تو فوراً اُس کٹورے میں پانی ڈال کر اُسے پلا دیتے۔تب وہ پریشان حال بغیر کوئی Analgesic یا Domperidone کھائے ایک دم اُٹھ بیٹھتا۔اسے بڑی عورتیں ماتم کا کٹورا کہا کرتیں اب تو اس کی شکل بھی بہت دِقت سے یاد کر کے ذہن میں آتی ہے۔

کیا ہی عمدہ علاج ہوا کرتے۔پورے گھر میں صرف ایک ہی دوائی پڑی ہوتی اور اُسے دادی ماں اَمرت دھارا کہا کرتیں جیسے طبیعت بگڑتی فوری طور پر اَمرت دھارا کی بوتل میں سے تھوڑی سی کھنڈ نکال کر مریض کو کھلا دیتے مریض منٹوں میں اُٹھ بیٹھتا۔اب تو چار اینٹی بیاٹک کے انجکشن نہ لگیں تو مریض سمجھتا ہی نہیں کہ کوئی علاج ہوا ہے۔ہمسایہ ہمجولوں کی دادی کا جب بھی پیٹ میں درد ہوتا تو ہمارے گارے سے بنے ہوئے چولہے سے اُپلوں کی راکھ اُٹھا کر پسے ہوئے ثابت نمک کی چٹکی کے ساتھ پھکی بنا کر پانی کے ساتھ نگل لیتیں اور پھر چند لمحوں میں اُن کا مارے درد کے پیٹ

سے ہاتھ اُٹھ جاتا۔علم فی نفسہ وسیلہِ لامتناہی اذیت ہے اگر یہ والہانہ سپردگی سے فرار اختیار کر لے۔
شاید حضرت اقبال نے اسی جانب اشارہ کیا تھا۔ع

ایں کارِ حکیمی نیست دامانِ کلیمی گیر

Homosapien یعنی انسان سمجھتا ہے کہ وہ آج زندگی کے ہر شعبہ میں بے انتہاء ترقی کر چکا ہے اور انسان کا یہ دعویٰ مبنی برحقیقت بھی ہے مگر کیا انسان نے یہ بھی سوچنے کی زحمت کی کبھی کہ اِس نگوڑی ترقی نے انسان کے قلب وجگر کا اطمینان بھی افزوں کیا ہے یا نری گوناگوں سہولیات کا نام ترقی رکھ دیا گیا؟۔ بلاشبہ پہلے لوگ تین سے سات سال کے عرصہ میں تپ دِق سے مر جاتے اور آج تپ دِق سے کوئی نہیں مرتا مگر وہ تین یا سات سال تپ دِق کے مریض ہوتے ہوئے بھی اس قدر جوش وولولہ سے جیتے کہ مرتے وقت موت بھی اُن کے اس استقلال پر رشک کرتے ہوئے اپنا کام کرتی جبکہ آج کینسر سے بچنے والے بھی جس پژمردگی ومایوسی کے عالم میں جی رہے ہیں کوئی حساب نہیں۔
جس نفس کو دیکھو ایک انجانے دکھ سے نبرد آزما ہے۔دکھ کی ایک وجہ پوچھو تو ہزار وجوہات بتا دے مگر خوشی وولولہ کی کوئی ایک وجہ بھی نہیں کیونکہ خوشی کیلئے وجہ نہیں چاہئے ہوتی۔خوشی جب بھی آتی ہے بغیر کسی وجہ کے ہی آتی ہے۔اس کے برعکس ہر دکھ کی ہمارے پاس کوئی نہ کوئی معقول وجہ ضرور ہوتی ہے۔پس خوشی معقول نہیں دکھ معقول ہے تبھی تو دنیا دکھی ہے۔اب کون بھلا مانس آج چاہے گا کہ لوگ اُسے احمق کہیں سو دکھی رہ کر اپنی غیر معمولی ذہانت کا خوب پرچار کیا جا رہا ہے۔دنیا میں جس قدر دکھ ذہین لوگوں نے پیدا کیئے ان کا عشر عشیر بھی کسی عام ذہنی سطح کے انسان نے نہیں پیدا کیا اور پھر یہی پڑھی لکھی مخلوق آخر میں لامتناہی اذیت وکربناک لامقصدیت کا شکار ہو کر اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے ہی ختم کر دیتی ہے بلکہ اب تو اِس کی بھی ضرورت نہیں رہی کیونکہ آج Euthanasia یورپ کی بہت سی ریاستوں میں قانونی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔
دنیا کا کوئی احمق خودکشی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے پاس اتنا علم ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے دکھوں کے اسباب تلاش کرتا پھرے۔وہ جیتا ہے اور صرف جیتا ہے پھر چاہے وہ جینا کس قدر کٹھن کیوں نہ ہو۔نوٹنگھم کے ایک انگریز سولیسٹر دوست

کے کہنے پر میں نے انگریزی میں Euthanasia یا یعنی طبی طور پر خودکشی کے اختیار پر ایک مضمون لکھا تھا جس کو یورپ میں رہنے والے چند دوستوں نے خوب سراہا بلکہ ایک کینیڈین وکیل دوست نے تو اسے انسان کو اپنی مرضی سے مرنے کے حق میں بطور قانونی دلیل عدالت میں جج کے سامنے بھی پیش کر دیا۔ واقعی جب زندگی بے مقصد و بے ربط ہو جائے اور ہمہ وقت ایک بے دلی و مایوسی و بے کلی طاری ہو جائے تو موت کے حق میں انسانی عقل خوب متحرک ہو جاتی ہے اور ایسے ایسے دلائل لے آتی ہے کہ الامان والحفیظ۔

میڈیکل، انجنیئر نگ، ایم بی اے، ایم سی ایس اور سوشل سائنسز میں ماسٹر یا پی ایچ ڈی کر لینے سے ہم خوشی سے متعارف نہیں ہوتے البتہ نت نئے دکھوں سے ضرور آشنا ہو جاتے ہیں اور پھر اُن شناخت شدہ دکھوں میں سے اپنی پسند کے چند ایک دکھ اپنے پاس مستقل طور پر رکھ لیتے ہیں۔ ہم نے تو کبھی سنا اور نہ ہی پڑھا کہ کسی اُستاد، مدرّس یا پروفیسر نے کبھی اپنے طلبہ کو علم و تعلیم کی غایت خود خوش رہنا اور دوسروں کو خوش کرنا بتلایا ہو۔ کسی کیلئے تعلیم کا مقصد ایک عمدہ ملازمت ہے تو کسی کیلئے گرہستی کا مستند سرٹیفکیٹ۔ کوئی سب کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے جانا چاہتا ہے تو کوئی محبت و عشق سے گندھے ہوئے رشتوں سے منہ موڑ کر اعلیٰ تعلیم کیلئے دیارِ غیر کا رخ کر لیتا ہے۔ یہی تعلیم یافتہ آخر میں اپنے حصے میں بڑے لاجواب اور انتہائی معقول دکھ پیدا کر کے پوری زندگی ایک لامتناہی اضمحلال میں گزار لیتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ بدھ کے چار آریہ ستو کہ زندگی دکھ ہے کا پرچار بھی خوب کرتے رہتے ہیں۔ محبت، وفا اور ایثار ہو تو مفلسی کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن اگر تونگری ہو اور وفاداری اور ایثار نہ ہو تو پھر بلھے شاہ سائیں کے بقول۔ ع

کتے تیں تھی اُتے

مرضِ حقیقی مفلسی و لاچاری نہیں ہے بلکہ محبت و ایثار کا شدید بحران ہے جس نے انسان کو دکھوں سے ہمکنار کر دیا۔ طبیعت اُداس ہو جائے تو عمدہ کھانا بھی کسی کام کا نہیں معلوم پڑتا جبکہ طبیعت سرشار ہو تو شوگر کے مریض کو گڑ کھلا دو تو رگوں میں بہتا خون کبھی نافرمانی نہیں کرے گا۔ امیر خسرو فرماتے ہیں۔ ع

از سرِ بالین ما برخیز اے ناداں طبیب
درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

یہ ایک لامتناہی موضوع ہے۔اس پر پوری ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے لیکن چونکہ یہ ایک اخباری کالم ہے اس لئے حضرت رومی کی ایک رباعی کے ساتھ مضمون کا خاتمہ کرتا ہوں آپ فرماتے ہیں۔ع

شاد باد اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما
اے تُو افلاطون و جالینوس ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما

☆☆☆☆☆☆☆

بابڑہ قتلِ عام

روزنامہ پاکستان 14 اگست 2020

قیامِ پاکستان کو ستر سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اس دورانیہ میں ایک عام آدمی پر جو قیامتیں ٹوٹیں وہ تو اب ہمیں گوگل کے علاوہ کہیں نہیں ملتیں۔انہی میں سے ایک قیامتِ صغریٰ اُس وقت بپا ہوئی جب خدائی خدمتگاروں نے ایک بالکل پُر امن جلسہ کا انعقاد کرتے ہوئے پاکستان کی نوزائیدہ حکومت سے اپنے ان تمام مرکزی و مقامی رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کیا جو انگریز سرکار کے وقت سے جیلوں میں پڑے ہوئے تھے۔اُنہی قیدیوں میں خدائی خدمتگار تحریک کے بانی و سرپرست باچا خان بابا بھی موجود تھے۔اُس وقت کی پاکستانی حکومت نے خدائی خدمتگار تحریک کے دفاتر نذرِ آتش کر دیئے تھے جس کے سبب خدائی خدمتگار بابڑہ چارسدہ کے مقام پر احتجاج کر رہے تھے۔اِس پُر امن احتجاج میں اُس وقت کی صوبہ سرحد حکومت نے مرکزی حکومت کو مطلع کئے بغیر اس پُر امن جلسے پر فائر کھول دیا بالکل جیسے جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں سینکڑوں بے گناہ سکھوں کو بھون کر رکھ دیا تھا۔

اِس واقعہ کو پشتونوں کی کربلا بھی کہا جاتا ہے۔مطالعہ پاکستان میں تو اِس قتل عام کی کوئی معقول تفصیل نہیں ملتی لیکن چونکہ آجکل گوگل کا دور ہے اس لئے ہر کوئی اس ناحق خونریزی کو گوگل کر کے تفصیل جان سکتا ہے۔میں اس مختصر مضمون میں اس پوری تحریک اور اس واقعہ کے پس و پیش مناظر کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

نوم چومسکی نے کہا تھا کہ طاقتور کے نزدیک ''جرم'' وہی ہے جو کسی اور شخص سے سرزد ہوا ہو۔وہ خود چاہے لاشوں کے ڈھیر لگا دے۔انسانی کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کر دے۔اپنے ظلم سے دریائے دجلہ کا پانی خون آلودہ کر دے۔وہ جرم نہیں بلکہ اُس کا حق کہلاتا ہے لیکن تاریخ نے ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کیا۔سفاک ظالم وقتی طور پر بھلے ہی انسانیت کا لبادہ اوڑھ لیں۔درباری اُن کی شان میں قصیدے گاتے پھریں۔ہر طرف اُن کی واہ واہ ہوتی رہے لیکن تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ وہ ظالم اور وحشی کے طور پر ہی جانے جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس محمد زبیر نیازی کے جلیانوالہ باغ کے سانحے کے بارے میں لکھے گئے ایک تحریر سے لیا گیا ہے۔ میں نے اسے یہاں اس لئے نقل کیا کہ جلیانوالہ باغ اور بابڑہ قتل عام میں کئی باتیں مشترک ہیں۔

یہ عبدالقیوم خان کشمیری کی حکومت تھی جس نے مرکز کو اندھیرے میں رکھ کر یہ ظلم سرانجام دیا۔

12 اگست 1948 کو یہ سانحہ پیش آیا۔ یہ بہت ہی اندوہ ناک صورتحال تھی جب خدائی خدمتگار تحریک کے کارکنوں کی عورتیں سروں پر قرآن رکھ کر فورسز کو فائرنگ روکنے کی منت کر رہی تھیں۔ اس ظلم و بربریت میں براہ راست سرحد پولیس اور پاکستان کی پارلیمانی فوج نے حصہ لیا۔ 611 بالکل بے گناہ کارکن شہید ہوئے اور قریباً 1200 سے زائد کارکن زخمی ہوئے جن میں اچھی خاصی تعداد عورتوں کی بھی تھی۔

یہ جلیانوالہ باغ کی طرح بالکل اندھادھند فائرنگ تھی جس میں عورتوں کو دیکھا گیا نہ ہی بچوں کو۔ سانحہ کے دوسرے روز عبدالقیوم کشمیری نے ایک بیان جاری کیا تھا کہ شکر کریں ہماری فورسز کے پاس گولیاں ختم ہوگئی تھیں ورنہ جلسہ گاہ میں ایک شخص بھی زندہ نہ بچتا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جس قدر صعوبتیں خدائی خدمتگاروں کے حق میں آئیں شاید ہی کسی اور سیاسی تحریک یا پارٹی کے حصے میں آئی ہوں۔ باچا خان بابا کو جس قدر اذیتیں قیامِ پاکستان کے بعد دی گئیں ان کی تفصیل کا وقت نہیں ورنہ یہاں تو معاملہ انگریز سرکار سے بھی کہیں آگے نکل جاتا ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی رحلت کے بعد سول اور فوجی آمریت نے اس نوزائیدہ ریاست کو اس مضبوطی سے دبوچ لیا تھا کہ پھر عوام انگریز سرکار کو یاد کرنے لگی تھی۔

باچا خان بابا کی تحریک عدم تشدد پر مبنی تھی آپ نے کبھی اپنے کارکنوں کو لاٹھی تک اٹھانے کی تاکید نہیں کی البتہ پشتون قوم کا واحد گناہ شاید قراردادِ بنوں ہی تھا جس میں انہوں نے انگریز سرکار سے یہ درخواست کی تھی ہمیں ایک الگ ریاست پختونستان کے قیام کی اجازت دی جائے جس کو بہرحال بغیر کسی بحث وتمحیص کے مسترد کر دیا گیا تھا۔ یہ قرارداد جون 1947 میں پیش کی گئی جس کے استرداد کے بعد باچا خان بابا نے 11 اگست 1947 کو پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی میں حلف لے کر ریاستِ پاکستان کو تسلیم کر لیا تھا مگر اس کے باوجود بھی باچا خان بابا پر ریاستِ پاکستان کی جانب سے قید و بند کی صعوبتوں کا سلسلہ جاری رہا اور پھر اسی کا حتمی نتیجہ بے گناہ اور نہتے پشتونوں پر کربلا یعنی بابڑہ قتل عام کی صورت میں سامنے آیا۔

چونکہ یہ ظلم وستم مقتدرہ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا اس لئے اس کا ذکر تفصیل سے تو درکنار اجمالی معلومات بھی کہیں ملتی مگر اس کا ہرگز کا مطلب نہیں کہ ہم اپنی تاریخ کو بھول جائیں۔

یہ ہماری ہی تاریخ ہے پھر چاہے سرنگوں ہو کر اس کا اقرار کریں یا ڈھٹائی سے انکار۔ امام الانقلاب مولانا عبید اللہ سندھی جب جلاوطنی کے بعد ہندوستان آئے تو کافی رنجیدہ تھے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر آپ کی صاحبزادی نے فرمایا کہ ابا حضور اب تو بس انگریز جانے والا ہے ہمارے ملک سے اور آپ کی جدو جہد رنگ لا رہی ہے۔ آپ نے اس موقع پر عظیم الشان الفاظ کہے "بیٹا انگریز چلا جائے گا اتنا تو اب سمجھ چکا میں لیکن انگریز کے جانے کے بعد جو لوگ اس خطے پر حکومت کریں گے لوگ کہیں گے کہ انگریز بہت اچھے تھے۔"

☆☆☆☆☆☆☆

فنی محاسن سے معریٰ شاعری

روزنامہ پاکستان 11 اگست 2020

وہ دن لد گئے جب دبستانِ دہلی دبستانِ لکھنو دبستانِ آگرہ اور دبستانِ دکن ہوا کرتے اور جہاں کئی اطفالِ مکتب کہنہ مشق اساتذہ کے ہاں زیر تربیت رہتے سالوں اساتذہ کی صحبت میں وہ اذہان سخنوری کے ماحول میں نمو پاتے تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوتے کہ کسی مشاعرہ میں کوئی ایک آدھ شعر پڑھ سکیں۔ہمارے ہاں تو اب سوشل میڈیا کی برکت سے صورتِ حال اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ہر دوسرا نوجوان شاعر اور ہر تیسری دوشیزہ شاعرہ بن چکی ہے۔گوگل کے فیض سے مستفید ہونے والی یہ نئی پود اب شاعری کے نام پر صرف شغل میلہ ہی لگا رہی ہے۔میں نام نہیں لوں گا کیونکہ شخصیت پر تنقید میرا وتیرہ نہیں رہا مگر آج کے ایک انتہائی معروف نوجوان شاعر کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ع

تیرا چپ رہنا مرے ذہن میں کیا بیٹھا گیا
اتنی آوازیں تجھے دیں کہ گلا بیٹھ گیا

اُردو اَدب کی تمام تر ندرت چھچھورے پن میں سرایت کر چکی ہے۔مزید لچر پن ملاحظہ فرمائیے۔ع

اگر تو یونہی شرماتی رہے گی
محبت ہاتھ سے جاتی رہے گی
یہ جنگلی پھول میرے بس میں کب ہے
یہ لڑکی یونہی جذباتی رہے گی
تجھے میں اس طرح چھوتا رہا تو
بدن کی تازگی جاتی رہے گی

اب ذرا شرمانے کی صفت سے محبت کی رخصتی کا معنوی ربط تلاش کیجئے اگر مل جائے تو بسم اللہ لیکن ملے گا نہیں کیونکہ ہم نے تو یہی سنا تھا اساتذہ سے کہ عورت جب شرمانے لگے تو سمجھ لو محبت ہاتھ لگ گئی مگر یہاں تو شاعر موصوف کچھ الٹا ہی کہہ گئے ۔مزید غور فرمائیں کہ عورت کو کس بھدے پن سے تشبیہ دی جنگلی پھول ۔اوّل تو مجھے اس ترکیب پر ہی اعتراض ہے کہ وہ کونسا نفیس وخوشبو دار پھول ہوتا ہے جو جنگل میں پایا جاتا ہے ۔میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی گلاب یا چنبیلی کسی جنگل میں نہیں دیکھے کیونکہ جنگل میں جو چیز اُگتی ہے وہ خود رو ہوتی ہے اور وہ عام طور پر حسِ جمالیات سے کوسوں دور ہوتی ہے ۔تشبیہات کا اب یہ معیار رہ گیا ہے ۔اس سے اگلے بند میں جو واہیات مضمون باندھا گیا ہے اُس پر تنقید ضروری نہیں کیونکہ شعر کا مطلب واضح ہے ۔تشبیہ کا یہ بیہودہ معیار بھی دیکھ لیا اور تشبیہ کا وہ معیار بھی دیکھ لیں جو میر تقی میر کے ہاں پایا جاتا ہے ۔ع

گل کے دیکھے کا غش گیا ہی نہ میر
منہ پہ چھڑکا میرے گلاب بہت

یہ ہوتی ہے تشبیہ ۔خیر معاملہ یہ ہے کہ ہمیشہ ذہنی استعداد کے مطابق مارکیٹ میں اشیاء دستیاب ہوتی ہیں ۔چونکہ آج کل ساری کہانی عورت پر آ کر مُک جاتی ہے اس لئے آج کا شاعر نسوانیت کو بنیاد بنا کر انسانی نفسیات سے خوب کھیل رہا ہے ۔اصل میں اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں عورت کے متعلق عموماً وہ جذباتی دباؤ پایا جاتا ہے جس کا نکاس اسی طرح کے شعراء حضرات اپنی شاعری میں کر کے عوام کو ایک غیر مرئی چسکے کی جانب لے جاتے ہیں ۔
دبستانِ فیس بک کا یہ انتہائی معروف شاعر مزید کچھ اس طرح سے رقم طراز ہے ۔ع

میں اُس کو ہر روز بس یہی ایک جھوٹ سننے کو فون کرتا ہوں
سنو یہاں کوئی مسئلہ ہے تمہاری آواز کٹ رہی ہے

شعر میں شاعر کہنا کیا چاہ رہا،اب اس مضمون کو ہماری نئی نسل خوب سمجھتی ہے۔

ہمارے ہاں دبستانِ دہلی کے عظیم المرتبت شاعر میر تقی میر کو ہی دیکھ لیں۔زندگی،محبت،اقدار کی بے ثباتی اور لامحدود کرب پر خوب لکھا ہے۔ایک بند میں فرماتے ہیں۔ع

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

کس قدر عام فہم اَمر کو ایک دل آویز پیرائیے میں بیان کر دیا۔بالکل اسی طرح دبستانِ دہلی ہی کے فقید المثل شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب نے زندگی اور انسانی نفسیات کو ایک کھلی کتاب کی طرح شاعری میں پرو دیا۔قنوطیت اور وجودی بحران کا یہ عالم طاری رہا کہ۔ع

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اور رجائیت کے معاملے میں ایسے جذباتی کہ۔ع

سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھُوٹا جائے ہے مجھ سے

ہمارے جنوبی پنجاب کی ایک انتہائی معروف نوجوان شاعرہ کچھ یوں رقم طراز ہیں۔ع

اُداس ہوں پر نیا بہانہ بنا رہی ہوں
سنو میں مصروف ہوں میں کھانا بنا رہی ہوں

اس شعر کی فنی مہارت پر تو اب میں کچھ کہنے سے رہا۔ قارئین خود ہی سمجھ لیں جو بھی سمجھنا چاہیں۔ دبستانِ فیس بک کی ایک اور معروف شاعرہ کچھ اس طرح سے گویا ہیں۔ ع

سیدھی کمان کیجئے اور تیر کھینچئے
پنچھی جو پھڑ پھڑائے تو تصویر کھینچئے

لیجئے جناب اب تیر کمان کے ساتھ شکاری کو گلے میں ڈی ایس ایل آر کیمرہ بھی لٹکانا چاہیئے تاکہ جب پنچھی پھڑ کنے لگے تو وہ جلدی سے تصویر کھینچ کر فیس بک پر اپلوڈ کر دے۔ میرا تو یہ عالم ہے کہ جب بھی کبھی اُداس ہوتا ہوں تو کمال احمد رضوی اور رفیع خاور کا کامیڈی سیریل الف نون دیکھ لیتا ہوں یا پھر سوشل میڈیا پر کسی بھی نئے شاعر یا شاعرہ کا کلام پڑھ لیتا ہوں۔ دونوں میں حسبِ ضرورت اچھا مزاح مل جاتا ہے۔

جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہمارے ایک بزرگ مدرّس ہوا کرتے حضرت مولانا موسیٰ خان روحانی البازی مرحوم جو جامعہ میں عربی علوم کے اُستاد اور شیخ الحدیث تھے۔ علمِ عروض پر اُنہوں نے خلیل ابن احمد کے چند شذرات پر مبنی عربی زبان میں ایک کتاب لکھی "محیط الدائرہ" جس میں آپ نے عروض کو خلیل کے پانچ دائروں میں منقسم کر کے تفصیل سے اُس کے اصول و مبادی بیان کر دیئے۔ اُصولِ شعر کے حوالے سے یہ بڑی ہی عمدہ کتاب ہے۔ شاید آج کل ناپید ہو مگر میرے پاس اس کا چالیس سال پرانا نسخہ موجود ہے۔ مَیں نے یہ کتاب زمانہ طالب علمی میں مولانا البازی صاحب کے تلمیذِ رشید اُستاذی مرحوم مولانا قاضی عبدالحلیم کلاچوی صاحب سے پڑھی تھی۔ بیان کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ شاعری وزن اور تخیل کے باہم معنی خیز ربط کا نام ہے جس میں بیک وقت شعور، تال، حلاوت اور تحریک موجود ہو کیونکہ شعر کے لغوی معنی ہی دانائی کے ہیں۔ پس ایسی دانائی جس میں حلاوت بھی موجود ہو اور تال یعنی عروض کے اصولوں پر بھی پورا اُتر رہی ہو ورنہ شعر اور شغل میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ ہمارے مرحوم اُستاذ فرمایا کرتے کہ ہر انسان شاعر ہوتا ہے مگر جسے زبان برتنے کے اسرار و رموز سمجھ آ جائیں وہ شاعر بن جاتا ہے۔ چنانچہ زبان کی ندرت و نیرنگی، علم الصرف یعنی معانی کے رموز، تال کی حلاوت اور ما فی الضمیر کو بیان کا سلیقہ ہی شعر کے فنی محاسن ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

خیارِ فکر

روزنامہ پاکستان 06 اگست 2020

ایک طویل عرصہ سے میں مسلسل لکھ رہا ہوں کہ سیکولرازم کا اُردو ترجمہ لادینیت نہیں ہوتا۔سیکولرازم کا بالکل موزوں اُردو ترجمہ خیارِ فکر ہے۔لفظ خیار عربی زبان میں ثلاثی مجرد کے باب خَیَرَ سے ہے۔خیار کے لغوی معنی اختیار یا ارادہ کے ہیں اور فکر سے مراد انسان کا علمی یا ایقانی موقف ہے چنانچہ خیارِ فکر سے مراد انسان کا وہ خالص انفرادی فکری اختیار ہے جو کسی بھی سیکولر ریاست میں انسان کو آئینی حیثیت سے غیر مشروط طور پر حاصل ہوتا ہے۔آپ کسی بھی سیکولر ریاست میں جا کر دیکھ لیں سب سے زیادہ آزادی وہاں آپ کو اپنے مذہب یا فکر کے مطابق عمل کرنے کی ہوتی ہے۔

ریاست افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر فرد ایک مخصوص فکری استعداد لیکر باشعور ہوتا ہے یعنی کچھ افراد بہت جذباتی ہوتے ہیں آپ اُنہیں بہتیری کوشش کے باوجود بھی منطق کی طرف نہیں دھکیل سکتے۔اس کے برعکس کچھ افراد میں زبردست قسم کا منطقی رجحان پایا جاتا ہے اور وہ ایک منظم جستجو کے رسیا ہوتے ہیں۔ کچھ افراد سرے سے ان معاملات میں دلچسپی ہی نہیں لیتے کہ جذبہ اور منطق میں سے مبنی بر صداقت کیا چیز ہے اور ہمیں کس طرف جانا چاہئے۔

ایک جوان بیٹا اپنے ضعیف العمر باپ سے فکری اختلاف رکھ سکتا ہے اور اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے۔اب اس کے بنیادی اسباب میں سے جنریشن گیپ ہو یا کوئی اور سبب بہرحال انتہائی قریبی رشتوں میں بھی فکری اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورت میں ریاست کس جانب رخ کرے گی؟ ۔ یہ ہے وہ حقیقی مسئلہ جس نے سیکولرازم جیسی انتظامی حکمتِ عملی کو جنم دیا۔ہمارے لئے یہ اَمر بلاشبہ تشویش ناک ہے لیکن آج یہ ایک ناقابل تردید حقیقت بھی ہے کہ قریباً آدھی دنیا لادین ہو چکی ہے اور باقی جو دیندار ہیں وہ صرف رسمی طور پر دین سے وابستہ ہیں اُن میں بھی اب وہ حقیقی شمعِ ایقان باقی نہیں رہی۔یقیناً یہ ایک افسوس ناک انسانی المیہ ہے کہ انسان تیقّن جیسی حتمی روحانی تسکین سے دور ہو چکا مگر یہ اَمر بھی بدیہی ہے کہ مذہب سے وابستہ علماء و حکماء نے مذاہب و ادیان کو معقولات کے فوائل پیپر میں لپیٹ کر مذاہب و ادیان کو بھون کے رکھ دیا۔میں اکثر و بیشتر یہ مسئلہ بیان کرتا رہتا ہوں کہ مذہب کو اب معقولات کے دائرہ سے باہر نکال کر جذبات کی خوشبودار فضاء میں سانس لینے دیں کیونکہ روحانی صداقتوں کو آج کا شرر رسیدہ شعور نہیں قبول کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اب سوشل میڈیا میں فکری آزادی کے بعد معقولات نے ایسی اُڑان بھری کہ الامان والحفیظ۔آج ناقدین کی زبانیں چپ نہیں کرائی جاسکتیں سوائے اس کے کہ ان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے یا پھر اُنہیں لامحدود مدت کیلئے عدالتوں کے سپرد کر دیا جائے۔لیکن یہ حق تو کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے انسان سے جینے کا حق ہی چھین لے پھر وجہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہم بھی خیارِ فکر کی حکمتِ عملی اپنا سکتے ہیں؟۔جواب کیلئے میں اثبات یا نفی کا انتخاب نہیں کروں گا۔اصحابِ دانش اس مسئلہ پر غور کریں کہ اگر ہم خیارِ فکر کی حکمتِ عملی اپنالیں تو ہمیں کیا فوائد اور کونسے نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہم آبائی لحاظ سے صوفی سلسلہ کے لوگ ہیں اور ہمارے آباء جیسلمیر میں ایک معروف چشتی بزرگ کے ہاتھ پر اسلام کی روشنی سے منور ہوئے تھے۔چنانچہ ہمارے لئے تو ہمارے بزرگان کے مدافن کی مٹی بھی اکسیرِ لاثانی ہے۔پس یہی ہمارا عقیدہ بھی ہے۔لیکن اگر ریاست ہمارے ان اعمال کو شرک و بدعت سے تعبیر کر کے ہمارے والہانہ التفات پر پابندی عائد کر دے گی تو یقیناً ہم جیسے بے ضرر افراد کے پاس بجز ہجرت کے کوئی دوسرا آپشن باقی نہیں رہے گا۔یہ وہ بنیادی اور حقیقی مسائل ہیں جن کے سبب اس وقت ریاست زبردست فکری و اخلاقی انتشار کا شکار ہو چکی ہے پس کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماش بین بنے بیٹھے رہیں گے یا اس بنیادی قضیہ کا کوئی حل بھی نکالنے کی جہد کریں گے؟۔

معلوم نہیں کہ ہم کب منطق اور جذبہ میں جوہری فرق کا ادراک کریں گے پس معلوم نہیں۔خدا جو حکمت و دانش کا مرجعِ اوّل ہے اہلِ ایمان کیلئے بلاشبہ ایک جوہری قوت ہے اور کسی بھی اہلِ ایمان کو وہ اس اَمر کی اجازت نہیں دے سکتا ہے کہ وہ کسی انسان کی شخصی آزادی کو حتمی طور پر سلب کر لے پس خدا کی حکمت نے تو خدا کے برگزیدہ فرشتہ عزازیل کی حتمی نافرمانی کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے اُسے اتنی آزادی دیدی کہ وہ اگر چاہے تو خدا کے مخالف افراد کو اپنا دوست بنا لے اور خدا کا دشمن۔اُسے تاقیامت مکمل آزادی حاصل ہے۔پس میرا نہیں خیال کہ تاریخِ عالم کون و مکاں میں شخصی آزادی کی اس سے بڑھ کر کوئی حتمی مثال موجود ہو۔عزازیل جسے قرآن میں خدا نے ابلیس کہا ہے، پیدائش آدم سے اَن گنت عرصہ قبل خدا کا برگزیدہ بندہ تھا لیکن خدا نے جب آدم کو پیدا کیا تو ابلیس سے کہا کہ اسے سجدہ کرو۔ابلیس نے صاف انکار کر دیا۔سو اب اصول کے مطابق تو ابلیس خدا کے حتمی عتاب کا موجب ٹھہرتا لیکن خدا نے ابلیس کی شخصی آزادی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے کھلا چھوڑ دیا، نہ صرف کھلا چھوڑ دیا بلکہ یہ اجازت بھی دیدی کہ اگر وہ چاہے تو انسانیت

کو اپنے پیچھے لگا سکتا ہے۔ یہ ہے وہ خیارِ فکر جس کا مظاہرہ سب سے پہلے خود خدا نے کیا۔ پس خیارِ فکر تو اللہ تعالیٰ کی سنتِ اَزلی ہے۔ وہ فعل جسے خود خدا نے سرانجام نہیں دیا اُس کا حکم وہ اپنے بندوں کو کیسے دے سکتا ہے؟۔ پس یہ تو مسلّمات کے بھی خلاف ہے۔ خدا کے ماننے والوں کیلئے اتنا تو لازمی ہونا چاہیئے کہ وہ خدا کی اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جذبہ کی صداقت پر کوئی بحث نہیں اور نہ ہی یہ معاملہ منطق کی گرفت میں آسکتا ہے۔ وہ برگزیدہ ہستیاں جن پر ہمارا ایمان ہوتا ہے اُن کے متعلق کسی قسم کی انتہائی معمولی بدتہذیبی بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی اور نہ ہی یہ علاقہِ جذبات کیلئے متحمل معاملہ ہے لیکن بہرصورت ہم نے معاشرہ میں ہی رہنا ہوتا ہے جہاں پر ہر فکر سے وابستہ افراد موجود ہوتے ہیں اور ان کی فکری و شخصی آزادی کا لحاظ بھی ہمیں خدائی صفات سے ملا ہے۔ پس ہمیں ایسا لائحہِ عمل اپنانا ہوگا جس میں ہم اپنے عقائد و جذبات کی بھی پوری آزادی کے ساتھ مشق کرسکیں اور اپنے سے مختلف افکار رکھنے والے افراد کی بھی فکری و شخصی آزادی کا لحاظ رکھ سکیں۔

پس ایسا لائحہِ عمل اب تک مجرب دانش کے مطابق صرف سیکولرازم یا خیارِ فکر ہی ہے جس کو کم از کم صرف ایک بار ہم اپنا کر دیکھ سکتے ہیں۔ آخر انسان ہمیشہ اپنے تجربات ہی سے تو سیکھتا رہتا ہے۔ افراد، معاشرے اور اقوام جب تک گوناگوں تجربات کی بھٹی سے نہیں گزرتے تب تک وہ ناقص الفہم اور خام الخلق رہتے ہیں۔ آج وہ اقوام جو معاشی و اخلاقی لحاظ سے اوجِ ثریا پر براجمان ہیں مسلسل تجربات کی بھٹی سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ پس اگر ہم یہ انتہائی اہم حکمت آج اپنا لیتے ہیں تو آنے والے وقتوں میں ہر قسم کی آسودگی ہمارا مقدر ٹھہرے گی ورنہ جس طرح ستر سال ہم نے خوابِ غفلت میں گزار دیئے ایسے ہی آنے والا لامحدود وقت بھی بغیر کسی غیر معمولی بہتری کے گزرتا جائے گا۔ آخر میں ایک مستند حوالہ کے طور پر میں بانی پاکستان کے 11 اگست 1947 کو پہلی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کا ایک مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں جو خیارِ فکر کی عین ترجمانی کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ”آپ آزاد ہیں۔ آپ آزاد ہیں اپنے مندروں میں جانے کیلئے۔ آپ آزاد ہیں اپنی مسجدوں میں جانے کیلئے اور ریاست پاکستان میں اپنی کسی بھی عبادت گاہ میں جانے کیلئے۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا نسل سے ہو۔ ریاست کا اِس سے کوئی لینا دینا نہیں“۔

☆☆☆☆☆☆☆

سنتِ ابراہیم کا مقصدِ اصلی

روزنامہ پاکستان 30 جولائی 2020

سنتِ ابراہیم جسے ہم مقامی اصطلاح میں قربانی یا بُراق کہتے ہیں کا بالکل سادہ مفہوم یہ ہے کہ خدا اور انسان کے بیچ ہر اُس والہانہ سپردگی کا فی نفسہٖ قلع قمع کر دیا جائے جو خدا اور انسان کے درمیان کسی بھی قسم کا فاصلہ پیدا کرتی ہے۔قربانی کا حقیقی فلسفہ بیان کرنے سے پہلے لابدی ہے کہ اس کی شرعی حیثیت پر طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

قرآن میں الاضحیہ یعنی عید الاضحیٰ کے دن جانور ذبح کرنے کا کوئی خصوصی حکم موجود نہیں چنانچہ اس ضمن میں جتنی بھی نصوص ہیں وہ عمومی احکام سے استنباطی نوعیت کی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔

ذخیرہِ احادیث پر نظر دوڑائیں تو وہاں پر قربانی کی فضیلت کے متعلق جتنی بھی روایات ملتی ہیں وہ یا تو بالکل غریب ہیں یا زیادہ سے زیادہ درجہِ حسن کو پہنچتی ہیں۔صحیحین کی ایک روایت ہے۔حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سیاہ اور سفید مینڈھوں کی قربانی دی۔اُنہیں اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور (ذبح کرتے ہوئے) بسم اللہ، اللہ اکبر کہا اور اپنا پاؤں اُن کی گردن پر رکھا۔

علاوہ ازیں مسند امام احمد کی ایک روایت عموماً بیان کی جاتی ہے اور جو معروف شامی محدث علامہ البانی کی تنقیح کے مطابق حسن درجہ کی ہے۔عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ شریف میں دس برس قیام کیا اور آپ ہر برس قربانی کیا کرتے تھے۔قرآن و حدیث کے اس اجمالی بیان کے بعد اب ہم رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل کو بھی بیان کر لیتے ہیں۔

چنانچہ امام بیہقی سنن کبریٰ میں ایک روایت اصحابِ صفہ کے صحابی حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ میں نے خود دیکھا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما قربانی ترک کر دیتے تھے صرف اس سبب کے پیشِ نظر کہ لوگ ہماری اتباع میں اس عمل کو لازم و واجب قرار نہ دے دیں۔

اسی روایت میں حضرت عقبہ بن عامر انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں قربانی ترک کر دیتا ہوں کسی سال تاکہ لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ واجب ہے۔

امام ابن حزم لکھتے ہیں کہ سید التابعین حضرت سعید ابن مسیب کا یہ عمل انتہائی معروف تھا کہ ایک سال آپ اُونٹ ذبح کرتے دوسرے سال گائے تیسرے سال بکری اور چوتھے سال یہ عمل ترک کر دیتے تا کہ لوگ اس کو لازم نہ سمجھ لیں۔آئمہ ثلاثہ حضرت امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اضحیہ سنت جبکہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ اس کے وجوب کے قائل تھے۔

یہ تو خیر قربانی کی شرعی حیثیت واضح کرنے کی ایک غیر جانبدارانہ کوشش تھی۔میرا مدعا تو قربانی کا مقصدِ اصلی بیان کرنا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام سلسلۂ نبوت کے مبتدی ہیں۔آپ کا خدا سے غیر معمولی ربط بعد کے تمام انبیاء کیلئے مشعل راہ بن گیا چنانچہ بت تراش آزر کے گھر پیدا ہونے والے حضرت ابراہیم عین جوانی میں خدا کی قربت کے اس قدر اہل ہو گئے کہ آپ کو خلیل اللہ یعنی اللہ کے دوست کا اعزاز مل گیا۔پس یہ عمل اضحیہ حضرت ابراہیم کی خدا سے غیر معمولی قربت ہی کی ایک یادگار ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ حضرت ابراہیم نے خدا سے آخری عمر میں اولاد کی التجا کی اور خدا نے آپ کو اخیر عمر میں ایک بیٹے سے نوازا۔بیٹا جوں جوں بڑھتا گیا، باپ سے بیٹے کی محبت بھی اپنے عروج کی جانب گامزن ہوتی گئی حتیٰ کہ اس قربت نے حضرت ابراہیم کو خدا کی جانب سے ایک زبردست آزمائش سے ہمکنار کر دیا۔پس ارشاد ہوا اے ابراہیم! میری راہ میں اپنی سب سے پیاری چیز قربان کیجئے۔پہلے تو آپ اپنے سالوں کی محنت سے پروردہ اُونٹ گائے اور بکریاں ذبح کرتے رہے لیکن بعد میں جب اپنے بیٹے کی جانب اشارہ ملا تو بغیر کسی تامل کے آپ اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کیلئے روانہ ہو گئے۔خدا نے حضرت ابراہیم کی اس والہانہ سپردگی کو قبول کیا اور حضرت ابراہیم کی اس والہانہ سپردگی کو آنے والی نسلوں کیلئے ایک مشعل راہ بنا دیا۔

پس قربانی کا سادہ مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں پیارے سے پیارا رشتہ بھی کوئی معنی نہ رکھے چنانچہ اضحیہ ایک درسِ عشق ہے اور عشق راہِ ایثار ہے۔کسی مخصوص دن کوئی مخصوص جانور ذبح کر لینے سے رسمِ شرعی تو پوری ہو جاتی ہے لیکن سنتِ ابراہیم کی کماحقہ تکمیل کیلئے ضروری ہے کہ آپ والہانہ سپردگی اور دائرۂ عشق سے حتمی طور پر واقف ہوں ورنہ کسی ذبیحہ کا گوشت یا ہڈیاں بانٹنے سے آپ مرادِ ابراہیم تک نہیں پہنچ سکتے جیسا کہ سورہ الحج میں ارشاد ہے۔

لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ ۚ۔

"اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون مگر اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔" یہاں یہ اَمر واضح ہو گیا کہ محض جانور ذبح کر لینے سے معاملہ صاف نہیں ہو جاتا۔ تقویٰ کا عمومی مفہوم تو خدا کا خوف بیان کیا جاتا ہے لیکن یہاں پھر ایک منطقی سوال یہ اُبھرتا ہے کہ جہاں معاملہ عشق و ایثار کا ہو وہاں خوف کیا معنی رکھتا ہے؟۔ یقیناً خوف تعلق کیلئے سمِ قاتل ہے بلکہ خوف تو ایک نقصان دہ نفسیاتی کیفیت ہے جس میں مبتلا انسان آج کے زمانے میں ایک نفسیاتی مریض کے طور پر جانا جاتا ہے۔

پس یہ ضروری ہو گیا ہے کہ تقویٰ کا مفہوم خدا کیلئے خالص ہونا قرار دے دیا جائے جیسا کہ ہمارے صوفیاء کے ہاں یہ معنیٰ و مفہوم لئے جاتے رہے۔ جب تقویٰ کے معانی عشق و ایثارِ خداوندی قرار پائیں گے تو پھر سنتِ ابراہیم کی کوئی اضافی منطق وضع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ جانور ذبح کرنا فی نفسہٖ مقصود نہیں اور نہ ہی یہ عمل خدا کی کسی اسکیم کا حصہ تھا۔ خدا جو حضرت ابراہیم سے ایک حتمی درجے کا ایثار طلب کر رہا تھا اگر کسی جانور کو ذبح کرنے پر اکتفا کر لیتا تو یہ عمل حضرت ابراہیم بارہا سرانجام دے چکے تھے لیکن خدا کو جو مطلوب تھا وہ دراصل خدا اور حضرت ابراہیم کے بیچ عشق و ایثار کا وہ غیر معمولی بہاؤ تھا جس میں اولادِ ابراہیم نے ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔ پس خدا کو جانچنا تھا کہ اب میرا دوست اپنی اولاد اور میرے معاملے میں کس جانب رخ کرتا ہے۔ چنانچہ دوست نے دوستی کی لاج رکھی اور اپنی سگی اولاد کو محبتِ خدا کی راہ میں پیش کر دیا جبکہ اسی طرح دوست اعلیٰ نے بھی اپنے دوست کو اس آزمائش میں سرخرو کرتے ہوئے اُنہیں اپنا بچہ ثابت سلامت واپس لوٹا دیا۔

پس سنتِ ابراہیم خدا اور اُس کے سچے بندے کے درمیان عشق و ایثار کی داستان ہے جسے رہتی دنیا تک کروڑوں انسانوں کیلئے ایک نمونہ بنا دیا گیا۔ سنتِ ابراہیم کا مقصدِ اصلی قافلۂ عشّاق ہی کماحقہ سمجھتا اور سمجھاتا رہا ہے ورنہ عقل و تدبر کی تو یہ حالت ہے کہ کسی بھی مخصوص دن کوئی مخصوص جانور ذبح کرنے کی نہ تو منطق سمجھ آ سکتی ہے اور نہ ہی اس ضمن میں کسی قسم کی کوئی دلیل کارگر ثابت ہو سکتی ہے جیسا کہ حضرت اقبال فرماتے ہیں۔ ع

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

☆☆☆☆☆☆☆

آسباقِ سیاست

روزنامہ پاکستان 25 جولائی 2020

گزشتہ روز دورانِ گفتگو پولیٹیکل سائنس کے ایک نوجوان سٹوڈنٹ نے یہ سوال داغ دیا کہ سر اگر منتخب حکومت ایک یا ڈیڑھ سال میں ناکام ہو جائے اور بھرپور عوامی مینڈیٹ کے عوض بہترین کارکردگی ڈیلور نہ کر سکے تو کیا پھر بھی وہ پانچ سال پورے کرے گی؟۔سوال کا بالکل سیدھا جواب تو یہ بنتا ہے کہ ایسی منتخب حکومت جو کارکردگی کا وعدہ کرکے اقتدار میں آئے اور پھر بعد میں وعدہ سمیت کارکردگی ہی بھول جائے تو ایسی حکومت کو بجائے مزید چار سال عوام پر مسلط رہنے کے فوری طور پر عزت کے ساتھ مستعفی ہو جانا چاہیے۔مگر یہ تو بس کہنے کی باتیں ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایسی باتوں کا تعلق اخلاقیات سے جوڑا جا سکتا ہے۔ایک بار اقتدار کی زمام ہاتھ لگ جائے پھر کون ولی اللہ عوامی مفادات کی خاطر اپنی کرسی کو لات مارتا ہے۔

اوّل تا آخر سارا رولہ ہی حصولِ اقتدار کا ہے ورنہ انسانیت کی خدمت کیلئے لوگوں سے اُن کی رائے تھوڑی نا طلب کی جاتی ہے۔ظاہر ہے خدمت اور حکومت میں جوہری فرق ہے۔جمہوریت جو مغرب کی چند ایک سکینڈینیوین ریاستوں کے علاوہ دنیا میں کہیں بھی حقیقی معنوں میں نظر نہیں آرہی ہمارے ہاں تو اب ایک شغل بن چکی ہے۔ہر کہیں حصولِ اقتدار ہی کی جنگ جاری وساری ہے پس کیا ایشیاء اور کیا یورپ۔

مجھے یہ بات انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہی ہے کہ آج تک میں نے کوئی کتاب یا پمفلٹ ایسا نہیں دیکھا کہ جس میں عوام کو بالکل سادہ الفاظ میں سیاست کا سبق دیا گیا ہوگا اور نہ ہی کبھی الیکشن کمیشن آف پاکستان کو یہ توفیق نصیب ہوئی کہ چلو عام حالات میں نہ سہی الیکشن کے زمانہ میں ہی عوامی آگہی کیلئے سیاست کی مبادیات پر کوئی ایک آدھ پمفلٹ شائع کر دیا جائے۔پھر ایسے میں جمہوریت سے ناآشنائی اور سیاسی شعور کی عدم موجودگی کو کیا رونا۔

یقین جانئے ہمارے ہاں دیہاتی علاقوں میں آج بھی منظم فراڈ کو سیاست سمجھا جاتا ہے یعنی اگر گاؤں میں کوئی ایک شخص کسی دوسرے کے ساتھ دھوکہ دہی کرلے تو متاثرہ شخص کے منہ سے صرف ایک ہی لفظ نکلتا ہے کہ یار آپ نے تو میرے ساتھ بڑی زبردست سیاست کرلی گویا ہمارے ہاں دھوکہ دہی کا دوسرا نام سیاست ہے۔

چنانچہ اب ایسے حالات میں کوئی بھی سیاست کو عبادت و خدمت کے دائرے میں کیسے رکھ سکتا ہے۔سیاست کا بالکل سادہ مطلب یہ ہے کہ چند خدا ترس اور انسانیت کا صحیح معنوں میں درد رکھنے والے افراد اپنے ہی جیسے دیگر افراد کیلئے دستیاب وسائل میں سے تقسیم کے عمل کو یکساں طور پر یقینی بنائیں اور اس پورے عمل میں وہ نہ صرف بالکل غیر جانبدار رہیں بلکہ وہ اپنے انفرادی مفادات پر بھی نظر نہ رکھیں۔پس یہ ایک طرح کی اعلیٰ ترین انسانی خدمت ہے اور اِسی کا نام درحقیقت سیاست ہے۔

سیاست کیلئے متبادل اصطلاح حکومت استعمال کرنا بھی اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے منافی ہے کیونکہ کسی بھی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔کسی انسان کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی گردنوں میں غلامی و بے بسی کا طوق ڈال دے۔ ہاں اگر کوئی انسانی خدمت کیلئے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہتا ہے تو یہ وتیرہ سیاست میں ایک جوہری مقام رکھتا ہے پس یہ بالکل بنیادی اور انتہائی اہم باتیں ہر شخص کیلئے جاننا بہت ضروری ہے تاکہ وہ ایک خالص جذبہِ خدمت لیکر سیاست میں حصہ لے سکیں۔

مجھ سے اکثر و بیشتر پوچھا جاتا ہے کہ ایک سیاستدان کی قابلیت کا بنیادی معیار کیا ہونا چاہئے اور میں ہر بار یہی کہتا ہوں کہ خدا ترسی،اور اس کی بہترین مثالیں ہمارے ہاں موجود بھی رہی ہیں۔کیا دنیائے سیاست میں کوئی ایسا سیاسی لیڈر بھی ہو گا جو خان عبدالغفار خان المعروف باچا خان مرحوم کی سیاسی جہد اور خدمات کا اعتراف نہ کرے؟ کیا آج کوئی پنجاب کے فقید المثل سپوت بھگت سنگھ اور بنگال کے عظیم سیاسی رہنما نیتاجی سبھاش چندر بوس کی سیاسی جہد و خدمات اور اپنے وطن کو گوروں کی غلامی سے آزاد کرانے کی ہر ممکن تگ و دو کا منکر ہو سکتا ہے؟ اپنے لوگوں کو ایک غیر قوم کی غلامی سے آزاد کرنے کیلئے ایک اکیس سالہ نوجوان بھگت سنگھ کے لازوال سیاسی جذبہ کی مثال دنیا کی کسی سیاسی تاریخ میں کہیں اور بھی ملتی ہے؟۔سیاست تو وہ پڑھے لکھے بھی کر گئے جنہوں نے جلیانوالہ باغ، ڈائریکٹ ایکشن ڈے، نواکھالی فسادات اور بابڑہ قتل عام میں ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

سیاستدان ہونے کیلئے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ایک اضافی خوبی ہے اگر تعلیم ہو تو بہتر، نہ ہو تو خدا ترسی و خدمت کا جذبہ بہرصورت ہونا چاہئے ورنہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ قومی خزانے کو لوٹ کر فرار ہو جائے گا اور غریب و مضمحل عوام سوائے زجر و توبیخ کے کچھ نہ کر سکے گی۔

اُصول و منطق سمجھانے کیلئے آپ کا تعلیم یافتہ ہونا لابدی ہے لیکن لوگوں کی خدمت کرنے کیلئے آپ کا پی ایچ ڈی ہونا ضروری نہیں۔سیاست کا کوئی بھی نظم یعنی جمہوریت، ملوکیت، فوجی یا مذہبی آمریت کیوں نہ ہو اگر یہ نظم خدا ترسی پر مبنی نہیں ہے تو یہ نری تانا شاہی ہے۔جب لوگ حصولِ اقتدار اور آرام طلبی کیلئے سیاست میں آئیں گے تو پھر نظم جمہوری ہو یا ملوکی عام آدمی کبھی سکھ کا سانس نہیں لے سکتا کیونکہ حکومت صرف عام لوگوں پر ہی کی جا سکتی ہے کیونکہ جو طاقتور طبقہ ہوتا ہے وہ خود سیاسی مقتدرہ کا حصہ ہوتا ہے۔جب تک سیاست میں خدا ترسی و خدمت کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا تب تک عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں مل سکتا۔جب تک ایک سیاستدان یہ سوچ کر سیاست میں نہیں آئے گا کہ میں نے موجود وسائل کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنانا ہے تب تک سیاست صرف حصولِ اقتدار ہی کا وسیلہ بنی رہے گی پھر اس کا نظم چاہے جمہوری ہو یا ملوکی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔معیار صرف ایک ہی ہے کہ آپ سیاست کو سمجھتے کیا ہیں؟ کیا آپ کو اقتدار اور شہرت چاہیئے یا آپ نے صرف اور صرف عوام کی خدمت کرنی ہے؟۔اگر آپ سیاست کو اقتدار کا سب سے مضبوط حصول سمجھتے ہیں تو پھر آپ اقتدار کسی نہ کسی صورت تو ضرور حاصل کر لیں گے لیکن عوام کو آپ کی موجودگی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔اسکے برعکس اگر آپ سیاست کو ایک خالص انسانی خدمت سمجھ کر اختیار کرتے ہیں تو پھر عین ممکن ہے کہ آپ ایک عام آدمی کے حالات یکسر بدل کر رکھ دیں اور اگر ایسا ہو جائے تو پھر یہی حقیقی سیاست ہے۔

پس بہت ضروری ہے کہ اب ہم سیاست کو ایک نئی بنیاد فراہم کریں اور اُس بنیاد کا خوب پرچار کریں تاکہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ سے لیکر ایک گنوار تک ہر کوئی بآسانی سمجھ سکے کہ سیاست کوئی فراڈ یا اقتدار حاصل کرنے کا حربہ نہیں بلکہ ایک خالص انسانی خدمت ہے اور ہر وہ شخص جو انسانی خدمت کے جذبات سے لبریز ہے وہ آئے اور اپنے اس لازوال جذبہ کو بھرپور طریقے سے بروئے کار لائے۔بی اے، ایم اے یا پی ایچ ڈی کر کے سیاست میں آنے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان بن کر سیاست اختیار کی جائے اور بس اتنا کافی ہے کہ کوئی سیاستدان انسانیت کے جذبے سے سرشار ہو ورنہ اوکسفرڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے سیاست کی ایسی درگت بنالیں گے کہ الامان والحفیظ۔

☆☆☆☆☆☆☆

آدمی دید است باقی پوست است

روزنامہ پاکستان 12 جولائی 2020

اُستاد ولایت خان صاحب مرحوم جو کہ متحدہ ہندوستان کے فقید المثل سِتار نواز تھے کے ہونہار فرزند اُستاد شجاعت حسین خان صاحب بھی باکمال سِتاریے ہوئے ہیں ۔ آپ نہ صرف سِتار نوازی کے ماہر ہیں بلکہ گلا بھی خوب پایا ہے ۔ پچھلے دنوں ریختہ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام جشنِ ریختہ کے عنوان سے دہلی میں ایک تین روزہ تقریب منعقد کی گئی جس میں اُستاد شجاعت حسین نے کرشن بہاری نور کی ایک انتہائی معروف غزل سِتار کی چھنکار کے ساتھ پیش کی ۔ غزل کا مطلع ہے ۔ ع

زندگی سے بڑی سزا ہی نہیں
اور کیا جرم ہے پتہ ہی نہیں

ہزاروں کا جمع اُس وقت اُچھل پڑا جب آپ نے غزل کا مصرعِ اوّل ایک دل آویز کھٹکے کے ساتھ اُٹھایا ۔ کھٹکہ گلوکاری کا ایک بہت ہی دلفریب اَنگ ہے جس میں الفاظ کو ہلکے ہلکے جھٹکوں کے ساتھ گلے سے نکالتے ہیں ۔ اساتذہ گلوکار راگ بھیرویں میں گلوکاری کے اس اَنگ کو خوب استعمال کرتے ہیں ۔ کرشن بہاری نور کی یہ غزل مجھے بے حد پسند ہے ۔ اس کا ہر مصرع لاجواب اور زندگی کے تلخ و پُر آلام تجربات پر مبنی ہے جیسا کہ یہ شعر ہے ۔ ع

زندگی! موت تیری منزل ہے
دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں

لیکن مجھے غزل کے پہلے مصرع نے اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے ۔ بالکل اسی نوعیت کا مضمون ہمیں ساغر صدیقی کے ہاں بھی ملتا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ ع

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

خیر یہ تو شعراء کے اندوہ ناک تجربات ہوتے ہیں جنہیں وہ الفاظ کے وسیلے سے بیان کر لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو زندگی کے اس جبرِ مسلسل پر باقاعدہ ایک کلامی فرقہ پیدا ہو گیا تھا جنہیں تاریخِ اسلام میں جبریہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس فرقہ کے علماء کا کہنا تھا کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اس کا ارادہ یا اختیار فی الواقع کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انسان کا کوئی بھی عمل اس کی قطعی مجبوری ہی ہے۔ بالکل اسی نظریہ کا پرچار معروف برطانوی فلاسفر تھامس ہابس نے بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات اور انسان کی ہر حرکت قانونِ اسباب کے تحت ہے اور سبب ہر اَمر کا اَٹل مقدر ہے۔

علمائے نفسیات کا خیال ہے کہ انسان اپنی مرضی کا مختار نہیں بلکہ ذہنی اور جسمانی حالات اس کے ارادے اور عمل کو جس رخ پر چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں۔ زندگی کیا ہے آج سے ساڑھے چوبیس سو سال قبل اس کے متعلق دنیائے دانش کے عظیم ترین دانا سدھارتھ گوتم بدھ نے اپنا گہرا تجربہ بیان کیا کہ زندگی محض دکھ ہے۔ زندگی دکھ ہے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی پیدائش ہی ایک مستقل المیہ ہے جس سے انسان کو موت تک مفر نہیں۔ گویا پیدائش سے لیکر مرتے دم تک انسان صرف اذیت ہی سے دو چار رہتا ہے اور اسی اذیت میں شریر تیاگ دیتا ہے۔

زندگی کے متعلق کچھ اس طرح کا المناک تجربہ معروف جرمن فلاسفر اور دانشور فریڈرک نطشے کا بھی ہے۔ پس ذہانت کے دائرہ میں زندگی صرف الم ہی سے عبارت ہو سکتی ہے علاوہ ازیں کوئی چارہ نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فلاسفہ و علمائے حکمت ہمیشہ ذہنی اضطراب کا شکار رہے ہیں کہ اُن کے نزدیک زندگی فی نفسہ ایک المیہ جو ٹھہری۔ خیر یہ تو کسی حد تک تمہیدی گفتگو تھی۔ اصل مدعا یہ ہے کہ کیا ذہانت کے علاوہ بھی کوئی پیمانہ ہے جس کی رو سے زندگی کی پڑتال کی جا سکے کیونکہ دانشور تو اپنا فیصلہ سنا چکے ہیں کہ زندگی ایک مستقل المیہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فی زمانہ ہر شخص ذہانت و دانشوری کی جانب لپکا جا رہا ہے اور بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ لوگ اب حصولِ حکمت کو ہی زندگی کا مقصد سمجھ بیٹھے ہیں قطع نظر اس سے کہ جینا فی نفسہٖ ایک مقصد ہے۔

میری تحقیق کے مطابق ذہانت کے علاوہ بھی زندگی کو جانچنے کا ایک پیمانہ ہے اور وہ ہے ایفاء و ایثار یا والہانہ سپردگی۔ یہ دراصل صوفیوں کی ایجاد ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تردد نہیں کہ دنیا میں اگر صوفی نہ ہوتے تو زندگی کبھی اتنی دلچسپ اور پُرسکون نہ ہوتی۔ پس اگر آپ علم و حکمت کے دشتِ ویراں سے رودکی، رومی، نظامی، جامی، سعدی، حافظ، عطار، خیام اور سرمد کو نکال دیں تو باقی صرف ذہنی اضطراب اور حیرتِ لامتناہی ہی بچتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں رہا اب کہ مطلق دانش کے پاس زندگی کا کوئی جواز نہیں ہے۔زندگی دکھ اور سزا تو ٹھہری دانشور کے ہاں مگر صوفی زندگی کے متعلق کیا کہتا ہے۔یہ حضرت رومی کی زبانی سن لیجئے۔ع

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

آپ نے اکثر و بیشتر مختلف پینٹنگز اور خطاطی پر مبنی فن پاروں میں حضرت رومی کا یہ بند دیکھا ہوگا مگر عموماً جو اس کی تفسیر کی جاتی ہے وہ انتہائی ناقص اور سطحی ہے۔حضرت رومی کے نزدیک اس بند میں بندگی سے مراد مذہبی مشقات ہرگز نہیں بلکہ بندگی کو ایک عالمگیر معنی میں برتا گیا ہے۔فارسی زبان میں کسی بھی معاملے میں غیر مشروط ایفاء و ایثار بندگی کہلاتی ہے۔چنانچہ یہاں بندگی سے مراد وہ والہانہ سپردگی ہے جو زیستِ انسانی کو حقیقی مقصد و اسلوب سے روشناس کرتی ہے۔ایک دوسرے مقام پر حضرت رومی فرماتے ہیں۔ع

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

فرماتے ہیں کہ انسان صرف ایک جذبہ اور خالص التفات ہے علاوہ ازیں صرف گوشت پوست ہے۔ہاں یہ التفات تبھی ممکن ہے جب آپ کی نظر کسی پر ٹھہرتی ہے گویا جب آپ والہانہ سپردگی اختیار کرتے ہیں۔بالکل یہی مضمون ہمارے ہاں علامہ اقبال نے بھی اپنی ایک طویل نظم پیرِ رومی اور مریدِ ہندی میں بیان کیا ہے جس میں وہ مذکورہ شعر کو اُردو کے قالب میں کچھ یوں ڈالتے ہیں۔ع

خاک تیرے نور سے روشن بصر
غایتِ آدم خبر ہے یا نظر؟

زندگی کا مفہوم حضرت سعدی سے بھی سن لیتے ہیں ۔آپ فرماتے ہیں ۔ع

زندگانی نتواں گفت حیاتی کہ مرا است
زندہ آنست کہ با دوست وصالی دارد

فرماتے ہیں کہ زندگی یہ نہیں جو میں بسر کر رہا ہوں بلکہ زندہ تو وہ ہے جس کے پاس اُس کا دوست موجود ہے ۔ بالکل سادہ الفاظ میں شیخ سعدی زندگی کو والہانہ سپردگی کے سپرد کرتے نظر آتے ہیں ۔
پس اب ہمارے پاس زندگی کو جانچنے کے دو مستند و مسلم پیمانے آچکے ہیں ۔ایک دانشور کا اور دوسرا صوفی کا۔ دانشور کے نزدیک زندگی ایک مستقل المیہ ہے جبکہ صوفی زندگی کو ایفاء وایثار کا سرچشمہ کہتا ہے ۔
یہاں پر ایک سائنسی نظریہ رہ جاتا ہے کہ زندگی کو ایک سائنسدان کس نظر سے دیکھتا ہے ۔پہلی بات تو یہ ہے کہ سائنس کے ہاں زندگی کی کوئی مسلم اور متفقہ تعریف ہی نہیں ملتی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک سائنسدان زیادہ سے زیادہ یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ زندگی محض ایک حیاتیاتی مظہر ہے جو مختلف اوقات میں مختلف جسمانی ارتقاء کے سبب وقوع پذیر ہوا۔ سائنس چونکہ انسانی دانش کی مرہونِ منت ہے اس لئے سائنس کے ہاں بھی ایک فطری اضطراب اور حتمی یاسیت نظر آتی ہے ۔خلاصہ بیان کرتے ہوئے مجھے اب یہ نکتہ عرض کرنے میں کوئی منطقی اشکال نہیں رہا کہ زندگی ایک مسلسل ولولہ ہے ایفاء وایثار کا،علاوہ ازیں لامتناہی فکری انتشار ہی مرجعِ عقل و دانش ہے ۔

☆☆☆☆☆☆☆

وبا کے دنوں میں ڈپریشن کا حل

روزنامہ پاکستان 30 جون 2020

ایک طویل عرصہ سے لکھنے لکھانے کا سلسلہ متروک ہوا پڑا ہے جس کی بنیادی وجوہات ایک تو نہیں کہ بیان کی جائے مگر ایک وجہ ایسی ضرور ہے کہ جس نے لفظوں کے ہیر پھیر سے دور کر دیا اور وہ وجہ ہے ہمارے ہاں علم و تحقیق سے وہ وراثتی غفلت جس کا گراف پچھلے دس سالوں میں قریباً زمیں بوس ہو چکا ہے۔
ہمارے ہاں علم کی جستجو، حکمت کی تلاش اور سائنسی رویہ کبھی پنپ ہی نہیں پایا جس کا تذکرہ اکثر و بیشتر میری نگارشات میں جاری رہتا ہے۔ چنانچہ اس موضوع کو کسی خاص وقت کیلئے محفوظ رکھتے ہوئے میں آج ایک عالمی مہلک وبا کے نفسیاتی پہلو پر بات کروں گا۔ میرا تعلق چونکہ براہ راست اطلاقی و طبی نفسیات سے رہا ہے اس لئے آجکل مجھ سے صرف ایک ہی سوال طلبہ و رفقاء کی جانب سے پوچھا جا رہا ہے کہ اس عجیب و غریب وبا نے تو ہمیں جسمانی اور ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اور اس سے بچنے کی جو طبی احتیاط بتائی جاتی ہے اس کی طبی افادیت تو ایک طرف لیکن اس سے متعدد ذہنی انتشار جنم لینے لگے ہیں یعنی ڈپریشن اور سٹریس وغیرہ چنانچہ ایسی صورتحال میں ڈپریشن سے کیسے بچا جائے؟۔ کیا کوئی ایسا مخصوص لائف سٹائل ہے جس کو اپنا کر وبا کے دوران ڈپریشن سے محفوظ رہا جا سکے؟۔
ایک شخص جو روزانہ لوگوں میں گھلنے ملنے کا عادی ہے اور اس کے بغیر اس کی زندگی بے رنگ سی ہے وہ کیونکر دو یا تین ہفتے اکیلے کمرے میں خود کو بند کر کے ذہنی طور پر معذور کر سکتا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس مہلک وبا سے بچنے کا اب یہی ایک ہی طریقہ ہے۔ چنانچہ جب آپشن کی گنجائش ہی موجود نہ ہو تو وہاں مجبوری ہی کو افادیت کے دھارے میں لانا ہی حقیقی دانشمندی ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں ذرا سا بھی تردد نہیں ہے کہ جہاں علم و دانش انسان کیلئے ایک حتمی ضابطۂ حیات ہے تو وہاں اسی دانش کے کچھ سائیڈ ایفیکٹس بھی ہیں جنہیں دور کرنے کیلئے جذبات کو کام میں لایا جاتا ہے۔ پس جذبہ ایک ایسی طاقت ہے جو حکمتِ انسانی کو جِلا بخشتا ہے۔ اگر حکمت سے جذبات کو دور کر دیا جائے تو پیچھے جو کچھ بچتا ہے اُسے ڈپریشن، سٹریس اور انگزائٹی کہا جا سکتا ہے۔ ذہنی صحت کا راز جذبات کی رنگا رنگ دنیا میں موجود ہے۔

جیسے جسم کیلئے بہترین خوراک کی ضرورت پڑتی ہے بالکل ایسے ہی ذہن کو بھی مناسب خوراک کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یہ ذہن جسے آپ مذہبی اصطلاح میں روح، منطق میں شعور اور سائنس میں لائف انرجی کہہ سکتے ہیں دراصل جسم کا ڈرائیور ہے ۔آپ نے کبھی غور کیا ہو کہ جب انسان اُداس ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کا اثر اُس کے معدہ پر پڑتا ہے اور وہ کھانا پینا ترک کر دیتا ہے ۔ چنانچہ جب تک سٹور کی ہوئی خوراک سے معدہ سروائیو کر سکتا ہے کرتا رہتا ہے ۔

ڈپریشن ایک خالص نفسیاتی اصطلاح ہے جس میں ایک مریض مستقبل کی فکر کو ایک دباؤ کی صورت میں ذہن پر لاد لیتا ہے ۔ یہی بوجھ ڈپریشن کہلاتا ہے ۔کل کیا ہوگا اس کیلئے ضروری ہے کہ کل ہو اور جب کل ہوگا تو وہ آج ہی ہوگا ۔ دنیا میں آج تک کسی کی زندگی میں آنے والا کل نہیں آیا کیونکہ جو کچھ موجود ہوتا ہے وہ بہر صورت آج ہی ہوتا ہے ۔ وہ لوگ کبھی خوش نہیں رہ سکتے جو یا تو ماضی میں جی رہے ہیں یا جنہیں مستقبل کی فکر نے نڈھال کر رکھا ہے ۔

طبی نفسیات میں ڈپریشن اور سٹریس کی سب سے بنیادی وجہ انسان کا حال سے غافل ہو جانا ہے ۔علاوہ ازیں تنہائی ذہنی رجحانات میں مختلف منفی اور مثبت تبدیلیاں لاتی ہے ۔مگر زیادہ تر انسان منفی رجحانات کی جانب ہی لڑھکتا رہتا ہے، اس لئے تنہائی کو علمائے نفسیات جہاں تخلیق کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں تو وہاں کچی ذہانت کے حامل افراد کیلئے تنہائی کسی ذہنی سانحہ سے کم بھی نہیں ۔پس وبائی علامات ظاہر ہونے کے بعد اگر کسی کو تنہائی اختیار کرنا پڑے تو ضروری ہے کہ وہ اس دوران اپنی قوتِ مدافعت پر خصوصی دھیان دے ۔خاص کر خوراک پر یعنی اُبلے ہوئے انڈے، ملائی، مکھن، مختلف دالیں، تازہ سبزیاں اور تازہ پھلوں کا بھرپور استعمال کرے ۔

ذہنی صحت کیلئے ضروری ہے کہ پسندیدہ کتب کا مطالعہ کیا جائے ۔نعت و نشید یا کلاسیکل موسیقی جس میں ردھم کا خوب استعمال ہو سنی جائے کیونکہ ردھم کا تعلق براہ راست نیورانز سے ہوتا ہے ۔مذہبی ذہنیت کے حامل افراد ایسے وقت کو غنیمت جان کر کوئی مذہبی علمی سرگرمی اختیار کر لیں جیسا کہ میرے ایک متشرع دوست تنہائی کے سبب آجکل آن لائن عربی زبان سیکھ رہے ہیں تاکہ وہ قرآن کو براہ راست سمجھ سکیں ۔اس طرح کی دیگر علمی و تفریحی سرگرمیاں اختیار کی جا سکتی ہیں ۔اگر دیکھا جائے تو ڈپریشن کرونا کی وبا سے بھی زیادہ خطرناک اور مہلک نفسیاتی بیماری ہے جو پہلے سے ہی عام تھی اور اب تو قریباً ہر تیسرا شخص اس مرض کا شکار نظر آتا ہے ۔

اس ضمن میں ایک انتہائی ضروری نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب تک آپ اپنے خیالات کو مثبت دھارے میں

نہیں ڈالیں گے تب تک ڈپریشن سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں۔

زندگی جیسی ہے اس کو بالکل ویسا ہی دیکھنے کی عادت ڈالیں اور ہر حال میں مثبت رہنے کی کوشش کریں کیونکہ دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت صرف اُس وقت تک مصیبت ہوتی ہے جب تک آپ اس کی ذہنی طور پر تصدیق نہیں کر لیتے چنانچہ کوئی بھی مسئلہ صرف اتنا بڑا ہوتا ہے جتنا کہ آپ اسے بنا لیتے ہیں ورنہ مسائل اس قدر طاقتور نہیں ہوتے کہ وہ انسانی زندگی کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ مجھے اکثر و بیشتر احباب یہ کہہ دیتے ہیں کہ جب تکلیف آتی ہے تو پھر سوائے ڈپریشن کے ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہوتا اور ایسے موقع پر میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جو بھی تکلیف آتی ہے تھوڑا سا غور کریں تو وہ تکلیف اپنے ساتھ راحت پر مبنی ایک دانش بھی لاتی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تکلیف کے دورانیہ میں اس دانش یا حکمت کو ڈھونڈا جائے جس کے بعد تکلیف کا احساس رفع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسی کوئی تکلیف نہیں ہوتی جس کا مستقل یا عارضی دافع موجود نہ ہو۔ پس تکلیف کو بڑھا چڑھا کر اس پر دھیان دینے سے بہتر ہے کہ دفعیات پر توجہ دی جائے تا کہ جلد از جلد تکلیف سے نجات حاصل ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆

قانون اور انصاف

روزنامہ پاکستان 14 فروری 2020

جب کبھی دنیا میں موجود قانون پر غور کرتا ہوں تو انتہائی اچنبھے میں پڑ جاتا ہوں کہ ہر قانون صرف انصاف کی کما حقہ فراہمی کے لئے ہی بنایا جاتا ہے مگر دنیا میں زیادہ تر قوانین کی رٹ انصاف کو بائی پاس کر دیتی ہے۔ گویا ملزم قانونی لڑائی لڑتے لڑتے انصاف سے کہیں بہت دور جا نکلتا ہے۔ پھر آخر میں جو کچھ بچتا ہے وہ صرف قانون کی بالادستی ہوتی ہے۔ انصاف نہیں۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں انصاف کی فراہمی کی بجائے اکثر و بیشتر قانون کی رِٹ قائم ہوتی رہتی ہے اور اِسی پر سارا زور ہوتا ہے۔

اگر آپ عدالت کی ذمہ داریوں پر غور کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک منصف کا سارا زور محض قانون کی عملداری پر ہوتا ہے۔ منصف کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ بہرصورت قانون کی بنیاد پر فیصلہ دے، قطعِ نظر اِس کے کہ اِس کے اِس فیصلے سے ملزم مجرم بن جاتا ہے یا الزام سے بری ہو کر سرخرو ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک عام ضرب المثل مشہور ہے کہ "قانون اندھا ہوتا ہے" جبکہ قانون نہیں منصف اندھا ہوتا ہے کیونکہ منصف نہیں جانتا کہ ملزم فی الواقع کن مسائل سے دوچار ہو کر یہاں تک پہنچا اور کیا وہ ملزم حقیقتاً بھی ملزم ہے یا اُسے کسی طاقتور نے اپنے انفرادی انتقام کی خاطر عدالت کا منہ دکھایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انصاف کی دیوی کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوتی ہے۔ حق کیا ہے؟۔ یہ خود انصاف کرنے والے بھی نہیں جانتے۔ مجرم اکثر و بیشتر عدم ثبوت کی بنیاد پر باعزت بری اور بے گناہ جعلی ثبوتوں کی بنیاد پر کال کوٹھڑی میں پھینک دیا جاتا ہے۔ دنیا میں موجود دیگر آلام کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی اہم انسانی اَلمیہ قانون اور انصاف بھی ہے۔ وکالت جو علمی و اخلاقی طور پر ایک بالکل غیر ضروری اور مبنی بر جہل پیشہ ہے فی نفسہٖ انصاف کی راہ میں ایک بنیادی رکاوٹ ہے۔ سوال یہ ہے کہ الزام مجھ پر لگا اور اِس الزام کی تردید وکیل کیوں کرے؟۔

کیا یہ ایک مضحکہ خیز صورت حال نہیں ہے کہ انصاف جیسے انتہائی بنیادی انسانی حق کیلئے بھی مجھے پہلے ایک ایسے شخص کا انتظام کرنا پڑے جو میری فریاد منصف تک پہنچا سکے اور وہ شخص اِس کام کو باقاعدہ دھندہ بنا کر کرتا رہے۔

مجھے آج تک وکالت جیسے غیر منطقی اور غیر ضروری شعبے کی سمجھ نہیں آسکی۔سوال یہ ہے کہ مجھ پر لگے الزام کو مجھ سے بہتر دیانتداری کے ساتھ بھلا اور کون بیان کرسکتا ہے؟،اور مَیں بذاتِ خود جس طرح اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو بیان کرسکتا ہوں۔کئی وکیل مل کر بھی اُس اذیت کو ویسے بیان نہیں کر سکتے۔دنیا میں انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وکالت اور قانون ہے۔انصاف کبھی بھی اِس قدر مہنگا اور غیر میسر نہ ہوتا اگر دنیا میں وکالت جیسا دھندہ نہ ہوتا اور قانون برائے نفاذِ قانون کی جگہ قانون برائے انصاف کی حکمتِ عملی اپنائی جاتی۔

ہمارے ملک میں ابتداء ہی سے انصاف کی فراہمی ہمیشہ مہنگی رہی ہے چنانچہ فریادی انصاف کی آس میں وکیل کے ہاتھوں لٹتا رہتا ہے اور منصف ایک نہایت آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر قوانین کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا ہے۔وکلاء جہاں عدالت میں جرح و تعدیل کے نام پر فریادی و مدعی کی عزت کو تار تار کرکے اپنی لیاقت کے جھنڈے گاڑھ رہے ہوتے ہیں تو وہاں جیوری فوری انصاف کے نام پر شغل لگائے بیٹھی ہوتی ہے۔قانون اندھا ہو یا نہ ہو پس فریادی انصاف کی آس میں ضرور اندھے ہو جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو انصاف کی آس لگائے مر بھی جاتے ہیں۔پھر اُن کی موت کے بعد اُن کو انصاف ملتا ہے۔یہ مذاق نہیں بلکہ ہمارے ہاں متعدد بار ایسا ہو چکا ہے۔

دنیا بس ایسی ہی ہے۔قانون ہر شہری کے بنیادی حقوق اور ترسیل انصاف کا ضامن ہوتا ہے جبکہ اِن دونوں کے درمیان میں موجود وکالت ایک غیر ضروری زحمت کے سوا کچھ نہیں۔سوال یہ ہے کہ انصاف کی فراہمی اِس قدر پیچیدہ اور مہنگی کیوں ہے کہ اس کے لئے ایک وکیل کی ضرورت پیش آئے؟۔دھندہ تو کوئی بھی کیا جا سکتا ہے پھر انصاف دلانے کا دھندہ کیوں ضروری ہے؟۔اگر منصف اِس قابل نہیں کہ وہ براہِ راست فریادی کی فریاد سن اور سمجھ سکے تو کیا محض بلیک اور براؤن کلر کی موٹی موٹی کتابیں پڑھ لینے سے منصف بنا جا سکتا ہے؟۔

دراصل اِس وقت دنیا میں بالعموم اور ہمارے ملک میں بالخصوص انصاف کی فراہمی کی جو مضحکہ خیز اور اذیت ناک صورت حال ہے،وہ بعید از بیان ہے۔دنیا میں رہنے والے کسی بھی ایک انسان کا سیٹ اَپ دنیا میں رہنے والے کسی بھی دوسرے انسان سے میل نہیں کھاتا۔علاوہ ازیں ہر انسان کے معاشی،سماجی اور اخلاقی مسائل الگ الگ ہوتے ہیں۔پانچ بچوں کے مفلس باپ کے پاس اگر کام نہیں ہوگا تو وہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر چوری یا ڈاکہ زنی نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا؟،جبکہ ریاست اُس کی خبر گیری سے بالکل بری الذمہ ہے۔پھر ایسا شخص کچھ

خاص حالات میں پھنس کر عدالت کی گرفت میں آجاتا ہے تو منصف نے صرف قانون کی کتاب دیکھ کر ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے قطعِ نظر اِس سے کہ ملزم نے کن حالات سے مجبور ہو کر یہ قدم اُٹھایا۔ ہمارے ہاں قانون اور انصاف کے نام پر آج بھی شغل جاری ہے ۔ جن کو بلا شک و شبہ کال کوٹھڑی میں ہونا چاہیئے تھا وہ مسندِ اقتدار پر براجمان ہیں اور جنہیں خدمتِ خلق جیسی عظیم الشان ذمہ داری ادا کرنی چاہیئے تھی وہ رُل رہے ہیں ۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔ ع

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے ہیں
ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے ہیں

کوٹ لکھپت جیل کے ایک سیل میں نو سال سے قید ایک بے تقصیر قیدی ملنگی بابا کہا کرتے "قانون طاقتور کی خواہش اور انصاف بے بس کا وہم ہے"۔ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد احساس ہوا کہ قانون کے نام پر طاقتور نے ہمیشہ اپنی من مانی ہی کی ہے جبکہ اِس کے برعکس بے بس انصاف کے لئے ہمیشہ در بدر مارا مارا پھرتا رہا اور پھر اِسی کسمپرسی میں مر گیا۔ گویا قانون مقتدرہ کے مفادات کا منظّم تحفظ اور انصاف بے بس کو دیا گیا وہ خوشنما لارا ہے جس کی آس پر یہ کاروبارِ زندگی چل رہا ہے تاکہ معاشرے میں طاقتور اور بے بس کے درمیان یہ مکروہ اور بظاہر اخلاقی توازن قائم رہے، نہ صرف توازن قائم رہے بلکہ بے بس کو قانون کے سہارے کی کھوکھلی تسلی بھی ملتی ہے ۔

☆☆☆☆☆☆☆

بسنت پنچمی

روزنامہ پاکستان 29 جنوری 2020

یہ اَمر منطقی طور پر ماوراء اَز دورائے ہے کہ انسان ہمیشہ تہازیب ہی کی کوکھ سے پروان چڑھتا رہا ہے۔انسان کی طبع و مابعدالطبع کا ظاہری و باطنی ڈھانچہ اپنی اصل میں تمدّن کی گود ہی میں پھلتا پھولتا رہا ہے۔رہی بات نظریے یا علمِ متصوّرہ کی تو اس کا تعلق انسان کی فکری و جذباتی پنپ سے ہے۔جغرافیائی خطوط کا انسان کی اس فکری نمو سے براہ راست کوئی ربط نہیں۔پس تہذیب وتمدن ہی انسان کی حقیقی شناخت اور انسانی طبیعت کا جوہری وصف ہے۔

خشکی کے اِس چھوٹے سے ٹکڑے کو خدا نے چار مختلف رُتوں سے نوازا ہے۔چنانچہ گرمی، خزاں، سردی اور بہار اس خطے کے جغرافیائی اوصاف ہیں۔موسمِ بہار جسے سنسکرت میں رُت مہاراج بھی کہا جاتا ہے۔ہمارے ہاں ابتداء ہی سے غیر معمولی نوعیت کے تیوہاروں کا مرکز رہا ہے۔ماگھ کے شروع ہوتے ہی جہاں سردی اپنا اثر کھونے لگتی ہے تو موسمی تہواروں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔چیت اور بیساکھ کے گوناگوں تیوہاروں کی ابتداء ماگھ کے وسط میں آنے والے پہلے ریتو رنگ بسنت پنچمی کی رونق چہار سو پھیلنے لگتی ہے۔گریگورین کیلنڈر کے مطابق اس سال بسنت پنچمی 29 جنوری کو منائی جارہی ہے۔چونکہ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اب ہم ایک درآمدشدہ تہذیب کے رسیا ہو چکے ہیں، اس لئے آج اپنے تہذیبی تیوہار منانا ہمیں معیوب لگتا ہے، حالانکہ کہاں نظریہ، کہاں علاقہ، کہاں تہذیب، کہاں تصّور؟۔

تمدّن وعقائد میں زبردست بُعد کے باوجود آج بھی ہم یہ انتہائی اہم نکتہ نہیں سمجھ سکے کہ سوچ جس قدر بھی طاقتور ہو جائے، تمدّن کو معدوم نہیں کر سکتی۔بسنت پنچمی ہنود، اہلِ اسلام، سکھ اور جین مت کے ماننے والوں کا جغرافیائی تیوہار ہے، جسے آج سے چند دہائیاں قبل بلا کسی نظریاتی دقّت کے یہاں کے باسی مل جل کر مناتے رہے ہیں۔

البتہ قیامِ پاکستان کے بعد علاقے، تہذیب وتمدّن، نظریات اور شخصیات کی تقسیم کے ساتھ ساتھ تیوہار بھی اِدھر اُدھر ہو گئے۔بسنت پنچمی ایک غیر معمولی ریتو تیوہار ہے، جس کی باقاعدہ تقریبات ہمارے ہاں معروف صوفی سلسلہ چشتیہ میں بھی قدرے تکریم سے منائی جاتی رہی ہیں۔چنانچہ حضرت بابا صاحب خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی کے خاص نیازمند طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو دہلوی کی متعدد نظمیں اور بندشیں اسی تیوہار سے منسوب ہیں۔

بسنت پنچمی کے حوالے سے ایک معروف بندش جو قدیم ہنداوی زبان میں ہے اور جس کی کمپوزیشن راگ بہار میں حضرت امیر خسرو دہلوی نے خود ہی ترتیب دی، کچھ اِس طرح سے ہے۔ع

پھول رہی سرسوں سگن بن
آنگنا مورے پی سُر پھُولے
کوئل بولے ڈار ڈار
اور گوری کرت سنگار
مالنیا ہر والے آئی گھرسوں
سگن بن پھول رہی سرسوں
طرح طرح کے پھول کھلائے
پیہروا آنگن میں آئے
نجام الدیں کے درواجے پر
آون کہہ دے عشق کے رنگ
اور بیت گئے برسوں
سگن بن پھول رہی سرسوں

بسنت پنچمی دراصل ریتو بہار کی آمد کا وہ اہتمام ہے جس میں ہنود سرسوتی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔اہلِ پنجاب کے ہاں اس تیوہار میں پتنگ بازی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ہمارے ہاں گو کہ اس تیوہار کا وہ مخصوص تاثر تو اب باقی نہیں رہا لیکن پھر بھی کبھی کبھار بہار کی آمد پر مغربی پنجاب کے کچھ علاقوں میں رونق دیکھنے کو مل جاتی ہے۔پتنگ بازی پنجاب کی خاصی قدیم تہذیبی روایت ہے جس پر پچھلے چند سال سے اب مستقل حکومتی قدغن لگ چکی ہے۔دراصل ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اس وقت اپنی تہذیب سے جڑا ہر شعار یا تو مذہبی امتناع کے سبب ترک کر دیا ہے

یا پھر مقتدر قوتوں کی بے جا پابندیوں کے سبب ہم سے ہماری تہذیب کی ہر رنگینی چھن گئی ہے۔

صورت کوئی بھی ہو، اس خطے کے باسیوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ تیوہار دراصل تہذیب کی وہ انمٹ یادداشت ہوتے ہیں جن کے وسیلے سے نئی نسلیں اپنے تمدّن سے روشناس ہوتی رہتی ہیں مگر ہم اس کے برعکس آج اپنے حقیقی تمدّن کی بجائے ایک بالکل درآمد شدہ تمدّن کے اسیر ہو چکے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اب اسی درآمد شدہ تمدّن پر نہ صرف فخر محسوس کرتے ہیں بلکہ اپنے حقیقی اور اصلی تمدّن کا نام لیتے ہوئے بھی عار محسوس کرتے ہیں۔

ہمارے ساتھ من حیث القوم یہ بہت بڑی زیادتی ہوئی ہے جس کا خمیازہ نہ صرف ہم بھگت رہے ہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس کے نظریاتی گزند سے محفوظ نہیں ہو پائیں گی۔ تہذیب و تمدّن جغرافیائی خطوط سے بنتے ہیں نہ کہ فکر و نظر سے۔ فکر و نظر کا تعیّن انسانی خصائل کی پنپ میں زبردست کردار ادا کرتا ہے مگر فکر میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ آپ سے آپ کی جغرافیائی شناخت چھین لے۔ چنانچہ عرب اور خراسانی جنگجوؤں، مغل سلاطین اور فرنگیوں کے زبردست فکری تسلط کے باوجود بھی برِصغیر میں بدوی، خراسانی اور برٹش کلٹ نہ پنپ سکا۔

پنجابی بے شک اہلِ اسلام ہوں یا سکھ، اُن کی طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی ترکیب سے پنجابیت نہیں کریدی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ درآمد شدہ تہذیبوں کی زبردست ترغیب کے باوجود آج بھی اس خطے کے باسی اپنے رہن سہن کو نئی تہذیب کے سانچے میں نہیں ڈھال سکے۔ سندھو تہذیب قریباً ایک ہزار سال تک غیروں کے فکری تشدّد کے نرغے میں رہی مگر آج تک اپنی حقیقی تمدنی شناخت نہیں گوا سکی۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ بہت پہلے ہمارے گھروں میں بہار کی آمد پر نوجوان لڑکیاں بسنتی رنگ کے کپڑے پہنتیں اور بزرگ عورتیں گڑ کا شربت اور ڈالہ، یعنی پسی ہوئی گندم کا بھات بنا کر ہمیں عزیز و اقارب کے ہاں بانٹنے کا کہتیں۔ پنجابی صوفیوں نے یہاں کے تمدّن کو من و عن قبول کیا اور جو ہنود مسلمان ہو جاتے اُنہیں بھی اپنے تمدّن پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے۔

البتہ تبدیلی دل کی دنیا میں لازماً بپا ہوتی۔ چنانچہ کرشن جی کو ماننے والے جب رسولِ کریم حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبرِ صادق کی تصدیق کرتے تو وہ کبھی بھی کرشن جی کے بھگتی مارگ سے منکر نہ ہوتے بلکہ اپنے دل کی دنیا کا رخ ایک روشنی سے موڑ کر دوسری روشنی کی جانب مرکوز کر لیتے۔ تبھی تو حضرت امیر خسرو دہلوی جیسے عظیم المرتبت صوفی ایک تُرک نژاد ہو کر بھی اس خطے کے تمدّن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اپنے مرشد کے مرشد معروف پنجابی صوفی بزرگ حضرت بابا فرید الدین سائیں سے عقیدت کو اسی تہذیبی رنگ میں بیان کرتے ہیں جو برصغیر میں رائج تھا۔

فرماتے ہیں۔ع

بسنتی چولہ پہن کے خسرو پی کو رِجائے
دین بدائی وَلیَن سارے گنج شکر گھر آئے

مذہب کی انتہائی معقول اور امن و آشتی پر مبنی تعبیر اس خطے کے صوفیاء کی وساطت سے ہی مروج ہوئی۔ پس اس خطے کے صوفیاء نے کبھی اس خطے کے لوگوں کو اپنی تہذیب سے روگردانی کی ترغیب نہیں دی بلکہ انہوں نے اپنی تہذیب ہی کی لو سے لوگوں کے دل روشن کیئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

خیرباد جمہویت

روزنامہ پاکستان 14 جنوری 2020

اختر الایمان متحدہ ہند کے ایک انتہائی زیرک اور صوفی مزاج نظم گو شاعر تھے ۔ ہند کے مسلمانوں کو جھنجھوڑنے کیلئے آپ نے شعر کے وسیلے سے جو ادبی خدمت سرانجام دی ہے، لاریب وہ کبھی نہیں بھلائی جائے گی ۔ فرماتے ہیں ۔ ع

غلام روحوں کے کارواں میں
جرس کی آواز بھی نہیں ہے

اختر الایمان کی اس نظم پر مَیں ایک باقاعدہ کالم اسی روزنامہ میں تین سال قبل 8 جولائی 2017ء کو لکھ چکا ہوں ۔ یہاں نظم کے متن کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ آج کے کالم کی بنیاد نظم کے پہلے بند پر ہی ہے ۔ یہ جو اصطلاح ہے "غلام روح" اس کے لغوی معانی چاہے کچھ بھی ہوں اصطلاحی معانی نہایت عام فہم ہیں ۔ یقین نہیں تو آس پاس نظر دوڑا کر دیکھ لیں ۔ جہالت و افلاس کی ماری عوام، جنہیں یہ سمجھانا کہ حکومت کرنا تمہارا بنیادی حق ہے، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، ذہنی غلامی میں جکڑی ہوئی عوام جنہیں جہالت، غربت، فراغت اور مہنگائی کے عفریت نے پوری طرح دبوچ رکھا ہے ۔ اِنہیں اِس وقت جمہوری اقدار اور سول سپر یمیسی کا بھاشن دینا خود ایک مستقل حماقت ہے ۔ بے شک دنیا سر پیٹتی رہے کہ جمہوریت سے مراد" عوام کی حکومت عوام کے ذریعے عوام پر ہے" مگر ہماری سمجھ میں یہ نکتہ کل آیا تھا نہ ہی آج ۔ نہ تو کل جب یہ ملک اپنے پیروں پر کھڑا ہو رہا تھا اور نہ ہی آج جب جدید دنیا جمہوری اقدار کی امین کہلانے لگی ہے ۔

قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک پاکستان کی تاریخ میں کوئی بھی خالص عوامی سیاستدان پیدا نہیں ہوا کہ جس کا سینہ عوام کے درد سے معمور ہو ۔ جمعیت اور جماعت کے علاوہ کوئی بھی سیاسی پارٹی ایسی نہیں ہے جس کی تاسیس مقتدرہ کے عمل دخل سے وقوع پذیر نہ ہوئی ہو ۔ پھر چاہے وہ روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانے والوں کی پارٹی ہی کیوں نہ ہو ۔ آج یہ

بات ہم سب بخوبی جانتے ہیں اور اس میں کوئی دو رائے نہیں اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی ابہام کہ ملکی سیاست کو لیڈ کرنے والی سیاسی جماعتیں کب، کیسے اور کن لوگوں کی وساطت سے وجود میں آئیں۔ہمیں تو تب بھی ان تِلوں میں تیل نظر نہیں آرہا تھا جب انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر "ووٹ کو عزت دو" کے سحر انگیز عوامی نعرے سے عوام کو بیوقوف بنایا۔کوئی حیرت کا مقام نہیں کیونکہ بقولِ شاعر۔ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

میرے آبائی علاقے میں آج بھی لوگ صاف پانی اور بنیادی طبی سہولتوں سے محروم ہیں۔علاقائی سیاست دان چونکہ جاگیردار ہیں پس جو اُن کی وساطت سے تھوڑا بہت عوام کو میسر آگیا تو آگیا ورنہ "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس"۔دنیا میں ہمیشہ سیاسی پارٹیاں ہی جمہوریت کی بقا کی ضامن ہوتی ہیں۔جمہوری اقدار کی حفاظت کی کلی ذمہ داری سیاسی پارٹیوں پر ہی عائد ہوتی ہے،لیکن ہمارے ہاں سیاسی پارٹیاں صرف شخصی مفادات ہی کے تحفظ کا نام ہیں۔جب انہیں ضرورت پڑتی ہے تو اپنے مفاد کیلئے "ووٹ کو عزت دو" جیسے دلکش نعرے ایجاد کر کے عوام کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں اور جب ذاتی مفاد پورا ہو جاتا ہے تو خیرباد جمہوریت کہہ کر خودی میں مست ہو جاتے ہیں۔

کیا کوئی دانشور بتا سکتا ہے کہ عوام کب سکھ کا سانس لیں گے؟ بجلی کب سستی ہوگی؟۔پٹرول اور گیس کب سستا ملے گا؟۔آلو، پیاز اور ترکاری کب اونے پونے داموں ملے گی؟۔غریب کا لڑکا کب Aitchison اور مفلس کی بچی کب Kinnaird کالج پڑھ سکے گی؟۔مقتدر طبقہ اگر صرف دس منٹ کے لئے سوشل میڈیا کا بغور جائزہ لے لے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ مارے شرم کے اپنا منہ موبائل یا کمپیوٹر سکرین سے نہ چھپالے۔شکر ہے کہ یہ ففتھ جنریشن وار کا دور ہے ورنہ ٹبر چور مافیا اور کھوکھلی تبدیلیوں کا لارا دینے والا مفاد پرست ٹولہ "سب اچھا ہے" کی رپورٹ کے ساتھ دنیا کو بھی بیوقوف بنالیتا۔

بخدا ملک میں ایک عام آدمی کی زندگی ہر آنے والے دن بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے اور اس کا کماحقہ احساس صرف ایک دردمند کو ہی ہوسکتا ہے۔جن کے Pug (پالتو کتا) کے لئے میکڈونلڈ سے پچیس سو کا پیزا آتا ہو اور جن کے بچے

چھ چھ اسلحہ بردار کمانڈوز کے ہمراہ سکول اور کالج جاتے ہوں اُن کیلئے تو یہ ملک بلاشک وشبہ جنت نظیر ہے۔

جمہوریت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی مطلب نہیں کہ ایک عام آدمی سکھ کا سانس لے ورنہ پھر ملوکیت و آمریت میں کیا قباحت ہے؟۔جمہوریت میں بھی تو آخر عوام کو کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھمایا جاتا ہے تاکہ بیل کو یہ محسوس ہو کہ وہ سفر کر رہا ہے اور عنقریب اس کی منزل آنے والی ہے جب مالک اس کی آنکھوں سے پٹی اُتار کر اسے کھلا چھوڑ دے گا۔

جو ملک کو لوٹ کر فرار ہو گئے۔جنہوں نے تبدیلی کا لارادے کر عوام کو گمراہ کیا۔جنہوں نے روٹی، کپڑا اور مکان کے نام پر سیاست کو وراثت میں تبدیل کیا۔اُن کو اِس سب سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ٹماٹر آج بھی 180 روپے کلو ہے۔جی ہاں ٹماٹر جس کے بغیر آپ شوربہ بھی نہیں بنا سکتے گویا اب عوام کو صرف اُبلے ہوئے آلو کھا کر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔مگر اس سب کے باوجود حکومت کے کانوں میں جوں تک نہیں رینگ رہی۔ہاں "ووٹ کو عزت دو" کی طرح "گھبرانا نہیں" کا بیانیہ بھی خوب چل پڑا۔چنانچہ اب حکومت کی جانب سے جب اس طرح کی کوئی آفت آئے تو جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ گھبرانا نہیں۔تہتر سالوں میں بارہا عوام پر مہنگائی وغربت کی آفات نازل ہوئیں مگر جو حال موجودہ حکومت نے عوام کا اس بار کیا ہے اس کی نظیر چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔

بے شک عوام اب اپنے اس حق سے دستبردار ہونے کو تیار ہے کہ جمہوریت کا مطلب "عوام کی حکومت ہے"۔حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تو عمران خان عام آدمی تھا، نہ نواز شریف اور نہ ہی بھٹو مرحوم۔یہ لوگ اُس زمانے میں بھی بلاواسطہ مقتدر حلقوں سے منسلک تھے جب ان کی کوئی سیاسی پہچان ہی نہیں تھی اور آج بھی انہی لوگوں کی پانچوں گھی میں ہیں۔

پس یہی اشرافیہ آج بھی مقتدرہ سے مل کر عام آدمی کو ہر قسم کی ذلالت میں دھکیلے ہوئے ہے کیونکہ دو مفاد پرست مقتدر اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے ایک دوسرے کی اعانت ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات میں کرتے آئے ہیں۔البتہ اب ایک روشن اُمید ضرور نظر آرہی ہے سوشل میڈیا کی برکت سے اور بہت جلد ایک ایسا عوامی انقلاب آئے گا کہ اشرافیہ اور مقتدرہ دونوں کی ہوایاں اُڑ جائیں گی۔پس ایسا ہوگا اور بہت جلد ہوگا کیونکہ یہ ففتھ جنریشن وار کا دور ہے اور اس دور میں سب سے بڑی طاقت انٹرنیٹ ہے اور انٹرنیٹ آج ایک عام آدمی کو بخوبی میسر ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

آرمی ایکٹ میں ترمیم کی ضرورت کیوں؟

روزنامہ پاکستان 07 جنوری 2020

قانون فی الواقع کس بلا کا نام ہے اِس پر بحث تو خیر مقنّنین کا مسئلہ ہے مگر ایک خالص عوامی و جمہوری ریاست میں قانون سازی کا مطلق نہ سہی جزوی حق تو عوام کے پاس ہونا چاہئے اور ایسا جدید ریاستوں میں ہو بھی رہا ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ دیسی جمہوریت واقع ہے اِس لئے یہاں پر قانون سازی کا حق صرف اُنہی لوگوں کو ہوتا ہے جو زمامِ اقتدار کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوتے ہیں۔

تحریک انصاف کے پاس اِس وقت عوام کا متنازعہ اور مبہم مینڈیٹ موجود ہے۔ جس کو حزبِ اختلاف تو درکنار خود عوام بھی مسترد کر چکے ہیں۔ مختلف ملکی و بین الاقوامی حوالے سے شائع ہونے والی متعدد رپورٹس یہ ثابت کر چکی ہیں کہ پچھلے ایک سال میں تحریکِ انصاف کی عوامی مقبولیت میں زبردست کمی واقع ہوئی ہے اور یہ سلسلہ اِس وقت بھی زور و شور سے جاری ہے۔ فوج ہمارا ایک معزز اور باعث تکریم دفاعی ادارہ ہے جس کی بنیادی ذمہ داری ملک کی سرحدوں کی حفاظت ہے۔ ریاست کو لاحق دہشت گردی کے عفریت سے نجات دلانے میں ہماری ملٹری فورسز نے جو قربانیاں دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ حالانکہ دہشت گردی کے اِس عفریت کی پیدائش کس طرح ہوئی اور اِس کے پیچھے کون لوگ تھے ہم سب بخوبی جانتے ہیں۔

آرمی ایکٹ میں ترامیم ایک خالص عوامی مسئلہ ہے اور اِس پر قانون سازی کا حق بھی عوامی نوعیت کا ہے۔ حکومت نے بہت اچھا کیا جو تمام مخالف جماعتوں کو اِس بنیادی جمہوری حق سے محروم نہیں کیا۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کی غیر مشروط حمایت پر بیک جنبش قلم تعجب تو ضرور ہے مگر اِس ضمن میں کوئی مختلف رائے سامنے نہیں آئی۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ ایک سادہ اور بالکل عام فہم قانون یہ ہے کہ تین سال بعد آرمی چیف ریٹائرڈ ہو جاتا ہے۔ یہ قانون فی نفسہٖ بہت زبردست اور معقول ہے مگر سوال یہ ہے کہ اگر ہنگامی صورتِ حال نہ ہو تو پھر بھی کیا ریٹائرڈ ہونے والے آرمی چیف کو توسیع دی جا سکتی ہے؟۔ اِس کا حتمی فیصلہ تو عوامی نمائندوں کا کام ہے ہم طبع زاد صحافیوں کا نہیں۔
مگر ہم جیسے طلبائے علم و فضل کو یہ حق تو حاصل ہے کہ ہم عوامی نمائندوں کے فیصلوں پر تنقید بر بنائے دلیل کر سکیں۔

آرمی چیف کی توسیع کا نوٹیفکیشن جو وزیرِاعظم نے اپنی صوابدید پر جاری کیا تھا اُس میں ایک انگریزی اصطلاح ابھی تک ذہن میں گھوم رہی ہے۔مَیں نہیں سمجھ سکا کہ اِس کا کیا مطلب ہے؟۔

وہ اصطلاح تھی Regional Security۔جس کا لفظی اُردو ترجمہ ہوتا ہے علاقائی تحفظ۔اب یہ ریجنل سیکیورٹی یا علاقائی تحفظ کیا ہے جس کی بنیاد پر وزیرِاعظم ایک آرمی چیف کی مدتِ ملازمت میں توسیع کر سکتا ہے؟۔اِس کی وضاحت خود عوامی رائے سے منتخب ہونے والے وزیرِاعظم کو ہی دینی ہے۔

ہمارے ہاں ایک عام رواج یہ ہے کہ قانون سازی کے معاملے میں عوام کو بالکل لاعلم رکھا جاتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ عوام کو اِس قابل ہی نہیں سمجھا جاتا کہ اُنہیں ایسے دقیق قانونی مسائل سے آگاہ کیا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔مقامِ حیرت ہے کہ قانون سازی کی اِس نہج پر بھی ابھی تک یہ نکتہ واضح نہیں کیا گیا کہ آخر کس منطقی بنیاد پر منتخب حکومت بغیر ہنگامی حالات کے ایک ریٹائر ہونے والے آرمی چیف کی مدتِ ملازمت میں توسیع کر سکتی ہے؟۔شاید کالم ہذا کی اشاعت کے بعد ہی ہماری اِس استدعا کو کوئی قانونی ماہر یا مارشل لاز پر گہری نظر رکھنے والا کوئی بندۂ خدا درخورِ اعتناء سمجھ لے اور واضح کر دے کہ ایک منتخب حکومت فلاں منطقی وجوہ پر ریٹائر ہونے والے آرمی چیف کی مدتِ ملازمت میں توسیع کر سکتی ہے۔جن اصحاب کی یہ ذمہ داری ہے وہ اِس نکتے کو عوام کے لئے واضح کریں۔

سرِدست اُن سے قطع نِظر خاکسار کو تو اِس قانون سازی کی صرف ایک ہی معقول وجہ نظر آرہی ہے کہ جب منتخب حکومت کے لئے سول نافرمانی کی تحریک ایسا زور پکڑ لے جس کا سدباب بظاہر ناممکن نظر آرہا ہو اور اُدھر ریاست کا آرمی چیف ریٹائر ہونے کے قریب ہو تو ایسی گھمبیر صورتِ حال میں پھر منتخب حکومت ریٹائر ہونے والے آرمی چیف کی مدتِ ملازمت میں توسیع کر سکتی ہے۔علاوہ ازیں اگر کوئی معقول وجہ ہے تو اُسے بہرصورت عوام کے سامنے لایا جائے کہ ایک خالص جمہوری ریاست میں حکومت کا دوسرا نام ہی عوام ہے گو کہ جمہوریت کی ہو بہو یہی تعریف ہماری ریاست پر چسپاں کرنا منطقی زیادتی کے مترادف ہے۔اگر مذکورہ ہنگامی صورت حال نہ ہو تو پھر ریٹائر ہونے والے آرمی چیف کی مدتِ ملازمت میں وسیع کرنا کس زمرے میں آتا ہے؟۔یہ نکتہ نہ صرف غور طلب بلکہ زیرِ بحث بھی ہونا چاہیئے۔

اِس طرح اگر بغیر ہنگامی صورتِ حال کے ریٹائر ہونے والے ہر آرمی چیف کی مدتِ ملازمت میں توسیع ہوتی رہی تو سوال یہ ہے کہ ترقی کے مستحق اُن افسروں کا کیا ہوگا جو بغیر ترقی کئے ریٹائر ہو جائیں گے؟۔

اِس سوال کا جواب بھی اُنہی کے ذمہ ہے جو آرمی ایکٹ میں ترامیم کر رہے ہیں ۔اِس اَمر کا براہِ راست دفاعی اداروں سے کوئی تعلق نہیں کہ یہ سارا کیا دھرا عوامی نمائندوں ہی کا ہوتا ہے البتہ اگر عوامی نمائندے کسی غیر مرئی دباؤ کے زیر اثر ہیں تو منافقت کی بجائے واضح طور پر قوم کو اپنے اِس عذر سے آگاہ کریں ۔یوں عوام کو اعتماد میں لئے بغیر اس طرح کی حساس قانون سازی کر لینا حکومت کے لئے بھی خطرے سے خالی نہیں اور خود دفاعی اداروں پر بھی سوالیہ نشان چسپاں کرنے کے مترادف ہے ۔آج اکہتر کی دہائی والے لاشعور عوام نہیں رہے ۔سوشل میڈیا اور مائیکرو بلاگنگ نے پوری دنیا کو ایک Virtual Village بنا کر رکھ دیا ہے ۔سو اِس طرح کے دھڑلے شاید ہی اب مقبول ہو پائیں ۔مَیں پچھلے سولہ گھنٹوں سے مسلسل سوشل میڈیا دیکھ رہا ہوں ۔ہر دوسری پوسٹ آرمی ایکٹ میں ترامیم کی تنقید پر مبنی ہے ۔

گزشتہ رات گئے جب مَیں نے "الجزیرہ" ٹی وی کے ایک سینئر صحافی دوست سے صرف اِس لئے رابطہ کیا کہ وہ مجھے یہ انفارمیشن دے سکے کہ دنیا کی کسی جمہوری ریاست میں کوئی ایسا قانون موجود ہے جس کے تحت موزوں حالات میں ایک ریٹائر ہونے والے آرمی چیف کی مدتِ ملازمت میں توسیع کی جائے، تو مَیں اپنے دوست کا جواب سن کر حیران رہ گیا کہ ایسا کوئی قانون دنیا کی کسی بھی جمہوری ریاست تو درکنار کسی نیم یا غیر جمہوری ریاست میں بھی موجود نہیں ہے بلکہ دوست کے مطابق تو ایسا کرنا خود آرمی قوانین کے صریح خلاف ہے کہ بالکل موزوں حالات میں ریٹائر ہونے والے آرمی چیف کی مدتِ ملازمت میں توسیع کر دی جائے ۔اس سے وہ آرمی افسر جو اِس ترقی کے اہل تھے بغیر پروموٹ ہوئے ریٹائر ہو جاتے ہیں ۔دوست کے مطابق پاکستان کی جانب سے یہ خبر بریک کرنے پر مجھے سب سے زیادہ حیرت ہوئی ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اشتراکیت اور رجعیت

روزنامہ پاکستان 20 دسمبر 2019

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام ایک مستقل لعنت ہے مگر یہ مسئلہ نہ تو نئے امیر بنانے سے حل ہو سکتا ہے اور نہ ہی چند افراد کو مطلق طاقت سونپ دینے سے غریبی مٹ سکتی ہے۔ مارکس کی معاشی جدلیات برحق اور آپ کی مفلس کے لئے علمی و عملی جدو جہد کو سرخ سلام۔ مگر لال لال لہرانے سے غریب کبھی سکھ کا سانس نہیں لے سکتا بلکہ اس کے ذریعے امیروں کا قلع قمع اور اجتماعی تشدد کی فضاء ضرور قائم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ماضی کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یہاں اس کا تذکرہ ہرگز نہیں کروں گا کہ غریبوں ہی کے ہمدرد لینن، سٹالن اور ماؤزے نے کتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ سوال یہ کہ گزشتہ ستر سالوں میں لال لال لہرانے والوں نے دنیا میں کتنے فیصد غریبی ختم کی اور ان کی جان توڑ جدو جہد کے اب تک کیا نتائج برآمد ہوئے؟۔

اب اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مَیں رجعیت کا پرچارک ہوں۔ مذہبی ریاستوں اور مذہب کے مدعی مقتدر طبقے کا حال بھی دنیا دیکھ چکی ہے۔ یہ دور اور آنے والا دور صرف Universal Economy یعنی عالمگیر معیشت اور خالص جمہوری و ارتقائی مراحل سے مسائل حل کرنے کا ہے۔ سرخ، سفید اور سیاہ انقلابات کے زمانے اب لد چکے۔ اب صرف وہی تبدیلی قابل قبول ہوگی جو عوامی اور جمہوری اقدار کی بنیاد پر علم و تحقیق سے حاصل ہوگی۔ گزشتہ چند دنوں سے یونیورسٹیوں کے طلبہ نے متخیل انقلاب کے نام پر جو غل عپاڑہ مچا رکھا ہے، سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ اب کون سا کہرام مچانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ تعلیم برائے تہذیب ہی کسی تعلیمی ادارے کا جوہر ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں سارا کچھ اُلٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ درسگاہیں سیاسی اڈے بن چکے ہیں جن میں چند مفاد پرست سیاستدان اپنے اپنے جتھوں کو منظم کر کے مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اشتراکیت کی بنیاد مطلق جبر پر قائم ہے گو کہ اس کا مقصد نیک ہے۔ کسی بھی نیک مقصد تک رسائی کے لئے انتہائی بنیادی اور عالمگیر اخلاقی اقدار کو بائی پاس نہیں کیا جا سکتا۔ جدید دنیا میں تشدد کی کوئی بھی صورت قابل قبول نہیں رہی اور نہ ہی انقلاب جیسی ہولناک اصطلاح اب مزید مروج ہو سکتی ہے۔

مارکس اور لینن کو تو اب روسیوں نے بھی پڑھنا چھوڑ دیا ہے جبکہ ہمارے ہاں مذہبی رجعت پسندی کی طرح اشتراکی رجعت پسندی بھی باقی ہے۔ دراصل طبقاتی تفریق ایک ناگزیر فطری مظہر ہے اِس سے جان چھڑانے کی ہر تگ و دو انسانی معاشرت میں ناکام ہو چکی ہے۔ بارہا تجربات کرنے کے باجود بھی طبقاتی تفریق کسی نہ کسی صورت میں جاری رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آج سرمایہ کا تعاقب ہی انسانی معاشرت کا اٹل وتیرہ بن چکا۔

جدید دنیا میں فلاحی ریاست کی شاندار انتظامی تمثیل نے پوری دنیا کو ایک گلوبل ویلج بنا دیا ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نہ ہوں۔ آپ کو دنیا کی کوئی بھی فلاحی ریاست خوش آمدید کہے گی بغیر آپ سے آپ کی نظریاتی، سیاسی، نسلی اور مذہبی وابستگی پوچھے۔ دنیا لال لال لہرا کر ویلی ہو چکی مگر ہم اب نیند سے جاگے ہیں۔ کیا علمی و اخلاقی لحاظ سے مفلوج اس ریاست میں لال لال لہرانے سے تبدیلی آجائے گی؟۔ بچوں کے پڑھنے اور سیکھنے کے دن ہیں۔ معلوم نہیں ان معصوموں کو کن چکروں میں پھنسا رہا ہے یہ اَنا پرست ٹولہ۔

گزشتہ دنوں آزادی مارچ کی صورت میں مولانا فضل الرحمان کا رجعتی انقلاب بھی دیکھ لیا عوام نے۔ رجعیت اور اشتراکیت دونوں کے غبارے سے اب ہوا نکل چکی ہے۔ نظامِ خلافت، ریاستِ مدینہ اور لال لال انقلاب کی پھکیاں اب بکنے والی نہیں۔ ملک میں بارہا رجعیت اور اشتراکیت دونوں کے بڑے زبردست تجربات ہو چکے ہیں اور دونوں کا نتیجہ بالکل صفر رہا۔

ذوالفقار علی بھٹو اشتراکیت اور جنرل ضیاء الحق رجعیت کے زبردست داعی بن کر سامنے آئے مگر دونوں ہی اپنے نظریات سمیت عوام کی عدالت میں راندہِ درگاہ ہو گئے۔ عوام اب مزید کوئی خطرناک شغل برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ پاور گیم کا سلسلہ اب روکنا ہو گا، ہمیں۔ اب اپنی نئی نسل کو مزید مس گائیڈ ہونے سے بچانا ہو گا۔ نئی نسل کو علم و تحقیق اور اخلاقیات کی بنیاد پر دنیا کے سامنے اپنا بیانیہ رکھنا ہو گا۔ اختلاف اور مخالفت میں باہم فرق سکھانا ہو گا۔ تہذیب اور مزاحمت کے بیچ ادب کی باریک لائن سمجھانا ہو گی۔ تبھی کچھ تبدیلی ممکن ہو پائے گی علاوہ ازیں کوئی صورت نہیں۔

اِس وقت معیشت اور تعلیم ہمارے دو انتہائی بنیادی مسائل ہیں جن کو بہر صورت ارتقائی مراحل سے ہمیں حل کرنا ہے۔ محض نظریات اور متخیل انقلابات کے ہنگامہ خیز نتائج یہ قوم بارہا دیکھ چکی ہے۔ آنے والی تازہ روحوں کو مزید جھوٹ اور شرارت کی متعفن فضاء میں چھوڑ کر جانا قوم کے اصحابِ دانش و بینش کا بدترین اخلاقی جرم ہے۔ بہت ہو گیا۔

دنیا کی کوئی بھی قوم اُس وقت تک حقیقی معنوں میں ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ ماضی کی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کر کے حال میں درست فیصلے نہیں کرلیتی ۔ بالکل یہی بنیادی مسائل اس خطے کے ذہین لوگوں نے اس پوری مجتمع قوم کو سمجھائے تھے ۔ اقبال فرماتے ہیں ۔ ع

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہِ فردا
جس قوم کی تقدیر میں اِمروز نہیں ہے

ہم نے اُنہیں بھی نہیں بخشا جنہوں نے ہمیں جھنجھوڑ کر سیدھے راستے پر لانے کی کوشش تھی ۔ دنیا جہان کے جھوٹ اور بہتان تراش کر اُن کے متھے لگا دیئے ۔ اشتراکیت اور رجعیت دراصل دو انتہاؤں کا نام ہے اور دونوں قوتِ متخیلہ سے منسلک ہیں ۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ مذہب عوام کا استحصال کر کے اُنہیں مفلسی کی طرف دھکیل رہا ہے جبکہ رجعتی کہتے ہیں کہ دہریت ہی سارے فساد کی جڑ ہے ۔ گویا دونوں ہی ایک دوسرے کی زبردست مزاحمت پر کھڑے ہیں ۔

فی زمانہ سرمایہ دارانہ نظام میں بے پناہ اخلاقی جرائم کا اضافہ ہو چکا ہے ۔

جب سے Trickle-down economics کی تھیوری نے جنم لیا ہے غریب غریب تر اور امیر امیر ترین بنتا جا رہا ہے اور ہر نوعیت کے وسائل محض چند ہاتھوں میں سمٹتے جا رہے ہیں ۔ اس مکروہ پالیسی کو روکنے کے لئے ہمیں یونیورسل اکنامکس کی طرف آنا ہوگا ۔ جیسے ٹیکنالوجی نے آج دنیا کو ایک روحانی دیہات کی شکل دے دی ہے بالکل ایسے ہی اب اکنامکس کا قبلہ بھی ایک عالمگیر معاشی ارتقائی تحریک کے ذریعے درست کرنا ہوگا کیونکہ دنیا میں کوئی بھی علمی، اخلاقی، سماجی اور معاشی تبدیلی صرف ارتقائی مراحل سے ہی وقوع پذیر ہوسکتی ہے ۔ جو تبدیلیاں ہنگامہ خیز واقعات سے جنم لیتی ہیں اُن کی مدت بھی برائے نام ہوتی ہے پس یہی اہم نکتہ آج ہمیں اپنی نئی نسل کو سمجھانا ہوگا ۔

☆☆☆☆☆☆☆

ففتھ جنریشن وار فیئر

روزنامہ پاکستان 04دسمبر 2019

گزشتہ کچھ عرصے سے ملک کے عوامی، سیاسی اور عسکری حلقوں میں ایک بہت ہی دلچسپ انگریزی اصطلاح Fifth-generation warfare استعمال ہو رہی ہے جس کی دقیق تحقیق کے بعد مجھ جیسے عبقریت پسند طالبعلم کو کچھ سمجھ آسکا کہ آخر یہ شغل ہے کیا۔

ماضی بعید اور قریب کی مختلف جنگوں کے تاریخی پس منظر پر بات کی جائے تو وار فیئر ماڈل کا استعمال 1648ء میں معاہدہ امن ویسفالیہ کے بعد شروع ہوا۔ یہ معاہدہ اُس تیس سالہ جنگ کے بعد ہوا تھا جو اُس وقت کی جرمن سلطنت اور دوسرے ممالک کے درمیان مذہبی بنیاد پر شروع ہوئی تھی۔تاریخ میں لکھا گیا ہے کہ اس جنگ میں تقریباً 80 لاکھ لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ یہ جنگ کیتھولک عیسائیوں اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے درمیان مذہبی منافرت کی بنیاد پر شروع ہوئی تھی۔

جنگوں کے ماڈل یعنی وار فیئر ماڈل کی اصطلاح اُس معاہدے کے بعد سے شروع ہوئی اور اس تیس سالہ جنگی دور کو "فرسٹ جنریشن وار فیئر" کہا گیا۔اُس جنگ اور اِس کے خاتمے کے بعد دنیا بھر میں آج کل کی رائج خودمختار ریاستوں کے نظام کا آغاز ہوا۔ہنگری کی نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی کی ایک ریسرچ کے مطابق فرسٹ جنریشن وار فیئر جنگوں کی وہ شکل ہے جس میں بڑی سلطنتیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ لڑ رہی ہوتی ہیں۔ان جنگوں کو "فری انڈسٹریل وارز" بھی کہا گیا ہے۔اس جنریشن میں انفنٹری یا فوج کے دستے ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں اور انسانی قوت کو کامیابی کا منبع سمجھا جاتا ہے یعنی جتنی بڑی فوج ہوگی اتنی ہی زیادہ کامیابی ہوگی۔ یہ پہلی جنریشن سترویں صدی کے وسط سے لے کر اُنیسویں صدی کے آخر تک چلتی رہی اور انہی اصولوں پر دنیا بھر میں مختلف جنگیں لڑی گئیں۔

اَمریکی پروفیسر رابرٹ جے بنکر کی لکھی ہوئی ایک تحقیق کے مطابق سیکنڈ جنریشن وار فیئر ٹیکنالوجی کی جنگیں تھیں جن میں فوج کے دستوں کی جگہ طاقتور ہتھیاروں نے لے لی اور جنگوں میں بڑا اسلحہ جیسا کہ مشین گن، میگزین رائفلز اور توپوں نے لے لی۔ پروفیسر رابرٹ نے ان جنگوں کو ٹیکنالوجی کی جنگیں قرار دیا۔

جنگوں کا یہ دور اُنیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا اور ابھی تک جنگیں انہی اصولوں پر لڑی جاتی ہیں۔ پروفیسر رابرٹ کے اسی تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ تھرڈ جنریشن وارفیئر میں جنگیں آئیڈیاز یعنی خیالات کی بنیاد پر شروع ہوگئیں۔ پروفیسر رابرٹ کے مطابق اس دور میں جنگی چالوں کا استعمال عام ہوا۔ ان کے مطابق ان جنگوں میں مختلف چالوں سے دشمن قوتوں کی جنگی طاقت کو کمزور کیا جاتا ہے یا ایسی جگہوں سے حملہ کیا جاتا ہے جس میں مخالف فریق کو پتہ نہیں چلتا کہ کہاں سے حملہ ہوا ہے۔

ایک اور تحقیقی مقالے میں تھرڈ جنریشن وارفیئر کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ اس جنریشن کی جنگوں میں ائیر کرافٹس یعنی جنگی طیاروں کا استعمال بھی شروع ہوگیا۔ جدید دور کی جنگوں کو فورتھ جنریشن وارفیئر کا نام دیا گیا ہے۔ مختلف تحقیقی مقالوں میں لکھا گیا ہے کہ فورتھ جنریشن وارفیئر کی اصطلاح 1989ء کے بعد سے شروع ہوئی۔ اس جنریشن کی جنگوں میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کو شامل کیا گیا ہے۔ رابرٹ بنکر نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ آج کل فوج ایک آبادی والی جگہ پر حملہ کرتی ہے اور اس چال کو فورتھ جنریشن وارفیئر کا ایک اہم عنصر گردانا جاتا ہے۔ لیکن دیگر مختلف تحقیقی مقالوں میں جنگوں کے اس ماڈل پر بہت تنقید بھی سامنے آئی ہے اور بعض افراد جنگوں کے اس ماڈل پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ پیپرز پڑھ کر یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ ماڈل ابھی ارتقائی دور سے گزر رہا ہے اور ابھی تک اس کو درست طور پر سکالرز کے سامنے نہیں رکھا گیا۔ تاہم دنیا بھر میں بعض ادارے بالخصوص ملٹری اُمور سے وابستہ ادارے اس قسم کی مختلف اصطلاحات استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

وارفیئرز کے مذکورہ بالا مکمل پس منظر کے بعد یہ نکتہ کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ مقتدرہ کی ایسی شاطریت ہر زمانے اور ہر ریاست کے عوام اور جمہوری اداروں کا استحصال کرنے کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے۔ وارفیئر سیریز کی پروپیگیشن صرف اُن ممالک میں اُٹھتی رہی ہے جن میں عوامی اور جمہوری بالادستی کو سبوتاژ کرنے کی حکمتِ عملی پر کام کیا جارہا ہو۔ پاکستان میں بھی گزشتہ چند برسوں سے ففتھ جنریشن وار کی اصطلاح سننے میں آرہی ہے جس کا استعمال زیادہ تر سیاسی جماعت کے رہنما کر رہے ہیں تاکہ مقتدرہ کی مبہم اور نامعلوم مراعات کا تحفظ کیا جاسکے۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں کا مُلّا اس اصطلاح کو تہذیبی تصادم سے تعبیر کر رہا ہے تاکہ وہ اپنے مفاد کی جنگ اس جدید مبہم بیانیہ کی بنیاد پر لڑ سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک کسی ریاست کے ملکی دفاع کو مصنوعی طور پر مخدوش ثابت نہ کیا جائے تب تک اِس طرح کی مبہم اور غیر معروف اصطلاحات سے عوام کو بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا۔

ویسے بھی یہاں یہ رواج کافی پرانا ہے کہ مغرب سے درآمدہ کوئی بھی شعار، قانون یا اصطلاح ہمارے ہاں مستند سمجھی جاتی ہے تا آنکہ اس کا مکمل علمی یا منطقی پوسٹ مارٹم کر کے عوام کو حقائق سے آگاہ نہ کر دیا جائے۔موجودہ حکومت اپنی تمام تر انتظامی نااہلی چھپانے کے لئے اس قسم کی مبہم اور غیر ضروری اصطلاحات کا سہارا لے کر اپنی کوتاہیوں کو آئینی جواز فراہم کرنے کی کوشش میں مبتلا ہے۔چونکہ عوام کی اکثریت ناخواندہ ہے اور جو کچھ پڑھے لکھے ہیں ان کی تعلیم بھی بجز حصولِ روزگار کچھ بھی نہیں تو ایسی صورت حال میں انتہائی دقیق اور شاطرانہ ریاستی پالیسیوں کو کون سمجھے؟۔

ملک وقوم کی خدمت علمی و اخلاقی بنیاد پر انجام دینے کی نفسیات پنپنے میں ابھی بہت وقت لگے لگا۔ریاست، سیاست، جمہوریت اور آئینی ذمہ داری فی نفسہ کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک کہ ایک عام آدمی زیورِ تعلیم سے کماحقہ آراستہ نہیں ہو جاتا۔کالجوں اور یونیورسٹیوں کی دلکش عمارتیں بنانے سے کوالٹی آف ایجوکیشن کبھی نہیں پنپ سکتی۔اس کیلئے ہمیں اصلی اُستاد اور تہذیب یافتہ دانشور پیدا کرنا ہوں گے۔ہم نے ابتداء ہی سے اپنے عظیم اور حکیم لوگوں کی ناقدری کی ہے۔ چار کتابیں پڑھ کر ہماری قوم ابتداء ہی سے خود کو افلاطون اور فیثا غورث سمجھنے لگی ہے۔خوبصورت تعلیمی عمارتیں بنانے سے سینے علم وتہذیب سے روشن نہیں ہو جاتے۔اقبال فرماتے ہیں۔ع

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

☆☆☆☆☆☆☆

سول سپریمیسی کا خواب

روزنامہ پاکستان 28 نومبر 2019

پاکستانی سیاست پراب بات کرنا بھی دلِ ناتواں پر بوجھ ڈالنے کے مترادف ہےلیکن پھر بھی کچھ تلخ حقائق ایسے ہیں جواِن دنوں کروٹ کروٹ بے چین کئے رکھتے ہیں ۔ملک کے دیگر دانشوروں اورصحافیوں کی طرح حضرت مولانا فضل الرحمن سے ہم بھی کچھ موہوم ہی اُمیدیں لگا بیٹھے تھے مگر یہ تو کچھ یوں ہوگیا کہ جس کی سمجھ شاید خود مولانا صاحب کو بھی نہیں آئی ۔حضرت مولانا نےتو میڈیا سمیت سول سپریمیسی کی پوری تحریک کوعوام کے ہاں راندہِ درگاہ کر دیا۔

پھر اِس پرمستزادیہ کہ چودھری پرویز الٰہی فرمارہے ہیں کہ ہم نے مولانا صاحب کو خالی ہاتھ نہیں بھیجا جبکہ مولانا صاحب بضد ہیں کہ ہم سیاسی طور پر ٹھیک وہیں کھڑے ہیں جہاں ہم پہلے دن سے موجود تھے ۔گویا مولانا صاحب یکسر مسترد کر رہے ہیں کہ ہمارے اور حکومت کے بیچ کوئی ساز باز ہوئی ہے ۔بہرحال مولانا صاحب کا یخ گزیدہ لہجہ بتا رہا ہے کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے ۔

خیرعوامی اورجمہوری بالادستی کی بنیاد پر قائم ہونے والا آزادی مارچ بھی کسی واضح تبدیلی کے بغیر بخیر و عافیت ایک مبہم مایوسی پر منتج ہوا۔عوامی بالا دستی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے مولانا صاحب نےبھی عوام کو بالآخر دیگر سیاسی پنڈتوں کی طرح سڑکوں پر تنہا چھوڑ کراپنی راہ لے لی ۔بخدا ایک لمحہ کے لئے تو ہمیں بھی محسوس ہوا تھا کہ شاید مولانا صاحب کے وجود میں امام الانقلاب مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی روح سرایت کر چکی مگر حسبِ روایت یہ بھی ایک دیوانے کا خواب ہی نکلا۔

آزادی مارچ کے مبہم اور اچانک اختتام کے بعد اب میاں نواز شریف کا مسئلہ بھی حل ہوگیا اور میاں نواز شریف منگل کی صبح ائر ایمبولینس کے ذریعے عازم سفر ہوئے اوراسی شام چھ بجے وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ چکے ہوں گے ۔حکومت نے تو اپنا پورا زور لگایا کہ کسی نہ کسی طریقے سے میاں نواز شریف کو گھیرلیں مگر کہانی سات ارب سے مبلغ پچاس روپے کے اسٹامپ پیپر پر تمام ہوئی ۔یوں یہ اُونٹ بھی اپنی کروٹ بیٹھ گیا۔حکومت کی یہ غیر معمولی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ اِس معاملے میں بالکل منطقی رہی اور رہنا بھی چاہیئے تھا کہ عدالتِ عالیہ کا فیصلہ سر آنکھوں پر ہونا چاہیئے ۔مذکورہ بالا تمام مسائل تو خیر کسی نہ کسی صورت حل ہونے ہی والے تھے ۔

اصل مسئلہ تو عوامی بالادستی کا ہے جو گزشتہ تہتر سالوں میں حل نہ ہو سکا۔ آخر کوئی تو ایسا سیاسی رہنما ہو جسے صرف عوام کا درد محسوس ہو۔ جس کی ساری صلاحیتیں اور خدمات صرف سول سپر یمیسی کے لئے وقف ہوں مگر ایسا کب ہو گا اور آخر کب تک عوام کبھی اشتراکیت اور کبھی ریاستِ مدینہ کے بیانیہ پر یقین کر کے بیوقوف بنتے رہیں گے۔ معلوم نہیں۔

اِس سے قبل تو ایک عمومی اعتراض یہ تھا کہ ملک میں قریباً تمام بڑی سیاسی جماعتیں جمہوری روش کی بجائے پاپائیت کی طرف چل پڑی ہیں۔ اب تو پاپائیت والا سین بھی نہیں رہا۔ تحریکِ انصاف جو کسی زمانے میں ایک خالص عوامی سیاسی بالادستی کی دعویدار ہوا کرتی تھی، آج اپنے اندر وہی سیاسی سورما لئے ہوئے ہے جن کی حیثیت صرف ایک خود غرض اور مفاد پرست مافیا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سیاست جیسی عظیم المرتبت خدمت کو جس طرح ہمارے ہاں پچھلے تہتر سالوں میں رسوا کیا گیا، اس کی نظیر تو شاید ہی کسی اور خطے میں موجود ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی قحط الرجال ہی چل رہا ہے۔ سیاستدان ہونا تو خیر ایک اضافی خوبی اور صلاحیت ہے یہاں تو ایک عمدہ انسان کا ملنا بھی قریباً ناممکن ہے۔ آپ جس کی طرف منہ کریں گے وہی جلد یا بدیر آپ کو ڈس لے گا۔ پھر چاہے وہ سیاست میں ہو یا کسی بھی دیگر شعبہ میں۔ سول سپر یمیسی تو اب اس ملک میں ایک خواب بن کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ حقیقی جمہوریت بغیر سول سپر یمیسی کے ممکن ہی نہیں کیونکہ جمہوریت دراصل اقتدار براہِ راست عوام ہی کے پاس ہونے کا نام ہے۔

تحریکِ انصاف نے جو سنہرے خواب دِکھا کر تبدیلی کا وعدہ کیا تھا وہ وعدہ اپنی کسی بھی صورت میں تا حال وفا نہ ہو سکا۔ بلکہ اب تو تحریکِ انصاف خود ٹھیک اُسی مقام پر آ کھڑی ہوئی ہے جہاں کبھی یہ جماعت دیگر سیاسی جماعتوں پر تنقید کے سبب مشہور و معروف تھی۔ رہی بات عمران خان کی اپنی ذات کی تو وہ بھی اب سطحی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ابھی تک تو کوئی خاطر خواہ تعمیری منصوبہ دیکھنے میں نہیں آیا بلکہ گزشتہ شب ایک نجی ٹی وی چینل پر میں عمران خان کی ایک تقریر دیکھ رہا تھا جس میں وہ بلاول بھٹو زرداری کی بہت عمدہ نقالی کر رہے تھے اور سامنے بیٹھے کارکن کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ مطلب وہ سیاسی کردار کشی، وہ سیاسی بدتہذیبی اور عناد جو کبھی دیگر سیاسی جماعتوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے آج تحریکِ انصاف اس کی سرخیل بن چکی ہے۔ عوام تو اس سے قبل بھی رُل رہی تھی اور آج بھی رُل ہی رہی ہے بلکہ آج تو عوام کا رُلنا ریکارڈ سطح پر پہنچ چکا ہے۔ نامعلوم یہ خود غرض اور مفاد پرست سیاسی رہنما کب تک افلاس کی ماری اور تعلیم و تہذیب سے عاری قوم کو بیوقوف بناتے رہیں گے۔

پاور گیم کے اس چکر نے جس قدر ذلیل ایک عام آدمی کو کیا بعید از بیان ہے۔ عمران خان جو ایک عام آدمی کیلئے کسی وقت میں خوشگوار ہوا کا جھونکا ہوا کرتے، آج ٹھیک اُسی پوزیشن پر آ گئے ہیں جس پر کبھی وہ لوگ تھے جنہیں آج حکومتی حلقے مجرم اور چور ڈاکو کہہ رہے ہیں۔ وہ کون سے خالص عوامی فلاحی منصوبے ہیں جن کا براہِ راست فائدہ عوام کو ہو رہا ہے؟۔ سرکاری ملازمت جو کسی بھی ریاست کے شہریوں کا ایک بنیادی حق ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی خدمت کر سکیں، آج بالکل ناپید ہو چکی ہے بلکہ اب تو یہ بیانیہ بھی عام ہو چکا ہے کہ نوکریاں دینا ریاست کا کام ہی نہیں۔ رہی بات مہنگائی پر کنٹرول اور عام آدمی کو اشیائے خورد ونوش مناسب قیمت پر فراہم کرنا تو اس میں تبدیلی کا اثر وہ لوگ بخوبی جانتے ہیں جو صبح مارکیٹ میں آلو تر کاری لینے جاتے ہیں۔

عورت اور خدمت

روزنامہ پاکستان 29 اکتوبر 2019

مرد اور عورت کے بیچ مثالی تعلق تو خیر اب قصہ پارینہ بن چکا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مرد کو قدرت نے جہاں سکتِ جہد ومشقّت دی ہے تو وہاں عورت کو مودّت و خدمت کے جذبات سے سرشار کر دیا ہے گو کہ قدرت کی یہ دَین آج عورت کو پسند نہیں اور اِس ناقابل تردید حقیقت کو آج کی عورت کسی نہ کسی صورت میں جھٹلانے اور دبانے کی کوشش میں مصروف ہے۔مرد اور عورت دونوں کے فطری حقوق یکساں ضرور ہیں مگر ان دونوں کی ذمہ داریوں میں جوہری فرق ہے اور یہی فرق مرد اور عورت کے مابین توازن قائم رکھے ہوئے ہے۔

عورت جس قدر بھی خوبصورت اور ذہین ہو جب تک وہ مودّت و خدمت کے جذبات کو بروئے کار نہیں لاتی تب تک وہ ایک ادھوری عورت ہی رہتی ہے۔اسی ادھورے پن کو آج عورت مادی اشیاء اور غیر ضروری خواہشات کے بل بوتے پر مکمل کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے حالانکہ عورت چاہے تو ایک پل میں پرُسکون اور مطمئن ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس مرد اتنی جلدی مطمئن نہیں ہوتا کیونکہ عورت کی کیمسٹری بہت نفیس اور خالص ہے وہ اپنے اندر بھاری پن زیادہ دیر تک جذب نہیں کر سکتی۔آج بھلے عورت کی ترجیحات بدل چکی ہوں۔

عورت صنعت وحرفت اور سائنس وتکنیک جیسے مشقّت آمیز شعبوں میں خود کو مصروف کر چکی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ عورت کا مابعد الطبعی جوہر مرد سے بے لوث مودّت اور اُس کی مسلسل خدمت ہی ہے۔ممکن ہے کوئی عورت آٹھ گھنٹے کمپیوٹر پر کام کرنے میں سکون محسوس کرتی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ عورت کی جسمانی اور روحانی ساخت ایسی نہیں کہ وہ اپنے جذبات کو مرد ذات کے دائرے سے باہر نکال کر رکھ دے۔

ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک ہر زمانے اور ہر تہذیب وتمدن میں مرد اور عورت کا غیر مشروط ساتھ رہا ہے۔اسلام اس ساتھ کو نکاح یعنی سماجی معاہدے کا نام دیتا ہے۔کہیں یہ تعلق میرج یا کامن لاء میرج تو کہیں وِواہ جیسی اصطلاحات سے موجود ہے مگر مرد اور عورت کا یہ تعلق ہمیشہ ہر معاشرے میں موجود رہا ہے۔کسی زمانے میں عورت جس گھر میں بیاہ کرلائی جاتی تو پورا گھر اُس کی خدمت سے مستفید ہوتا۔

اپنے مرد کے علاوہ وہ اپنے مرد کے پورے خاندان کو سنبھال لیتی اور اسے اس سب میں سکھ بھی ملتا۔لیکن آج ایسا نہیں ہے اور نہ ہی اب ایسا ہوسکتا ہے کیونکہ آج کی عورت بہت ذہین ہو چکی ہے۔مرد کا خاندان تو درکنار اپنے مرد کی خدمت کو وہ بوجھ سمجھنے لگی ہے اور بینر اُٹھا کر ایک ایسے شخص سے مخاطب ہے جو اُس کی مودّت و خدمت کا غیر مشروط حق دار ہے کہ" کھانا خود گرم کرلو"۔

مَیں دقیانوسیت کا حامی نہیں۔عورت کو تعلیم و تربیت اور اپنی مرضی سے جینے کا پورا پورا حق حاصل ہے مگر سوال یہ ہے کہ عورت ہے کیا اور اُس کی مابعدالطبیعیات مرد کی نسبت ہے کیسی؟۔اس سوال پر شاید آج تک خود عورت نے بھی غور نہیں کیا۔تعلیم بلاشبہ ایک روشنی ہے۔تربیت ایک بہترین زندگی کی ضامن ہے فطرتی آزادی بھی بنیادی معنی رکھتی ہے مگر ان سب کا مطلب صرف ایک مطمئن زندگی کے علاوہ کیا اور کچھ بھی ہوسکتا ہے؟۔ہر گز نہیں۔مرد ہو یا عورت، انسانی زندگی کا واحد مقصد ہی تسکین اور اطمینان ہے۔جب انسان اپنی من مانی کرنے کے باوجود بھی پُرسکون نہ رہ سکے تو پھر انسان کو یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ وہ زندگی کے کس اسلوب کو پیچھے چھوڑ آیا ہے جس کے سبب وہ بے چین اور دکھی ہے۔ عورت کا میٹا فزیکل سٹرکچر کچھ ایسا ہے کہ اُس میں مودّت نمو پذیر ہوتی ہے۔مودّت دراصل قرآنی اصطلاح ہے جس کے معنیٰ ایک خاص قسم کا اطمینان ہے جو صرف ایک عورت مرد کی قربت میں آکر ہی محسوس کرتی ہے۔

قرآن کریم کی سورہ روم میں ہے" جَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّ رَحۡمَةً "۔یعنی ہم نے تم دونوں کو ایک دوسرے کے لئے مودّت و رحمت بنایا۔آیت کا یہ جز بہت معنیٰ خیز ہے۔اصطلاح مودّت جہاں عورت کے لئے خاص ہے تو وہاں اصطلاح رحمت مرد کے لئے خاص کر دی گئی۔رحمت بھی ایک عظیم الشان جذبہ ہے۔عورت چاہے تو کچھ بھی کر سکتی ہے۔ جہاز اُڑا سکتی ہے۔بارڈر پر جاسکتی ہے۔آفس میں بیٹھ سکتی ہے۔بچوں کو پڑھا سکتی ہے۔انڈسٹری چلا سکتی ہے وغیرہ وغیرہ،مگر عورت کے فطرتی میلان کا مطالعہ کیا جائے تو عورت سراپا محبت و خدمت ہے۔

عورت کا وجود انسان کی جنم بھومی ہے تبھی وہ اضافی ذہنی صلاحیتوں کی بجائے محبت،شفقت،عقیدت اور خدمت جیسے لازوال جذبات کا نفیس مرکب ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جب سے جدید طبی سہولتوں کا رواج عام ہوا تو مریض کی تیمار داری و خدمت کے لئے مرد کی بجائے عورت ہی کو منتخب کیا گیا اور یہ اُسی فطری میلان کے سبب کیا گیا تا کہ عورت اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مریض کی بہترین خدمت کر سکے۔

یہ نہیں کہ مرد خدمت کر کے تسکین محسوس نہیں کرتا مگر جو اطمینان اور راحت عورت کو بعد از خدمت نصیب ہوتی ہے مرد قطعی طور پر اُس احساس سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ پس خدمت نسوانیت کا جزو لاینفک ہے۔ یہ انتہائی اہم نکتہ آج کی عورت کو سمجھنے کی ضرورت ہے نہیں تو ایک پرُسکون گھر کا تصور ہی ختم ہو جائے گا بلکہ جدید دنیا میں تو اب ایک پرُسکون گھر کا تصور قریباً ختم ہی ہو چکا ہے۔ عالی شان مکانات اور عمارتیں تو موجود ہیں مگر اُن شیشے کے سائبانوں میں محبت، خدمت اور اطاعت جیسی والہانہ اور غیر مشروط اقدار ناپید ہو چکی ہیں۔ اگر روایتی طرزِ ازدواج آج کی عورت کے لئے قابل قبول نہیں رہا تو پھر یہ بھی عورت زاد کی ایک انتہائی اہم ذمہ داری ہے کہ وہ روایتی طرزِ ازدواج کے مقابلے میں اُس سے کہیں بہتر ازدواجی نظم دنیا کو دے تا کہ مرد ایک عورت کی مخصوص فطرتی صفتِ خدمت سے محروم نہ ہو۔

بٹر فلائی ایفیکٹ

روزنامہ پاکستان 25 اکتوبر 2019

ستمبر 1918ء کو برطانیہ اور جرمنی کے درمیان جنگ جاری تھی کہ دورانِ جنگ برطانوی فوجی ہنری ٹینڈے کی گولیوں کی زد میں ایک جرمن نوجوان فوجی آ گیا۔ ہنری چاہتا تو اُس زخمی نوجوان کو بڑی آسانی کے ساتھ مار سکتا تھا مگر ہنری نے اُس نوجوان جرمن فوجی کو جانے دیا۔ بعد میں اُس زخمی جرمن فوجی کو دنیا نے ایڈولف ہٹلر کے نام سے جانا جس نے قریباً ساٹھ لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر دنیا کی تاریخ میں ہولوکاسٹ کی بنیاد رکھ دی۔

نظریہ شواش جسے انگریزی اصطلاح میں Butterfly Effect اور قیاس تھیوری بھی کہا جاتا ہے، دراصل انتہائی معمولی اور غیر اہم وقوعہ ہے جس پر ابتدائی مراحل میں توجہ نہ دینے سے وہ زبردست انتشار پھیل سکتا ہے جس کے متعلق انسان سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنی بڑی تبدیلی کے پیچھے اِس قدر غیر اہم اور معمولی اثر تھا۔ بٹر فلائی ایفیکٹ یا نظریہ شواش کی جانب سب سے پہلے ایک اَمریکی ریاضی دان ایڈورڈ لورینز نے توجہ دلائی۔ لورینز نے اپنی اِس تھیوری کو سمجھانے کے لئے تتلی کے پروں کی حرکت سے انتہائی معمولی سطح پر ہونے والی فضائی تبدیلی کی جانب اشارہ کیا کہ یہ معمولی فضائی تبدیلی بعد میں کہیں ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ بٹر فلائی ایفیکٹ یا نظریہ شواش محض ریاضی یا طبیعیات کا مسئلہ نہیں بلکہ اس کا ایک گہرا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے بھی ہے۔ یعنی زندگی میں کئے گئے ہمارے وہ انتہائی معمولی فیصلے جن پر ہم بالکل بھی توجہ نہیں دیتے، وہی فیصلے کل کو ہمارے سامنے ایک بڑی بلا بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں ہمیشہ سے معمولی فیصلے ہی ہمیں آگے لے کر جاتے ہیں۔ وہ فیصلے جن پر ہم گھنٹوں غور کرتے ہیں اُن کا اثر عموماً بہت معمولی ہوتا ہے۔ نظریہ شواش سے آگہی کا سادہ مطلب یہ ہے کہ ہم زندگی کے کسی بھی معاملے میں غفلت کا مظاہرہ نہ کریں اور اپنے آس پاس بالخصوص اپنے کئے گئے ہر ایک عمل پر گہرائی سے غور کریں۔ اگر ہم اپنی زندگی کو تھوڑا اسا ریورس کر کے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سے انتہائی معمولی تخیلات و افعال تھے جن کے مثبت یا منفی اثرات سے آج ہم گزر رہے ہیں۔

اس سیارے پر انسان کی ہر سوچ وعمل اور اِس کائنات میں ہونے والا کوئی انتہائی معمولی سا واقعہ بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور یہ سب کچھ باہم مربوط ہے ۔یعنی انسان اور کائنات کا آپس میں زبردست تعلق ہے ۔گوتم بدھ نے کہا تھا کہ سوچ کے متعلق ہمیشہ محتاط رہو کیونکہ آپ کی سوچ جلد یا بدیر ایک واقعہ بن کر آپ کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور نہ صرف آپ اپنی سوچ سے متاثر ہوں گے بلکہ لاکھوں لوگ بھی اس کی زد میں آسکتے ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ جب کارل مارکس نے کہا تھا کہ سرمایہ دار سے اپنا حق زبردستی چھین لو تو اس کیلئے اشتراکیوں نے باقاعدہ اسلحہ تیار کیا تاکہ سرمایہ دار سے لڑا جاسکے، بعد میں وہی اسلحہ غریب طبقے کے خلاف استعمال ہوا اور لاکھوں بے بس لقمہِ اجل بن گئے ۔پنسلین تو فلیمنگ الیگزینڈر نے بنائی تھی مگر آج دنیا میں کوئی بھی ایسی جراثیم کش دوا نہیں ہے جس میں پنسلین کا استعمال نہ ہوتا ہو ۔ایک انسان کی اپنے وقت میں انتہائی معمولی سی کوشش بعد میں پوری کائنات پر اثر انداز ہوسکتی ہے اور ایسا ہوتا ہے یہ کوئی سائنس فکشن نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے ۔

اِس کائنات اور انسان کا ربط بہت گہرا ہے اور ہر انسان کا کسی دوسرے انسان سے تعلق بھی انتہائی گہری نوعیت کا ہے ۔رسالت مآب ﷺ نے ایک چھوٹے سے دیہات (یثرب) میں چند مساکین کے ساتھ مل کر تحریکِ اسلام کا آغاز کیا تھا ۔آج دنیا بھر میں ایک اَرب اَسّی کروڑ لوگ اس تحریک کے ماننے والے ہیں ۔ یہاں کچھ بھی معمولی نہیں ہے ۔آپ کا ہر عمل حتیٰ کہ آپ کی ہر ایک سوچ پوری دنیا کو ہلا کر رکھ سکتی ہے اور یہ ایک ایسی دانش ہے کہ اگر انسان پوری توجہ کے ساتھ اس کو اپنے پلے باندھ لے تو اس سے پوری انسانیت کا بھلا ہوسکتا ہے ۔مگر ہم انسان یہی سمجھتے آئے ہیں کہ ہماری سوچ صرف ہماری ہے اور ہمارا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔انسان جس قدر بھی عزلت نشین ہو جائے، اس کی سوچ اور عمل یہ کائنات اپنے اندر محفوظ کر لیتی ہے اور پھر وقت آنے پر اُس سوچ یا عمل کو بروئے کار لاتی ہے ۔پس اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ہمارا پورا معاشرہ بٹر فلائی ایفیکٹ کی بنیاد پر قائم ہے ۔

انسان تو بہر صورت مر جاتا ہے، مگر اُس کی سوچ اور اُس کا انجام دیا گیا عمل صدیوں تک جاری رہتا ہے ۔اگر ہم غور کریں تو آج کروڑوں انسانوں کا طرزِ عمل ہزار دو ہزار سال قبل کی سوچ اور نظریات کا جدید ورژن ہے ۔ہم جو کچھ بھی آج سوچ رہے ہیں یہی کچھ صدیوں پہلے سوچا جا چکا ہے ۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ہزاروں سال قبل یہی کچھ کیا جا چکا ہے تبھی تو آج ہم ایسا سوچتے ہیں اور تبھی تو آج ہم ایسا کرتے ہیں ۔

آج دنیا میں ہزاروں رنگ کے قمقمے روشن ہیں مگر یہ سب تبھی ممکن ہوا جب ایک مفلوک الحال ماہرِ طبیعیات تھامس ایڈیسن نے ایک انتہائی معمولی سی برقی قندیل ایجاد کرتے ہوئے اپنی آنکھیں گنوا دیں۔ سو آج ہم جس قدر بھی اعلیٰ ترین بلب ایجاد کرلیں اِس جدید ترین ایجاد کو تھامس ایڈیسن کی کوشش سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چمڑے پر درخت کی ہری ٹہنیوں سے لکھے گئے اشارات آج آئی پیڈ پر ٹائپ کئے گئے حروف سے اپنی ہیئت میں تو مختلف ہو سکتے ہیں مگر چمڑے پر ہری ٹہنی سے اشارات کو آپس میں جوڑنے والے کی سوچ سے اس ایجاد کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل یہی معاملہ پوری کائنات کا ہے۔ اِس کائنات میں ایک انتہائی معمولی سی فضائی اور خلائی تبدیلی انسانی سوچ اور عمل کا زاویہ متعین کر دیتی ہے اور پھر یہی تبدیلی ارتقائی مراحل طے کر کے دنیا کی ہیئتِ مجموعی بدل دیتی ہے۔

جاں بلب فنونِ لطیفہ

روزنامہ پاکستان 20 اکتوبر 2019

کیا آج آپ تصور کرسکتے ہیں کہ مسجد کے عین مقابل پانچ سو لوگوں کا جمگھٹا جمع ہو اور اِنہی میں سے ایک طائفہ ڈھول بجا رہا ہو اور دوسرا شہنائی، ساتھ میں اَولگی یعنی خاندانی نائی پیتل کے کٹوروں میں صندل کا تیل لئے دولہا اور اس کے اقرباء کے سروں پر لگا رہے ہوں۔ یہ عصر کا وقت ہو اور شہنائی نواز اُونچے سروں میں راگ سندھی بھیرویں کے لہرے پھونک رہے ہوں۔نئی پود کیلئے تو اب یہ ایک قصہ یا کہانی ہی ہوگی مگر آج سے قریباً بیس پچیس سال پہلے ہمارے ہاں یعنی راجستھانی سرائیکیوں کی شادی بیاہ پر ایسا ہی ہوتا تھا۔

دراصل ہمارے ساتھ سب سے بڑی زیادتی اُس وقت ہوئی جب اَمریکہ کو سپر پاور بننے کا خبط چڑھا اور پھر اس نے روس کے مارکسسٹ جنونیوں کو سبق سکھانے کیلئے افغانستان اور پاکستان کو اپنی پراکسی وار میں دھکیل دیا۔روسی مارکسسٹ نے کلاشنکوف اس لئے بنائی تاکہ دنیا میں موجود جابر مقتدر اور خونخوار سرمایہ دار سے دولت اور وسائل چھین کر غریبوں کو لوٹادے۔مگر شاطر دماغ اَمریکیوں نے وہی کلاشنکوف روسیوں سے چھین کر افغان اور پاکستانی عوام کو جہادِ عظیم کے بیانئے کے ساتھ تھمادی اور پھر ہوا یوں کہ اَمریکہ تو بن بیٹھا سپر پاور اور شامت آئی ہماری۔

کلاشنکوف کلچر نے ایک ایسی ذہنیت پیدا کردی جو بقولِ اقبال اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کر بیٹھی۔اقبال کا یہ شعر تو خیر مغرب کے تہذیبی انتشار کے متعلق تھا مگر صادق ان کی اپنی قوم پر ہی آچکا۔ہمارے ہاں ڈرامہ،فلم،موسیقی، مصوّری اور صحت مند اَدبی سرگرمیاں اب بس برائے نام ہی رہ گئی ہیں۔جو کچھ بچا ہے وہ یا تو مذہبی بیانئے کے تڑکے کے ساتھ چل رہا ہے یا پھر زبردست گلیمر کا مسالہ لگا کر بیچا جارہا ہے۔نہ تو اب محمود علی، سبحانی بایونس، محبوب عالم،لطیف کپاڈیہ، یوسف کمال المعروف شکیل، سلیم ناصر، قاضی واجد، کمال احمد رضوی، فاروق ضمیر، رفیع خاور، جمشید انصاری، ارشد محمود اور معین اختر جیسے کہنہ مشق اداکار رہے اور نہ ہی بیگم خورشید مرزا، عذرا شیروانی، ذہین طاہرہ، بدر خلیل،نسرین قریشی، طاہرہ سلیم، دردانہ بٹ، عظمیٰ گیلانی، تمنا بیگم، طاہرہ واسطی اور شہناز شیخ جیسی زیرک اداکارائیں جو کبھی آنے والی نسلوں کے لئے رول ماڈل ہوا کرتیں۔

پاکستان کی ڈرامہ انڈسٹری ستّر اور اَسّی کی دہائی میں ایشیاء کی سب سے بہترین ڈرامہ انڈسٹری رہی ہے۔ ہمارے ڈرامہ کے کردار حقیقی اور معاشرے کے عین عکاس ہوا کرتے۔ اُس زمانے میں پاکستان ٹیلی ویژن ایک تربیت گاہ تھی جہاں ملک کے بہترین دماغ اپنے اپنے فنی جوہر دکھاتے نظر آتے۔ اُس زمانے میں ڈرامہ لکھنے والے بھی شوکت صدیقی، محمود عالی، فاطمہ ثریا بجیا، بانو قدسیہ، حسینہ معین اور اشفاق احمد جیسے باکمال لکھاری ہوتے اور اداکاری کے جوہر دکھانے والے بھی باکمال۔ ڈرامہ سیریل پرچھائیاں میں بحیثیت خالہ ساحرہ کاظمی سے بیگم خورشید مرزا کے مکالمات آج بھی اپنے اندر گہری دانائی اور اَن گنت اسباقِ زیست لئے ہوئے ہیں۔

اِسی طرح ہماری فلمی موسیقی ماسٹر غلام حیدر، رشید عطرے، عنایت حسین بھٹی، ایم اشرف، خواجہ خورشید انور، بابا جی اے چشتی اور حافظ نثار بزمی جیسے زیرک اور کہنہ مشق موسیقاروں کے طفیل آج بھی کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ جو بھی موسیقی کی شدھ بدھ رکھتا ہے وہ ہماری فلمی موسیقی سے خوب واقف ہے۔ اچھی موسیقی تو اب چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ طوفانِ بدتمیزی اور ہلڑ بازی نے آج موسیقی کی جگہ لے لی۔ مصوّری و نقّاشی میں سید صادقین نقوی، عبدالرحمان چغتائی، جمیل نقش اور احمد پرویز جیسے عظیم فنکار ہمارے شاندار ماضی کے دمکتے ستارے رہے ہیں۔ خطّاطی میں رشید بٹ، سید نفیس الحسینی شاہ اور خورشید گوہر قلم جیسے زیرک خطّاط بھی ہمارا طرہِ امتیاز رہے ہیں۔

شاعری کی تو بات ہی الگ رہی ہے ہمارے ہاں۔ احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، ناصر کاظمی، منیر نیازی، عبدالحمید عدم، محسن نقوی، احمد فراز، پروین شاکر، سارہ شگفتہ اور ادا جعفری جیسی کہنہ مشق شاعرات آج بھی بھلائے نہیں بھولتیں۔ فنونِ لطیفہ کے لحاظ سے ہمارا ملک ہمیشہ تابندہ و درخشاں رہا ہے مگر اس وقت فنونِ لطیفہ قریباً آخری سانسیں لے رہا ہے۔ اس میں رہی سہی کسر پھرٹی آر پیز کے چکر میں سرگرداں پرائیویٹ ٹی وی چینلز نے پوری کر دی۔ کند ذہن اور ناتجربہ کار لوگوں کو سکرین پر لا کر راتوں رات سلیبرٹی بنا دینے والے یہ ٹی وی چینلز فنونِ لطیفہ کے اصلی قاتل ہیں۔ اگر کہیں حقیقی ٹیلنٹ موجود ہے بھی تو وہ مارے بےبسی کے اپنی موت آپ ہی مرجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کے حوالے سے اب حقیقی صلاحیت ناپید ہو چکی ہے۔ آرٹ کونسلز میں مذہبی اور سیاسی جلسے ہو رہے ہیں۔ فلم انڈسٹری کا جنازہ تو ہم آج سے تیس سال قبل ہی نکال چکے تھے۔ رہا ڈرامہ اور موسیقی تو اُودھم کا نام موسیقی اور گلیمر کا نام اب ڈرامہ رکھ دیا گیا ہے جسے دیکھ کر اخلاقی تربیت تو درکنار انسان ہوس، جاہ و حشم کی لالچ اور جرائم کی دنیا کی طرف ہی راغب ہوتا ہے۔

فی زمانہ پرائیویٹ ٹی وی چینلز اور پرائیویٹ میوزک سٹوڈیوز نے جس قدر ڈرامہ اور موسیقی کا بیڑا غرق کیا ہوا ہے شاید ہی کوئی اور عوامل اس تباہی کے ذمہ دار ہوں۔ پھر اِس پر مستزاد یہ کہ غیر ضروری اور فرقہ وارانہ مذہبی لٹریچر جس نے گلی کوچے اور محلوں تک فکری منافرت کو وہ ہوا دی کہ اب اس معاشرے میں فنونِ لطیفہ کا نام تک لینا بھی جرم بن چکا ہے بلکہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اب ہمارے معاشرے میں فنونِ لطیفہ کا شعور ہی باقی نہیں رہا تو زیادہ مناسب ہوگا۔
فنونِ لطیفہ کی تباہی کے ذمہ دار جس قدر اس کی بے جا مخالفت کرنے والے لوگ ہیں تو ٹھیک اُسی طرح اس جرم کے ذمہ دار ہمارے وہ ناتجربہ کار اور کند ذہن فنکار بھی ہیں جو فنکار کم اور نوٹنکی زیادہ ہیں۔ جنہوں نے فنونِ لطیفہ کو ایک انتہائی خوفناک اور ناقابل قبول صورت دے دی ہے حالانکہ فنونِ لطیفہ کا تعلق انسان کی حسِ جمالیات سے ہے اور بنیادی انسانی ضروریات کے بعد اس کی ضرورت انسان کو ہمیشہ بالکل ویسے ہی رہتی ہے جیسے روٹی کپڑا اور مکان کی۔

خیرات نہیں حقوق دو

روزنامہ پاکستان 15 اکتوبر 2019

دنیا جہاں پہنچنا چاہتی ہے بھلے پہنچ جائے مگر ہمارا معاشرہ تو ابھی تک غمِ روزگار ہی میں اٹکا ہوا ہے۔ نچلے طبقے سے لیکر اَپر مڈل کلاس تک ہر کوئی اسی روزگار کا رونا رو رہا ہے بلکہ اب تو سرمایہ داروں کے منہ بھی لٹکے ہوئے ہیں کہ آخر موجودہ حکومت ہمارے ساتھ کرنا کیا چاہ رہی ہے۔ اچھا خاصا تنخواہ دار طبقہ بھی اب ہائے ہائے پر اُتر آیا ہے۔ موجودہ حکومت کی تمام تر معاشی پالیسیاں ایک ایک کر کے زمیں بوس ہو چکی ہیں حتیٰ کہ وہ جو کبھی موجودہ حکومت کے ارسطو ہائے معیشت ہوا کرتے وہ بھی اب لامحالہ غلط معاشی پالیسیوں پر تنقید کرنے لگے ہیں۔ البتہ چند ابنائے دہر حسبِ معمول اقتدار سے کماحقہ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ نہیں معلوم ہمیں کب سمجھ آئے گی کہ دراصل ہمارا دیرینہ اور مستقل مسئلہ معیشت ہی ہے حتیٰ کہ ہمارے انتہائی غیر معمولی ذہین بھی گل و بلبل، جام و سبو، وصل و فراق اور زلفِ یار سے اُکتا کر مجبوراً غمِ روزگار کی جانب ہی نکل پڑتے۔ اب فیض صاحب کو ہی دیکھ لیں فرماتے ہیں۔ ع

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

ایک ایسا شخص جس نے غربت و افلاس اور انسانی بے بسی کو انتہائی قریب سے دیکھا تھا مقتدر مخالفین نے اُسے بھی اُنہی اُمراء کی صف میں لاکھڑا کیا جن کے خلاف وہ غرباء کے حق میں لڑ رہے تھے۔ معاشی آسودگی اور اعلیٰ تعلیم ہر بنی نوع انسان کا بنیادی حق ہے۔ روئے زمین پر بسنے والا ہر انسان بہترین روٹی، بہترین کپڑا، بہترین مکان اور اعلیٰ تعلیم کا حق لیکر ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کسی بھی فردِ واحد یا مقتدر طبقہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی بھی انسان کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر دے۔ ریاست ماں باپ سے کہیں بڑھ کر اپنے شہریوں کے حقوق کی محافظ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ ریاست ہو۔ ہم تو ایسے حرماں نصیب ہیں کہ ریاست کے ساتھ وہ جذباتی تعلق ہی نہیں قائم کر پائے جو تعلق

مغرب کی چند ایک فلاحی ریاستوں میں شہری اپنی ریاست کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ بندہ دیکھتا ہے تو عش عش کر اُٹھتا ہے کہ بھلا ایسے بھی ہوتا ہے کہ شہری اتنی جذباتیت اور کمال دیانت کے ساتھ بھی اپنی ریاست سے وابستہ ہو سکتے ہیں اور اپنی ریاست کو ماں سے بھی بڑھ کر معظم جانتے ہیں۔

دنیا کی قدیم ترین تہذیب سناتن دھرم میں ریاست کو ماں جیسی عظمت سے نوازا گیا اور ریاست کے لئے "دھرتی ماتا" کی اصطلاح استعمال کی جاتی رہی۔ اپنے وطن سے محبت دراصل اپنی ذات سے محبت ہے کیونکہ دنیا کا کوئی بھی انسان معاشرتی اقدار سے ٹوٹ کر سروایو نہیں کر سکتا اور ریاست تو معاشرت کی جائے پیدائش ہوتی ہے۔ جس طرح ماں اوائل عمری میں اپنے بچے کو دودھ پلا کر بڑھا کرتی ہے بعینہ ریاست اپنے شہری کی معاشی، اخلاقی اور علمی تربیت کی پاسدار ہوتی ہے۔ پس بچپن میں ماں اور بقیا پوری عمر میں ریاست ہی ایک شہری کے تمام حقوق کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے ہاں تو گزشتہ بہتّر سالوں سے ریاست نے اپنے شہریوں کو Own ہی نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ریاست کے معاملے میں تنقیدی و تخریبی ذہن پروان چڑھا ہے اور یہ بالکل ایک منطقی مظہر بھی ہے کہ کوئی بھی بچہ جب بنا ماں باپ کے خود ہی پلا بڑھا ہو تو پھر اُسے ماں باپ کی تعظیم کی کیا خبر ہو گی۔ پس اُس سے شکایت حماقت کے مترادف ہے۔

گزشتہ دنوں ایک سٹوڈنٹ بتا رہا تھا کہ ہمارے ڈسٹرکٹ میں پرائمری سکول ٹیچر کی پانچ آسامیوں کے لئے کوئی چودہ سو اُمیدوار جمع ہو گئے تھے جن میں اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی تھی۔ اِنہیں اُوورایج ہونے کا خدشہ تھا اِس لئے ایک آخری موقع جان کر اپلائی کرتے گئے۔ ہمارے ایک تایا زاد ہیں۔ وہ بیچارے گزشتہ سات سال سے مسلسل سرکاری نوکری کی تلاش میں سرگرداں پچھلے دنوں اُوورایج ہو گئے ہیں۔ حالانکہ موصوف ایک یونیورسٹی کے ٹاپر بھی رہ چکے ہیں اور ڈگری بھی انتہائی اعلیٰ لئے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنی زندگی تو بس اب سرمایہ داروں کا سرمایہ ہی بڑھانے میں گزر جائے گی۔

انقلاب اور تبدیلی کے دعویدار ذرا دیہی علاقوں کا رخ تو کریں تو اُنہیں لگ پتہ جائے گا کہ ایک غریب اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان جس نے اپنا سب کچھ بیچ بوچ دیا تا کہ ایک اعلیٰ ڈگری حاصل کر لے کیسے کلاس فور اور گریڈ سات اور نو کی نوکری کے لئے دربدر بھٹک رہا ہے۔

نہیں معلوم وہ لاکھوں نوکریاں کہاں گئیں جن کا وعدہ تبدیلی سرکار نے کیا تھا۔نہیں معلوم وہ دل فریب تبدیلی کہاں رہ گئی بس ہوا یوں کہ پرانے کھلاڑیوں کی جگہ اب نئے کھلاڑی کھیل میں کود چکے ہیں۔گیم وہی ہے حکمتِ عملی بھی وہی ہے یعنی کھاؤ پیو اور سائیڈ پر ہو جاؤ اور اگر اتفاق سے پکڑے بھی جاؤ تو پھر قوم کے مسیحا بن جاؤ۔بہتّر سالوں سے یہی دھما چوکڑی لگی ہوئی ہے جسے ہمارے ہاں سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔رہی سہی کسر درباری مُلاّؤں نے پوری کر دی جو مقتدر طبقے کو درویش اور ولی بنا کر عوام کو اپنے حقوق کیلئے آواز اُٹھانے سے محروم کر دیتے ہیں۔مقتدر اور مُلاّ طبقے کی بے ضمیری اور خود غرضی اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔حضرت اقبال نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ع

باقی نہ رہی وہ تیری آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلاّئی و پیری

ریاست عوام کو انفرادی طور پر معزز طریقے سے روٹی کپڑا اور مکان جو عوام کا بنیادی حق ہے فراہم کرنے کی بجائے خیرات دینے کا تہیہ کر چکی ہے۔چنانچہ اب عوام کو مہنگی اشیائے خورد ونوش لینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ریاست دال روٹی کا بہتیرا انتظام کر رہی ہے۔پہلے تو دال روٹی کا انتظام صوفیاء کے لنگر خانوں میں ہوا کرتا اب اس کام کو ریاست خود سرانجام دے گی تا کہ عوام پوری طرح خیرات کی عادی ہو جائے اور اسی طرح اپنے بنیادی حقوق سے دستبردار ہو کر ریاست کو مستقل طور پر ہر قسم کی سر دردی سے نجات دلا دے۔

☆☆☆☆☆☆☆

دھرنے کا موسم

روزنامہ پاکستان 12 اکتوبر 2019

اگر آپ کو ڈی چوک پر تحریکِ انصاف کی دھما چوکڑی یاد ہے تو پھر آپ مولانا فضل الرحمن کی تازہ ترین سیاسی حکمتِ عملی پر معترض ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ دھرنے کی سیاست کا آغاز تو خیر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ایک مذہبی احتجاج سے ہوا تھا مگر اِس جدید سیاسی سرگرمی کو بامِ عروج پر پہنچانے والے ہمارے موجودہ وزیرِ اعظم صاحب ہی ہیں جنہوں نے ملک میں باقاعدہ دھرنا سیاست کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ بذریعہ دھرنا ہائے رقص وسرود اپنے نیک مقاصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ چنانچہ اب آپ کے مخالفین اُسی سیاسی حکمتِ عملی کو اپنا کر آپ کی حکومت کا تیا پانچہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اب تحریکِ انصاف کے قابل ترجمان ذرا تحمل مزاجی کا مظاہرہ کریں کیونکہ ملکی سیاست چت لیٹنے کے بعد اب کروٹ بدلنے پر آمادہ ہو چکی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے نئے پاکستان کے بعد اب واپس پرانے پاکستان کی بازگشت کانوں تک پہنچ رہی ہے۔

کہتے ہیں پاکستان میں کُل چار موسم ہیں۔ گرمی، سردی، خزاں اور بہار۔ ماہرین موسمیات نے یہ نہیں بتایا کہ یہ جو موسم ستمبر کے آخری دنوں میں شروع ہوتا ہوا نومبر کے وسط تک رہتا ہے یہ کونسا موسم ہے اور اصطلاحاً اِسے کیا کہتے ہیں۔ ماہرین موسمیات نہیں بتاتے تو ہم بتا دیتے ہیں۔ اِس موسم کی تفصیلات کچھ اِس طرح ہیں کہ اس موسم میں گرمی قریباً ختم ہو جاتی ہے مگر سردی بھی نہیں ہوتی۔ ہوا چلنے لگے تو سردی محسوس ہوتی ہے دھوپ پڑ جائے تو پسینے شروع ہو جاتے ہیں۔ پنکھا آن کرو تو سردی ہونے لگتی ہے پنکھا بند کر دو تو حبس محسوس ہونے لگتا ہے۔

یہ موسم گرمی، سردی، خزاں، بہار میں سے کسی ایک موسم کے ساتھ بھی میل نہیں کھاتا کیونکہ سردی اور گرمی کی سمجھ تو بہرصورت قائم رہتی ہے۔ خزاں کا موسم سردی کے فوری بعد شروع ہو جاتا ہے یعنی جب ہوا میں خنکی محسوس نہ ہو اور دھوپ بھی فرحت کا احساس دے تو ایسے موسم کو بہار کہتے ہیں۔ لیکن یہ جو موجودہ موسم ہے اب موسمیات کے ماہرین کی ہی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے کسی مخصوص اصطلاح سے تعبیر کریں لیکن میں سرِ دست اِس موسم کو ایک سیاسی اصطلاح "دھرنے کے موسم" سے تعبیر کر رہا ہوں۔

اگر آپ اپنے دماغ کے عین وسط پر تلی یعنی ہتھیلی سے زور دے کر غور کریں تو اس ملک میں ایک عوامی انقلاب ہوا کرتا تھا جس کی سرپرستی ہمارے نہایت محترم بزرگ کر رہے تھے۔ اب بھی اگر آپ کو یاد نہیں تو پھر" مبارک ہو، مبارک ہو " کے الفاظ یاد کریں۔ اُمید ہے کہ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ بالکل یہی موسم تھا، اکتوبر اور نومبر کا جب ایک موہوم عوامی انقلاب نے پورے پاکستان میں غوغا مچا دی تھی اور پھر انقلاب جب ذرا لیٹ ہوا تو شدید بارشیں اور ٹھنڈی ہوائیں شروع ہوگئیں اور تمام انقلابی بیچارے سردی سے مرونڈا ہو گئے تھے۔

عوامی انقلاب تو خیر آتے آتے رہ گیا تھا بعد میں عربی زبان کی اصطلاح انقلاب کی جگہ تبدیلی نے لے لی۔ پھر یہ تبدیلی بیچاری مسلسل تین ماہ تک ڈی چوک پر رقص کناں رہی اور بلآخر بخیر و عافیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئی۔ پس اب ہم تبدیلی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ معیشت، صحت، تعلیم، تجارت، صنعت، تکنیک و سائنس سبھی شعبہ جات آج تبدیلی سے پوری طرح مستفید ہو چکے ہیں۔

ریٹائرڈ شیخ الانقلاب برائے عوامی انقلاب علامہ طاہر القادری کے دھرنے تو خیر رائیگاں گئے البتہ تبدیلی سرکار کے دھرنے از دھرنا ہائے شیخ العتاب کامیاب ہوئے۔ اب یہ ذرا ثقیل اُردو ہوگئی فلہٰذا اس کو سلیس کئے دیتا ہوں۔ عوامی انقلاب کے بعد تبدیلی سرکار کے دھرنے تو دھڑا دھڑ ہوئے مگر اُن کا مثبت نتیجہ تب تک برآمد نہ ہو سکا جب تک شیخ العتاب یعنی حضرت علامہ خادم رضوی صاحب کے خالص مذہبی دھرنے وقوع پذیر نہ ہوئے۔ سو اب ذرا دارالحکومت کو حبس بے جا بنانے والے موسم پر بھی غور کریں وہ بھی یہی اکتوبر اور نومبر کے دن تھے جب حضرت علامہ جڑواں شہروں کو سنسان بنائے ریاست کے تمام اعلیٰ اداروں کے سربراہان کو کھری کھری سنا رہے تھے۔

عوامی انقلاب، تحریکِ انصاف اور تحریکِ لبیک پاکستان کی دھرنا حکمتِ عملی کے مثبت اور منفی ہر دو اثرات سے عوام کماحقہ مستفید ہو چکے البتہ یہ اثرات مثبت کم اور منفی زیادہ رہے۔ اب عین یہی حکمتِ عملی مولانا فضل الرحمان اپنانے کا تہیہ کر چکے ہیں اور اُنہوں نے اعلان بھی کر دیا کہ وہ 27 اکتوبر کو ایک جمِ غفیر کے ساتھ اسلام آباد پدھاریں گے۔

اُصول کے مطابق اب تحریکِ انصاف جو ایک منظم تحریک کی بجائے اِس وقت چند ایک اشخاص پر مشتمل ہو چکی ہے حضرت مولانا کو کھلے دل سے اسلام آباد میں خوش آمدید کہے ورنہ پھر یہ منافقت کی ایک عمدہ مثال قائم ہو جائے گی کہ جو قدم کل اپنے لئے جائز تھا وہ آج کسی دوسرے کیلئے ناجائز ہوگیا۔

مولانا کی سیاست پر سرِ حاصل گفتگو تو خیر ایک الگ کالم کی متقاضی ہے سرِ دست اتنا کہہ دینا قرین انصاف ہو گا کہ مولانا کو سیاسی اصولوں کے مطابق دھرنا دینے کا پورا پورا حق حاصل ہے بعینہٖ جیسے ماضی میں تحریکِ انصاف اور دیگر سیاسی جماعتوں کو حاصل تھا۔اب اس سے قطع نظر کہ ان دھرنوں کے سبب ایک عام آدمی کس اذیت سے دو چار ہو گا کیونکہ یہاں جیسے عوام کسی کی نہیں سنتی بالکل اسی طرح سیاستدان بھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔جب وہ ایک فیصلہ کر لیں تو پھر بنیادی مسائل حل ہوں یا نہ ہوں معیشت بہتر ہو یا نہ ہو یہ لوگ اپنی ہی کرتے ہیں۔چنانچہ عوام کو چاہئے کہ وہ اب چپ کر کے سرِ دست دھرنے کے موسم کا لطف لیں۔دھرنے میں کیا ہو گا اور دھرنے کے بعد کیا ہو گا اس کی فکر اپنے ناتواں مغز پر ڈال کر ناحق چنتت نہ ہوں کیونکہ جو بھی ہو گا بالیقین وہ اچھا نہیں ہو گا۔ہمیں بھلے سمجھ نہ آئے لیکن قدرت اپنا یہ اصول ہمارے لئے بدل نہیں سکتی کہ غلط بنیاد پر شروع کیا گیا کوئی بھی اَمر یا حکمتِ عملی بہر صورت غلط نتائج پر ہی ختم ہوتا ہے۔شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ع

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

☆☆☆☆☆☆☆

تُو کی جانڑیں یار اَمیرا

روزنامہ پاکستان 08اکتوبر 2019

کبھی اِس بھرم پرمست قلندر رہا کرتے کہ علم و اخلاق ہی انسان کے اساسی وصف ہیں اوراس کے بغیر انسان دراصل حیوان کے مترادف ہے۔مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا،علم وحکمت ایک اضافی تعیش معلوم ہونے لگا اور پھر آج نتائج عین جوانی کے علمی تجسس سے بالکل برعکس سامنے آچکے ہیں۔یوں تو زندگی ایک مسلسل سفر کا نام ہے۔مختلف سے مختلف تر نتائج انسان کے تجربات کا ماحصل رہتے ہیں مگر کچھ حقائق ایسے ہوتے ہیں جن کا دکھ انسان کو ہر لحاظ سے مضمحل کر دیتا ہے جیسے کہ روٹی کا دکھ۔

ہم جس ریاست میں اتفاق سے نمودار ہوئے ہیں،زمانہ شعور سے لے کر اب تک عوام کو جس اذیت میں مبتلا دیکھا وہ دراصل فکرِ معاش کی اذیت ہے۔ہمارے وقتوں میں تو سب سے بڑی عیاشی گھی چپڑی روٹی کی بلامشقت دستیابی ہوا کرتی اور وہ گھر بڑا معتبر گھر سمجھا جاتا جہاں گندم کی روٹی اور دیسی گھی ایک ساتھ موجود ہوتا۔یہ شور ایک طرف کہ دنیا صنعتی و تکنیکی ترقی کی اَوج پر پہنچ گئی ہمیں تو آج بھی اپنے آس پاس وہی فاقہ کشی،وہی محرومی،وہی لاچاری نظر آرہی ہے۔گاؤں کارخ کرتا ہوں تو بچے سے لے کر بوڑھے تک سبھی جان توڑ مشقت میں مستغرق نظر آتے ہیں۔شہر میں گھومتا ہوں تو یہ دکھ مزید گہرا ہو جاتا ہے جب غریب طبقہ کے افراد کو ایلیٹ کلاس کی چاکری کرتے دیکھتا ہوں۔

گزشتہ دنوں بلوا ایریا میں ایک ملازمہ پر نظر پڑی جو اپنی مالکہ کو مسلسل یہ کہے جارہی تھی کہ بی بی جی مجھے اجازت دیں میں نے جاکے کھانا بھی بنانا ہے۔میرے بچے بھوکے ہوں گے۔مالکہ نے ڈپٹ کے کہا کہ کلموہی سلو(مالکہ کا بیٹا) کو جاکے چاکلیٹ لے دے پھر رکشہ لے کر دفع ہو جانا۔ملازمہ اور مالکہ کا یہ مکالمہ سن کر مجھے اپنے مفلوک الحال سرائیکی شاعر شاکر شجاع آبادی کا یہ بند یاد آگیا۔ع

اُنہاں دے بال ساری رات روندن بھک توں سمدے نہیں
جنہاں دے کئی دے بالاں کوں کھیڈیندے شام تھی ویندی

بھاری بھرکم فلسفے بیان کرنا، غرباء کے حقوق کے لئے نت نئی تنظیمیں بنانا، کبھی مارکس کو کوٹ کرنا تو کبھی مقدس واقعات سنا کر بعد از مرگ ایک پُر آسائش زندگی کی خوشخبریاں سنانا، نہایت آسان کام ہیں مگر غربت و مسکنت کا جڑ سے خاتمہ کرنا کبھی ہمارا حقیقی مطمح نظر رہا ہی نہیں ۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہر کوئی اپنے مقام پر کھڑے ہو کر ہی سوچتا ہے ۔ ایک صاحب ثروت کو اُس اذیت ناک کیفیت کا ادراک کیسے ہو سکتا ہے جو ایک لاچار نہایت قلیل آمدنی میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے ۔ کیا خوب کہا شاعر نے ۔ ع

تُو	کی	جانڑیں	یار	اَمیرا
روٹی	بندہ	کھا	جاندی	اِی

انسانی حقوق کی تنظیم بنا کر ایک پُر آسائش زندگی گزارنے والا دانشور افلاس کے ماروں پر محض اپنی آسائش کی بقاء کا خواہش مند ہی رہتا ہے نہیں تو کب کا غربت کا قلع قمع ہو جاتا ۔ آج دانشور ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ دفاع ہے ۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کشمیر ہے ۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ قیامِ خلافت ہے ۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ مسلم نشاۃِ ثانیہ ہے جبکہ کوئی بھول کر بھی یہ الفاظ منہ سے نہیں نکالتا کہ اس قوم کا سب سے بڑا روگ غربت و مسکنت ہے ۔ بے بسی اور بیماری ہے ۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم ایک معمولی سے وائرس پر بھی قابو نہیں پا سکتے ۔ اس جدید ترین دور میں بھی ہمارے آبائی گاؤں میں کسی کو مچھر کاٹ لے تو خون ٹیسٹ کرنے کی سہولت تک موجود نہیں ہے جبکہ تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال کی شاندار عمارت موجود ہے ۔ پچاس ہزار آبادی والے علاقے میں سرکاری سطح پر کوئی ایک بھی لیڈی ڈاکٹر بھی موجود نہیں ہے ۔ ڈیلیوری کیسز یا ایمرجنسی کی صورت میں ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے شہر جانا پڑتا ہے اور یہ تو محض میرا اپنا علاقہ ہے ۔ اس طرح کے کئی علاقے خیبر پختونخواہ، بلوچستان، سندھ اور جنوبی پنجاب میں موجود ہیں جہاں آج بھی انتہائی بنیادی طبی سہولیات کا فقدان ہے ۔

خدارا عوام کے حال پر رحم کیا جائے ۔ جس ریاست میں عوام روٹی اور صحت جیسی انتہائی بنیادی ضروریات کیلئے ترس رہے ہوں وہاں عالمی برادری کے سامنے شیخیاں بکھیرنا مستند حماقت کے سوا کچھ نہیں ۔

ہمیں اپنے مسائل حل کرنا چاہئیں نہ کہ اُن مسائل میں پڑنا چاہئے جن کی براہِ راست ذمہ داری سرے سے ہم پر عائد ہی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر ہم اس قدر خوشحال اور طاقتور بن چکے ہوں کہ ہم اپنے اندرونی مسائل چٹکیوں میں حل کر لیتے ہوں تو پھر بے شک ہم سیادتِ عالم کو اپنی ذمہ داری بنا سکتے ہیں۔ اِس وقت ریاست کے سامنے جو دو عفریت سینہ تان کر کھڑے ہیں وہ معیشت اور صحت ہے۔ سرمایہ دار بپھرے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں جبکہ عام آدمی مہنگائی کے ہاتھوں چھلنی ہو کر کراہ رہا ہے۔ تیل، بجلی، گیس، اشیائے خورد و نوش اور ہر قسم کی اجناس کی قیمتوں میں مسلسل اضافے نے عام آدمی کو چت لٹا دیا ہے۔

علاوہ ازیں سیاسی دھما چوکڑی کا شو تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔ پھر روڈ بلاک، ٹریفک جام، روزمرہ کے اُمور میں رکاوٹ کا عذاب تو اب ہمارا مقدر بن گیا ہے۔ ایسے حالات میں غیر ضروری مسائل چھیڑ کر اپنی حقیقی ذمہ داریوں سے پہلوتہی مجرمانہ غفلت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایک قدیم سیاسی حکمتِ عملی ہے کہ جب حقیقی مسائل درپیش ہوں اور اُن کے خاطر خواہ حل پر دسترس نہ ہو تو پھر مصنوعی مسائل پیدا کر دو تا کہ عوام کا رخ اُس جانب ہو جائے جہاں وہ اپنے حقیقی مسائل بھلا کر مصنوعی مسائل کے پیچھے لگ جائیں۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے کسی کو شدید بخار ہو تو بجائے اُس کا علاج کرنے کے اُسے باور کرا دیا جائے کہ تم عنقریب مرنے والے ہو اور تمہاری موت اب اٹل ہے، تو وہ بیچارہ جھٹ سے شدید بخار کو غنیمت جان کر موت سے نجات حاصل کرنے کیلئے زندگی کی بھیک مانگنا شروع کر دے۔

☆☆☆☆☆☆☆

کیا بودو باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو

روزنامہ پاکستان 26 اپریل 2019

غمِ روزگار بھی عجیب بلا ہے۔عمر کا سب سے خوبصورت حصہ حصولِ معیشت کی مشقت میں گزار دو جب بیٹھ کر کھانے کا وقت آئے تو صحت ندارد۔ چنانچہ وہی پیسہ جس کے حصول میں صحت خراب ہوگئی اب تندرستی کے لئے لگاتے جاؤ اور پھر آخیر میں ایک سرد آہ بھر کر ملکِ عدم کے راہی بن جاؤ۔ یہ ہے انسان کی کل حیات کا ماحصل۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ جو برائی ہے اِس کی اساسی تحریک دراصل مشقت سے نجات حاصل کرنے کی ایک جدوجہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان شعور حاصل کرنے کے فوری بعد حصولِ معیشت کے ایسے شارٹ کٹ رستے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے جو بالآخر جرم کی لامحدود منزل پر منتج ہوتے ہیں۔پس یہی جرم کا اصلی محرک بھی ہے۔

کسی پریشان حال شاعر کے منتشر خیالات کی طرح ریاست میں بھی عجیب قنوطیت و بے یقینی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ معلوم پڑتا ہے کہ عنقریب کوئی بڑا طوفان اِس انجانے خوف کا پیش خیمہ ثابت ہو کر بکھری اُمیدوں کو خس و خاشاک کی مانند بہا کر لے جائے گا۔

عمران خان جو اِس ملک کیلئے اُمید کی کرن تھے چراغِ سحر کی مانند پھڑ پھڑا رہے ہیں کہ گویا اب گُل ہوئے سو ابھی۔میں پاکستان کو اپنے جسم سے تعبیر کرتا ہوں اور لاانتہاء تاسف یہ کہ یہ جسم اپنی پیدائش سے لے کر اب تک شاذ و نادر ہی تندرست رہا۔ملکی حالات جس سبک انداز سے ابتری کی جانب رواں ہیں مبادا وہ وقت آن پہنچے کہ پیٹ نان کو اور تہذیب اطوار کو ترس اُٹھے۔جدید و قدیم دنیا کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں، جہاں کہیں بھی ترقی و خوشحالی کی ادنیٰ سی نظیر بھی ملے گی تو اس کے عقب میں علم و اخلاق کے عَلم لہر رہے ہوں گے۔

فرد ہو یا خاندان معاشرہ ہو یا ریاست جب تک علم و اخلاق کے زیور سے آراستہ نہیں ہونگے کسی بھی ضمن میں ترقی کی کوئی اُمید پیدا نہیں ہوسکتی۔افسوس صد افسوس ہمارے ہاں دونوں کا فی نفسہ اور مستقل فقدان پایا جاتا ہے۔معیشت کے بکھیڑے تو ایک طرف ہمیں جن بنیادی اور انتہائی اہم انسانی خصائل کا حامل ہونا چاہئے تھا وہ بھی ناپید ہو چکے اور اِس پر مستزاد یہ کہ کبھی اپنی اصلاح نہیں کرنی بلکہ اس ضمن میں سوچنا بھی لایعنی تصور کیا جاتا ہے۔

مارکس نے کہا تھا کہ انسان کی شوریدگی کا ذمہ دار معاشرہ ہے۔فرائیڈ نے کہا تھا والدین ہیں جبکہ بدھ نے کہا تھا کہ انسان خود ہے۔میرے نزدیک بدھ کی تحقیق مارکس اور فرائیڈ کی نسبت زیادہ معقول اور موثر ہے۔جب تک انسان کے اندر انفرادی طور پر اصلاحِ ذات کا محرک پیدا نہیں ہوگا، ایک صاحب الخلق مقتدر بھی کسی فرد یا معاشرہ کی اصلاح نہیں کرسکتا۔یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایک عظیم الشان اعلان ہوا۔ "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔" بے شک ہم نے آپ کو اخلاق کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز کیا"۔پس یہ انفرادی اصلاح کا اوّلین الہیاتی منصوبہ تھا۔
فی زمانہ صنعت وتجارت اور سائنسی وتکنیکی ترقی کی دشوار گزار پگڈنڈیاں کشادہ اور ہموار شاہراہوں کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔جدید انسان اب معیشت کے معاملے میں اپنے تمام تر حزن وملال کو بالائے طاق رکھ چکا۔دریں اثناء ارفع اخلاق کی خاطر خواہ منازل بھی طے کر چکا مگر ہم ہیں کہ افلاس وتہی خُلق کی دلدل میں پھنستے جارہے ہیں۔آخر وجہ کیا ہے کہ ہمارے ساتھ اس طرح ہو رہا ہے؟غور کریں ہو رہا ہے یا ہم خود اپنے ساتھ کر رہے ہیں؟۔پس یہ سوال ہے اور ہم اس کے معتوب وماخوذ ہیں۔خودغرضی اور مفاد پرستی کا یہ عالم ہے کہ ہرکس وناکس گھات میں لگا ہوا ہے اور جس کا جس نہج تک بن پڑتا ہے اپنے سے کمزور کو دبوچ لیتا ہے۔پھر یہ چاہے مقتدر طبقہ ہو، عوام کے نمائندے ہوں یا پھر ہما شما۔
غالباً حضرت اقبال نے اُس زمانے میں الہامی طور پر پاکستان کے موجودہ حالات سے آگہی حاصل کرلی تھی۔ع

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی

ہاں ہمارے زمانے میں بھی گردشِ صبح وشام بلاشبہ وہی ہے مگر اتنا ضرور ہوا ہے کہ ایک عام انسان کی زندگی دکھ اور اذیت سے ہمکنار ہوگئی۔ایک کمانے والا اور دس کھانے والے۔کہیں دونان چار آدمی کھا رہے ہیں تو کہیں پالتو کتے برگر کھا رہے ہیں۔کوئی قوم کی جمع پونجی لے اُڑا تو کوئی دھونس کے ذریعے مسلط ہوگیا۔پھر کہتے ہیں کہ مایوسی والی کوئی بات نہیں، اللہ خیر کرے گا۔یقیناً اللہ ہی خیر کرے گا، جبکہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اللہ بھی اُس وقت خیر نہیں کرتا جب تک انسان خود اپنے لئے خیر نہیں چن لیتا۔

قرآن کی آیت کی بالکل مناسب تعبیر کی ہے مولانا ظفر علی خان نے اپنے اِس شعر میں ۔ع

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قنوطیت اپنی ذات میں ایک مستقل بے بسی ہے ورنہ کون نامراد شادمانی سے لطف اندوز ہو کر نا اُمیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں خود کو جھونکنا چاہے گا۔تنقید اور تکلیف میں جوہری فرق ہے ۔نقاد تیقن کی بنیاد پر نقد کرتا ہے جبکہ تکلیف کا خمیر بے یقینی سے اُٹھتا ہے ۔پس یہ تکلیف ہے تنقید نہیں ۔پچھم کے پرسکون اور فرحت بخش ماحول میں رہائش پذیر احباب بظاہر بطورِ مزاح اور بباطن استہزاء پوچھتے ہیں کہ ہاں جی صاحب کیا حال ہیں آپ کے؟، جواب میں ہم برجستگی سے میر کا بند پیش کر دیتے ہیں ۔ع

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کر ہنس ہنس پکار کر

دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے چنانچہ جگ ہنسائی میں اب صرف چند منٹس لگتے ہیں ۔غلطی پر غلطی کرنا اب ہمارا وتیرہ بن چکا ہے اور سدھرنے کی تو گویا قسمِ مصمم لی ہوئی ہے ۔وقت بھلا کب کسی کا منتظر رہتا ہے یہ مضحکہ خیز تبدیلی بھی بہر حال عنقریب ایک اذیت ناک قصّہِ پارینہ بن جائے گی ۔مگر اس سے بھی زیادہ مضمحل الطبع اندیشہ یہ ہے کہ اب آگے کیا ہو گا جہاں اُمید کی کوئی ہلکی سی بھی کرن کہیں دور دور تک نظر نہیں آ رہی اور عطار کے لڑکے سے بھی دوا لینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، ۔فلہٰذا واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆☆☆☆☆

دیسی جمہوریت

روزنامہ پاکستان 12 جون 2018

جمہوریت کی اصطلاح عربی زبان میں اجتماع کے معنی میں استعمال ہوتی ہے جبکہ مقامی اصطلاح دیسی جمہوریت سے مراد ایک ایسی مافوق الفہم جمہوریت ہے جس کے سر کا پتہ ہے نہ ہی پیر کا۔ دیسی جمہویت جس میں نہ تو خالص مغربی جمہوریت موجود ہوتی ہے نہ ہی ضابطۂ شریعتِ اسلامیہ۔ پس ایک عجیب وغریب کنفیوژن ہے جسے ہمارے ہاں جمہوریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی جامع تعریف کرتے ہوئے معروف سیاہ فام سیاسی رہنما ابراہم لنکن نے کہا تھا کہ جمہوریت سے مراد عوام کی حکومت عوام کے ذریعہ سے عوام پر گویا اس میں سکہ عوام ہی کے پاس رہنا ہے۔ انتقالِ اقتدار کا موجودہ تصور ہمیں سب سے پہلے خدا اور خدا کی عالمگیر بصیرت سے توڑ دیتا ہے۔ اَنا پرستی کی جال میں پھنسا ہوا نفس پرست انسان جب اقتدار پر قابض ہوتا ہے تو جو کچھ وہ کرسکتا ہے اس کا کما حقہ مشاہدہ ہم آج ملکِ خداداد میں کر رہے ہیں۔ جمہوریت چاہے ولایتی ہو یا دیسی اس میں سب سے پہلے خدا کے وجود کو چیلنج کیا جاتا ہے کیونکہ جمہوریت کا تصور اپنی اصل میں انسان کو مختارِ کل بنانے کا پُرتعیش واہمہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہاں سکندر و دارائے اعظم بھی رسوا ہو کر رخصت ہوئے تو پھر یہ نام نہاد جمہوری مقتدر کیا کچھ پالیں گے۔

مغرب میں جمہوریت ایک باشعور معاشرے کیلئے انتقالِ اقتدار کا سب سے محفوظ اور مطمئن ذریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری اور مغربی جمہوریت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہماری جمہوریت میں بنیادی عنصر اسلامائزیشن ہے یہی وجہ ہے کہ ہم خالص جمہوریت کی بجائے اسلامی جمہوریہ کی اصطلاح پر تکیہ کرتے ہیں تاکہ ہم جدید دنیا کی غیر اسلامی جمہوریت سے الگ ہو جائیں۔ میرے نزدیک اسلامی جمہوریت سے زیادہ معقول اصطلاح دیسی جمہوریت ہے۔ کیونکہ اسلام اور جمہوریت میں ایک زبردست منطقی بُعد پایا جاتا ہے۔ قرآن کا یہ واضح اعلان ہے کہ علم والے اور لاعلم برابر نہیں ہو سکتے اسلام کے نزدیک حفظِ مراتب کے ایک بنیادی سماجی اُصول کے طور پر پریکٹس کیا جاتا رہا ہے مگر جمہوریت میں ایک عالم، صوفی، ولی، بزرگ کی رائے اور ایک افیمی اور آوارہ گرد کی رائے برابر ہوتی ہے۔

ریاست جب اپنے شہریوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ کر پائی ہو جہاں عوام اور خواص بدترین اخلاقی بحران سے گزر رہے ہوں وہاں جس قسم کی جمہوریت پروان چڑھتی ہے اس کا ادنیٰ سا مشاہدہ مملکتِ خداداد میں بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت نے انسان کے اندر خودغرضی اور ہوس کی مسلسل آبیاری کی۔ آخر وہ کونسا انسان ہے جسے تمنائے سروری نہیں ستا رہی؟۔ سبھی مقتدر بننا چاہ رہے ہیں۔ کوئی ضابطہ ہی نہیں۔ جس کا دل چاہے کاغذات جمع کرا کر اقتدار کی دوڑ میں حصہ لے لے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نظمِ جمہوریت انتقالِ اقتدار کا کوئی حتمی معیار ہی نہیں ہے۔ باشعور ہے یا لاشعور دھڑلے سے اپنے آپ کو اقتدار کی باگ دوڑ سنبھالنے کیلئے پیش کر سکتا ہے پھر جو طاقتور ہوا وہی صاحبِ اقتدار چنانچہ ہمارے جمہوری لیڈر بھی وہی ہیں جو پہلے کسی طاقتور کے غلام تھے اور اب خود طاقتور بن کر آگے مزید غلاموں کی کھپت پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔

اقتدار کی دھکم پیل غریب کے بس کا روگ ہی نہیں۔ غریب روٹی پیدا کرے یا ملکی سیاست میں حصہ لے۔ وہی چند ایک لوگ جو کبھی مقتدر حلقوں کے غلام تھے آج خود آقا بن کر نئے غلام پیدا کر رہے ہیں اور یہی سلسلہ پچھلے کئی دہائیوں سے چل رہا ہے۔ شاطر اذہان نے اسلام کا سابقہ لگا کر جمہوریت کو بھی مطہر کر دیا چنانچہ اب اگر کوئی دیوانہ اعتراض کرے کہ بھئی جمہوریت اسلامی روش نہیں تو اس کا منہ جھٹ سے بند کر دیا جاتا ہے کہ اجی یہ مغربی جمہوریت تھوڑی ہے یہ تو دیسی جمہوریت ہے اور دیسی جمہوریت کا اعجاز یہ ہے کہ یہاں لوگوں کی رائے پیسوں سے خریدی جاتی ہے۔

غریب عوام بیچارے کیا جانیں کہ ان کی رائے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک ہرے اور نیلے نوٹ ہی حقیقی وقعت رکھتے ہیں کیونکہ اندھا کیا مانگے صرف دو آنکھیں۔ دیسی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت سمجھنے والے اسلام کا یہ بنیادی اصول نہیں جانتے کہ اسلام میں اقتدار کی طلب ہی اخلاقی جرم ہے۔ اسلام میں سیاست عبادت کی ایک قسم ہے بلکہ اگر سیاست کو اسلام کا مرکز کہہ لیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے معاشرے کی نہ صرف اخلاقی تربیت کی بلکہ اپنے لوگوں کیلئے ایک ایسی خدایافتہ ریاست کا بھی بندوبست کیا جس میں کوئی غریب تھا نہ ہی امیر، چھوٹا تھا نہ بڑا، بادشاہ تھا نہ ہی وزیر۔ سب برابر کے معزز، صالح اور اعلیٰ اخلاقیات کے حامل شہری تھے اور جن کی جان و مال اور دولت خدا کی غیر مشروط امانت تھی۔ جب بھی خدا کا پیغام ملتا وہ اپنا تن من اور دھن سب کچھ خدا کی راہ میں بلاجھجک قربان کر دیتے۔

ایسی عدیم النظیر اور رفیع الامثل ریاست کے نظمِ اُلوہی کو موجودہ متعفن جمہوریت سے تشبیہ دینا نہ صرف صریح حماقت ہے بلکہ بدترین جہالت بھی ہے۔جس معاشرے میں اُستاد اور شاگرد، عالم اور لاعلم، ولی اور بدقماش کی رائے برابر ہو وہ معاشرے کیونکر ترقی یافتہ ہوسکتا ہے۔پس جمہوریت کا راگ الاپنے سے پہلے جہالت سے جنگ ضروری ہے۔ اخلاقی بحران سے نجات لابدی ہے، بعد میں کہیں جا کے ایک شہری کی رائے کو اہمیت دی جاسکتی ہے۔اقتدار زمین پر خدا کی سب سے حساس ترین امانت ہے ایسی بھاری بھرکم امانت کہ جس کی موجودگی سے حضرت عمر فاروق جیسے جلیل القدر اور فقید المثل سیاسی رہنما پُرملال تھے کہ مبادا کہیں مجھ سے جانے انجانے میں شہریوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی ناانصافی نہ ہو جائے۔مگر یہاں تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے سب سے آسان ترین شغل حصولِ اقتدار ہی ہے۔کہیں سے کوئی ایک آدھ کرسی ہی مل جائے بس ٹوٹی پھوٹی ہی سہی۔

بلاشبہ اقتدار خدا کی امانت ہے اور اس کے وہی عظیم نفوس اہل ہو سکتے ہیں جن کے دلوں میں خدا کا نور ہے۔خلق خدا کی بے لوث محبت ہے۔جن کے دلوں میں خدمتِ خلق کا غیر مشروط جذبہِ صادق ہے اور وہ جو صادق ہیں۔امین ہیں۔ بہادر ہیں اور عادل ہیں۔دھیان رہے کہ یہ پاکستانی آئین والے صادق واَمین نہیں۔حضرت اقبال نے یہی درس دیا تھا برصغیر کے مسلمان کو کہ حصولِ اقتدار سے قبل اپنے اندر اصحابِ اقتدار کے اوصاف پیدا کر لے۔ع

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

☆☆☆☆☆☆☆

محبتِ حقیقی

روزنامہ پاکستان 28 مئی 2018

انسان اپنی شعوری عمر سے لے کر حواس باختگی کے عالم تک اگر کسی چیز کی اطاعت کرتا ہے تو وہ صرف اس کا نفس ہے۔ ہاں اس کے رنگ مختلف ہیں۔نفسانی خواہشات کے بت پر کبھی تو نیکی کا رنگ چڑھا دیا جاتا ہے اور کبھی اجتماعی مفاد و انسانیت کی علمبر داری کا۔مگر انسان کے دلفریب دجل کا خلاصہ یہی ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں اپنے مفادات کا ہی پجاری رہتا ہے۔انسان کے مفاد کی انتہا اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان خدا سے اب تک اپنے مفادات کی تکمیل کی التجا ہی کرتا رہا ہے۔

کبھی اِسے بہترین رزق چاہئے اور کبھی دنیاوی قدرومنزلت اور کبھی روحانی اضطراب سے نجات۔مگر حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ تاریخ کے مطالعے کی منتج تحقیق کی رو سے انسان سے خدا کا تعلق محض مفاد کا ہی رہا ہے اور یہ ہم انسانوں کا ایک دیرینہ اور مستقل المیہ ہے۔ہاں انسانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کی دیوانگی صرف ذاتِ حق کی جستجو یعنی محبتِ حقیقی پر منحصر ہوتی ہے گو کہ ایسے نفوس اب چراغ لے کر بھی نہیں ڈھونڈے جا سکتے۔مگر کچھ تو باقی ہے جس کی بنیاد پر نظامِ کائنات قائم ہے۔گوتم بدھ نے کہا تھا کہ زندگی دکھ ہے۔گوتم بدھ واحد انسان تھے جنہوں نے براہِ راست خدا کی جستجو کی بات نہیں کی بلکہ اپنے نفس کو اس قدر پاکیزہ کرنے کی ہدایت کی کہ ذاتِ انسانی میں خدا خود جلوہ گر ہو جائے۔

اس مقام کی سب سے بہترین تفسیر سائیں کبیر داس بیان کر گئے۔ع

کبیرا! من نرمل بھیو جیسو گنگا نیر
پیچھے پیچھے ہری چلت کہت کبیر کبیر

اپنے گریبان میں جھانک کر ذرا ایک پل کے لئے سوچیں کہ کیا ہم نے اپنی پوری زندگی میں کبھی ایک ساعت کے لئے بھی خدا سے خدا کی جستجو کی؟۔نہیں، کیونکہ ہم دنیاوی بکھیڑوں سے فراغت ہی حاصل نہیں کر پاتے۔

یہ تو ظرف ظرف کی بات ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے ظرف کے مطابق خدا سے تعلق رکھتا ہے۔کس قدر عظیم ترین ہیں وہ نفوس جن کے سینے خدا کی طلب سے مضطرب ہیں۔جن کے پاس خدا کی طلب کے سوا کوئی درد نہیں۔جن کی آنکھیں صرف خدا کی جستجو میں ہی تر رہتی ہیں۔دنیا کا کیا ہے،کم پر قناعت عام انسان کے بس کا روگ ہی نہیں اور بہت کرتے کرتے ایک دن ہم خود ہی مٹی کے ڈھیر تلے آجاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ بہت کبھی نہیں ہوتا ہمیشہ کم ہی رہتا ہے۔ یہاں کے اندھے بلاشبہ آگے چل کر بھی اندھے ہی رہیں گے۔جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے۔"وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔" جو دنیاوی زندگی میں اندھا رہا یعنی جو انسان اِس زندگی میں خدا کی بصیرت سے بے بہرہ رہا،وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ اندھے سے بھی بدتر۔

ایمان کا اقرار چاہے لسانی ہو یا قلبی جب تک یہ اقرار حضوری کے مقام پر فائز نہیں ہو جاتا انسان مشاہدۂ حق سے محروم ہی رہتا ہے۔اسی مقامِ ارفع کو ہماری صوفیانہ اصطلاح میں "اعتبار" کہا جاتا ہے۔یقین جو اپنے اصل میں اعتبار ہی کی ابتدائی اشکال میں نمودار ہوتا ہے۔چار درجات پر مشتمل ہے۔توہّم الیقین۔علم الیقین۔عین الیقین اور حق الیقین۔

توہّم الیقین عوام الناس کا یقین ہے جس کی کوئی علمی بنیاد ہوتی ہے نہ ہی مشاہداتی۔اس کے بعد علم الیقین کا درجہ ہے جس کی بنیاد عقلی بصیرت پر قائم ہوتی ہے۔یہ یقین کا خام مگر روشن مقام ہے جہاں پر انسان علم کی بنیاد پر خدا سے محبت یعنی یقین کا مدعی ہوتا ہے۔عین الیقین معرفت کا مقام ہے جہاں پر ایک عالم سالک کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور خدا سے محبت کی عارفانہ بنیاد پا لیتا ہے۔یقین کا یہ درجہ بھی اکملیت سے منہا ہوتا ہے۔یقین کا حتمی مقام جسے ہم حق الیقین سے تعبیر کر چکے ہیں دراصل مشاہدۂ حق کی بنیاد پر قائم کیا گیا کامل یقین ہوتا ہے یعنی دیدارِ الٰہی جسے ہم قرآنی اصطلاح میں مقامِ مومن بھی کہہ سکتے ہیں۔یہ وہ مقام ہے جہاں پر شہادتِ اُلوہیت و نبوت مشاہداتی رستوں سے گزر کر ایک کامل و اکمل یقین کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اِسے ہم محبتِ حقیقی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے پھر عظیم ترین اور دقیق ترین صوفیانہ شہادت وحدت الوجود واقع ہوتی ہے۔وحدت الوجود کوئی فلسفیانہ تخمینہ یا ماورائے تجربہ نظریہ نہیں بلکہ مشاہدۂ حق کا وہ حتمی و تکریمی مقام ہے جس کا ادراک صاحبِ وحدت الوجود کے سوا کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ تصوف نام ہے تجربات و مشاہدات کا اور بغیر تجربہ کے کسی کو اس تجربے کا علم یا بصیرت دینا لایعنی و تضیعِ اوقات ہی ہے۔

یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی کو چینی کے ذائقہ کے متعلق حقیقی علم فراہم کیا جاسکے جب تک کہ وہ خود چینی کھا کر اس کا کامل ادراک نہیں حاصل کرلیتا۔تصوف پرتنقید کی بنیادی وجوہات میں سے ایک بنیادی وجہ یہی ہے کہ انسان ان تجربات و مشاہدات کے متعلق لب کشائی کرنے لگتا ہے جس کے متعلق وہ ظاہری علم تو رکھتا ہے مگر نورِ تجربہ سے محروم رہتا ہے۔
پس خدا سے تعلق علم، آسائش، مشقات و احترازات سے قائم نہیں ہوسکتا۔اس کیلئے بنیادی قرآنی اصول تزکیہ نفس چاہیئے جسے ہم تصوف سے تعبیر کرتے ہیں اور جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے"قد افلح من تزکی۔کامیاب ہوگیا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا"۔
نفس کی پاکیزگی علم و مشقت سے ممکن نہیں بلکہ رویہ میں گہری تبدیلی سے واقع ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم اس سارے پروسیجر کو صوفیانہ اصطلاح میں منازلِ سلوک کہتے ہیں یعنی انسانی رویہ میں منفیات کا سدِ باب ہی دراصل اعلی اخلاقی صفات کو پروان چڑھا سکتا ہے جیسا کہ قرآن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق خدائی اعلان"وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ "صوفیانہ منہج پر مہر ثبت کررہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

عقل اور عشق

روزنامہ پاکستان 08 اپریل 2018

عقل عربی زبان میں روک لینے کو کہتے ہیں ۔عرب عقّال اُس رسی کو کہا کرتے جس سے اُونٹ کی ٹانگ کے نچلے حصے کو موڑ کر اسکی پنڈلی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔عقل ایک ایسا غیر مرئی جوہر ہے جس کے ذریعے انسان طبع اور مابعد الطبع (Physics and Metaphysics) کا تجزیہ کرتا ہے اور طبیعیات و نظریات کو باہم منقسم کر کے اس کے بنیادی سٹرکچر کے بارے آگہی حاصل کرتا ہے۔بس یہی عقل کا کام اور یہی عقل کی حد ہے جیسا کہ معروف تھیوریٹکل فزیسٹ البرٹ آئن سٹائن لکھتے ہیں کہ" ہم نے تلخ تجربات کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رو سے نہیں سلجھ سکتیں ۔اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنانا چاہئے کیونکہ اس خدا کے عضلات (Muscles) تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات (Personality) نہیں ہے ۔عقل اسباب و ذرائع پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے مگر مقاصد و اقدار کی طرف سے اندھی ہو جاتی ہے"۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ عقل نہ تو حل پیش کرتی ہے نہ ہی کسی چیز یا انسان کی مقصدیت و افادیت تک پہنچاتی ہے۔ ہمارے صوفی بزرگ بھی ہر زمانے میں عقل کی بے ثباتی اور تہی دامنی پر عام و خاص کو متنبہ کرتے رہے کہ کبھی عقل کے دجل میں نہ آجانا کیونکہ عقل صرف توڑنا جانتی ہے۔جوڑنا عقل کے بس کی بات نہیں سیدی رومی فرماتے ہیں۔ع

عقل آمد دین و دنیا شد خراب
عشق آمد در دو عالم کامیاب

اس سب کے برعکس اس حقیقت میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ جب عقل کسی شے یا سوچ کو توڑ کر ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہے تو اس کے نتیجے میں ہم اس شے یا سوچ کو سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں ۔عقل کا یہ بنیادی کام یقیناً قابل ستائش ہے مگر عقل صرف ایک راستہ ہے منزل نہیں ۔نیکی کو برائی سے دور رکھنے میں عقل کا کردار شاندار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر عقل کی تحسین کی گئی ہے اور انسان کو عقل سے کام لینے کو کہا گیا ہے مگر یہاں ایک دقیق نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عقل فی نفسہ ایک آلہ ہے جس کے ذریعے انسان اشیاء اور نظریات کو سنوارتا ہے ان کو باہم ممیز کرتا ہے اور حسن و قبح (Beauty and Hideous) کی تعیین کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نکتہ کا بھی لحاظ رہے کہ عقل اس تمام مرحلے میں کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ یہ عقل کے دائرۂ کار سے باہر کی چیز ہے۔ انسان شعور سنبھالتے ہی ذہانت کا تعاقب کر رہا ہے مگر آج تک حتمی شعور کو عبور نہ کر سکا بلکہ خدا کی اسکیم ہی یہی ہے کہ انسان بتدریج اپنے شعور میں جدت و سہولت پیدا کرتا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جب فیصلہ کرتا ہے تو اُسے ذہانت کی بجائے تیقن (Conviction) کی طرف کوچ کرنا پڑتی ہے یہ تیقن ہی دراصل عشق کا بنیادی خمیر ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ انتہائی محیر العقول و مرجعِ لطائف ہے کہ عقل اپنی ذات میں تدریج و ارتقاء سے بالاتر ہے۔ یقیناً یہ اَمر خود عقل کو بھی مبہوت کر کے رکھ دیتا ہے کہ آخر عقل ارتقاء سے ماوراء کیوں ہے جبکہ عقل کی تجرباتی صورت یعنی شعور بظاہر تو بڑھتا چلا جاتا ہے حالانکہ شعور نہ بڑھتا ہے نہ ہی گھٹتا ہے۔ شعور کی بنیاد میں کھڑا تیقن ہی دراصل ایک زبردست متحرک حالت میں جاری رہتا ہے۔

تیقن انسان کے اندر ایک باطنی تحریک پیدا کرتا ہے۔ وہ باطنی تحریک انسانی عقل کو روشن و واضح کرتی چلی جاتی ہے۔ پھر انسان گمان کرنے لگتا ہے کہ اس کی عقل ارتقاء کے عمل سے گزر رہی ہے حالانکہ ارتقاء تو تیقن میں جاری رہتا ہے جس کی انتہائی صورت عشق ہے۔ عشق کے لغوی معنی تو پھٹ جانے کے ہیں مگر متصوفانہ اصطلاح میں عشق کی تعریف دراصل تیقن کے انتہائی مقام کی صورت میں کی جاتی ہے۔ عشق کے مفہوم کو واضح کرنے کیلئے تصوف کا علاقہ اس لئے مستعار لیا گیا کہ عشق کی وضاحت پر سب سے زیادہ علمی کام اب تک صوفیاء ہی کر سکے ہیں۔

ایک صوفی عشق کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ "عشق اُس آگ کا نام ہے جو عاشقوں کے دل اور سینے میں جلتی رہتی ہے اور خدا کے سوا جو کچھ ہے اُسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے"۔ بالکل یہی کیفیت ایک انسان کی دوسرے انسان کے لئے بھی بیدار ہو سکتی ہے جسے صوفیانہ اصطلاح میں عشق مجازی کہا جاتا ہے۔ اگر عمومی قرائن پر نظر رکھی جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ کسی بھی انسانی معاشرے کے عاشق اور شاعر غیر معمولی ذہانت کے حامل ہوتے ہیں جبکہ ان کے برعکس وہ لوگ جو صرف عقل کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں حقیقی دانش سے محروم ہی رہتے ہیں۔

عقل اور عشق کا باہم موازنہ کرکے اگر ہم پوری دنیا کے علمی ذخیرے پر نظر دوڑائیں تو ہمیں صوفیاء کی کتب میں عشق کے مدارج تو مل جائیں گے مگر عقل کے مدارج کہیں بھی نظر نہیں آئیں گے اور جس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ شعور ہی تیقن کی پیروی کرتا ہے۔ باالفاظِ دیگر عقل ہی عشق کی پیروی کرتی ہے۔ عموماًیہ قدیم جملہ سننے کو مل جاتا ہے کہ عقل جذبات کی غلام ہے جبکہ جذبہ اور کچھ بھی نہیں دراصل تیقن کی شدید ترین صورت ہے۔ صوفیاء نہ صرف عقل کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ اسے انسانیت کیلئے سمِ قاتل بھی بتاتے ہیں جیسا کہ ہم نے اُوپر سیدی رومی کا ایک بیت عرض کیا جبکہ فلاسفہ عقل کی حاکمیت پر مُصر ہیں کہ دراصل عقل ہی تمام تر احوال کی حرکتِ اوّل ہے۔ اِس قضیہ کو حل کرنے کے لئے صرف ایک ہی نکتہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ آپ جہاں سے بھی شروع کریں کسی نہ کسی بنیاد سے ہی آغاز کریں گے تو پس وہ بنیاد تیقن ہے۔ عشق ہے۔

اس میں کسی بھی شبہ کی گنجائش موجود نہیں کہ آغاز سے آگے عقل اپنے بہترین جوہر کا اظہار کرتی ہے مگر حاصل بحث یہ ہے کہ وہ بنیاد جس پر عقل براجمان ہو کر ارتقاء کا دعویٰ لئے بیٹھی ہے دراصل عشق ہے۔ بالکل اِسی انتہائی دقیق نکتہ کے ادراک سے عاری قرآن کے معترضین اس لایعنی قیاس مع الفارق (Paradox) کو اُٹھا لیتے ہیں کہ لاریب فیہ کی شرط کے ساتھ افلا تعقلون کیا معنی رکھتا ہے جبکہ اُنہیں یہ نکتہ سمجھنے کی حاجت ہے کہ عقل اگر آوارگی پر مقیم ہے تو وہ تشکیک و تجزیہ پیدا کرے گی جس کے بعد فیصلے کی قوت انسان سے فرار حاصل کرلیتی ہے۔

پس بہت ضروری ہے کہ لاریب فیہ کی روشنی سے پہلے تیقن پیدا کرلیا جائے۔ جب تیقن پیدا ہو جائے گا تو پھر تعقل کبھی ٹھوکر نہیں کھائے گا۔ اِسکے برعکس عقلِ محض کے پاس ایک قدم اُٹھانے کی بھی طاقت نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سیّد اور ولی

روزنامہ پاکستان 05 اپریل 2018

ہمارے ہاں پاک وہند میں ایک عام اسطورہ (Myth) بنی ہوئی ہے کہ سید خاندان جن کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اجداد یعنی بنو ہاشم سے بواسطہ حضرت علی جاملتا ہے غیر مشروط طور پر اصحابِ عترت و عظمت ہیں گو کہ اِن اصحاب کے اعمال صریح قباحت کا شکار کیوں نہ ہوں۔ صلح وتہذیب سے عاری اگر کوئی بھی حقیقی یا مبینہ سیّد ہے تو اس کی تعظیم ہمارے ہاں ہر خاص وعام پر واجب ہے حالانکہ نصوص یعنی قرآن کریم کے عمومی مزاج کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اس عوامی تصور کا شائبہ تک نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے یہ نسلیں اور قبیلے اس لئے بنائے تاکہ تم ان کے وسیلے سے ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ پس خدا کے نزدیک قابل تکریم وہی ہے جو حامل تقویٰ یعنی جو خدا کے سب سے زیادہ قریب ہے۔

ہم اگر سیّد کی لغوی تعبیر پر غور کریں تو عربی زبان میں یہ اصطلاح سربراہ، انگریزی زبان کے مسٹر یا اُردو میں جناب کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ عرب کے ہاں یہ ایک عجیب رواج ہے کہ جب وہاں جواہر لعل نہرو جاتے ہیں تو وہ سیّد بن جاتے، ہم جاتے ہیں تو شیخ بن جاتے ہیں۔

سیّد کا عجمی تصور عرب کے ہاں نہ صرف غیر معروف ہے بلکہ غیر معتبر بھی ہے۔ اسلام نے جہاں بت پرستی و توہم پرستی کا خاتمہ کیا تو وہاں نسل پرستی پر بھی کاری ضرب لگائی تاکہ کل کو انبیائے کرام علیہم السلام کی اولاد اعمالِ صالحہ سے منہ موڑ کر اپنے اجداد کی نیکیوں کو ہی کافی نہ سمجھ لے کہ جو کچھ وہ کر گئے وہی ہمارے لئے بھی کافی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے وہ جو لوگ گزر گئے اُنہوں نے جو اعمال کئے وہ اُنہی کے لئے تھے اور جو کچھ تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہیں۔ آیت کریمہ کے اثر سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ خدا کے نزدیک تکریم کا موجب انسان کا نسب نہیں بلکہ محض کسب ہے۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ پیغامِ خدا اور پیغمبرِ خدا کے سب سے اوّلین مخاطب اصحابِ قریش ہی تھے۔ چنانچہ بنو مخزوم کے سردار عمر ابن ہشام (ابوجہل) اور رسول اللہ کے سگے چچا عبدالعزیٰ (ابولہب) اسلام کے کھلے مخالف تھے۔ انہوں نے اسلام اور اہلِ اسلام کے حق میں آخری سانس تک کسی بھی قسم کی کوئی رعایت نہیں برتی۔

نسل پرستی خدا کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی ورنہ حضرت نوح علیہ السلام کا سگا بیٹا کنعان کبھی بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے طوفان میں غرق نہ ہوتا یا پھر نمرود کے مصاحب بت تراش آزر کا بیٹا حضرت ابراہیم کبھی ولایتِ خداوندی کا حق دار نہ ٹھہرتا۔ یہاں پر ایک روایتی غلط فہمی کا ازالہ بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اکثر علماء اِس نکتے پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہم آلِ رسول کی اس لئے تعظیم کرتے ہیں کہ خدا نے ہمیں درودِ ابراہیمی میں آلِ محمد پر صلوٰات بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہم اس اہم نکتے پر سیر حاصل گفتگو کرلیں۔

درودِ ابراہیمی کی ابتدا حضرت ابراہیم اور آپ کی آل پر سلامتی بھیجنے سے شروع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر سلامتی بھیجنے پر ختم ہوتی ہے۔ خدا نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور آپ کی اولاد جو حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام سے جاری ہوئی پر صلوٰات بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ درودِ ابراہیمی میں آلِ ابراہیم اور آلِ محمد پر صلوٰات بھیجنے کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہر وہ شخص شامل ہے جس نے خدا کے مبعوث انبیائے کرام علیہم السلام کی اطاعت کی۔ جس نے حکمِ عدولی کی اور خدا کے پیغام کو جھٹلایا وہ کبھی بھی اور کسی بھی زمانے میں خدا کی رحمت کا حق دار نہیں ٹھہرا پھر چاہے وہ انبیائے کرام کی اولاد میں سے کیوں نہ ہو۔

آل ابراہیم پر صلوٰات ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور قرب سے مشروط رہی ہے اور یہی اصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے متعلق بھی قائم رہا۔ اِطاعتِ خداوندی و اطاعت رسول کے بغیر کوئی بھی آلِ ابراہیم یا آلِ محمد صلوٰات کی حق دار نہیں ٹھہر سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں سے متعدد معتبر افراد اسلام سے محروم رہ گئے۔ پس ثابت ہوا کہ خدا کے پورے اُلوہی منصوبے میں کہیں بھی نسل پرستی موجود نہیں۔ البتہ وہ چاہے تو حضرت ابراہیم کی نسل میں یکے بعد دیگرے بہت سے پیغمبر پیدا کر دے اور نہ چاہے تو حضرت نوح جیسے جلیل القدر نبی کے ہاں کنعان جیسا محروم پیدا کر دے۔ لبِ لباب یہ کہ نسل پرستی خدا کے نزدیک کبھی بھی معتبر نہیں رہی۔ خدا کے نزدیک جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ صرف خدا کا قرب ہے۔ خدا کی سنگت ہے۔ پس ارشاد ہے "بلاشبہ خدا کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی کوئی حزن"۔

کلاسیک عربی ادب کے ذوق سے آشنا بخوبی جانتے ہیں کہ عربی اصطلاح خوف ہمیشہ مستقبل سے مشروط ہوتی ہے اور حزن یعنی غم کی نسبت ہمیشہ ماضی سے ہوتی ہے۔

دنیا کا کوئی بھی خوف ایسا نہیں جو ماضی میں وارد ہوا ہو اور دنیا کا کوئی بھی غم ایسا نہیں جو اپنا وجود مستقبل میں رکھتا ہو۔ خوف ایک ایسی نفسیاتی کیفیت ہے جو ماضی یا حال میں واقع ہی نہیں ہو سکتی بعینہٖ غم ایسی کیفیت ہے جس کا براہ راست تعلق گزرے ہوئے لمحات سے ہوتا ہے چاہے ان کا فاصلہ ایک ثانیہ پر مشتمل کیوں نہ ہو یا پھر گزشتہ صدیوں پر، پس ہر دو صورتوں میں غم کی نسبت ماضی سے ہی معلق ہے۔آیت کی تفہیم میں ذرا بھی اَڑ چن نہیں۔ارشاد ہوا کہ خدا کے دوستوں یعنی ولیوں کو اپنے کیئے کا کوئی غم نہیں ہوتا اور نہ ہی آنے والی کسی ساعت کا کوئی خوف لاحق ہوتا ہے پھر وہ چاہے آنے والی دنیوی ساعت ہو یا اقتربت الساعت یعنی روزِ قیامت۔

☆☆☆☆☆☆☆

روحانی خلاء کی تکمیل

روزنامہ پاکستان 28فروری 2018

خدا بیزار معاشروں سے جو روحانی اَمراض ہم تک پہنچے ہی اِن میں ”Depression“ ذہنی تناؤ، ”Stress“ ذہنی دباؤ، ”Tension“ ذہنی کشیدگی، ”Anxiety“ ذہنی اضطراب اور ”Emptiness“ یعنی ذہنی خلاء آج ہمارے معاشرے میں بھی عام ہو چکے ہیں۔ یہاں پر ایک نکتہ یاد رہے کہ میں نے اُردو اصطلاح ”ذہن“ اس لئے استعمال کی تاکہ سمجھنے میں آسانی رہے ورنہ ذہن کی جگہ موزوں اصطلاح روح ہی ہے۔

مذکورہ بالا تمام بیماریاں آج ہمارے معاشرے میں عام ہو چکی ہیں یعنی دو میں سے ہر تیسرا بندہ اِن پانچ بیماریوں میں سے لاشعوری پر خود کو کسی ایک بیماری کا حامل سمجھتا ہے بلکہ ذرا تفنن سے کام لیا جائے تو اس میں اپنی سماجی برتری سمجھتا ہے کہ اگر وہ ان میں سے کسی ایک بیماری کا شکار ہو گیا ہے۔ اِس کے برعکس جو لوگ پرسکون اور اپنے حالات سے مطمئن رہتے ہیں اُنہیں احمق اور ناخواندہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ آج دنیا خواندگی کی شرح میں خاطر خواہ اضافہ کر چکی ہے مگر اس کے باوجود بھی اپنے لئے حقیقی اطمینان کے ذرائع نہ پیدا کر سکی۔

یورپ میں لوگ ذہنی اطمینان حاصل کرنے کے لئے Alcohol and Narcotics استعمال کرتے ہیں۔ دنیا کے پانچ ممالک جہاں نشہ آور ادویات اور الکوحل کا استعمال عام ہو چکا ہے ان میں پہلے نمبر پر نیوزی لینڈ دوسرے نمبر پر آئس لینڈ تیسرے نمبر پر رشیا چوتھے نمبر پر سکاٹ لینڈ اور پانچویں نمبر برازیل ہے۔ اب یہ بات کہنے کی قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں کہ یہ تمام ممالک پڑھے لکھے یا ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ یہاں پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا نشہ لینا جرم ہے بھی یا نہیں کیونکہ سیکولر سٹیٹ میں تو اچھے یا برے کا فیصلہ عوام کرتے ہیں۔

سیکولر سٹیٹ کی عوام چاہے جس اخلاقی قباحت کو اپنی ضرورت قرار دے کر اس پر عمل شروع کر دے بہر حال قوانین فطرت کے لحاظ سے وہ قبیح ہی رہے گی۔ اس ضمن میں ایک سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ کیا اخلاقی پیراڈائم انسان خود بنا سکتے ہیں؟۔ یعنی کیا انسان اچھائی اور برائی کے پیرامیٹرز خود ترتیب دے سکتا ہے؟۔ سادہ جواب یہ ہے کہ بالکل بھی نہیں کیونکہ اچھائی یا برائی کا شعور طبع زاد نہیں بلکہ یہ انسانی معاشرت کی مشترکہ وراثت ہے جس کا ظہور گاہے گاہے

نبوت، رسالت اور حکمت ِمتعالیہ کی صورت میں ہوتا رہا۔بے شک دنیائے فلسفہ کا معتبر دانشور کانٹ اس پر مُہر ثبت کیوں نہ کر چکا ہو درحقیقت اچھائی اور برائی کا شعور انسان کے اندرفی نفسہٖ یعنی built-in ہے جس کی رہنمائی کے لئے وجدان کا سہارا لیا جاتا ہے اگر وجدان کی روشنی سے انسان اپنے ضمیر کو محروم کر دے تو بالیقین وہ برائی و ذلالت کی گہری کھائی میں جا گرے گا۔اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ تاریخِ دنیا کا مطالعہ کر کے اس اَمر کی تصدیق کر سکتا ہے کہ انسان جب بھی وجدان سے دور ہوا اس کا حال تباہ ہوا۔پس حقیقی دانش وہ ہے جس میں وجدان کا نور شامل ہو۔اس مقام پر حضرت اقبال کا ایک بند ذہن میں محوِ گردش ہے۔ع

اِک دانشِ نورانی اِک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

خدا جسے آپ بے شک کسی بھی زبان میں پکار لیں یا کوئی بھی نام دے دیں دراصل انسان کی حتمی علت، حتمی اطمینان اور حتمی ضرورت ہے بلکہ خدا انسان کی عقلی ضرورت ہے۔آج تشکیک اور الحاد نے انسان سے اس کا حقیقی سکون چھین کر اِسے دشتِ اذیت میں اکیلا چھوڑ دیا جہاں پر وہ کسی کو اپنا یارومددگار نہیں پاتا۔آج سے بیس سال پہلے یہ مسائل یورپ میں تھے مگر اب ہمارا معاشرہ بھی انہی مسائل کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔یہاں بھی اب غیر ضروری معلومات کے بے ہنگم اژدہام نے انسان کو اپنی ذات اور وجدان کی روشنی سے بے بہرہ کر دیا ہے۔راقم الحروف اِنہی وادیوں میں ایک زمانہ تک محوِ سفر رہا مگر یقین جانیں سوائے حیرت و اذیت کے کچھ ہاتھ نہ لگ سکا۔ایمان جو انسان کا حقیقی سرمایہ ہے دراصل انسان سے خدا کی سب سے آسان ترین ڈیمانڈ ہے اور اسی کا اعلیٰ ترین درجہ عشق ہے۔عشق دراصل وہ مقام ہے جہاں انسان روحانی طور پر مکمل ہو جاتا ہے اور خدا کا حقیقی قرب پا لیتا ہے۔حضرت سلطان باہو سے بڑھ کون اِس مقامِ اَرفع کو بیان کر سکتا ہے۔ع

ایمان سلامت ہر کوئی منگے عشق سلامت کوئی ہُو
منگن ایمان شرماون عشقوں دل نوں غیرت ہوئی ہُو
جس منزل تے عشق پچاوے ایمان خبر نہ کوئی ہُو
عشق میرا سلامت رکھیں باہو ایمان دیاں در وہی ہُو

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اعتقاد کے معاملے میں انسان مختارِ مطلق ہے اور قرآن اس اختیار کو بہت منطقی اسلوب سے بیان کرتا ہے۔" فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ "۔پس جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کر لے۔آیت کے عمومی اثر سے معلوم ہوا کہ خدا انسان کو اختیار دینے کے بعد اسکے اعمال میں براہ راست مداخلت نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہمیں ظلم و زیادتی نظر آرہی ہے ۔خدا بیزار ذہین اکثر یہ اعتراض کر لیتے ہیں کہ اگر یہ کائنات خدا کے حیطہِ نگاہ میں ہوتی تو کبھی ناانصافی و معاشی تفریق نظر نہ آتی حالانکہ یہ ذہین اس اساسی نکتہ پر غور نہیں کرتے کہ خدا نے انسان کو اختیار دیا ہے اور جب اختیار مل گیا تو انسان اچھائی اور برائی دونوں پر کامل دسترس رکھ چکا۔پس وہ چاہے تو نیکی اختیار کرے چاہے تو بدی البتہ حتمی فلاح صرف بھلائی کے حامل ہی کے حق میں آتی ہے ۔خدا انسان کے ارادہ و اختیار میں اس لئے مخل نہیں ہوتا تاکہ انسان اپنی مکمل ذمہ داری کے ساتھ حق اور باطل پر عمل پیرا ہو سکے ہاں خدا نے وحی اور حکمتِ متعالیہ کے ذریعے انسان کو صحیح اور غلط راستوں کا ادراک دے دیا۔

پس جو لوگ خدا کی مقرر کی گئی حدود میں رہ کر اپنے ارادہ و اختیار کا استعمال کرتے ہیں تو خدا انہیں حقیقی راحت سے ہمکنار کرتا ہے ۔چنانچہ سورہ یونس کی آیات ستاون اور اٹھاون میں ارشاد ہے"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لئے شفا ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور ایمان والوں کے لئے رحمت ہے ۔اے محمد! آپ فرما دیجئے کہ آپ کو اللہ کے اس انعام اور فضل پر خوش ہونا چاہیئے یہ اس سے بہت بہتر ہے جو کچھ تم جمع کر رہے ہو"۔پس خدا نے ایمان کے دائرے میں وحی کو حقیقی سکون کا وسیلہ قرار دے دیا جبکہ یہی صورتحال وجدان کے ضمن میں بھی ہے ۔

☆☆☆☆☆☆☆

کوریوگرافی

روزنامہ پاکستان 24فروری 2018

کوریوگرافی (Choreography) جسے عام طور پر رقص کہا جاتا ہے دراصل یونانی زبان کے لفظ "Khorea" جس کے معنی دائرہ نما رقص کے ہوتے ہیں ایک دوسرے یونانی لفظ "Graphy" یعنی مصوراتی تحریر سے مل کر انگریزی ترکیب بنی ہے جس کی لغوی تعبیر "مرقص نثر" کے طور پر کی جائے گی۔کوریوگرافی جسے ہم مروجہ زبان میں ڈانس بھی کہہ سکتے ہیں دراصل انسان کی جمالیاتی حس (Aesthetic Sense) کا بہترین مظہر سمجھی جاتی رہی ہے۔کرہِ ارض پر وہ خطہ موجود نہیں جہاں کے باشندے کسی نہ کسی صورت میں رقص نہ کرتے آئے ہوں۔
دنیا کی ہر تہذیب وتمدن میں رقص کو ایک مرکزی شغل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔کہیں یہ ایک مقدس مشق کے طور پر تسلیم کیا گیا تو کہیں اظہارِ مسرت کا وسیلہ تو بعض مقامات پر رقص کو خدا سے براہ راست تعلق کا زینہ سمجھا گیا۔ چنانچہ ہر انسان زندگی میں خفیہ یا بظاہر بہرحال ایک بار بھرپور طریقے سے رقص ضرور کرتا ہے گو کہ وہ اس عمل کو بادی النظر میں صحیح سمجھتا ہو یا غلط۔اہلِ ادب رقص کو جسم کی شاعری کہتے ہیں۔سیدی ومرشدی حضرت جلال الدین رومی رقص کو خدا کا نور کہتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ "تمہارے نور نے مجھے کائنات سے محبت کرنا سکھایا۔تمہارے حُسن نے مجھے شعر کہنے پر مجبور کیا۔تم رقص کر رہے ہو میرے سینے میں مگر تمہیں میرے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا اور یہ دیکھنا بھی ایک ریاضت ہے"۔
سیدی رومی تو یہاں تک فرما گئے کہ "رقص کرو جب تمہارا دل ٹوٹ جائے۔رقص کرو جب تمہارا زخم پھٹ جائے۔رقص کرو جب تم گھمسان کی لڑائی میں پھنس جاؤ۔رقص کرو کیونکہ تمہارا خون تمہارے جسم میں رقص کر رہا ہے۔رقص کرو جب تم ہر چیز سے فراغت حاصل کرلو "۔

قرآن کی سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ارشاد فرماتے ہیں۔"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ "۔فرما دیجئے اے محمد! کس نے حرام کی ہے وہ خوبصورتی جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے وضع کی اور پاکیزہ رزق میں سے۔آیت کے عمومی مزاج سے تنبیہ کا اثر واضح ہو رہا ہے کہ خدا کے سوا یہ اختیار کس کو حاصل ہو چکا کہ وہ خدا کی حلال کردہ خوبصورتی کو حرام قرار دے بالخصوص رزق

میں سے۔آیت میں رزق اور زینت میں مماثلت مادی بھی ہے اور روحانی بھی۔مادی رزق سے مراد خوبصورت ملبوسات اور اشیائے خورد ونوش کے علاوہ روحانی رزق بھی ہے اور روحانی رزق سے مراد فنونِ لطیفہ ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ آیت قانون کی حیثیت رکھتی ہے اور فنونِ لطیفہ کی اِباحت پر ایک منصوص دلیل ہے۔کوریوگرافی آج ایک فزیکل سائنس کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔رقص کے متعلق ابتدا ہی سے یہ شعور پیدا ہوگیا تھا کہ اس سے روحانی اور بالخصوص جسمانی بیماریوں کا علاج کیا جاسکتا ہے خاص طور پر اُن لوگوں کے لئے جو کولیسٹرول یا اعصابی تناؤ کا شکار رہتے ہیں۔اس کے علاوہ ہمارے برِصغیر میں تو رقص کو اہلِ ہنود کے ہاں ایک مقدس عبادت کا درجہ حاصل ہے چنانچہ ہندی تہذیب میں کتھک، بھرت ناٹیئم، اُڑیسی رقص آج بھی ایک مقدس مشق کے طور پر کیا جاتا ہے۔اِس کے علاوہ کتھک کلی، کچی پودی، موہنا ئیٹم، مانی پوری اور ستریا بھی معروف سنسکرتی رقص ہیں۔

ہمارے پنجاب میں صوفیانہ رقص دھمال آج بھی ہر عام و خاص میں مقبول ہے۔اس کے علاوہ پنجابی تہذیب میں لُڈی، بھنگڑا اور سمی رقص خوشی کے مواقع پر کیا جاتا ہے۔شادی بیاہ کے موقع پر بھنگڑا ڈالنا پنجاب کی معروف روایت ہے۔اسی طرح ہماری سرائیکی تہذیب میں مردوں کے لئے جُھمر اور عورتوں کے لئے فیریاں بہت معروف رقص ہیں۔پشتو تہذیب میں تو مردوں کے لئے بہت ہی معروف دائرہ نما رقص اتنڑ بہت ہی مقبول ہے بلکہ پشتون گھرانوں میں تو شادی بیاہ اور مقامی تہوار کے مواقع پر اتنڑ ڈالنا ایک قدیم روایت ہے۔اسی طرح اتنڑ افغانستان میں بھی بہت معروف ہے۔

مغرب میں انتہائی معروف رقص waltz ہے۔عرب کے ہاں خلیجی رقص، بلادی رقص، دبکی، شمادان اور Bellydance (رقص الشرقی) بہت معروف ہیں۔افریقہ میں Galala، Yahooze، اور Hlokoloza انتہائی معروف رقص ہیں۔چین کے روایتی رقص میں Dragon اور Lion بہت معروف ہیں جبکہ موجودہ دور میں Han Chinese بھی ایک انتہائی مقبول رقص ہے۔رقص کا اگر مراقباتی پس منظر جھانکنے کی کوشش کریں تو ہمیں سیدی رومی کا رقص جسے گھمن (Whirling) کہا جاتا ہے نظر آتا ہے جو ایک سفید گھیرے دار لباس میں سر پر نمد (Felt) کی ٹوپی کر کے ایک ہی مقام پر گھوم کر کی جانے والی ایک خالص روحانی و جسمانی مشق ہے۔اِس سے آلائش باطن کافور ہوتی رہتی ہے اور ذہن ایک ہی نقطہ پر مرتکز ہوجاتا ہے۔

اِسے مقامِ جذب بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خالص وجدانی کیفیت ہے جو درویش پر دورانِ رقص طاری ہو جاتی ہے۔ اسے عام اصطلاح میں صوفیانہ رقص بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مضبوط مراقبہ (Meditation) ہے جس کی مشق آج بھی سیدی رومی کے مزار کے احاطے میں دف کی تال اور بانسری کی لے کے ساتھ جاری ہے۔

دنیا میں ایسی تہذیب کا ملنا قریباً ناممکن ہے جہاں کے باسیوں میں کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی صورت میں ہم آہنگ رقص مروج نہ رہا ہو یہی وجہ ہے کہ رقص انسانی معاشروں میں شعور کی دیرینہ میراث اور ایک صحت مند شغل کی حیثیت حاصل کر چکا اور جس کا تسلسل آج بھی جاری و ساری ہے۔

ہمارے پشتون کلچر میں تو آج بھی ضعیف العمر کسی شادی بیاہ کے موقع پر اپنے روایتی رقص اتنڑ میں شرکت کرنا اس طرح لازمی سمجھتے ہیں جیسا کہ ولیمہ کی دعوت میں شرکت کرنا بلکہ اتنڑ میں شرکت ولیمہ میں شرکت کرنے سے بھی زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ رقص موجودہ دور میں تمام تر ذہنی بیماریوں جیسا کہ Stress، Depression اور Anxiety کو رفع کرنے میں اکسیر کا کام دیتا ہے۔

مادیت (Materialism) کے اس دور میں آج ہر انسان حقیقی سکون کو ترس رہا ہے۔ ایسے میں روحانی عبادات کے ساتھ ساتھ اگر جمالیاتی حس کی تسکین کے لئے انسان فنون لطیفہ بالخصوص رقص اور شفاف موسیقی سے محظوظ ہوتا رہے تو مابعد الطبیعیاتی توازن (Metaphysical Balance) قائم رہتا ہے اور اس سے انسان کی روحانی و جسمانی صحت قابل دید ہو سکتی ہے۔ خدا زینت کا موجدِ اعلیٰ ہے اور ہر وہ زینت جو انسان کو خدا کے قریب کر دے بلاشبہ عبادت کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے۔ "ان اللہ جمیل و یحب الجمال"۔ اللہ صاحب الجمال ہے اور اُسے جمال (خوبصورتی) پسند ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

یو مِ محبت

روزنامہ پاکستان 16 فروری 2018

روئے زمین پر کوئی ایسا شخص ڈھونڈ نا ممکن ہی نہیں جو پیار اور محبت کا مخالف ہو۔ پھر ہم جیسے پریم سے گُند ھے ہوئے مشرقیوں پر ویسٹ کا یہ الزام کہ یہ لوگ پیار اور محبت کو نہیں سمجھتے سراسر زیادتی ہے۔ بابا فرید، شاہ حسین، وارث شاہ، علی حیدر ملتانی، سچل سرمست، بلھے شاہ، امیر خسرو، عبدالطیف بھٹائی، میاں محمد بخش، کالی داس، دادو دیال، کبیر داس، رس خان، عبدالرحیم خانِ خاناں، سارد ھا دیوی، بھُوری بائی اور مِیرا بائی ہمارے خطے کے وہ اَنمٹ استعاراتِ محبت ہیں جنہیں تاریخ دنیا رہتی دنیا تک نہیں مٹا سکتی۔

اِس دھرتی کا تو خمیر ہی پریم کی سگندھ سے اُٹھا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تردد نہیں کہ دنیا کو پریم پنتھ کا راستہ بتانے والے ہمارے ہی پریم شاستر ہیں۔ ہمارے پاس قرآن ہے جس کا موضوع انسان ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسی مذہبی کتاب موجود نہیں جس کا موضوع صرف انسان ہو۔ انسان سے محبت ہو۔ انسان کی جسمانی اور اخلاقی تربیت ہو۔ اسی خطے میں ہمارے پاس صدیوں سے گیتا جیسی پیار سے لبریز مذہبی کتاب موجود رہی ہے جس کا مطلب ہی پیار کی دھن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں شری کرشن کے ہاتھ میں بانسری دکھائی دیتی ہے۔ قرآن ہمیں عورت سے نہ صرف محبت کرنا سکھاتا ہے بلکہ اس محبت کے آداب بھی بتاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے "نساھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّھُنَّ "۔ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم اِن کا لباس ہو۔ لباس کو قرآن زینت قرار دیتا ہے گویا مرد اور عورت ایک دوسرے کی زینت ہیں۔

لباس کا استعارہ اپنے اندر انتہائی خوشبودار معنوی اور روحانی کیفیات رکھتا ہے۔ لباس چونکہ انسان پہنتا ہے اس لئے اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مرد اور عورت کی قربت کے احساس کو انتہائی لطیف پیرائے میں ڈھانپ دیا گیا۔ لباس کی دوسری خصوصیت زینت (Beauty) ہے فلہٰذا مرد اور عورت ایک دوسرے کیلئے حتمی خوبصورتی قرار پائے۔ لباس کی تیسری خصوصیت جسمانی عیوب کو چھپانا ہے پس عورت اور مرد ایک دوسرے کیلئے ایسے ستر (Concealment) کی مانند ہیں جس میں تمام ترعیب چھپ جاتے ہیں۔

عورت سے محبت کا یہ تو جسمانی پہلو ہوگیا۔اس کے علاوہ قرآن ہمیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ اپنی عورت کے نان نفقہ کی ذمہ داری کے علاوہ نکاح کے وقت اس کیلئے خصوصی تحفہ کا بھی انتظام کرو جسے ہم عرفِ عام میں حق مہر کہتے ہیں۔دنیا کے کسی بھی مذہب یا فلسفہ میں عورت کو اپنانے سے پہلے اس طرح کے کسی خصوصی تحفہ کا اہتمام نہیں کیا جاتا مگر ہمارے ہاں یہ تحفہ علیٰ الاعلان عورت کو اپناتے وقت دیا جاتا ہے۔چنانچہ ارشاد ہے۔"فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً"۔پس عورت سے تلذذ اُٹھاؤ لیکن اِس کے بدلے اُنہیں حق مہر بطورِ فرض ادا کرو۔ مہر عربی زبان میں محبت کو کہتے ہیں۔گویا حق مہر سے مراد مرد کا اپنی عورت کی محبت کے اظہار کیلئے مادی وسائل کا سہارا لینا ہے تاکہ عورت مرد کی اس محبت کے بدلے اپنے اندر خدمت اور مودت کے جذبات پیدا کرلے۔اظہارِ محبت کیلئے تحائف کا سہارا لینا دنیا کی قدیم رسم ہے۔عورت سے جسمانی قربت کے علاوہ عورت سے محبت کا ایک بنیادی پہلو اخلاقی اور روحانی بھی ہے جس کی تاکید پر ہمارے دین کا دارومدار ہے۔آخر وہ کونسا مذہب یا فلسفہ ہے جس نے اس طرح سختی سے مرد کو منع کیا ہو کہ وہ زبردستی عورت کا وارث نہیں بن سکتا۔چنانچہ ارشاد ہے۔"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا"۔اے ایمان والو! نہیں حلال تم پر یہ کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔ پس آیتِ کریمہ کے عمومی اثر سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ کسی بھی عورت کو زبردستی تعلق پر مجبور نہیں سکتا۔اگر ایک عورت کے خط وخال مرد کو پسند آگئے اور وہ اُس سے تعلق قائم کرنا چاہتا ہے تو اِس کیلئے عورت کا باقاعدہ راضی ہونا ضروری ہے۔آیت میں عورت کی وراثت جان ومال دونوں مراد ہیں۔اس کے علاوہ عورت سے قربت کے بعد کی جو ذمہ داری ہے اس پر بھی قرآن کی تاکید ملاحظہ فرمائیں۔"وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ"۔اور اپنی عورتوں سے تہذیب سے پیش آؤ یعنی اپنی عورتوں سے کسی بھی قسم کے معاملات میں بدخلقی سے پیش نہ آؤ۔اس سے آگے ارشاد ہے۔"فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا"۔پس اگر تم اپنی عورت کو ناپسند کرتے ہو تو عین ممکن ہے کہ جو چیز تمہیں پسند نہیں اُس میں خدا نے تمہارے لئے کثیر بھلائی رکھی ہو"۔گویا ناپسندیدگی کی وجہ سے تم اپنی عورت سے بدتہذیبی نہ کرو۔دورنہ جاؤ۔اسی ناپسندیدگی میں خدا تمہیں ایسی خیر عطاء کردے گا جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگی۔چنانچہ آیت کریمہ اپنی عورت کی تکریم اور اس سے مہذب انداز سے معاملہ رکھنے کی تاکید میں ایک چمکتے ستارے کی مانند ہے۔

دنیا کا کوئی بھی فلسفہ یا اِزم مرد کی اپنی عورت کے معاملے میں اس طرح کی بہترین اور کامل تربیت نہیں کرتا۔

لبِ لباب یہ کہ ہم عورت سے محبت کے مخالف نہیں ۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا عورت سے محبت کسی مخصوص اخلاقی ضابطہ کے تحت کی جائے گی یا بالکل آزاد ذرائع سے؟ ۔ اصل سوال یہ ہے ۔ اگر بالکل آزاد ذرائع سے محبت کی جائے گی تو پھر مرد کا عورت سے کسی بھی وقت دور ہو جانا قوی امکان میں رہے گا بلکہ اکثر و بیشتر مرد عورت سے آزاد جسمانی قربت کے بعد دور ہی ہو جاتے ہیں تو ایسے میں عورت کہاں جائے گی؟ ۔ اگر اس کے حق میں صرف یہ دلیل دی جائے کہ عورت کو معاشی طور پر مستحکم کر دو پھر وہ مرد کے تسلط یا قید سے حتمی طور پر آزاد ہو جائے گی تو پھر سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت صرف ایک جسمانی وجود ہے؟ ۔ کیا اس کا کوئی جذباتی یا روحانی وجود نہیں ہے؟ ۔ اگر ہے تو یقیناً جدید معاشرہ کی عورت کو معاشی طور پر مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتی طور پر بھی استحکام کی اشد ضرورت ہے بلکہ عورت جذباتی استحکام کی ہی بنیاد پر عورت قرار پائی ورنہ جذباتی طور پر بکھرا ہوا ایک وجود ہو سکتا ہے عورت نہیں ۔

تو کیا ایک عورت ایک مرد سے بنا اخلاقی ضابطہ کے قربت رکھنے کے بعد مستقبل میں جذباتی طور پر مستحکم رہ سکتی ہے؟ ، جبکہ مرد کی عمومی فطرت یہ ہے کہ وہ عورت سے آزاد قربت کے بعد جذباتی طور پر دور ہو جاتا ہے ۔ پس یہ ایک بنیادی سوال ہے جو ہمارے نوجوان طبقہ کو Valentines's Day کے موقع پر خود سے کرنا چاہئے ۔

☆☆☆☆☆☆☆

دُرِّ شباب

روزنامہ پاکستان 09فروری 2018

تزکیہ نفس جو اسلام کا محور اور حتمی تعبیر ہے اسکے بغیر دینیات بالکلیہ غیر مستند ہے۔یہی وجہ ہے کہ مذہبی تعلیم بغیر تربیت کے اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتی۔پس ایک مسلمان کو اعلیٰ اخلاقیات کا حامل بنانے کے لئے تربیت ہی حتمی وسیلہ ہے اور تربیت کا آج جس قدر فقدان مذہبی مدارس اور بالخصوص مذہبی رویہ کے حاملین کے اندر دیکھا جارہا ہے شاید ہی اس سے قبل کبھی اس طرح کا سنگین بحران پیدا ہوا ہو۔

اِس انتہائی تشویش کی ایک ہی بنیادی وجہ سامنے آرہی ہے کہ عین جوانی کے ایام میں ہمارے ہاں کچے اذہان کے حامل بچوں اور بچیوں کو دین کے انتہائی حساس اور اعلی ترین روحانی مقامات کی جانب راغب کردیا جاتا ہے۔جس کے بعد پھر وہ بیچارے بھرمِ پارسائی رکھ سکتے ہیں نہ ہی خدا کی قربت کے لئے اپنی نفسانی آلائشوں سے دور رہ سکتے ہیں۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین کا لبادہ اوڑھے یہ ناپختہ ذہن گمراہی اور بدخلقی کے اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں جہاں پھر ضرب عقائد اور دینی رویہ پر پڑنے لگتی ہے اور اس سے بڑا اندوہ ناک المیہ فی زمانہ ہو ہی نہیں سکتا۔

پس ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ دیں اس کے ساتھ ہمیں کسی بھی دوسری تھیوری یا فلسفہ کو شامل نہیں کرنا چاہئے۔صرف تربیت اور بس تربیت۔پس تربیت ہی وہ اعلیٰ ترین صفت ہے جس کے بعد انسان صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔یہاں پر سب سے پہلا کام والدین کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ جوانی کے ایام میں داخل ہوتے ہی اپنے بچوں کی نسبت طے کردیں یا پھر سب سے بہترین اقدام یہ ہے کہ انہیں نکاح کے بندھن میں باندھ لیں۔

بالکل اسی انتہائی اہم حکم کی جانب خدا کا دوٹوک اعلان آج بھی قرآن میں ہمارا منتظر ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

”وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ ۔اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِہِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ۔وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ “۔نکاح کرواپنے نوجوان مرد اور عورتوں کا یہاں تک کہ نیک غلام نوجوانوں کو بھی کھلا نہ چھوڑو ان کا بھی نکاح کراؤ ساتھ نوجوان غلام لڑکیوں کا اور ہاں اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ نکاح کے بعد تم مفلس ہو

جاؤ گے تو اسکی فکر نہ کرو خدا تمہیں اپنے ہاں سے غنی کر دے گا اور خدا بڑی وسعت والا اور تمہارے حالات تم سے بہتر جاننے والا ہے۔

امام بیہقی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"جب کوئی شخص نکاح کر لیتا ہے تو اس کا آدھا دین مکمل ہو جاتا ہے"۔امام حاکم نیشاپوری کے نزدیک یہ روایت صحیح الاسناد ہے۔عالمگیر انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی مانند عیاں ہو جاتی ہے کہ انسان کو عین جوانی میں گمراہ کرنے والے محرکات میں عورت سے دوری (Celibacy) ایک بنیادی محرکہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ذہنی انتشار، مایوسی اور سماجی بغاوت کا مادہ بھی قریباً اسی بنیادی سبب کے باعث پیدا ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ایک دوسری بنیادی وجہ بھی اس عمر میں گمراہی کا سبب بن جاتی ہے اور وہ ہے معقول معیشت کی عدم دستیابی۔اب اگر اس کو مزید مفصل کیا تو بات سوشلزم تک پہنچ جائے گی۔

ایک زمینی حقیقت کے طور معاشرے میں نوجوان طبقے کا بے روزگار رہنا بھی اس کی اخلاقیات پر بہت منفی اثرات مرتب کرتا ہے کیونکہ جبلی ضروریات میں صحت مند معیشت و جائز مجامعت ایک انسان کی زندگی میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ نوجوانوں کی تربیت میں تمام بنیادی نکات کا خیال رکھتے ہوئے سب سے پہلے ان کے لئے معاشی اور جنسی استحکام کا بندوبست کرنا انتہائی ضروری ہے۔نہیں تو پھر ساری اخلاقیات دھری کی دھری رہ جائے گی کیونکہ انسان اپنی خو میں پہلے حیوانی ضروریات کی تکمیل کا مکلف ہے بعد میں یہ روحانی و اخلاقی عظمت کا واحد استعارہ کہ انسان جیسی حامل تکریم ہستی اس کائنات میں فی الحال موجود نہیں۔ بلاشبہ جوانی میں پارسائی انبیاء کرام کا شیوہ ہے مگر اس مقام تک پہنچنا بھی انبیاء ہی کے شایانِ شان ہے۔

ایک عام انسان عین جوانی میں اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ اپنے جبلی تقاضوں کا کماحقہ مقابلہ کر سکے اس لئے اس کا کسی نہ کسی صورت میں بہکنا لازمی ہو جاتا ہے۔پس یہی وہ وقت ہوتا ہے جب والدین پر کڑی ذمہ داری آجاتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی مکمل نگرانی کر کے ان کی بہتر سے بہترین تربیت کا اہتمام کریں۔

یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہمارے ہاں شادی مغرب میں مروج قانون کی طرح جنسی شغل یا کوئی ٹرائل بیس ریلیشن نہیں کہ جس میں جب چاہے ایک لفظ بول کر یا ایک سائن کر کے فارغ ہو جاؤ بلکہ ہمارے ہاں نکاح ایک

با قاعدہ ادارے کا نام ہے۔ ہمارے ہاں نکاح انسان کی متنوع ضروریات کی تکمیل کا نام ہے۔

پس یہ بیس سال کی مسلسل معاشی و اخلاقی جدو جہد کا نام ہے جس کا واحد مرکز اگر اولاد نہ ہو تو پھر ہم معاشرے کو کبھی ایک اخلاق یافتہ نوجوان نہیں دے سکتے۔ نوجوان کسی بھی معاشرے کا سنگار ہوتے ہیں۔ وہ تر و تازہ چشمہ ہوتے ہیں جن سے ملک و قوم کی علمی، اخلاقی اور معاشی فصل سیراب ہوتی ہے۔

کسی بھی ریاست کی پہچان اس کا نوجوان طبقہ ہی ہوتا ہے۔ پس نوجوانی کی حفاظت اور اس میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا ثبوت دینا ایک مضبوط ریاست کے نہ صرف والدین بلکہ اصحابِ دانش و بینش کا بھی اولین فریضہ ہے۔ عورت اور مرد کا ایک دوسرے سے محبت کرنا نہ صرف انسان کا جبلی تقاضا ہے بلکہ انسانی شعور کی حتمی خوبصورتی بھی ہے۔ چنانچہ جو نوجوان مرد اور عورت جائز سمت اور مناسب وقت پر اپنے جبلی تقاضوں کی تکمیل کر لیتے ہیں وہی مستقبل کے ایک مستحکم دماغ بنتے ہیں اور ان کی اخلاقی رفعت یقیناً پورے معاشرے کے لئے باعثِ رحمت ہوتی ہے۔ یہی وہ جوڑے (Couples) ہوتے ہیں جن سے وقت کے زرخیز دماغ اور اعلیٰ ترین صفات کے حامل نفوس جنم لیتے ہیں۔ پس خلاصہ یہ کہ دُرِ شباب یعنی جوانی کا موتی صرف اعلیٰ اخلاقی تربیت ہی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

نفاذِ شریعت یا اسلام؟

روزنامہ پاکستان 02 فروری2018

شہادتِ عثمان ابن عفان اور سقوط خلافتِ علی رضی اللہ عنہما کے بعد سے لے کر آج تک اہلِ اسلام جس مذہبی تشویش میں مسلسل مبتلا رہے ہیں اُس کا لبِ لباب صرف نفاذِ شریعت ہی ہے۔خلفاء جنہیں بعد از خلفائے راشدین ملوکین کہنا ہی مناسب ہو گا بے دین ہوتے گئے۔عوام کا خون چوس کر قیصر و کسریٰ کی طرح محلات بنا لئے گئے۔مسجد پارلیمنٹ سے الگ کر دی گئی اور تقویٰ دلوں سے فرو ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ وقت بھی آن پہنچا جب سیاست کو دین سے جدا کر کے سلاطین تختِ اقتدار پر قابض ہو گئے اور فقیہانِ شہر کو دین سونپ دیا۔

غیر اسلامی طریقے سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد اس پر دین کی مہر بھی لگوا دی گئی تا کہ عوام سیاست اور دین کی تفریق پر اعتراض کا سوچ بھی نہ سکیں۔"السلطان ظل اللہ من اھانہ اھان اللہ" دیکھو لوگو! یہ جو سلطان ہے یہ زمین پر اللہ کا سایہ ہے۔جس نے سلطان کی توہین کی اُس نے اللہ کی توہین کی۔ لاحول ولا قوۃ۔ایسی ہمت تو یارِ غار اور دیرینہ ہمدمِ رسول عزت مآب حضرت ابوبکر صدیق بھی نہ کر سکے۔شاہکارِ رسالت حضرت عمر ابن خطاب کو بھی یہ ترکیب نہ سوجھی کہ اپنی ذات کو زمین پر خدا کا سایہ ڈکلیئر کر دیں۔

ذوالنورین حضرت عثمان ابن عفان اور باب العلم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی ایسی جرات سے باز رہے اور کیوں نہ رہتے کہ وہ تربیتِ رسول کے اکمل ترین درجے پر فائز تھے۔پس سلاطین سیاست کو وراثت بنا بیٹھے اور مذہبی رسومات کی نگرانی فقیہانِ شہر کو سونپ دی۔اب نئی پود یہی سمجھنے لگی کہ سیاست کوئی مکروہ شعبہ ہے جس کا اسلام سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔پھر اہلِ سیاست یعنی بنو اُمیہ کے ملوکین کا کردار بھی عوام کے سامنے تھا۔پس معروف یہی ہوا کہ دین اسلام جو اب ایک بالکل اجنبی اصطلاح شریعت جس کے لغوی معنیٰ عربی میں پانی کے گھاٹ کے ہیں، ہی اصل الاصول بن گیا۔فقہاء اسلام کی بجائے شریعت کی اصطلاح استعمال کرنے لگے تا کہ مقتدر طبقے کا دینی امور سے براہِ راست تعلق قائم نہ رہے وہ اپنی سیاست میں مگن رہیں اور ہم عوام کی دینداری کے نگراں رہیں۔

جو مردِ حق بھی سلاطین کو ان کی اوقات یاد دلاتا اور انہیں اپنے منصب کے غلط استعمال پر ٹوکتا اور ان کی استعانت سے

علی الاعلان دستبردار ہوتا تو اُسے امام ابو حنیفہ جیسے جلیل القدر بزرگ کی طرح پابندِ سلاسل کر دیا جاتا۔

عام فقہاء نے بالکل وہی کیا جو اُنہیں سلاطین کی جانب سے حکم ملا۔ ادوارِ ملوکیت و سلطانیت میں فقیہہ ہوں یا روحانی پیشوا ہمیشہ مقتدر طبقہ کے زیرِ اثر ہی رہتے ہیں کیونکہ کسی بھی ریاست کی اصل دراصل سیاست ہے اور سیاست طاقت کا ایک مکمل نظم ہے۔ پس جس کے پاس طاقت وہی مقتدر۔ سقوطِ خلافتِ علی کرم اللہ وجہہ کے بعد جہاں کہیں بغاوت یا خروج دیکھنے کو ملتا سلاطینِ اُمیہ اُس کا سروالناس کر دیتے۔ آخر طاقت کے سامنے کون ٹک پایا۔ سلاطین جب بالکل بے دین ہو گئے تو چند ایک دیں شعاروں نے عوام میں ایک بار پھر نئے سرے سے دینی شعور بیدار کیا کہ اُٹھو خدا کے دین کے لئے بغاوت کرو۔ یہ ہلکی پھلکی بغاوت ابتدائی اُموی دور میں نظر آجاتی ہے جس کی منتہا کربلا پر ہوئی مگر اس بغاوت کا ثمر یعنی مجتمع انتظامی ڈھانچہ کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔

حتیٰ کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا اور سید ابو الاعلیٰ مودودی جیسے زیرک عالم دین بھی پکار اٹھے کہ" دین کی کوئی ایسی تعبیر نظر نہیں آرہی جس پر تمام مسالک کے حاملین متفق ہو سکیں"، اور کیوں نظر آئے جب ہر مسلک اسلام کی بجائے اپنے ہی مسلک کی فقہی تعبیر کو نافذ کرنے پر مُصر ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس وقت اسلام کا اجتماعی فہم اس قدر سطحی اور غیر منطقی ہو چکا ہے کہ آج جدید دنیا میں اسلام کو ایک مکمل نظامِ حیات اور اعلیٰ ترین معیارِ اخلاق کی حیثیت سے پیش کرنا مسلکی گروہ بندیوں میں جکڑے مسلمان کے لئے ممکن ہی نہیں رہا۔ کوئی گروہ پیری مریدی میں پھنسا ہوا ہے تو کوئی فقہی موشگافیوں میں مستغرق ہے۔ کوئی گروہ خود کو اصلی اہلِ سنت کہتا ہے اور باقیوں کو گمراہ تو کوئی اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر گستاخِ رسول کے فتوے جاری کر رہا ہے۔ کسی گروہ کو ملحد اور بیرونی ایجنڈے پر کام کرنے والوں کا ساتھی قرار دے دیا جاتا ہے تو کسی گروہ پر علیٰ الاعلان کفر کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ ریاست کا ان تمام انتہائی حساس مسائل سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ خود غرضی اور بے ضمیری اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ حضرت اقبال نے بخدا بجا فرمایا تھا۔ ع

باقی نہ رہی وہ تیری آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

کیادوررس نگاہ تھی اُس مردِ مومن کی۔کس قدر موزوں اور برمحل اصطلاح استعمال کی ہے اِن تین مقتدر طبقات کے متعلق جن کا کسی نہ کسی صورت میں عوام پر کنٹرول رہتا ہے۔کشتہ یعنی مختلف عناصر کو ہاون دستہ میں کُوٹ کر ایک ہی صورت میں لے آنا یعنی سفوف بنا دینا۔ بلاشک وشبہ یہ تین مقتدر طبقے آج بے ضمیری کا کشتہ بن چکے ہیں۔سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ شریعت کی اصطلاح استعمال کرنے کی بجائے وہی اصطلاح استعمال کی جائے جوخود خدا نے قرآن میں استعمال کی ہے۔"اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ "۔ خدا کے نزدیک دین تو بس اسلام ہی ہے۔

اس لئے اُمتِ وسطیٰ کا درک پیدا کر کے ہم سب کو نفاذِ اسلام کے لئے پورے اخلاص کے ساتھ جدو جہد کرنی چاہیئے انفرادی اور اجتماعی ہر دو صورتوں میں۔جبکہ دوسرا اہم کام کرنے کا یہ ہے کہ ہم اس وقت اسلام اور سیاست میں دوری کو جڑ سے ختم کر دیں۔یہ جسے آج سیکولر ازم کہا جاتا ہے اور دنیا جس کے گن گاتے نہیں تھکتی اس کی پریکٹس تو ہم ساڑھے تیرہ سوسال سے کرتے آرہے ہیں۔دین کو پارلیمنٹ سے نکال کر انسانی ذہن جس بے انتہاء اضطراب اور لامقصدیت کا شکار رہا ہے، زرخیز اذہان اچھی طرح یہ تباہ کن انتظامی وفکری بحران جان چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

روحانیت اور سیاست

روزنامہ پاکستان 26 جنوری 2018

روحانیت ،تصوف ،معرفت ،عشق اور Mysticism دراصل اسلام کی روح ہے اور اس میں کسی بھی قسم کے شبہ کی گنجائش موجود نہیں کیونکہ اس دنیا میں ہر شے اور ہر جاندار کی ایک روح ہوتی ہے ۔بغیر روح کے وہ جاندار یا شے قائم نہیں ہو سکتی ۔ضمناً عرض کرتا چلوں کہ فی زمانہ کچھ علماء روحانیت کو ایک متوازی دین سمجھنے لگے ہیں جو سراز سر علمی زیادتی ہے ۔روحانیت یا تصوف سہ جہاتی (Three Dimensional) لائف سٹائل ہے جس میں اسلام کا کامل رس موجود ہے ۔"**محبتِ خدا۔ مکارمِ اخلاق اور خدمتِ خلق**"۔یہ ہیں وہ تین مبادیات (Essences) جن پر تصوف کی پوری عمارت کھڑی ہے ۔

تصوف کا اثر دنیا کے ہر مذہب اور دین میں کسی نہ کسی صورت میں قائم ہے ۔ اِس کی تفصیل کا مقام نہیں اس لئے آگے بڑھنے کی کوشش کروں گا ۔آجکل چند ایک غیر معمولی حادثات کے سبب تصوف ہر خاص وعام کے ہاں تختۂ مشق بنا ہوا ہے جس کی وضاحت نہایت ضروری ہوگئی ۔پہلی بات تو یہ ہے کہ تصوف پختہ علم اور مسلسل ریاضت کے بعد ہی کہیں دلوں میں جا گزیں ہوتا ہے اس لئے ہر وہ شخص جو معاشرے میں ایک روحانی شخصیت کی حیثیت سے معروف ہے یا پھر وہ شخص جس نے اپنے ارد گرد چند ایک عقیدتمند جمع کر لئے ہیں صوفی نہیں کہلاتا ۔صوفی کا محور خدا سے عشق ہے ۔اُسے اتنی فرصت کہاں کہ وہ دنیاوی بکھیڑوں میں پڑ کر اپنے آپ کو مادیت کی دھکم پیل میں مصروف رکھے ۔جہانداری یعنی لین دین اسلام کے بنیادی احکامات میں سے ہے اس سے مفر نہیں مگر دنیا کا ہو کر رہ جانا یا پھر اپنے انفرادی مفادات کیلئے اسلامی تشخص یا اسلامی شعار کو استعمال کرنا مکروہ فعل ہے ۔جس کسی نے بھی تصوف جیسے پُرسوز راستے کو دنیاوی مفادات کیلئے استعمال کیا وہ نامراد ہی ہوا ۔سلطان العارفین حضرت سلطان باہو کی تنبیہ ملاحظہ ہو ۔ع

اے دنیا زن حیض پلیتی کتنی مَل مَل دھوون ہُو

دنیا کارن عالم فاضل گوشے بہہ بہہ روون ہُو

انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے کوئی بھی فورم استعمال کرسکتا ہے مگر اس کیلئے دین اور تصوف جیسے مقدس اور انسانی جذبات سے براہ راست وابستہ راستوں کو استعمال کر کے لوگوں کے منہ بند کرنا بدترین دجل ہے۔ جن کے دلوں میں خدا کی محبت جڑ پکڑ چکی ہے اُنہیں اتنی فرصت بھی نہیں کہ وہ اپنے حال پر توجہ دے سکیں۔ البتہ ان کا فکری مرکز مخلوقِ خدا ضرور بن جاتی ہے۔ خدمتِ خلق تصوف کا تیسرا بنیادی رکن اور اسلام کا مرکزی حکم ہے۔ خدا کا عاشق بندوں کے عشق سے فرار نہیں حاصل کرسکتا اقبال نے بجا فرمایا۔ ع

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

آپ جو بھی کرنا چاہتے ہیں شوق سے کریں مگر اتنی اخلاقی جرأت آپ میں ہونی چاہئے کہ آپ اپنے اقدام کو معاشرے میں مبنی برحق ثابت کرسکیں۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو براہِ کرم روحانیت یا دین کی آڑ لیکر اپنے انفرادی مقاصد کی تکمیل سے گریز کریں کیونکہ آپ کے اس اقدام سے لوگوں کے جذبات مجروح ہوں گے اور مخالف سمت سے مسلسل تنقید حقائق کو مسخ کر دے گی۔ پھر وہ رستہ جس پر آپ چلے ہی نہیں تھے حق کے متلاشیوں کیلئے مشکوک بن جائے گا۔ پس سچے لوگوں کے ساتھ اس سے بڑی زیادتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ مفاد پرست حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر دیں۔ مگر یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ حق کبھی باطل کے ساتھ خلط ملط نہیں ہوتا چاہے باطل کا غلبہ ہر سو قائم کیوں نہ ہو جائے۔ سیاست ایک طرزِ حکومت ہے اور اسلام سیاست سے الگ نہیں۔ امام الانقلاب امام خمینی مرحوم نے بجا فرمایا تھا کہ" اسلام سب سے بہترین سیاست ہے یا پھر کچھ بھی نہیں"۔

مکہ سے یثرب ہجرت، پھر مدینہ میں نظم و نسق کا قیام دراصل اسلام کے سیاسی منظر نامہ کو پوری آب و تاب سے پیش کرتا ہے۔ سیاست روحانیت کے تیسرے بنیادی اصول خدمتِ خلق کا ہی اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ اسلام میں سیاست کوئی حکمرانی نہیں بلکہ ایک کڑی ذمہ داری ہے جس کی تاب سے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب نور اللہ وجہہ جیسے عظیم نفوس بھی گریزاں رہے۔

شاہکارِ رسالت حضرت عمر ابن خطاب جیسے جلیل القدر سیاسی لیڈر بھی احتیاج کی گرفت میں آ کر ایک عمر رسیدہ سے یوں مخاطب ہوئے کہ "خدا آپ پر رحم کرے عمر کو تیرے حال کی کیا خبر۔ بولی، عمر کیسے امیر ہیں جو اپنی رعایا کی خبر ہی نہیں رکھتے"۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام سے سیاست نکال دی جائے تو پھر باقی کچھ نہیں بچتا۔ اگر کچھ بچتا بھی ہے تو وہ بدھ مت کے طرز کا کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اسلام محض فاقہ کشی یا دھونی رما کر کسی غار میں بیٹھ جانے کا نام نہیں بلکہ نظام حیات کے ساتھ ساتھ یہ معاشرہ کے نظم و نسق کیلئے بھی بہتیری رہنمائی کرتا ہے۔ اس ضمن میں اقبال نے بہترین عکاسی کی ہے۔ ع

رِشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

گویا سیاست اسلام کی عصا ہے بلکہ عصائے موسوی ہے۔ آج ایک دیرینہ فقہی مسئلہ پھر سے سر اٹھا رہا ہے کہ ملک میں شریعت کا نفاذ کیا جائے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شریعت ایک فقہی اصطلاح ہے جو قرآن و احادیث میں ہمیں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ اس لئے نفاذِ شریعت کی بجائے نفاذِ اسلام کی اصطلاح استعمال کی جائے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے لولی لنگڑی ہی سہی مگر اسلام ریاست کا ایک مرکزی قانون ہے جس کی روشنی میں دیگر قوانین مرتب ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ ملک میں کسی من پسند مسلک کی فقہی تعبیر نافذ کر دی جائے دیگر مسالک کے ساتھ کھلم کھلا زیادتی کے مترادف ہے۔ شریعت کیا ہے اور اسلام کا سیاسی ڈھانچہ کیا ہے اس پر ایک الگ مضمون ضبطِ تحریر کا متقاضی ہے۔ سرِ دست اتنا کہنا کافی و شافی ہے کہ ریاست میں نت نئے بکھیڑے پیدا کر کے اسلامی وقار کو دنیا میں کنفیوز کرنے سے براہِ کرم گریز کیا جائے۔ نہیں تو وہ وقت دور نہیں جب دنیا اسلام اور انسانیت کے بیچ ایک ناقابل تردید بیانیہ جاری کر دے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

تربیتِ ذات کا فقدان

روزنامہ پاکستان 19 جنوری 2018

امام شعرانی اپنی کتاب میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ" ابن القاسم جو حضرت امام مالک بن انس کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ میں بیس سال امام مالک کی شاگردی میں رہا اور آپ نے مجھے پورے اٹھارہ سال ادب سکھایا اور باقی کے دو سال علم سکھایا۔ابن القاسم اپنی عمر کے آخری حصے میں تاسف سے یہ فرمایا کرتے کہ کاش وہ آخری دو سال بھی اُستاد مجھے صرف ادب سکھانے پر ہی لگا دیتے"۔

قرآن میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بنیادی ذمہ داری کا ذکر ایک ہی نکتے کے گرد گھوم رہا ہے کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد ہی تزکیہ نفس (Purification of Soul) ہے کہ وہ اپنے لوگوں کے نفوس سے آلائشیں (Impurities) دور کرتے ہیں، اُنہیں خدائی احکامات کے متعلق آگہی دینے کے ساتھ ساتھ ان احکامات کی منطق بھی سمجھاتے ہیں اور اس تمام تر جدو جہد کا مقصدِ اصلی صرف تزکیہ نفس ہی ہوتا ہے۔یعنی لوگ اپنے نفس سے ہر قسم کے منفی اثرات کو زائل کرلیں یہی اصل فلاح ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی"۔یعنی کامیاب ہوگیا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا۔

انسانی نفس جس میں ارادہ و اختیار کا جوہر ڈال کر خدا نے انسان کو اپنے تمام تر افعال کا خود مختار بنا دیا ہے دراصل ایک انتہائی اہم اور حساس ذمہ داری ہے۔جس کو اعتدال کی راہ میں لا کر استعمال کرنا انسان کے لئے ابتدا ہی سے مشکل مرحلہ رہا ہے مگر جو لوگ اس اَمر کا ادراک کرلیتے ہیں کہ ہمارا نفس ہی ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے۔خدا اگر انسان میں برائی کی رغبت ہی نہ رکھتا تو اس کی یہ تمام تر اسکیم بیکار ہو جاتی کیونکہ جب اختیار ہی نہ ہوتا تو پھر افعال کے صادر ہونے کی منطق پر انسان کی گرفت بھی بے معنی ہو جاتی۔اس لئے انسانی نفس میں برائی کی رغبت ڈال دی گئی ہے تاکہ انسان اس برائی کا مقابلہ کرکے خدا کے ہاں مقرب ٹھہرے۔

انسانی نفس میں دو بنیادی خرابیاں انسان کو لے ڈوبتی ہیں۔ایک لذت کا حصول۔دوسری فوقیت کی روش یعنی ہر وہ چیز جو انسان کو پسند آجائے اسکے حصول کے لئے جائز و ناجائز کا فرق مٹالینا اور دیگر انسانوں سے برتر نظر آنا یا خود کو ایسے

پیش کرنا کہ وہ دوسروں سے افضل و اعلیٰ ہے۔

بہترین علم اپنے نفس کا محاسبہ اور بہترین نصیحت بھلائی پر کاربند رہنا ہے مگر آج معاملہ اسکے بالکل برعکس ہے۔ تربیتِ ذات کا فقدان اس قدر بڑھ چکا ہے کہ آج عوام تو درکنار خواص اور خود کو اہلِ علم کہلوانے والے حضرات بھی تربیتِ ذات سے محروم ہیں ۔انسانی نفس کے لئے آسان ترین کام دوسرے کے متعلق اپنی رائے پیش کرنا جبکہ مشکل ترین کام اپنے اعمال اور نظریات کا محاسبہ کرنا کہ کہیں میں اعتدال کی راہ سے ہٹ تو نہیں گیا۔ میانہ روی ہی انسانی روح کا اوجِ کمال ہے ۔صراطِ دانش کی منزل ہی تربیتِ ذات ہے نہیں تو پھر علم و دانش خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ۔ آج علم وتعلیم سے وابستہ عموماً کسی بھی طالبعلم یا معلم کی فکر میں توازن اور رویہ میں تہذیب نظر نہیں آتی کیونکہ صدیوں سے ہم نے تربیتِ ذات پر سے توجہ ہٹا دی ۔علاوہ ازیں ہمارا خانقاہی نظام بھی آج پوری طرح مفقود ہو چکا۔ جو باقی ہے اس کا تذکرہ کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ جن اصحاب کے اسلاف کبھی تربیتِ ذات کا اہتمام کر کے لوگوں سے نفسانی آلودگی دور کیا کرتے اُن کے اَخلاف آج خود ہوائے نفس کا شکار ہو چکے ہیں ۔اقبال کا درد بخدا بجا تھا۔ع

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

سچائی کو اگر صرف ایک جملے میں بیان کیا جائے تو اسکے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان اب تک تربیتِ ذات ہی سے بھاگتا رہا ہے ۔انسان کی فکری جدو جہد ہو یا پھر عملی کاوش دراصل اس کی ذات سے باہر ہی کے مظاہر ہیں گویا ابھی تک انسان دوسرے کو درست کرنے میں لگا ہوا ہے حالانکہ سب سے زیادہ حق ایک انسان کا اس کی اپنی ذات پر ہے مگر ہم ایک طویل عرصہ سے اپنے آپ سے فرار حاصل کر چکے ہیں ۔اپنے آپ تک لانے والے مقدس نفوس اب چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے ۔سارا مسئلہ ہی سامنے والے سے شروع ہوتا ہے یعنی ہم اپنی تمام تر جدو جہد دوسرے سے شروع کر کے دوسرے پر ہی ختم کر لیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آج کامل انسان ناپید ہو چکے ہیں۔ وہ عظیم نفوس مفقود ہو چکے ہیں جن پر یہ کون و مکاں ناز کریں۔

وہ جو صحیح معنوں میں اشرف المخلوق ہونے کا حق ادا کر دیں۔کسی سے لڑنے کی ضرورت نہیں نہ ہی کسی سے برسرِ پیکار ہونے کی ضرورت ہے۔اپنے آپ سے لڑنا ہی اصل بہادری اور حقیقی دانش ہے۔اس برائی سے لڑنا ہی اصل کام ہے جس نے انسان کے اندر ایک خونخوار بھیڑیا پال رکھا ہے اور وہ خونخوار بھیڑیا انسانی نفس ہے۔حضرت بلھے شاہ سائیں فرماتے ہیں۔ع

نفس پلید پلید کیتا اساں اصل پلید نہ ہاسے
فرقت خیر خراب کیتا نہ تاں ذاتی ہاسے خاصے

انسان چونکہ اپنے نفس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اس لئے وہ دوسروں سے برسرِ پیکار ہونے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان کبھی تربیتِ ذات کی طرف توجہ نہیں دے پاتا کیونکہ اسے اپنی خبر ہوگی تو وہ تربیتِ ذات پر توجہ دے گا۔ایک وقت تھا جب ہمارے ہاں صوفیاء خانقاہی نظام کے ذریعے سالکین سے منازلِ سلوک طے کروا کے اُن کے باطن کو پاکیزہ کیا کرتے مگر آج پورے خطے میں ایسا کوئی میخانہ نظر نہیں آرہا جس میں کوئی سالک آج سلوک و وحدت کی مے سے سیراب ہوسکے۔اقبال نے تو آج سے کئی سال پہلے ہی اس کمی کی شدت کا اظہار کر دیا تھا۔ع

وقت است کہ بکشایم میخانۂ رومی باز
پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست

☆☆☆☆☆☆☆

مغرب زدہ ذہنیت

روزنامہ پاکستان 29دسمبر2017

مغرب جسے جدید اصطلاح میں (Western Culture) کہا جاتا ہے دراصل ایک مخصوص یورپی تمدن ہے جو قیامِ پاکستان کے فوری بعد یہاں کے اہلِ حل و عقد (Officialdom) اور اربابِ دانش و بینش (Intelligentsia) کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔اب اس پر حیران ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں کہ آج کیوں ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اپنے ہر نجی وسماجی معاملہ میں مغربی اقدار کی تقلید کرتا ہے بلکہ اِن کی دیکھا دیکھی ہماری مڈل کلاس بھی خود کو دیسی یورپی ظاہر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔تقلید چاہے اُموی وعباسی تمدن کی ہو یا پھر قدیم اینگلو و جدید اَمریکن تمدن کی بہرحال ایک غلام ذہنیت کی ہی علامت ہے۔تقلید سے انسان کی اپنی شناخت گم ہو جاتی ہے اور وہ محض ایک کٹھ پتلی بن کے رہ جاتا ہے۔شاید اسی صورت حال کی عکاسی تب حضرت اقبال نے اپنے اس شعر میں کی تھی۔ع

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اِس کی حفاظت کہ یہ ہے گھر یگانہ

تمدن کسی بھی قوم کا شعوری اثاثہ ہوتا ہے اور اُس قوم کی شناخت کا واحد مظہر،چنانچہ دنیا کی کسی بھی قوم کے اطوار وعادات پرکھنے کا واحد ذریعہ تمدن ہی ہے۔تمدن کے اجزائے ترکیبی (Ingredients) میں چال ڈھال،وضع قطع،بول چال،سوچنے کے ڈھنگ اور اطوارِ زندگی (Lifestyle) شامل ہیں۔تمدن کی سب سے مضبوط عکاسی کسی بھی تمدن کے حامل افراد کا لائف سٹائل ہی ہوتا ہے کہ زندگی گزارنے کا ڈھنگ ہی آپ کے مہذب یا غیر مہذب ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔

انتہائی کرب کے ساتھ یہ حقیقت بیان کرنا پڑتی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک ہم پاکستانی دنیا میں اپنی جداگانہ تہذیب متعارف نہ کرا سکے۔ حالانکہ ہمارے پاس دنیا کا وہ بہترین اور ابدی تہذیبی ڈھانچہ موجود ہے جس کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ خدا کا محفوظ ترین کلام ہے اور جو ختمی رسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا مگر اس کے باوجود بھی ہم غیروں کی چال ڈھال اور ان کے عقلی اختلال (Rational Disruption) پر فخر کر رہے ہیں اور یہی سمجھ بیٹھے ہیں کہ مغرب سے درآمدہ ہر عمل اور نظریہ پرفیکٹ ہے۔ ہماری یہ تقلیدی روش ہمیں غیر شعوری طور پر غلامی کا عادی بنا چکی ہے۔ یعنی ایک ایسی غلامی جس پر فخر کیا جاتا ہے اور جسے غلامی سمجھا ہی نہیں جاتا۔ پس یہی وجہ ہے کہ ہم آج تک اِس غلامی سے نہیں نکل پا رہے۔

میں اُن تمام زیرک روشن خیال احباب سے معذرت کا خواہاں ہوں جن کو میری یہ ترکیب "مغرب زدہ ذہنیت" بری لگی، جبکہ حقیقت کے متعلق ایک مسلمہ اصول یہ بھی ہے کہ حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ آج اگر ہم اپنی چال ڈھال اور سوچنے کے رخ پر گہری نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ہم اس وقت کہاں کھڑے ہیں۔ آج مادر پدر آزادی ہمارا قومی مطالبہ بن چکا ہے۔ خاندان کا ادارہ اب ہمیں دقیانوسیت معلوم ہوتا ہے۔

اخلاقی اقدار اب ہمیں رجعت پسندی (Conservatism) معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کی حاکمیت اب ہمیں انتہاء پسندی اور مفروضہ (Hypothesis) معلوم ہوتی ہے، کیونکہ آج ہم بہت پڑھ لکھ چکے ہیں۔ بہت آگے جا چکے ہیں۔ روشن خیال بن چکے ہیں اور اپنے تمام تر فیصلوں کا اختیار اپنے ہی ہاتھ میں رکھنے کے سارے گُر جان چکے ہیں۔ انسان جب خدا کی حاکمیت کو چیلنج کرتا ہے تو اس کے بعد جو روحانی عذاب نازل ہوتا ہے اُس کی زندہ مثال آج مغربی ممالک ہیں۔ کوئی بھی سلیم الفطرت اور مہذب انسان اُن ممالک کے شہریوں کو روحانی طور پر ایک پُرسکون اور تہذیب یافتہ نہیں کہہ سکتا۔ اخلاقیات کے پیراڈائم بھی اِن کے اپنے ہیں۔ جو ان کی نفسانی خواہشات کے مطابق ہو وہ روشن خیالی ہے اور جو ان کی خواہشات سے متصادم ہو وہ جہالت اور دہشت گردی ہے۔

یقین جانیئے آج ہمارا پڑھا لکھا طبقہ پوری طرح اس کھوکھلی چکا چوند میں غرق ہو چکا ہے۔ انسان سائنسی، صنعتی اور تکنیکی ترقی کے باوجود بھی اپنے نفس کو آلائش سے پاک نہ کر سکا۔ آج ترقی یافتہ ممالک میں انسان روحانی سکون کو ترس گیا ہے۔ اس کے علاوہ آج مغرب میں خاندان کا ادارہ بالکل تباہ ہو چکا ہے۔

آزاد جنسی تعلق (Open Relationship) نے انسان کو ایک بار پھر حیوانیت کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ یورپین ممالک اپنے نجات دہندہ حضرت مسیح علیہ السلام کا وہ تابندہ ارشاد بھول گئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "زنا (Fornication) تمام گناہوں کی ماں ہے" جبکہ اس بدکاری کے حق میں منطق یہ پیش کی جاتی ہے کہ انسانی طبیعت چونکہ یک رنگی سے اُکتا جاتی ہے اس لئے آزاد تعلق میں انسان سکون محسوس کرتا ہے حالانکہ یہ سکون کی کہانی بھی انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ جو طبیعت کسی ایک انسان پر قناعت (Contentment) نہ کر سکی وہ بھلا دس انسانوں پر کیا قناعت کر پائے گی۔

خاندان کا ادارہ تباہ کرنے کے بعد یہ بھلا مانس اب کتے اور بلیاں پال کر اپنی روحانی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ خدا نے ممتا (Motherhood) میں عورت کی تکمیل رکھی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی عورت اُس وقت تک روحانی طور پر مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ ماں نہ بن جائے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت مغرب میں عورت کا ماں بننا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شادی شدہ عورتیں بلیاں پال لیتی ہیں یا پھر پگ (Bulldog) تاکہ انہیں وہ اولاد کی طرح سے ٹریٹ کر سکیں۔ بالکل یہی صورت حال آج کل پاکستان میں بھی پیدا ہو چکی ہے۔ ایلیٹ کلاس اور پھر ان کی دیکھا دیکھی مڈل کلاس کی اولاد نہ چاہنے والی شادی شدہ اور نوعمر آزاد خیال بچیاں اکثر پگ یا بلیاں پالنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ اب یہاں بھی شادی شدہ شفاف زندگی کو ایک غیر ضروری زحمت سمجھا جانے لگا ہے حالانکہ شادی مرد اور عورت دونوں کی متنوع ضروریات (Various Needs) کی باقاعدہ تکمیل کا نام ہے۔

یہ ضروریات ایک مرد اور عورت دونوں کو آخری سانس تک درپیش رہتی ہیں چاہے انسان انفرادی طور پر جس قدر بھی خود کفیل اور کامل کیوں نہ ہو جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مالیخولیا اور شیزوفرینیا

روزنامہ پاکستان 22دسمبر2017

Psychology جسے عربی زبان میں نفسیات یا فعلیات کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے دراصل انسانی رویہ اور تخیل کے مطالعہ کا نام ہے۔نفسیات دراصل نفس سے مشتق اسمِ صفت ہے اور نفس کے لئے انگریزی میں ایک الگ اصطلاح"Spirit"موجود ہے۔فلہذا نفسیات کا انگریزی ترجمہ"Spirituality"ہی بنے گا مگر چونکہ سائنس ابتداہی سے روح کے وجود کی منکر رہی ہے اس لئے Psychology کو روحانیت سے تعبیر کرنا اب عام فہم نہیں رہا۔

علم النفس یا نفسیات میں سب سے بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسانی رویہ اور تخیل کا ماخذ کیا ہے؟۔اس نکتہ کی تحقیق کے لئے اگر ہم قدیم دفاترِ علم کا مطالعہ کریں تو انسانی رویہ اور تخیل کا مقام ہمیں"دل"ہی ملتا ہے۔اس کے بعد سائنسی ترقی انسان کو دل سے دماغ پر لے آئی چنانچہ اب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ انسانی رویہ اور تخیل کا صدر مقام"ذہن"ہے۔عجیب تفنن آمیز مرحلہ ہے کہ انسان اپنی جوہری صفت یعنی روح کو اپنے شعور کے مطابق اب تک متعدد نام دے چکا ہے مگر اصل ہے کہ اپنی ہیئت میں کوئی تغیر نہ بپا کرسکا۔

دل کہو یا ذہن،شعور کہو یا"Psyche"اپنے اصل کے لحاظ سے جوہر(Essence)ایک ہی ہے۔ایک زمانے تک سائیکالوجی کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ علم تو ایک ہی ہے بس اصطلاحات بدل دی گئی۔گویا آج آپ روحانی سکالر کو سائیکالوجسٹ کہہ لیں تو عجب نہیں مگر اپنے اصل کے اعتبار سے کام دونوں کا ایک ہی ہے۔یہ مختصر سا کالم سائیکالوجی پر میری اعصاب شکن تحقیق کا حق تو بہر حال نہیں ادا کرسکتا مگر یہاں سائیکالوجی کے متعلق ایک سطحی شناسائی اور مروجہ دو معروف بیماریوں کے بارے بنیادی معلومات قارئین تک پہنچ جائیں تو یہی کافی ہے۔

سائیکالوجی کہتی ہے اگر آپ کو کسی سے محبت ہو جائے تو اس محبت کا صدر مقام دل ہے اور اگر آپ ڈپریس ہو جائیں تو پھر اس ڈپریشن کا مصدر آپ کا دماغ ہے۔اس لئے محبت کرنے والا اپنے محبوب کو اظہارِ محبت کے لئے دماغ نہیں دیتا اور کوئی ڈپریشن کا مارا سائیکالوجسٹ سے یہ نہیں کہتا کہ میرے دل میں تناؤ ہے۔مگر یقین جانئے یہ سب اٹکل پچو ہیں۔
دل اور دماغ یہ دونوں محض فعلیاتی عضو(Physiological Organ)ہیں۔

اب مجھے اس تفصیل میں نہیں پڑنا کہ میڈیکل نقطہ نظر سے دل اور دماغ کا کام کیا ہے کیونکہ اس تفصیل سے ہر خاص و عام آگاہ ہے۔سائیکالوجی جس قدر بھی جدید اصطلاحات کا سہارا لے لے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ دراصل روحانیت ہی رہے گی کیونکہ طبع اور مابعد الطبع (Physics and Metaphysics) کا فرق کوئی انسان نہیں مٹا سکتا اور یہی فرق روحانیت اور مادیت کی تفریق (Dichotomy) کو بحال رکھے ہوئے ہے۔مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب ایک پریشان حال کو سائیکالوجسٹ نشہ آور ادویات دے کر اپنی جان چھڑا لیتا ہے جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ روح کے مسائل ایلوپیتھی سے کبھی حل ہوئے نہ ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دھوکہ ملنے کے بعد جو تکلیف ہوتی ہے اس کا علاج دنیا کا کوئی بھی سائیکالوجسٹ یا فزیشن نہیں کر سکتا کیونکہ یہ روح کا مسئلہ ہے اور اس کا حل روحانی سکالر ہی کر سکتا ہے۔

مالیخولیا جسے انگریزی میں Melancholia اور اُردو میں سوداویہ یا قدیم عربی اصطلاح میں مراق کہا جاتا رہا ہے دراصل ایک مستقل اُداسی اور گہری پژمردگی کا نام ہے۔ یہ بیماری مختلف علامات کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔اس بیماری کے حامل مریض کے پٹھے گردن اور چہرے کے مسلز مسلسل تناؤ کا شکار رہتے ہیں۔مریض کے تخیلات میں زبردست بے ترتیبی (Disorder) پیدا ہو جاتی ہے۔تشویش اور مایوسی اس بیماری کے حامل مریض کی بنیادی علامات ہیں۔ اس بیماری کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ایک جذبات کی عدم سیرابی یعنی محبت میں ناکامی جسے Broken Heart Syndrome کہا جاتا ہے۔احساسِ کمتری جسے Inferiority Complex کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بچپن میں والدین کی عدم توجہی اور شق الایمان یعنی Creedlessness۔

دوسرا بنیادی سبب وفورِ ذہانت (Excessive Intelligence) ہے۔وفورِ ذہانت سے مراد معلومات کا وہ وسیع ذخیرہ ہے جس کی بے ترتیبی تعین نہج (Determination of Gestalt) کی بجائے انسان کو کنفیوژن کا شکار کر دیتی ہے۔ یہ دراصل ایک طرح سے فکری بے راہ روی ہے جو بالآخر انسان کو سوداویہ کا مریض بنا دیتی ہے جیسا کہ جرمنی کے معروف فلاسفر فریڈرک نطشے آخری عمر میں اِس مرض کا شکار ہو گئے تھے۔اس کے علاوہ مولانا عبید اللہ سندھی اور مرزا غالب کے متعلق بھی یہی کہا جاتا رہا ہے کہ وہ بھی آخری عمر میں سوداویہ کا شکار ہو گئے تھے۔

Schizophrenia جسے عربی اور اُردو میں انفصام کہا جاتا ہے دراصل ایک ایسی روحانی بیماری ہے جس میں مریض موجود اور غیر موجود میں فرق نہیں کر پاتا۔

یہی وجہ ہے کہ عربی میں اسے فصم سے مشتق اسمِ صفت انفصام سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے معنی منقسم ہو جانے کے ہیں کہ اس بیماری میں مریض حقیقت اور توہّم میں منقسم ہو جاتا ہے۔اس بیماری کا حامل مریض ایسے جاندار کی حرکت اور صدا سننے کا دعویٰ کرتا ہے جو فی الحقیقت موجود نہیں ہوتے۔مستقل تنہائی اور توہّم اس بیماری کی بنیادی علامات ہیں۔اس بیماری کا بنیادی سبب جہالت اور ضروری معلومات کی عدم دستیابی ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ انسان تخیل کے ذریعے کسی مطلوبہ نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس رستے میں مطلوبہ بنیادی معلومات کی عدم دستیابی اُسے تیقن (Conviction) کی بجائے توہّم (Superstition) تک لے جاتی ہے جس کے سبب وہ خطائے حس (Hallucination) کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خطائے حس کی کیفیت میں مبتلا مریض کو غیر موجود نظر آنے لگتے ہیں یا پھر وہ غیر موجود کی آوازیں سن سکتا ہے جبکہ فی الحقیقت ایسا ہوتا نہیں مگر خطائے حس کے سبب اُسے ایسا معلوم پڑتا ہے۔

پرانے زمانے میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں جنات کا گھس جانا یا پھر جادو ٹونہ کا شکار ہونے والے افراد کا بے ہنگم اور بے ترتیب حرکات سرانجام دینا یا چیخنا چلانا بھی دراصل شیزوفرینیا کی علامات تھیں۔سوداویہ اور انفصام میں بنیادی فرق یاد رہے کہ سوداویہ غیر ضروری معلومات کی بے ترتیبی کے سبب یا فکر کے بے ہنگم ہو جانے یا پھر جذبات کی عدم سیرابی سے نمودار ہوتی ہے جبکہ شیزوفرینیا ضروری معلومات کی عدم دستیابی یا توہمات کے شکار ہو جانے کے سبب واقع ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سکون کی تلاش

روزنامہ پاکستان 15 دسمبر 2017

انسانی زندگی کا محور و مرکز اگر بادی النظر میں دیکھا جائے تو دھیان صرف ایک ہی مسئلے کی طرف جاتا ہے اور وہ ہے سکون۔ واضح رہے کہ سکون کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ سکون کی تلاش ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ لوگ جو سکون حاصل کر چکے ہیں اُن کے لئے قرآن میں ایک اصطلاح نفس المطمئنہ نازل ہوئی ہے یعنی ایسا نفس جو مقامِ سکینہ تک پہنچ چکا۔

اصطلاح "سکینہ" کے ضمن میں محدث امام مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیان کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو لوگ تحصیل علم کے لئے کسی مخصوص مقام پر یکجا ہوتے ہیں تو خدا اُن پر سکینہ نازل کرتا ہے۔ سکینہ کی تفسیر میں امام نووی اور طبری کی یہ رائے ہے کہ یہ ایک خاص قسم کی رحمت اور سکون ہے جو مومنین کے قلب پر نازل ہوتا ہے۔ جدید تکنیکی دور میں آج کے پریشان حال انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ سکون کا حصول ہے۔ مادی وسائل ہوں یعنی معیشت و آسائش یا پھر مابعد الطبیعیاتی یعنی سائیکالوجی اور سوشیالوجی وغیرہ انسان کی بنیادی سرگرمی یہی رہی ہے کہ کسی طور وہ حقیقی اطمینان تک پہنچ جائے۔

سائنسی ترقی کے پیچھے انسان کی بنیادی غایت کا جائزہ لینے والے ذہین یہ نکتہ بڑی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں کہ سائنس ابتداء سے انتہاء تک انسان کو آسانیاں بہم پہنچانے کی تگ و دو میں سرگرداں رہی ہے تو لبِ لباب یہی ہوا کہ بہت گہرائی میں جا کر سائنس کا مدعا بھی دراصل سکون کی تلاش کا دوسرا نام ہی ہے۔ پلاسٹک اور میٹل کی ڈبیا (موبائل) سے پانچ ہزار کلو میٹر دوری سے بات کرنا آج معمول کی بات ہے مگر سفید کاغذ کے ٹکڑے پر سیاہ حرفوں کا معتقدانہ سکون (قرآن) آج بھی کروڑوں لوگوں کیلئے جینے کا حتمی ڈھنگ ہے۔ اسی طرح انسان کی روحانی محرومیوں کو نت نئی انگریزی کی اصطلاحات میں جکڑ لینے والا سائیکالوجسٹ بھی دل ٹوٹنے کے کرب کو لفظوں کے ہیر پھیر سے رفع نہیں کرسکتا۔ بے سکونی کی سب سے بنیادی وجہ اَنا پرستی اور مایوسی ہے۔ اَنا انسان کی روح کا وہ کانٹا ہے جسے فقیروں کے سوا کوئی نہ اُکھاڑ سکا۔

مایوسی وہ بلا ہے جو انسان کو دنیا کی ہر نعمت سے بے بہرہ کر کے خودکشی جیسے قبیح فعل سے دوچار کر لیتی ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے دور میں بھی ایسے بھلے مانس رہے ہیں جو سکون سے جینے کو بے حسی سے تعبیر کرتے رہے ہیں حالانکہ یہ ایک تجرباتی حقیقت ہے کہ ہمیشہ ایک پُرسکون انسان ہی سب سے زیادہ حساس ہوتا ہے کہ جس کے پاس خود سکون نہ ہو وہ دوسروں کو کیا سکون دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مایوس اور مضطرب دوسروں کو ہمیشہ پریشان ہی کرتا رہا ہے۔

کائنات کے ساتھ ہم آہنگ صوفی سرمست نہ تو کبھی مایوس ہوتے ہیں اور نہ ہی کبھی اَنا پرستی کے چنگل میں آتے ہیں کہ انسان کی سب سے بڑی دشمن اس کی Ego یعنی انا ہی ہے۔ تکبر کے ہوتے ہوئے انسان کسی کا نہیں بن سکتا جبکہ تُو کا پہلا تعارف خدا سے ہے پھر انسان سے کہ جو شخص حقیقی معنوں میں خدا کا ہو گیا وہی تو انسان کا ہوا۔ علاوہ ازیں تو خود کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے صوفی ہم سے اکثر ایک واقعہ بیان کیا کرتے تھے، پس ضروری ہے کہ وہ واقعہ یہاں درج کروں تاکہ انا پرستی اور مایوسی کے جال میں پھنسے شوریدہ حال انسان اس دجل سے باہر نکل آئیں۔

گروجی فرمایا کرتے کہ ایک نوجوان پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا خودکشی کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک پاس ہی موجود ایک فقیر کی نظر اُس پر پڑ گئی۔ فقیر نے آواز دی کہ بھلے مانس یہ کیا کر رہے ہو؟۔ نوجوان بولا کہ گروجی بس تنگ آ گیا ہوں زندگی سے۔ کچھ بھی نہیں رہا۔ کوئی ایک خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ میرے پاس جب کچھ بچا ہی نہیں تو پھر زندہ رہنے کا فائدہ ہی کیا؟۔ اِس لئے نیچے چھلانگ لگا رہا ہوں۔

یہ سن کر فقیر نے پھر آواز دی رکو میاں رک جاؤ۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ فقیر کی یہ بات سن کر نوجوان بولا کہ آپ میری کیا مدد کریں گے؟۔ آپ تو خود فقیر ہیں۔ فقیر نے جواب دیا کہ دیکھو میاں میں یہاں پاس ہی ایک ایسے سمراٹھ (بادشاہ) کو جانتا ہوں جو آنکھیں خریدتا ہے اور اگر چاہو تو میں آپ کی ایک آنکھ ایک لاکھ میں بکوا سکتا ہوں۔ نوجوان یہ سن کر حیران ہوا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ فقیر نے جواب دیا کہ چلو پھر میرے ساتھ۔ چنانچہ فقیر نوجوان کو لے کر سمراٹھ کے پاس پہنچا۔ سمراٹھ نوجوان کی مایوسی بھانپ گیا۔ کہنے لگا کہ مجھے دونوں آنکھیں چاہئیں اور دو لاکھ لے لو نوجوان خاصا پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ آنکھیں چلی گئیں تو پھر دیکھوں گا کیسے؟۔ پس اسی تشویش میں مبتلا نوجوان بولا معاف کیجئے گا سمراٹھ جی میں اپنی آنکھیں نہیں بیچ سکتا۔

سمراٹھ اصرار کرنے لگا کہ چلیں آپ دونوں کا چار لاکھ لے لیں مگر پھر بھی نوجوان نہ مانا حتیٰ کہ سمراٹھ نے دس لاکھ تک قیمت بڑھا دی مگر نوجوان فقیر سے بولا چلیں باباجی مجھے یہاں سے لے چلو۔فقیر مسکرا کر نوجوان کو سمراٹھ کے محل سے باہر لے آیا اور کہنے لگا کہ کیا ہوا بچے؟ ۔دس لاکھ تو بہت زیادہ قیمت ہے دو آنکھوں کی۔ پیچھے کیوں ہٹ گئے تم تو پورے جسم کو مارنا چاہ رہے تھے اور یہ تو صرف دو آنکھوں کی بات ہے ۔نوجوان کھسیانی صورت بنائے فقیر سے مخاطب ہوا کہ بس باباجی آ گئی سمجھ اور میں جان گیا ہوں کہ ابھی میرے پاس اتنا کچھ ہے کہ جو لاکھوں میں بھی نہیں بیچا جا سکتا۔

خدا نے مجھے آنکھیں دیں جن سے میں پوری کائنات کی رنگینیاں دیکھ سکتا ہوں۔خدا نے مجھے کان دیئے جن سے میں پوری کائنات کی مدھر صدائیں سن سکتا ہوں۔خدا نے مجھے پاؤں دیئے جن سے جہاں چاہوں جا سکتا ہوں اور خدا نے مجھے ہاتھ دیئے جن سے اپنی مرضی کا کام لے سکتا ہوں۔دھنے واد باباجی دھنے واد۔

☆☆☆☆☆☆☆

اخلاقی اقدار کا انحطاط

روزنامہ پاکستان 08دسمبر 2017

آزادی انسان کا جوہری وصف ہے مگر جب یہ آزادی اپنا توازن کھو بیٹھتی ہے تو ایک لامحدود اذیت بن جاتی ہے نہ صرف اذیت بلکہ لامقصدیت وقنوطیت کی وہ تاریکی بن جاتی ہے جس میں اخلاقی روشنی کی کوئی کرن نمودار نہیں ہو پاتی تب انسان کو فکری بے راہروی صرف سانس کھینچنے والی مشین بنا کر مرنے کا پابند کر دیتی ہے۔شاید اسی کیفیت کو حضرت علامہ اقبال نے بیان کیا تھا۔ع

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

زندگی سے اگر اخلاقی اقدار کو نکال دیا جائے تو انسان شرفِ انسانیت سے گر کر حیوان کی سطح پر آجاتا ہے۔ چنانچہ آج کا جدید انسان آزادی کا تعاقب کرتے کرتے اخلاقیات سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ہمارا دیرینہ المیہ یہ ہے کہ ہم مغرب سے درآمدہ ہر قدر کو بغیر تحقیق وتنقید قبول کر کے اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں پھر نتیجتاً جن روحانی بیماریوں کا شکار آج مغرب ہے ٹھیک اُنہی بیماریوں کا شکار ہم بھی ہو جاتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بیس پچیس سال پہلے ہم ٹینشن، ڈپریشن، سٹریس، انگزائٹی وغیرہ کا مروجہ تصور بھی نہیں رکھتے تھے جبکہ آج یہ روحانی بیماریاں ہماری سوسائٹی میں عام ہو چکی ہیں صرف اس لئے کہ ہم بھی آزادی کے زعم میں مبتلا ہو کر اس قدر آگے نکل چکے ہیں اور آج ہمارے لئے بھی اخلاقیات محض دقیانوسیت کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتے۔

یہ ایک طویل اور مسلم تجرباتی حقیقت ہے کہ جب بھی معاشرے میں انسان روحانی اقدار کو پامال کرتا رہا ہے وہ شدید ترین روحانی اضطراب کا شکار رہوتا رہا ہے۔تاریخ اس اَمر پر گواہ ہے خود مغرب کے زرخیز اذہان بھی اس بنیادی مسئلہ پر مضطرب رہے ہیں۔

جدیدوجودیت اور مطلق آزادی کے علمبردار ژان پال سارترا اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں کہ" انسان کو آزادی کی سزا ملی ہے" گویاان کے نزدیک بھی مطلق آزادی سزا کے سوا کچھ نہیں۔

یہاں پر ایک منطقی سہو کا ازالہ ضروری ہے۔ چند ایک ذہین کہتے ہیں کہ کسی انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کا احترام کرنے کے بعد جو چاہے کرو کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر تجربات سے ثابت ہوا کہ یہ ایک حسین فریب کے سوا کچھ نہیں ۔سب سے بنیادی اخلاقی ضابطہ تو انسان کے اپنے نفس پر لاگو ہوتا ہے۔بے شک کسی کی جان ومال اور عزت کی حفاظت اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار ہیں مگر انسان سب سے زیادہ حق اپنی ذات پر رکھتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو ہر روحانی آلائش سے دور رکھے اخلاقی اقدار متعدد ہوسکتی ہیں۔ یہاں پر صرف ایک اخلاقی قدر کا ذکر کرنا ضروری ہے جس کی بنیاد پر تمام اخلاقی اقدار کھڑی ہیں ۔اگر کوئی انسان صرف اسی ایک اخلاقی قدر کو مضبوطی سے تھام لے تو وہ کبھی گمراہ اور مضطرب نہیں ہوسکتا اور یہ ایک اخلاقی قدر" حیاء" ہے۔حیاء کی تعریف میں امام راغب فرماتے ہیں کہ حیاء وہ خصلت ہے جو انسانی نفس کو ہر برائی سے روک لیتی ہے۔حیاء کی اہمیت کا اندازہ اس اَمر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ حیاء کو قرآن نے زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ عام اصطلاح میں ہم حیات کے معنیٰ زندگی ہی کرتے ہیں ۔اس کے لئے ہم عربی میں احیاء کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں یعنی زندہ کرنا تو گویا حیاء انسان کو زندگی سے ہمکنار کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ" حیاء ایمان میں سے ہے اور حیاء بالکلیہ بھلائی ہے۔" بالکلیہ بھلائی سے مراد یہ ہے کہ اگر حیاء ہے تو پھر انسان کے لئے ہر نیکی آسان ہو جاتی ہے جبکہ حیاء نہیں ہے تو پھر ہر برائی آسان ہو جاتی ہے۔فارسی میں ایک ضرب المثل ہے کہ" بے حیاء باش ہر چہ خواہد کرد" یعنی بے حیاء ہوجا پھر جو چاہے کرلے۔

آج سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ جیسی سہولیات نے جہاں انسان کے لئے علمی و معاشی مسائل حل کر رکھے ہیں تو اسکے برعکس انسان کی روحانی زندگی کو بہت بری طرح متاثر کیا ہوا ہے۔مغرب میں چونکہ سیلف پیوری فکیشن یا تزکیہ نفس کا کوئی تصور موجود نہیں اس لئے وہاں روحانی اقدار بھی کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

جبکہ ہمارے ہاں تو انسانی ذات کا مرکز ہی تزکیہ نفس ہے۔خدا ہم سے قرآن میں مخاطب ہو کر یہ اعلان کرتا ہے کہ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی یعنی کامیاب ہوگیا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا۔نفس کی پاکیزگی بغیر حیاء کے ممکن ہی نہیں اور آج چہار سو حیاء باختہ تکنیکی وسائل کی بھرمار ہے۔

پس ایسی صورتحال میں موجودہ جنریشن کو اس سے دور رکھنا اور حیاء کی تربیت دینا لابدی ہو چکا ہے نہیں تو پھر ہماری آنے والی نسلیں مغرب سے بھی زیادہ ژولیدہ حال ہوں گی۔ ہمیں چاہئے کہ اپنے بچے اور بچیوں پر چیک اینڈ بیلنس رکھیں۔ اُنہیں حیاء داری کی تربیت دیں۔ تزکیہِ نفس کے اصول سکھائیں۔

ایک ماں اور باپ کا اپنی اولاد کو سب سے بہترین تحفہ اخلاقی تربیت ہے۔ ہم جس عظیم المرتبت انسان کے ماننے والے ہیں اُن کے بارے میں خدا نے قرآن میں فرمایا کہ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ یعنی ہم نے محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاق کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز کیا۔ چنانچہ یہ ہماری بنیادی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم انفرادی طور پر اپنی اولاد اور اپنے ماتحت نفوس کی اخلاقی تربیت کریں بلکہ اس انتہائی اہم فریضہ کی انجام دہی کے لئے سٹیٹ آفیشل طور پر ایسی محافل کا انعقاد کرے۔ جہاں راست باز اور معتدل مزاج رکھنے والے ذہین اور جدید علوم سے آراستہ دانشور باقاعدہ اخلاقی تربیت پر لیکچر دیں تاکہ ہم مجموعی طور پر بھی تزکیہِ نفس کی نعمت سے بہرہ مند ہوتے رہیں۔ اگر ہم نے اس انتہائی اہم ذمہ داری سے تساہل برتا تو راقم کے الفاظ بطور اتمامِ حجت مرقوم رہیں کہ یہ معاشرہ اخلاقی پستی کی جس نہج پر پہنچ جائے گا وہاں پھر محرمات کا تقدس بھی ناپید ہو جائے گا کیونکہ نفس ہمہ وقت انسان کی ٹوہ میں ہے اور بغیر پختہ تربیت کے نفس کے چنگل سے آزادی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

دلم زندہ شد از وصالِ محمد ﷺ

روزنامہ پاکستان 30 نومبر 2017

عجیب طوفانِ بدتمیزی ہے کہ ہر سمت اضمحلالِ قلب ونظر کی فراوانی ہے ۔ایک طرف تعقل نے تنکیر کے وہ جال بچھا دیئے کہ انسان ایک خشک میکانکی آلہ بن گیا تو دوسری جانب بے کیف و لاعرفانیت کے کھوکھلے نعروں نے عشق و جذب کے منازلِ ارفع کو دہشت وجہل کی وہ بیڑیاں پہنا دیں کہ الامان والحفیظ۔

علم وحکمت بلاشبہ خدا کا نور ہے ۔اِس کے بغیر انسان خدا تک رسائی ہی نہیں حاصل کرسکتا۔یہی وجہ ہے کہ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلمِ کتاب وحکمت بنا کر مبعوث کیا گیا تا کہ آقائے نامدار اَبد قرار علم کی روشنی کے ساتھ ساتھ حکمت یعنی دانش کی لو بھی جلاسکیں اور بخدا یہی حتمی اور حقیقی روشنی ہے ۔علاوہ ازیں دجل ابلیس اور آزارِ قلب ہے ۔پس اِسی علم کا نور جب معرفت کے منازل سے گزر کر عشقِ محمدیہ میں روپانتر ہوتا ہے تو بیک جنبش ساعت قلب ونظر کو تمام تر روحانی آلائشوں سے منزہ کردیتا ہے ۔حضرت رومی فرماتے ہیں کہ علم تو ایک ہی ہے ۔ع

علم نبود جز بعلم عاشقی
مابقی تلبیس ابلیس شقی

حقیقتِ محمدیہ کا کماحقہ ادراک ہی انسان کو دراصل عشقِ محمدیہ سے ہمکنار کرتا ہے اور یہ نکتہ سالکین بہتر طریق سے جانتے ہیں ۔یہ اصول اس قدر مضبوط اور لافانی ہے کہ بنا آشنائی صحبت راس ہی نہیں آسکتی کیونکہ کوئی چیز ہو یا انسان جب تک آپ اس سے کماحقہ آگاہ نہیں ہو جاتے تب تک آپ اس کی اصلیت وحقیقت تک نہیں پہنچ سکتے ۔حضرت اقبال اس نکتہ کو بہت خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں ۔ع

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

محبتِ حقیقی دراصل اُس وقت رونما ہوتی ہے جب آپ محبوب کی ذات وصفات اوراس کی روحانی رفعت سے کماحقہ آگاہ ہوجاتے ہیں اور یہ وہ انتہائی بنیادی ذرائع ہیں محبت کی توقع کے جس کو کوئی بھی ذہن مسترد نہیں کرسکتا۔محبوب کو جانے بغیر محبت کادعویٰ مغلوبِ ماحول کرسکتا ہے یا پھراضمحلالِ قلب ونظر کا حامل تاکہ وہ اپنے روحانی کرب کا عارضی بنیادوں پرازالہ کرکے آگے بڑھ جائے۔شومئی قسمت کہ ہمارے ہاں آج اِن دوصفات کے حامل افراد کی بہتات ہے۔بخدا چراغ لے کربھی ڈھونڈنے سے ایسے نفوس آج نہیں ملیں گے جن کی روح میں عشقِ محمدیہ کی لوجل رہی ہو۔
حضرت بیدم شاہ وارثی فرماتے ہیں۔ع

عدم سے لائی ہے ہستی میں آرزوئے رسول
کہاں کہاں لئے پھرتی ہے جستجوئے رسول

خداگواہ ہے کہ عشق ہُوک کے بغیر کُوک نہیں سکتااورعاشق کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے۔ع

ہوک کروں تو جگ جرے اور جو کچھ ہے جر جائے
پاپی جیارا ناہی جرے کہ جاں میں ہوک سمائے

ایسی اعصاب شکن وروح کشیدہ کیفیت میں انسان کیسے کون ومکاں سے باخبر ہوسکتا ہے۔پس جوخبر دار ہے وہ ناقص ہے اس کو چاہیے کہ وہ سلوک کی راہ اختیار کرے۔کسی صاحب نظر کی صحبت اختیار کرے۔علاوہ ازیں یہ مقام محض آموختہ کتب کا محتاج نہیں اور نہ ہی صَرف ونحو کی جگلری سے نمودار ہوتا ہے۔حضرت رومی فرماتے ہیں۔ع

آں علم کہ در مدرسہ حاصل گردد
کارِ دگر است و عشق کارِ دگر است

عشق دلائل و استنباط کی بوقلمونیوں سے منزہ ہے۔ عشق جہل کا مرکب ہے نہ ہی ریا کا استعارہ۔ عشق عرفان کی وہ آخری آرام گاہ ہے جس کے بعد انسان اس قابل ہی نہیں رہتا کہ وہ دنیاوی احتیاج پر دھیان دے سکے۔
پس جو افراد عشقِ رسول ﷺ کے نعرے لگاتے ہیں وہ یقیناً بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ یہ تو وہ مقام ہے جہاں الفاظ اپنا وجود کھو دیتے ہیں اور کیفیت اپنے اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ عارفین کہتے ہیں کہ عشق ہڈیاں سرمہ نہ کر دے تو وہ کیونکر عشق ہوا۔ ع

عشق گر خاک نہ کر دے
تو ہوا خاک پھر عشق

عارفین کا قول ہے کہ خدا سے اس قدر محبت کرو کہ تمہارا سینہ روشن ہو جائے اور پھر خدا کے رسول ﷺ سے اس قدر محبت کرو کہ تمہارا سینہ پھٹ جائے، تو اب اَمرِ خوض یہ ہے کہ جس کا سینہ پھٹ جائے وہ بھلا کیسے دنیاوی اُمور میں ہوس وحشم کا حامل ہوسکتا ہے؟۔ یقیناً نہیں ہوسکتا۔ عاشق اگر بقاء باللہ پر بھی مقیم ہو تب بھی اِس سے اس اَمر کی توقع ممکن نہیں کہ وہ کسی جہل ومخرب التہذیب قول یا فعل کا ارتکاب کرے چہ جائیکہ عاشق مخبوط الحواس ہو۔
عشق جسے صوفیاء تصوف سے تعبیر کرتے ہیں یا تصوف جسے صوفیاء عشق سے تعبیر کرتے ہیں دراصل مخ الاسلام یعنی اسلام کا مغز ہے۔ پس عشقِ الٰہی اسلام کی بنیاد اور عشقِ محمدیہ اسلام کا محور ہے جس کے گرد پورا اسلام متحرک ہے۔ قرآن میں عشق کی ابتدائی کیفیت کا ذکر ہے جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ ایمان چونکہ ایک ابتدائی اور انتہائی آسان مقام ہے اس لئے خدا نے عام انسانوں سے اسی کا ہی مطالبہ کیا ہے مگر عارفین کا دل کہاں بھرتا ہے جب تک کہ وہ خدا کی محبت میں مستغرق نہ ہو جائیں۔ انتہائی معروف روایت ہے۔ آقائے نامدار اَبد قرار فرماتے ہیں کہ "أَكْثِرُوا ذِكْرَ اللهِ تَعَالَى، حَتَّى يَقُولُوا مَجْنُونٌ" یعنی خدا کا ذکر اس قدر اپنے اندر جا گزیں کر لو کہ لوگ تمہیں دیوانہ کہنا شروع کر دیں۔ (رواه حاکم فی المستدرک علی الصحیحین۔ جلد-1۔ صفحه677-رقم1839- دارالکتب العلمیه بیروت۔)۔ پس اِسی دیوانگی کو صوفیاء عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔

سلطان العارفین حضرت سلطان باہو بہت خوبصورت طریق سے اِس مقام کی رفعت بیان کرتے ہیں ۔ع

ایمان سلامت ہر کوئی منگے عشق سلامت کوئی ہُو
منگن ایمان شرماون عشقوں دل نوں غیرت ہوئی ہُو
جس منزل تے عشق پچاوے ایمان خبر نہ کوئی ہُو
عشق سلامت رکھیں باہو ایمان دیاں در وہی ہُو

زمانہ بدل گیا ہے۔آج حمقاء کی روحانی تربیت کیلئے عارف کی خانقاہ رہی نہ ہی پیر مغاں کا میکدہ۔ذہنی خشکی اور روحانی خلاء نے انسان کو ہوسِ زن، زر اور زمین میں مبتلا کر دیا ہے۔پس ایسے میں دل مردہ کیوں نہ ہوں۔کون ہے جو عارف کے علاوہ زر کی چمک زن کے فریب اور زمین کی ہوس سے محفوظ رہ سکے۔ہاں اگر وہ عارف ہے کیونکہ عارف کا دل ہمہ وقت عشقِ محمدیہ کی لو سے منور رہتا ہے اس لئے دنیا کی کوئی بھی تاریکی اسے مردہ نہیں کر سکتی بلکہ روشنی تو ہے ہی فقط عشقِ محمدیہ کا دوسرا نام۔حضرت مولانا عبدالرحمن جامی فرماتے ہیں۔ع

جہاں روشن است از جمالِ محمد ﷺ
دلم زندہ شد از وصالِ محمد ﷺ

☆☆☆☆☆☆☆

مرشد فاؤنڈیشن

روزنامہ پاکستان 10 اگست 2017

تصوف نام ہے علم الذات والکونیات کا۔اپنی ذات کا علم انسان کو تزکیہِ نفس وتصفیہِ قلب کی راہ پر لگا دیتا ہے جبکہ کونیات یعنی Cosmology کا علم انسان کو کائنات سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔تصوف کو ہم اگر دو اساسی گروہوں میں تقسیم کریں تو ایک حلقہ وہ ہمارے سامنے آتا ہے جو میتھالوجیکل پیراڈائم میں جکڑا ہوا ہے دوسرا وہ جو علم اور محبت کے دائرے میں تیر رہا ہے۔

پہلے گروہ میں وہ لوگ آتے ہیں جو اپنے زمانے میں خالص روایتی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور جو نہ صرف خود پختہ عقائد کے حامل تھے بلکہ ساری عمر اُنہوں نے عوام میں عقائد کی ترویج کے لئے جدوجہد کی۔یہ لوگ یقیناً با کمال ہوں گے لیکن ان لوگوں نے عوام میں علم وتحقیق کی تمام راہیں قریباً مسدود کر دیں جبکہ اس کے برعکس وہ صوفیاء جو علم وتحقیق اور خالص معرفت کی راہیں وا کرتے رہے آج بھی حق کے متلاشیوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔چنانچہ ابن العربی اور سیدی رومی کو کسی بھی زمانے میں نہیں بھلایا جاسکتا۔یہ وہ جلیل القدر نفوس تھے جنہوں نے اپنے زمانے میں خود کو ایک عام انسان کے مقام پر رکھ کر علم وتحقیق کے حصول کے لئے جدوجہد کی اور تقدیس وتفاخر سے خود کو دور رکھا۔

اس میں کسی بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہم سب انسان فطری طور پر ایک ہی روشنی اور توانائی لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ہماری ارواح بلاتفریق نسل ومذہب اور رنگ وجغرافیہ ایک ہی جوہر لے کر واقع ہوتی ہیں۔اس وقوع میں تخصیص وتقدیس لایعنی ہے ہاں حفظِ مراتب ایک بہترین اخلاقی ضابطہ ہے۔اس کائنات میں پیدا ہونے والے ہر انسان کی روح میں نور یعنی پوٹینشل موجود ہوتی ہے۔ہاں جو لوگ اسے دریافت کر لیتے ہیں وہ صوفی کہلاتے ہیں۔چنانچہ تصوف کو کسی کے ذاتی مشاہدات وتجربات میں قید نہیں کیا جاسکتا۔تصوف ایک عالمگیر سچائی ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہے۔یہ ایک پوشیدہ حقیقت ہے کہ ہر انسان فی نفسہٖ صوفی ہے۔بات صرف اتنی ہے کہ اس روشنی کو دریافت کیا جائے۔مرشد فاؤنڈیشن اِسی روشنی کو دریافت کرنے کا نام ہے۔

مرشد فاؤنڈیشن کا قیام میری دیرینہ علمی تمنا تھی جو آج ایک طویل عرصے کی مسلسل جدوجہد کے بعد رُوبہ عمل ہوئی۔مادیت انسان کا بنیادی محور ہے چنانچہ اس سے مفر ممکن نہیں۔

فقر و فاقہ کے قائل بزرگ اس انتہائی اہم بنیادی ضرورت سے مفر کیوں حاصل کر لیتے ہیں یہ محض ان کی انفرادی چوائس ہے۔تصوف ایسا کوئی حکم لاگو نہیں کرتا۔میری یہ انتہائی کوشش رہی ہے کہ تصوف کو قدیم میتھالوجیکل پیراڈائم اور عقیدت کی بوسیدگی سے نکال کر ایک بہتے جھرنے کی مانند رواں دواں کر دیا جائے۔جہاں نہ کوئی فکری جکڑن ہو نہ ہی تقدیس کی دبیز چادر کیونکہ ہر انسان قابل تکریم و اعتراز ہے۔اپنے لئے کسی کو رہنما متعین کرنے میں کوئی قباحت نہیں مگر اس کا لحاظ ہمیشہ رہے کہ یہ تعلق شخصیت پرستی کی شکل نہ اختیار کر لے۔میں نے علم و معرفت کے پوشیدہ خزانے گرو رجنیش المعروف اُوشو سے حاصل کئے جبکہ علم سے محبت کی ورثا مجھے سیدی جلال الدین رومی کی شخصیت سے نصیب ہوئی اور کرم بابا صاحب حضرت خواجہ سیّدنا نظام الدین اولیاء کا ہوا گویا آپ برس پڑے مجھ پر بھادوں کی بارش کی مانند مگر میں نے کبھی اِن شخصیات کو بت نہیں بنایا نہ ہی اس اَمر کی کبھی ترویج کی۔اُوشو اکثر فرمایا کرتے کہ "آپ سب کا گرو Existence یعنی موجودیت ہونی چاہئے اِس کے سوا کوئی گرو نہیں"۔

روحانی ارتقاء کیوں ضروری ہے؟۔اِس سوال کا سادہ جواب یہ ہے کہ روحانی Elevation یعنی رفعت سے انسان مکتی (مغفرت) تک پہنچ جاتا ہے۔دنیا کا ہر مذہب بالخصوص اسلام ہمیں مغفرت کی تلقین کرتا ہے اور خدا اُن لوگوں کو بہت پسند کرتا ہے جو مسلسل استغفار کرتے ہیں۔معروف روحانی اُستاد سدھارتھ گوتم بدھ مغفرت کو نروان سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ روحانی ارتقاء کے بغیر ممکن نہیں۔یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ روحانی ارتقاء کی راہ میں سب سے بنیادی رکاوٹ اندھا عقیدہ اور شخصیت ہے۔اندھا عقیدہ اور شخصیت دراصل ایک ہی ذہنی کیفیت کی دو مختلف اشکال ہیں۔آپ علم اور عقیدہ میں سے بیک وقت ایک ہی کیفیت کے تابع ہو سکتے ہیں۔اگر آپ نے حق کی راہ اختیار کرنی ہے تو آپ کو علم کی پیروی کرنی ہوگی لیکن اگر آپ سہولت اور تن آسانی کے قائل ہیں تو یقیناً عقیدہ ہی آپ کا مداوا کر سکتا ہے،علم عقائد پر حاوی ہے مگر عقائد کبھی علم پر حاوی نہیں ہو سکتے۔

مرشد فاؤنڈیشن علم،محبت اور مراقبہ کی بنیاد پر قائم ہونے والا پہلا روحانی ادارہ ہے۔جس کا قیام فکری جمود کے حامل معاشرے میں ایک جاری وساری چشمۂ تسکین و پیہم آگہی ہے۔ہمیں اس اَمر کا بخوبی ادراک ہے کہ یہاں روحانیت ہمیشہ سے جنات اور موکلات کے ذریعے شو بھو کروانے کا نام ہے۔چنانچہ اپنے آپ کو کھوجنے کی مشق کبھی ہمارے ہاں رائج نہیں ہوئی۔

اس لئے ہم جانتے ہیں کہ ہماری راہ میں رکاوٹیں ضرور آئیں گی مگر ہم نے اپنے مقصد سے کب پیچھے ہٹنا ہے۔ ہمارے نزدیک جستجو سے بڑا کوئی معجزہ نہیں اور محبت سے بڑی کوئی کرامت نہیں۔ ارض وسما ہماری مٹھی میں نہیں بلکہ ہمارے شانہ بشانہ ہیں۔ ہم کائنات سے ہم آہنگ ہونے کی ہر ممکن تگ و دو میں ہمہ تن منہمک ہیں۔ مرشد فاؤنڈیشن وہ پلیٹ فارم ہے جہاں پر ہم اس جلتے ہوئے سیارے کے ہر باسی کو اپنے آپ سے متعارف کرانے کی جدوجہد کریں گے۔ خود کو ڈھونڈنے اور خدا سے لامحدود ربط قائم رکھنے میں اگر آپ دلچسپی لے رہے ہیں تو آئیے ہمارے ہمسفر بن جائیے۔ ہم آپ کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ مرشد فاؤنڈیشن کی آفیشل ویب سائٹ وزٹ کرنے کے لئے نیچے مرشد فاؤنڈیشن کے URL تک رسائی حاصل کریں۔

www.murshidfoundation .org

منازلِ سلوک

روزنامہ پاکستان 20 جولائی 2017

تصوف اسلام کی روح ہے جیسا کہ قرآن میں ذکر" قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰى "۔یعنی کامیاب ہوگیا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا۔نفس کی پاکیزگی کا نام تصوف ہے۔انسان کا باطن ہی اُس کے ظاہر کا عکاس ہوتا ہے۔اگر باطن میں کچھ خرابی پیدا ہوجائے تو اس کا اثر ظاہر پر بھی ہوجاتا ہے۔ بلاشبہ شریعت ظاہر پر توجہ دیتی ہے مگر قرآن میں متعدد بار باطن کی صفائی کا بھی ذکر موجود ہے۔ چنانچہ باطن کی صفائی کے لئے صوفیاء نے چار درجات متعین کئے ہیں جن پر عمل کرکے ہر مسلمان نہ صرف اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کے قابل ہوسکتا ہے بلکہ اپنے باطن کا تزکیہ کرنے کے قابل بھی ہوسکتا ہے۔ اِن چار منازل پر ہم ترتیب سے مختصر روشنی ڈالتے ہیں۔

شریعت : شریعت کے لغوی معنی تو پنگھٹ کے ہیں مگر اسلامی اصطلاح میں شریعت اُن قوانین کے مجموعے کو کہتے ہیں جو اللہ اور اس کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے سپرد کئے۔ ہر وہ شخص جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتا ہے اُس پر شریعت نافذ ہوجاتی ہے۔اس کو ہم ایسے سمجھ لیتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آرمی جائن کرتا ہے تو اُس پر آرمی کے تمام قوانین لاگو ہوجاتے ہیں۔اس کے برعکس اگر کوئی شخص آرمی جائن نہیں کرتا تو اس پر آرمی کے قوانین بھی لاگو نہیں ہوں گے۔شریعت ایک ہی ہے اور وہ ہے شریعتِ محمدی جس کی تھیوری قرآن اور پریکٹیکل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات ہے۔شریعت کے لحاظ سے اس وقت امتِ مسلمہ مختلف راستے اپنا چکی ہے اور یہ سب راستے اللہ تک جاتے ہیں۔ہمیں اسلام کے کسی بھی مسلک پر تنقید یا اعتراض کا کوئی حق نہیں۔سب کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں اور وہ اپنے اپنے اعمال پر مطمئن ہیں فلہٰذا ہم کسی کو کنفیوز نہیں کرنا چاہتے۔اس لئے ہم یہی تجویز پیش کرتے ہیں کہ ہر مسلمان اپنے ہی مسلک کے مطابق شریعت پر عمل کرے۔

ہم نے کوئی نیا مسلک نہیں بنانا جس کی طرف ہم لوگوں کو بلاتے پھریں۔اِس لئے بہتر یہی ہے کہ ہر مسلمان شریعت کے ضمن میں اپنے ہی مسلک کی پیروی کرے۔

طریقت : طریقت کے لغوی معنی تو راستے کے ہیں مگر تصوف کی اصطلاح میں طریقت اُس عہد کو کہتے ہیں جو باطنی اصلاح کے لئے کسی صاحبِ حقیقت کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کیا جائے۔

یہ ایک روایتی اسلوب ہے جو ہمارے ہاں رائج چار مختلف صوفی سلاسل کی بنیاد پر قائم ہے یعنی قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک سلاسل ہیں مگر معروف یہی چار ہیں۔ شریعت جہاں انسان کو جسمانی ضابطہ فراہم کرتی ہے تو وہاں طریقت سے انسان روحانی پاکیزگی حاصل کرتا ہے گویا طریقت روحانی ارتقاء کا اولین مقام ہے۔ روح کی تہذیب اور ارتقاء اس لئے ضروری ہے کہ جسم کا سارا دارومدار روح پر قائم ہے چنانچہ روح کی تخریب و انتشار دراصل جسم کی تخریب و انتشار ہے اس لئے روح کی تہذیب بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ طریقت نہ صرف روح کو تہذیب سکھاتی ہے بلکہ انسانی فکر کو ارتقائی مراحل سے گزرنے میں بھی مدد دیتی ہے بشرطیکہ مرشد صاحبِ حقیقت ہو۔ اگر مرشد صاحبِ شریعت ہے اور اُس نے خود باطنی منازل طے نہیں کیں تو وہ اپنے سے جڑے لوگوں کو بھی وہیں لا کھڑا کرے گا جہاں وہ خود موجود ہوگا۔ اس لئے کسی کا لڑ پکڑتے وقت انتہائی ذہانت اور تدبر سے کام لینا چاہیئے۔

معرفت : معرفت کے لغوی معنی شناخت کے ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں معرفت سے مراد دراصل خدا کی پہچان ہے اور خدا کی پہچان کا پہلا راستہ خود کی پہچان ہے۔ ایک صوفی بزرگ کا قول ہے کہ "جس نے خود کو پہچان لیا اُس نے خدا کو پہچان لیا"۔ خدا کی معرفت کا یہ مرحلہ اُن بنیادی قوانین کی پریکٹس سے شروع ہوتا ہے جو خدا کے برگزیدہ پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن میں ہمیں بتا دیئے اور جسے فقہی اصطلاح میں شریعت کہتے ہیں اور جس کا ابتداء میں ہم ذکر کر چکے۔ خدا تک پہنچنے کے کئی ایک راستے ہیں اور ہر مذہب نے الگ الگ راستے بتائے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ہم تمام معتبر مذاہب کا تذکرہ کریں گے۔ شریعت سے مراد خدا کے مقرر کردہ قوانین پر عمل کرنا، طریقت سے مراد اُن قوانین کی پریکٹس کرنا کسی صاحبِ حقیقت کے ہاتھ پر بیعت کر کے جبکہ معرفت سے مراد خدا کی پہچان حاصل کرنا اُن قوانین پر غور و فکر کر کے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار ہمیں غور و فکر کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ہم خدا کی معرفت حاصل کر سکیں۔ قرآن میں ہے کہ خدا ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور یہ قربت خدا کی معرفت کے در کھولتی ہے بشرطیکہ غور و فکر سے کام لیا جائے۔

حقیقت : حقیقت کے لغوی معنی ثابت ہو جانے کے ہیں مگر تصوف کی اصطلاح میں حقیقت دراصل خدا تعالیٰ کی کلی معرفت فی الوجود ہے۔ اس سے مراد یہ کہ چونکہ خدا تعالیٰ کوئی مخصوص شخصی وجود نہیں رکھتا اس لئے اس کو پھر تمثیل کے طور پر صوفیاء وجودِ مطلق پر محمول کر لیتے ہیں۔

یہ معرفت کا حتمی اور انتہائی دقیق مقام ہے جس کو غیر صوفی کے لئے سمجھنا کافی مشکل ہے حتیٰ کہ وہ سالک جو سلوک کی راہ میں سفر کر رہا ہو اس کے لئے بھی اس مقامِ ارفع کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں پر خالق ومخلوق میں دوئی کا پردہ چھٹ جاتا ہے۔ دوئی جس کو صوفیاء حقیقی شرک سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل ایک ایسا مقام ہے جس پر رہتے ہوئے وحدت کے رمز کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ وحدت یعنی دوئی کا خاتمہ یہ وہ مقام ہے جہاں ذات غیر از ذات میں تحلیل ہو کر توحیدِ اصلی کی شکل اختیار کر لیتی ہے پس یہ مرتبہِ حقیقت ہے۔ شیخِ اکبر ابن عربی فرماتے ہیں۔ ع

الرب	عبد	والعبد	رب
یاَلیت	شعری	من	المکلف

☆☆☆☆☆☆☆

اکیڈیمک دھندہ

روزنامہ پاکستان 13 جولائی 2017

سینہ بہ سینہ علم کے دور تو خیر کب کے لد چکے۔ایک زمانہ تھا جب علم کے حصول کے لئے انسان دور دراز کا سفر اختیار کرتا اور اس کام کے لئے پوری زندگی وقف کر دیتا۔شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری سنسکرتی تہذیب میں برہمچاری کو بہت تعظیم کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ظہورِ اسلام کے بعد تو اہلِ اسلام کی ایک مسلسل علمی روایت موجود رہی ہے جو ہمارے علم و حکمت کے شاندار ماضی کی عکاس ہے۔

ہندوستان میں بھی حصولِ علم کی روایت بہت مضبوط تھی۔بے شک ہمارے پاس شاندار سکول اور کالج نہیں تھے۔ بیٹھنے کے لئے فارمیکا کے ڈیسک اور بینچ نہیں تھے مگر جھنڈ کے سائے تلے بیٹھ کر ہم نے حصولِ علم کی وہ روایت رقم کی کہ جس کی مثال شاید ہی کسی تہذیب میں موجود ہو۔دنیا کی پہلی باقاعدہ یونیورسٹی براعظم ایشیاء ہی میں قائم ہوئی جس کو تکشلا یونیورسٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو ٹیکسلا (موجودہ پاکستان) میں قائم کی گئی تھی اور جس کے بوسیدہ آثار آج بھی ہمارے شاندار ماضی کے غماز ہیں۔

ہمارے تعلیمی نظام میں معیار اور محنت کا گلا گھونٹنے والے لارڈ میکالے نے ہمیں اپنا مستقل غلام بنانے کے لئے انگلش ایجوکیشن ایکٹ 1835ء کے تحت جو نصاب ترتیب دیا تھا وہ آج بھی من وعن ہمارے ہاں رائج ہے جبکہ اس سے قبل ہم علم اور دھندے (بزنس) میں خاطر خواہ تفریق کیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے رِشی مُنی اور مولوی اپنی تمام عمر علم وحکمت کے لئے وقف کر دیتے چاہے اُن کے معاشی حالات انتہائی بحران رسیدہ کیوں نہ رہتے مگر وہ اپنے عزم اور مقاصد میں یگانہ روزگار رہتے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت جدید وسائل اور ٹیکنالوجی کے حامل وہی لوگ ہیں جنہوں نے صدیاں ہمیں اپنا فکری اور معاشی غلام بنائے رکھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قوم میں ملی شعور اور اپنی تہذیب پر مضبوط تفاخر موجود ہے وہ اس اَمر کو خاطر میں نہیں لاتے کہ جدید وسائل پر کس کا قبضہ ہے۔اِس کی مثال ہمارے پڑوس چائنہ اور افغانستان کی دی جاسکتی ہے۔میں ایک مختصر سا عرصہ چائنیز کے ساتھ رہ چکا ہوں۔یہ قوم بہت خود دار اور اپنی تہذیب پر فخر کرنے والی ہے۔

انہیں نہ صرف اپنی زبان پر ناز ہے بلکہ اپنی بود و باش کو دنیا کی سب سے بہترین بود و باش سمجھتے ہیں۔ یہ قوم علمی لحاظ سے کسی طرف منہ نہیں کرتی اور یہ دنیا کی واحد قوم ہے جو علم و تعلیم کو دھندہ نہیں سمجھتی۔ ہمارے ہاں اب تعلیمی نظام مکمل طور پر ایک دھندے کی شکل اختیار کر چکا ہے اور ہمارا اُستاد اِس وقت ایک منجھا ہوا بزنس مین بن چکا ہے۔ ڈگری جو کسی زمانے میں علم و حکمت کی ضمانت سمجھی جاتی آج صرف حصولِ معاش کا ایک پروانہ بن چکی ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے انتہائی پسماندہ ترین گاؤں میں بھی چار پرائیویٹ سکول ہیں اور وہ اپنا کاروبار بہت عمدہ طریقے سے چلا رہے ہیں۔ اگر ہمارے سرکاری سکول بھوت بنگلہ نہ بن چکے ہوتے تو شاید آج یہ اکیڈیمک دھندہ اتنا جڑ نہ پکڑتا۔ ملک کے کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے شہر میں سروے کر کے دیکھ لیں حمام نہیں ہوگا لیکن پرائیویٹ سکول ضرور موجود ہوں گے۔ آخر کیوں؟ کیا ہم اِس قدر پڑھی لکھی قوم ہیں؟۔ بالکل بھی نہیں۔ ہمیں پڑھنے لکھنے سے کوئی مطلب نہیں۔ ہمارا مقصد تو محض حصولِ معاش ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم ایک مہنگا فیشن بن چکی ہے اور یہ فیشن متعارف کروانے والے ہمارے پرائیویٹ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہیں۔ آئے روز کوئی نہ کوئی پرائیویٹ یونیورسٹی لاؤنچ ہو رہی ہے گویا جس کے پاس چار پیسے ہیں وہ اسی دھندے میں انویسٹ کر رہا ہے۔

ہمارے ایک دوست میونسپل کارپوریٹ رہ چکے ہیں۔ عوامی نمائندگی کے دوران خوب کمایا۔ جب اُن کا پانچ سالہ دور ختم ہوا تو اُنہوں نے ایک لاء کالج بنالیا شہر میں۔ مجھے معلوم ہوا تو احوال دریافت کرنے اُن کے آفس پہنچ گیا۔ جب اُنہیں پرنسپل کی سیٹ پر براجمان دیکھا تو زمین نکل گئی پیروں سے۔ میں نے عرض کیا کہ ناظم صاحب یہ کیا بات ہوئی؟۔ ایک تحصیل ناظم لاء کالج کیسے قائم کر سکتا ہے؟۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے۔ مرشد آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہماری پارٹی کو واپس اقتدار میں آتے آتے پانچ سال لگ جانے ہیں تب تک کوئی روزی روٹی کا تو بندوبست کرنا تھا۔ تھوڑی سی رقم پاس تھی، سو چا اسی شعبہ میں انویسٹ کر دوں۔ آپ پریشان نہ ہوں میں نے بڑے تگڑے وکیل اساتذہ رکھ لئے ہیں پڑھانے کے لئے۔ واقعی ہمارے ہاں سب کچھ مل جاتا ہے بس پیسہ لگانے کی دیر ہے۔

فطرت کے اس انتہائی بنیادی اصول کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ ہر انسانی ذہن حصولِ تعلیم کے لئے نہیں پیدا ہوتا۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کے مقبول ترین انسان محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کی فارمل ایجوکیشن کے حامل نہیں تھے۔ اِس دنیا کی ہیئت بدلنے والی اَن گنت شخصیات اپنے زمانے کی رسمی تعلیم کی حامل نہیں تھیں۔

ہم اگر تاریخِ دنیا کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ دنیا میں ایسے کئی ایک اعلیٰ صفات انسان موجود رہے ہیں جو نہ تو رسمی تعلیم کے حامل تھے نہ ہی معقول معیشت کے مگر پھر بھی انہوں نے فطرتی ذہانت سے دنیا کے سوچنے کے انداز بدل دیئے۔ مدراس جسے آجکل چنائی کہا جاتا ہے کے ایک انتہائی پسماندہ گاؤں اَروڑ میں پیدا ہونے والے غریب تامل بچے شری واستو را مانو جن جس کے پاس نہ تو تعلیم حاصل کرنے کے پیسے تھے نہ ہی پیٹ پالنے کے، مگر پھر بھی انہوں نے علم الہندسہ (Arithmetic) میں نا قابل یقین تحقیق پیش کر کے دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا۔ اِسی طرح سائیکل مرمت کرنے والے رائٹ برادران بھی کسی مہنگے سکول کے پڑھے ہوئے نہیں تھے جنہوں نے دنیا کو جہاز بنا کر دیا۔ علمی پختگی اور فن میں مہارت بغیر کسی مہنگے سکول میں پڑھے ہوئے بھی آ سکتی ہے کیونکہ انسانی فطرت فی نفسہٖ ایک آفاقی ذہانت پر منحصر ہے۔ ہاں تربیت کا اہتمام ضروری ہے۔ صرف حصولِ ڈگری کے لئے بچوں کو اچھے سکول اور یونیورسٹیوں میں داخل کرنا پڑھے لکھے احمق پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

دی کنٹریکٹر از ریمنڈ ڈیوس

روزنامہ پاکستان 06 جولائی 2017

آج کل سوشل میڈیا پر پاکستان میں کام کرنے والے سابق سی آئی اے کنٹریکٹر ریمنڈ ڈیوس کی کتاب کا معاملہ بڑا اُچھل پڑا ہے۔کتاب میں اُنہوں نے جس دیدہ دلیری سے ہمارے انتہائی حساس ادارے کے سربراہ اور دیگر سیاسی لیڈروں کا مذاق اُڑایا ہے وہ اَمریکی عوام کی مہذب منافقت کی زبردست عکاسی کرتا ہے۔انہوں نے انکشاف کیا کہ انہیں رہا کرنے میں پاکستان کے حساس ادارے کے علاوہ چند ایک سیاسی رہنما بھی شامل تھے جنہوں نے سرتوڑ کوشش کرکے زبردستی کی دیت کے بدلے اُنہیں عدالت سے باعزت بری کروایا۔
ریمنڈ ڈیوس کے اس انکشاف میں کس حد تک حقیقت ہے یہ اُس وقت تک معلوم کرنا ممکن نہیں جب تک کہ دوسری طرف سے کوئی باقاعدہ تردید یا تائید سامنے نہ آجائے۔ریمنڈ نے جو کہا اگر وہ جھوٹ پر مبنی ہے تو ریمنڈ کی کتاب کو عالمی عدالت انصاف میں چیلنج کرنا چاہئے۔مگر مسئلہ یہ ہے کہ گورے ابتداء ہی سے برصغیر کے لوگوں پر اپنی علمی، سیاسی اور معاشی برتری ثابت کرتے آئے ہیں۔ان کی یہ خودسری کوئی نیا اقدام نہیں ہے۔افسوس یہی ہے کہ ہم لوگ ان کی اس خودسری کو دوام بخشتے آئے ہیں۔اگر ہمارے اندر ان سے مقابلہ کرنے کا صرف جذبہ ہی پیدا ہو جاتا تو یہ ہر لحاظ سے ڈرپوک قوم ہمارے گلے نہ پہنچ پاتی۔ایک شخص دن دہاڑے پاکستان کے دو غریب شہریوں کو گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی کرکے عدالت کے راستے محفوظ ہو کر نکل جاتا ہے۔
عدالت اور ہمارے مقتدر طبقے مقتول کے لواحقین کو اِس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ قصاص کے بدلے دیت پر آمادہ ہوں اور ایک مضبوط اَمریکی شہری کو صحیح سلامت واپس اپنے ملک جانے دیں۔گویا ہم اُسے روک کر اُس پر مقدمہ چلانے اور اُسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کی بجائے اُسے باعزت بری کرکے واپس اپنے ملک بھیجنے کی فکر میں تھے۔ہمارا یہ اقدام اس اَمر پر گواہ ہے کہ یا تو ہم ایک انتہائی مجبور اور کمزور قوم ہیں یا پھر ہم ایمان اور ضمیر جیسی عنقا اقدار سے مفرور ہو چکے ہیں۔
دنیا کا ہر مذہب اور بالخصوص اسلام ہمیں سچ کا ساتھ دینے اور انصاف کیلئے مر مٹنے کا حکم دیتا ہے۔

اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ انصاف کے راستے میں اگر تمہارا دشمن تمہارا باپ بھی ہو تو اُس کا ڈٹ کر مقابلہ کرو حتیٰ کہ اس کو شکست دے کر انصاف کا بول بالا کر دو۔ مگر ہم فی نفسہٖ قوتِ ارادی سے خارج قوم ہیں جو اپنے حق کیلئے لڑنا تو درکنار محض آواز اُٹھانے کی بھی ہمت نہیں رکھتی۔ ہم نے اگر کسی سے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا بھی ہے تو وہ صرف ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ ریمنڈ نے اپنی آپ بیتی لکھ کر پاکستانی حکام اور بالخصوص ہمارے حساس ادارے پر جو اپنے تئیں مضبوط تعاون اور ہمارے نزدیک بدترین الزامات لگائے ہیں ان کا ایک سرسری مطالعہ ریمنڈ کی کتاب سے لئے گئے چند ایک اقتباسات سے کیا جاسکتا ہے۔ ریمنڈ ڈیوس لکھتا ہے کہ"جب دیت کے تحت معاملہ نمٹانے کا فیصلہ کیا گیا تو اس میں ایک الجھن یہ آگئی کہ مقتولین کے عزیزوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ 14 مارچ کو آئی ایس آئی کے اہلکار حرکت میں آئے اور انھوں نے تمام اٹھارہ عزیزوں کو کوٹ لکھپت جیل میں بند کر دیا۔ ان کے گھروں کو تالے لگا دیئے گئے اور ان سے موبائل فون بھی لے لئے گئے"۔ سنتا جا شرماتا جا۔ ریمنڈ کا یہ اقتباس انتہائی حیران کن اور افسوس ناک ہے۔ ان واقعات کی تصدیق تو مقتول کے لواحقین ہی کر سکتے ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ایک الزام ہے یا پھر اَمریکہ کے ساتھ وہ تعاون جو ہمارے محافظ ادارے کی جانب سے کیا گیا؟۔

ریمنڈ ڈیوس مزید لکھتا ہے کہ" جنرل پاشا کو صرف دو دن بعد یعنی 18 مارچ کو ریٹائرڈ ہو جانا تھا اس لئے وہ سرتوڑ کوشش کر رہے تھے کہ یہ معاملہ کسی طرح نمٹ جائے اور جب یہ معاملہ نمٹا تو اُن کی مدتِ ملازمت میں ایک سال کی توسیع کر دی گئی اور پھر وہ مارچ 2011ء کی بجائے مارچ 2012 میں ریٹائر ہوئے"۔

ریمنڈ کے اس اقتباس پر تبصرہ بالکل بے معنیٰ ہے۔ شاید قاتل دبی مسکراہٹ سے یہ الفاظ لکھتے ہوئے ہمارے سسٹم کا مذاق اڑانا چاہ رہا ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو آج وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا کیونکہ جو جگ ہنسائی اس نے کرنی تھی وہ تو بہر حال ہوگئی۔ ریمنڈ ڈیوس مزید لکھتا ہے کہ" مقدمہ کو شرعی بنیادوں پر ختم کرنے کے فیصلے کے منصوبہ سازوں میں جنرل پاشا اور کیمرون منٹر (اس وقت کے اَمریکی سفیر) شامل تھے۔ پاکستانی فوج بھی اس سے آگاہ تھی جبکہ صدر زرداری اور نواز شریف کو بھی بتا دیا گیا تھا کہ کیا کھچڑی پک رہی ہے"۔ گویا اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ کافی مضحکہ خیز ہے کہ مقدمہ کو شرعی بنیاد پر حل کرنا جبکہ شرعی حق تو مقتول کے لواحقین چیخ چیخ کر مانگ رہے تھے کہ ہمیں قصاص چاہیئے اور کچھ نہیں مگر کیا شرعی بنیاد صرف دیت ہی ہے؟۔

ریمنڈ لکھتا ہے کہ" عدالت کی کارروائی کے دوران جنرل پاشا مسلسل کیمرون منٹر کو لمحہ بہ لمحہ کارروائی کی خبریں موبائل فون پر میسج کر کے بھیج رہے تھے"۔ یہ پیرا گراف لکھتے ہوئے ہمارا قومی مجرم مسکرا رہا ہوگا کیونکہ اس کے الفاظ میں ایک گہرا اطمینان ایک عام لکھاری بھی محسوس کر سکتا ہے۔ ریمنڈ نے دعوی کیا ہے کہ" جیل میں مقتول کے لواحقین کے سامنے دو راستے رکھے گئے یا تو وہ ایک لاکھ تیس ہزار ڈالر کا خون بہا قبول کریں ورنہ۔" ورنہ کے آگے ریمنڈ نے کچھ نہیں لکھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ پاکستانی عوام اتنے بھولے نہیں کہ وہ ورنہ کے آگے کا جملہ نہ سمجھ سکیں۔ اِس ادھورے جملے کے آگے وہ لکھتا ہے کہ" عدالتی کارروائی کے دوران مقتول کے لواحقین کو عدالت کے باہر گن پوائنٹ پر رکھا گیا اور اُنہیں کہا گیا کہ وہ میڈیا کے سامنے زبان نہ کھولیں"۔ شکریہ ریمنڈ ڈیوس! لاشعوری طور پر ہی سہی اپنے مقتول کے لواحقین کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا انکشاف تو کیا۔ شکریہ ریمنڈ ڈیوس۔ بہت بہت شکریہ۔

وحدت الوجود

روزنامہ پاکستان 22جون 2017

وحدت الوجود سے مراد دراصل ایک ہی وجود ہے۔اصطلاح میں" تمام جاندار بشمول نباتات و جمادات وحیوانات تمام دراصل ذاتِ خداوندی کا عین ہیں" ۔اِسے اہل تصوف توحید، فارس ہمہ اواست اور سنسکرتی ویدانت کہتے ہیں۔ یہ کوئی نظریہ فلسفہ یا عقیدہ نہیں بلکہ ایک عالمگیر سچائی ہے۔نہ صرف علم کی انتہاء ہے بلکہ ہر مذہب کا حتمی مقصود بھی ہے۔
وحدت الوجود یا توحیدِ حقیقی دراصل دین اسلام کی روح ہے۔حجتہ الاسلام امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس کے تین درجات بیان کئے ہیں۔توحید العوام۔توحید الاخواص اور توحید اخص الاخواص۔توحید العوام سے مراد دراصل عوام کا وہ فہم ہے جو توحید کے متعلق راسخ ہو چکا یعنی انسان اور خدا کا وہ معاملہ جو ایک عام سطح پر قائم ہوتا ہے۔اس کے بعد توحید الاخواص ہے یعنی علماء کی توحید اسے ہم فہمِ توحید بر بنائے بصیرت بھی کہہ سکتے ہیں۔پس انسان اور خدا کا معاملہ ایک خاص عقلی بصیرت پر قائم ہو تو یہ توحید الاخواص کہلاتی ہے۔اس کے بعد توحید کا آخری درجہ ہے۔اخص الاخواص یعنی عارفین اور عشاق کرام کی توحید۔وحدت الوجود کو اسلام کے جید اور معروف ترین صوفیاء اور فضلاء اسلام کی روح تسلیم کرتے ہیں۔اِن میں ابوطالب مکی، ابونصر سراج طوسی، حسین بن منصور حلاج، جلال الدین رومی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی، حضرت شیخ بہاءالدین نقشبندی، شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی، صدر الدین شیرازی المعروف مُلّا صدرا، خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، علامہ محمد اقبال وغیرہم، وحدت الوجود کو سنسکرت میں ویدانت کہتے ہیں۔سنت ویاسا، آدی شنکرا چاریہ اور کبیر داس اِس کے معروف ترین مبلغ رہے ہیں۔
وحدت الوجود کو انگریزی میں Pantheism کہتے ہیں۔مغرب میں اس کے معروف ترین مبلغین میں معروف اطالوی ریاضی دان اور عیسائی راہب گیوردانو برونو، معروف جرمن فلاسفر جارج ولیم فریڈرک ہیگل، یہودی فلاسفر بارخ اسپینوزا اور معروف تھیوریٹکل فزیسٹ البرٹ آئن سٹائن شامل تھے۔چین میں اس کے معروف ترین مبلغ لاؤزے تھے جبکہ یونان میں ہیراقلاطیس اس عالمگیر سچائی کے پرچارک تھے۔

دنیا میں اَن گنت مذاہب مروج رہے ہیں مگر مطلق سچائی ہر دور میں ایک ہی رہی۔ پس جس پر انکشاف ہوا اُس نے اعلان کر دیا جو محروم رہ گیا وہ پھر اس طرف نہ آسکا۔ وحدت الوجود ایک روشنی ہے اور یہ صرف اسی پر منکشف ہوتی ہے جسے حتمی سچ کی جستجو ہو۔ علاوہ ازیں تو انسان کہیں نہ کہیں پھنس ہی جاتا ہے۔ وحدت الوجود عقلیت اور بصیرت کا حتمی مقام ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے زیادہ تر ذہین ترین لوگ آخر کار وحدت الوجود پر ہی مقیم ہو جاتے ہیں۔

اب ہم وحدت الوجود کو انتہائی سادہ الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ یہ کوئی فلسفہ یا نظریہ نہیں ہے اس لئے اس میں کوئی گھمبیرتا یا ابہام بھی نہیں ہے۔ ذاتِ خداوندی ایک مکمل وجود ہے۔ اِس کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں جبکہ اِس کے ساتھ یہ دنیا اور غیر از دنیا جو ابھی دریافت نہیں ہوئی یا دریافت کے مراحل میں ہے بشمول نباتات و جمادات و حیوانات کے ایک دوسرا وجود ہیں جو خدا کی صناعی یا تخلیق ہیں۔ پس یہ کُل دو وجود ہوئے۔ اِن دو وجود کو صوفیاء دوئی اور فلاسفر Dualism سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِسی دوئی کو سیدی جلال الدین رومی اپنی اصطلاح میں مثنوی سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فارسی میں مثنوی دوئی کو کہتے ہیں۔

یہ دوئی امام غزالی کی شرح کے مطابق عوام کی توحید ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو اگلا مقام بصیرت اور منطق کا ہے یعنی اس دوئی کو منطق کی بنیاد پر سمجھنا اور سمجھانا۔ یہ مرحلہ مذہب کے دائرے میں آجاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے فرائض شروع ہوتے ہیں اور یہ خواص کی توحید ہے۔ وہ لوگ جن کا مذہب سے غیر معمولی تعلق ہوتا ہے وہ اسی مقام پر قائم ہوتے ہیں۔ اب اِن دونوں مراحل پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مراحل میں صرف ایک ہی نکتہ مماثل ہے اور وہ ہے "اشتراکِ مطلق" جسے مذہب شرک سے تعبیر کرتا ہے۔

یعنی ذاتِ خداوندی اور اس کی صناعی کو دو وجود قرار دینا دراصل حقیقی شرک ہے۔ سطحی ذہن چونکہ اِس راز سے واقف نہیں ہوتا اِسی لئے وہ اِس مقام کو حقیقی توحید سمجھنے لگتا ہے جبکہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ توحید کا آخری اور حقیقی مقام وحدت الوجود ہے، یعنی ذاتِ خداوندی اور اس کی صناعی کو ایک وجود جاننا اور ماننا بر بنائے منطق و یقین۔

تھوڑا سا مزید سلیس کئے دیتا ہوں۔ ایک پینٹر جب کسی شفاف کینوس پر رنگ بکھیر کر کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو وہ فن پارہ اپنا کوئی الگ وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ اُسی پینٹر یعنی مصور ہی کے وجود کا مظہر ہوتا ہے۔ صوفیاء اِسے اپنی اصطلاح میں قدس سرہ کہتے ہیں یعنی پاکیزہ راز۔

ایسا راز جس میں کوئی ابہام نہیں اور جو بالکل شیشے کی طرح صاف ہے کہ خالق قبل از تخلیق بھی ایک وجود ہے اور بعد از تخلیق بھی۔ چنانچہ تخلیق فریبِ اصلی ہے۔ یہ ہے درحقیقت وحدت الوجود اور اِسی کا اظہار کرتے ہوئے حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔ع

به هر سو جلوهٔ دلدار دیدم
به هر چیزے جمالِ یار دیدم

اسی مقام پر پہنچ کر پھر انسان پوری کائنات بشمول ذاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور یہی ہم آہنگی پس کسی سے اَناالحق کہلوا کر دار پر پہنچا دیتی ہے اور کسی کو دنیاوی منزلت پر براجمان کر دیتی ہے۔سیدی رومی فرماتے ہیں۔ع

نے نے کہ ہمی بود کہ می گفت انا الحق
در صورتِ منصور
منصور نہ بود آں کہ برآں دار برآمد
ناداں بہ گماں شد

اسی مقام کی توضیح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کچھ یوں بیان فرماتے ہیں کہ" موحد جب مقامِ توحید پر پہنچتا ہے تو نہ موحد رہتا ہے۔نہ توحید۔نہ واحد نہ بسیار۔نہ عابد نہ معبود۔نہ ہستی نہ نیستی۔نہ صفت نہ موصوف۔نہ ظاہر نہ باطن۔نہ منزل نہ مقام۔نہ کفر نہ اسلام۔نہ کافر نہ مسلمان "۔

☆☆☆☆☆☆☆

مذہب پر بحث

روزنامہ پاکستان 15 جون 2017

میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن قرآن، حدیث، فقہ اور منطق کی دقیق و عتیق وادیوں میں گزار دیا۔اَن گنت مباحثے، مجادلے، مناقشے، مناظرے اور مکالمے کرنے کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ مذہب کا براہِ راست عقل سے کوئی تعلق نہیں۔عقل فلسفہ کا موضوع ہے مذہب کا نہیں۔فلسفی مذہبی نہیں ہوسکتا اور مذہبی فلسفی نہیں ہوسکتا کیونکہ جو سوچتا ہے وہ مانتا نہیں اور جو مانتا ہے وہ سوچ نہیں سکتا۔

انسان کو زندہ رہنے کے لئے روٹی کی ضرورت ہوتی ہے علم کی نہیں۔مذہب کے حوالے سے علم اُن لوگوں کے لئے سودمند ہوسکتا ہے جو اِس کے لئے وقف ہو چکے یا پھر اُن لوگوں کے لئے جو اَمارت کے ایک خاص درجے تک پہنچ چکے ہیں۔اِس کے علاوہ عام آدمی کے لئے مذہبی علوم نہ صرف غیر ضروری ہیں بلکہ اَذیت کا باعث ہیں۔

معقولات ایک انتہائی خشک موضوع ہے اِسی سے بچنے کے لئے عقائد کا سہارا لیا جاتا ہے۔معروف جرمن فلاسفر فریڈرک نطشے نے کہا تھا کہ "اگر آپ اپنی زندگی میں اطمینان اور سکون چاہتے ہیں تو عقائد پر کاربند ہو جائیں لیکن اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو پھر اذیت آپ کا مقدر ٹھہرے گی"۔

سچائی سکون سے فرار حاصل کر لیتی ہے اِس لئے انسان خالص سچائی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔معروف ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائیڈ نے مرنے سے پہلے ایک بات کہی تھی کہ" تمام عمر انسانی رویوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان سچائی کے ساتھ نہیں جی سکتا"۔

دنیا میں اَن گنت مذاہب کے رواج کا مطلب ہی یہی ہے کہ انسان تحقیق سے کنارہ کر لے۔گوتم بدھ جو سچائی ہی کی تلاش کے لئے اپنا گھر بار بیوی بچے راج باگ سب کچھ چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل گئے تھے آخر کار وہ بھی اِس نتیجے پر پہنچے کہ انسان جان بوجھ کر جھوٹ کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔اِس لئے مطلق سچائی اِس دنیا میں کبھی رواج نہیں پا سکتی۔گوتم بدھ کے معروف قول" زندگی دکھ ہے" کے یہی معنیٰ ہیں کہ زندگی سچائی کے ساتھ جینے میں دکھ ہے۔اِس کے علاوہ تو لوگ بڑے پُرسکون طریقے سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

مذہب انسان کے ضروری اور غیر ضروری سوالوں کا جواب دیتا ہے اور بات یہ نہیں کہ وہ جواب حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں یا نہیں اصل نکتہ یہ ہے کہ کیا وہ جوابات انسان کو مطمئن کر پاتے ہیں؟۔اگر اُن جوابات سے انسان مطمئن ہو گیا تو معاملہ ختم۔اَب اس سے آگے جانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ پھر سچ کیا ہے اور کیا جھوٹ ہے۔ایک بات ہمیشہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ "مذہب پر بحث کرنے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ وہ اطمینان جو آپ کو مذہب نے دیا اس کو سبوتاژ کرنا"۔واصل ابن عطاء ہو جہم بن صفوان ہو یا ہو ابوالحسن الاشعری یا ابومنصور الماتریدی یہ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگا لیں مگر پھر بھی آپ کو عقائد کی منطق نہیں سمجھا سکتے کیونکہ عقیدہ عربی زبان میں باندھنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور جب تک آپ کسی خاص قدر کے ساتھ خود کو باندھ نہیں لیتے تب تک عقیدہ کی سمجھ نہیں آسکتی۔علاوہ ازیں یہ باندھنا صوفیانہ معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی کسی کی محبت آپ کے اختیارات کو باندھ لے۔عقیدہ عشق کی ابتدائی منازل میں سے ہے۔عقیدہ ہو یا عشق اِن کا کوئی فلسفہ نہیں ہوتا۔ع

کوئی فلسفہ نہیں عشق کا جہاں دل جھکے وہاں سر جھکا
وہیں ہاتھ جوڑ کے بیٹھ جا نہ سوال کر نہ جواب دے

ہمارے ہاں مہاویر اور بدھ جیسے ذہین لوگ موجود رہے ہیں۔یہ ہماری ہندوستانی تہذیب کے وہ فقید المثل سپوت ہیں جن کے نظریات سے دنیا آج بھی ذہانت کے معیار طے کرتی ہے مگر ہماری محبت تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سیدی رومی فرماتے ہیں۔ع

نے نے کہ ہمی بود کہ می آمد و می رفت
ہر قرن کہ دیدم تا عاقبت آں شکل عرب وار برآمد
دارائے جہاں شد

انسانی روح، دل،شعور، ذہن یا آپ جو بھی نام دے دیں اِس کے راستے صرف دو ہی ہیں ۔ایک سچائی کا رستہ دوسرا سکون کا۔ اِس کے علاوہ کوئی رستہ نہیں ۔جب ہم سچائی کے رستے پر چلتے ہیں تو ہر مقام پر دکھ ہمارا استقبال کرتے ہیں ۔اس کے برعکس اگر ہم نے سکون کا رستہ اپنالیا تو ہمیں ہمارا باطن ٹھیک اُسی مقام پر لے جاتا ہے جہاں سے ہم نے باطنی رستے بنائے ہوتے ہیں ۔ یہاں پر ایک اعتراض یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ سچائی کے مقابلے میں تو جھوٹ ہوتا ہے یہ سکون کیسے سچائی کا مدِمقابل ہوسکتا ہے ۔؟ تو اِس کا سادہ جواب یہ ہے کہ انسان شعور سنبھالتے ہی اپنی ہر کاوش کا نتیجہ سکون کی صورت میں تلاش کرتا ہے ۔عزت، دولت، اولاد، محبت، مذہب، عبادت سب کا مقصد صرف ایک کہ سکون مل جائے ۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر انسان سچائی سے توجہ ہٹالیتا ہے ۔اب اس کے برعکس ایک کوشش وہ ہے جو صرف حق کو ڈھونڈنے کے لئے کی جاتی ہے پس ایسی کاوش صرف دکھ پر ہی منتج ہوتی ہے ۔سلطان العارفین حضرت سلطان باہو اِسی راہ کے مسافر تھے ۔آپ فرماتے ہیں ۔ع

کوک دل آ مت رب سنے چا درد منداں دیاں آہیں ہُو

سینہ تاں میرا درد بھریا اندر بھڑکن باہیں ہُو

تیلاں باج نہ بلن مشالاں تے درد باج نہ آہیں ہُو

آتش نال یرانے لا کے باہو وت اُو سڑن کے ناہیں ہُو

اب اس تعجب میں مت پڑیئے کہ سکون کے متلاشی کو اس کی دہلیز پر خدا مل جاتا ہے جبکہ حق کے متلاشی عمر بھر راہوں کی دھول بنے رہتے ہیں ۔بس اتنا فرق ملحوظ رہے کہ عقیدہ اور سچائی میں درد اور سکون جتنا فرق ہوتا ہے ۔عہد نامہ جدید کو ہم جھوٹ نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ دو ارب انسانوں کے لئے سکون کا باعث ہے ۔ اِس کے برعکس ہم بدھ کی ذہانت کو سچائی سے تعبیر کریں گے کیونکہ وہ حق کا متلاشی تھا اور متی، مرقا، یوحنا اور یوقس سکون کے مسافر تھے ۔ چنانچہ بدھ کا فلسفہ مذہب نہ بن سکا اس کے برعکس مسیح مت فلسفہ نہ بن سکا۔بس یہی وہ بنیادی فرق ہے جو ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے ۔

☆☆☆☆☆☆☆

غلام روحوں کے کارواں میں

روزنامہ پاکستان 08 جون 2017

من الحیث القوم ہم اِس وقت علمی ،تہذیبی اور اخلاقی قحط کا شکار ہیں ۔علمی رویہ تو کبھی تھا ہی نہیں ہمارے پاس ۔تہذیب اور اخلاقیات کے لحاظ سے بھی ہم نے ہمیشہ مشرقِ وسطیٰ اور مغرب کا رخ کیا ۔گویا ہم نے ابتداء ہی سے تقلید اور ذہنی غلامی کو ترجیح دی ۔ یہ غلامی دراصل ایسی غلامی ہے جو ہمیں غلامی کے ادراک سے بھی عاری کر چکی ہے ۔ چنانچہ ہم اس مطمئن غلامی سے نجات حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ ہم اِس پر فخر محسوس کر رہے ہیں ۔میں اگر خود کو مہذب کہتا ہوں تو میری تہذیب براہ راست مجھے تو فائدہ دے سکتی ہے مگر میں اسے معاشرے میں اپلائی نہیں کر سکتا کیونکہ یہاں کا ماحول مجھے زیادہ دیر تک اپنی تہذیب پر قائم نہیں رہنے دیتا ۔ہم نے کبھی اجتماعی طور پر اپنی ذہنی تربیت پر توجہ نہیں دی بلکہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم علمی و اخلاقی پستی کا شکار ہو چکے ہیں ۔

قوم نظریات سے بنے یا اوطان سے مگر قوموں میں ایک بنیادی شعور ہمیشہ بیدار رہتا ہے کہ وہ ایک قوم ہیں جبکہ ہمارے ہاں یہ انتہائی بنیادی شعور بھی موجود نہیں ۔ہمارا پورا زور مذہبی مشقات پر ہے اور جس کے لئے ہماری نظریں ہمہ وقت اُس جہان پر لگی رہتی ہیں جس تک پہنچنے کے لئے ہمیں پہلے مرنا پڑتا ہے ۔چلیں مرنا تو رہا ایک طرف ،بنیادی بات یہ ہے کہ کیا ہم اس وقت جو زمین پر چل رہے ہیں اور زندہ سلامت ہیں کیا واقعی زندہ ہیں؟ ۔ یہ ہے وہ بنیادی سوال جس پر غور کر کے ہم اس دنیا میں ترقی کر سکتے ہیں ۔اگر ہم نے یہی سوچنا ہے کہ ہم نے تو مر کر آگے نکل جانا ہے اور اس فانی دنیا میں ہمیشہ کے لئے نہیں رہنا اِس لئے یہاں مغز کھپانے کی ضرورت نہیں تو اِس غلط فہمی کا جواب یہ ہے کہ آپ نے تو مر جانا ہے لیکن آپ کے بعد جو ایک نسل اس خطے پر آباد ہو گی کیا وہ اِس دنیا میں اپنے حصے کا جینے کا حق نہیں رکھتی؟ ۔ہم اگر اِس دنیا میں کچھ موجودہ مسائل کم کر کے مر جائیں تو کیا اُن ہزاروں انسانوں کے لئے بہتر نہیں ہو گا جن کے لئے یہ دنیا بالکل نت نئے مسائل کا گھر ہو گی؟ ۔

یہ دنیا فانی ہے ۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے اور عقائد کی کوئی منطق نہیں ہوتی کیونکہ منطق ٹھوس تجرباتی ثبوت پر منحصر ہوتی ہے ۔ زندگی اور موت اِس کائنات کے ناقابل تسخیر حقائق ہیں ۔

زندگی اور موت کی ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق جسم سے ہوتا ہے جبکہ اس کے علاوہ زندگی اور موت کی ایک دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق روح سے ہے۔ دل سے ہے۔ ذہن سے ہے۔ شعور سے ہے یا آپ اسے جو بھی نام بھی دے دیں۔ وہ انسان جو جسمانی طور پر زندہ رہتا ہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ روحانی طور پر بھی زندہ رہے بلکہ یہی حقیقی زندگی ہے۔ روحانی زندگی شعور یا اقبال کی اصطلاح میں "خودی" سے بیدار ہوتی ہے۔ وہ انسان یا قوم جو جسمانی طور پر تو سرگرم ہو مگر روحانی طور پر مردہ ہو درحقیقت مردہ ہے۔ آزادی ایک فطری روشنی ہے جس کے ذریعے انسان اس زندگی کو جنت بنا سکتا ہے جبکہ غلامی ایک ایسی متعدی مرض ہے جس کے سبب انسان چلتے پھرتے بھی مردہ رہتا ہے۔ غلامی کی کئی ایک اقسام ہیں مگر اس کی ایک قسم انتہائی تباہ کن ہے اور وہ ہے تہذیبی غلامی۔ تہذیبی غلامی سے مراد اُن اقدار کی تقلید ہے جن کا متعلقہ خطے سے براہ راست تعلق نہ ہو اور یہی وہ بنیادی سبب ہے دنیا میں قوموں کے زوال کا کیونکہ انسان چاہ کر بھی اپنے خون سے اپنی تہذیب کو نہیں نکال سکتا حتیٰ کہ کوئی درآمدہ نظریہ اسے بدترین موت سے ہمکناریوں نہ کردے۔ نظریہ اور تہذیب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نظریہ انسان کی انفرادی صوابدید پر مبنی ہوتا ہے جبکہ تہذیب انسان کو وراثت میں ملتی ہے۔ نظریات بھی انسان کو وراثت میں مل سکتے ہیں مگر وہ تہذیب پر سبقت نہیں لے سکتے کیونکہ تہذیب دراصل مٹی سے گندھی ہوئی وہ خوشبو ہوتی ہے جو مرتے دم تک انسان کے خون میں جاری وساری رہتی ہے۔ یہاں پر دو بنیادی باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ انسان یا قوم کو اپنی تہذیب نہیں بدلنی چاہئے جبکہ دوسری بات یہ کہ انسان کو اپنی تہذیب کی حدود میں رہتے ہوئے آگے بڑھنا چاہئے۔

وہ قومیں جلد صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہیں جو ماضی کا مزار بنی رہتی ہیں۔ اپنی تہذیب میں جدت پیدا کرنے میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ قومیں ہمیشہ تغیر سے پنپتی ہیں۔ پرانی اقدار سے فرار اور جدید اقدار کا وقوع ہی دراصل ترقی یافتہ اقوام کا وتیرہ رہا ہے۔ دوسری تہازیب کو اپنے اُوپر لاد لینے سے قومیں صرف فکری غلام ہی پیدا کرتی ہیں۔

غلام روحوں کے کارواں میں
جرس کی آواز بھی نہیں ہے
اُٹھو تمدن کے پاسبانو

تمہارے آقاؤں کی زمیں سے
اُبل چکے زندگی کے چشمے
نشان سجدوں کے اب زمیں سے مٹاؤ
دیکھو چھپا نہ لے وہ لہو ٹپکتا ہے آستیں سے
غلام روحوں کے کارواں میں
نفس کی آواز بھی نہیں ہے
اُٹھو محبت کے پاسبانو
یہ کہر و صحرا یہ دشت و دریا
تمہارے اجداد گا چکے ہیں
یہاں پہ وہ آتشیں ترانہ
جو گرمی بزم تھا مگر اب
گزر گیا اُس کو اک زمانہ
سمند ایام برق پا ہے
اُٹھو کہ تاریخ ہر ورق پر
تمہارا شبنام ڈھونڈتی ہے
نہ دیں گے آواز اس کے شہہ پر
جو وقت اُڑتا چلا گیا ہے
زمین آنکھوں سے مت کریدو
نہ مل سکیں گی وہ ہڈیاں جو
زمیں کا تاریک گہرا سینہ نگل چکا ہے
نیا قرینہ سکھاؤ پامال زندگی کو

اُٹھو مزاروں کے پاسبانو
چلو نا گرماؤ زندگی کو
کہ ڈھیر سونے پڑے ہیں اُن پر
کہیں سے دو پھول ہی چڑھاؤ
غلام روحوں کے کارواں میں
جرس کی آواز بھی نہیں ہے

☆☆☆☆☆☆☆

رموزِ شعر

روزنامہ پاکستان 01جون۔ 25مئی 2017

علم نفسیات میں جذبات اور احساسات کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے مگر شاعری میں بھی جذبات اور احساسات کو خاصی اہمیت حاصل ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ شاعری کی لطیف عمارت جذبات اور احساسات پر استوار ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ انسان کے اندر چھپے جذبات اور احساسات جب الفاظ کا روپ دھار لیتے ہیں تو تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کہنے والا اپنے اندر کی بات کا اظہار کر رہا ہے۔ بس یہی الفاظ ذرا ڈھنگ سے بغیر کسی ربط میں لکھے جائیں تو اصطلاح میں نثر کہلاتے ہیں۔ اگر اِن الفاظ کو ایک خاص متخیل ربط کے ساتھ وزن کے قالب میں ڈال دیا جائے تو یہ الفاظ اشعار کہلاتے ہیں۔

سمجھنے کیلئے اسکی مثال کچھ یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ "محبوب کی جدائی نے دل کو گھائل کر دیا ہے جب وہ یاد آتے ہیں تو بے چینی ایک دم سے اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور سوچتے ہیں کہ کبھی اِنہی سرد لمحوں میں ہم اپنے محبوب کے ساتھ تھے مگر اب نہ وصال رہا اور نہ وہ عنایات البتہ محبوب کو محض یاد کر کے دل کو بہلایا جاتا ہے"۔ قارئین اپنے دل میں چھپے جذبات کو میں نے الفاظ کا رنگ دیدیا آپ اسے ایک نثر پارہ تو کہہ سکتے ہیں مگر نظم نہیں۔ وہ اس لئے کہ نثر کے قواعد کی طرح نظم کے بھی کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں اور ان ضوابط کے علم کو اصطلاح میں "علم عروض" کہتے ہیں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ درج بالا الفاظ ہم معروف شاعر جوش ملیح آبادی کی زبانی پڑھتے ہیں۔ مگر واضح رہے جوش صاحب کے جذبات اور درج بالا الفاظ میں بیان کئے گئے جذبات میں بنیادی فرق صرف اس سانچے کا ہے جس کا استعمال اُوپر کے الفاظ میں نہیں کیا گیا جبکہ جوش صاحب نے انہی جذبات کو الفاظ کا رنگ تو دیا ایک خاص ربط اور وزن کے سانچے میں ڈھال کر، پس یہی سانچہ "بحر" کہلاتا ہے۔ اب غور سے پڑھئے کہ جوش صاحب کیسے اِن الفاظ کو ایک خوبصورت سانچہ یعنی "بحر" میں قید کرتے ہیں۔ ع

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا

غور کرنے سے معلوم ہوا کہ درج بالا الفاظ جن میں جذبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں اور جوش صاحب کے الفاظ میں صرف ایک بنیادی فرق ہے کہ اُوپر کے الفاظ میں ایک خاص ربط تو ہے مگر کوئی وزن نہیں جبکہ جوش کے الفاظ میں نہ صرف ربط ہے بلکہ ایک خاص وزن بھی پایا جاتا ہے جسے ہم "بحر" کے نام سے ذکر کر چکے ہیں۔ بس اسی بنیادی فرق کو اصطلاح میں نثر اور نظم کہا جاتا ہے۔ قطع نظر نثر سے کیونکہ یہاں پر ہم صرف نظم کو سمجھنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں اس لئے نثر کی طرف ہم کان نہیں دھریں گے۔

اُمید ہے کہ قارئین نثر اور نظم کا بنیادی فرق سمجھ گئے ہوں گے۔ یوں تو نظم کی کئی اقسام ہیں مگر یہاں پر ہم صرف غزل کو زیر بحث لائیں گے کیونکہ راقم کا مقصد یہ ہے کہ شاعری کے رموز و اسرار کو ایک ایسی سلیس زبان میں بیان کیا جائے کہ ایک عام قاری بھی سمجھ سکے کہ شاعری آخر کن اجزاء کا مرکب ہے۔ سب سے پہلے ہم اس چیز کا ذکر کریں گے جس سے شعر کا وجود پیدا ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم ابتداء میں ذکر کر چکے ہیں کہ کسی بھی نثر یا نظم کا وجود صرف آپ کے وہ جذبات اور احساسات ہوتے ہیں۔ جب وہ اندر سے باہر کا رخ کرتے ہیں تو اُنہیں الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ یہ الفاظ یا تو نثر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یا پھر نظم کی اور اُوپر اس کی ایک جامع مثال بھی دی چکی ہے۔ اب آئیے اس طرف کہ شعر آخر بنتا کیسے ہے؟۔

اس میں زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک سادہ سا اُصول ذہن میں رکھئے کہ جب آپ کے اندرونی جذبات اور احساسات بنے بنائے سانچے میں ڈھلے ہوئے باہر نمودار ہوں تو سمجھ جائیے کہ یہ اشعار ہی ہیں جبکہ اگر یہی جذبات الفاظ کی شکل میں ایک سادہ اور نارمل کیفیت میں باہر آئیں تو سمجھ جایئے کہ یہ کوئی نثر ہی ہے۔ پس یاد رکھئے کہ ان الفاظ کا خود سے ذہن میں آنا ادب کی اصطلاح میں "آمد" کہلاتا ہے جبکہ انسان اپنے وسیع تر علم اور مطالعہ کی بدولت اگر اپنے جذبات کو الفاظ کی شکل دیتا ہے تو وہ اصطلاح میں "آورد" کہلاتا ہے۔ لٰہذا یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا کا ہر انسان یا تو شاعر ہوتا ہے یا پھر نثر نگار مگر بات یہ ہے کہ کسی کو خدا اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ نثری شکل میں عطاء کرتا ہے اور کسی کو منظوم شکل میں جبکہ کسی کو سرے سے الفاظ کی دولت عطاء ہی نہیں کرتا کہ وہ اپنے جذبات اور احساسات کو الفاظ کی شکل میں تعمیر کر سکیں۔

بس یہی اٹل حقیقت ہے۔ اِسی صورت کو شاعر نے کچھ یوں اپنے مبذون الفاظ میں پرویا ہے۔ ع

یہ الگ بات کہ تعمیر کی توفیق نہ ہوئی
ورنہ ہر ذہن میں اِک تاج محل ہوتا ہے

اب ضروری سمجھتا ہوں کہ آگے جانے سے پہلے تھوڑی سی روشنی آمد اور آورد پر ڈال لی جائے۔

آمد : جب انسان کے جذبات اور احساسات کچھ ایسے الفاظ کی شکل اختیار کرتے ہیں جس کا اس انسان کو بھی یقین نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ اتنے مبذون اور مربوط کیسے ہو گئے ہیں، آمد کہلاتی ہے۔پس یہی وہ چیز ہے جسے ہم خداداد صلاحیت سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور جس میں عقلی مشقت کا کوئی خاص کردار نہیں ہوتا۔اِسی کیفیت کو ایک شاعر نے بڑے پیارے انداز سے بیان کیا ہے۔ع

ہم تو الفاظ سے اِک دھند ہٹا لیتے ہیں
شعر پہلے سے خیالوں میں لکھا ہوتا ہے

آورد : آمد کے برعکس انسان جب اپنی قوت متخیلہ سے کام لیتا ہے تو اس کو پھر اصطلاح میں آورد کہتے ہیں۔اکثر شعراء کبھی کبھار آورد سے بھی کام لے لیتے ہیں۔مگر یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے جو کبھی بھی آورد کی محتاج نہیں ہو سکتی۔اب ہم شعر کا مکمل پوسٹ مارٹم کریں گے کہ آخر شعر بنتا کیسے ہے؟۔سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھئے گا کہ دنیا کا ہر شعر کسی نہ کسی ایک سانچے یعنی ُبحر“ میں ضرور ہوتا ہے۔بلا شبہ کوئی اگر نظم معراء بھی لکھتا ہے تو وہ بھی ایک مخصوص بحر میں لکھی جاتی ہے گویا ہر شعر کی کوئی نہ کوئی ایک ”بحر“ ضرور ہوتی ہے جس میں وہ شعر بندھا ہوتا ہے۔آئیے ہم شعر بنانا سیکھیں۔جیسا کہ ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں کہ شاعری دراصل ایک خداداد صلاحیت ہے اور اس کے لئے انسانی جدو جہد بہت کم ہی مفید ہوتی ہے۔پس جب انسان کسی چیز کو بنیاد سے جان لیتا ہے تو پھر اس کو سمجھنے میں کوئی خاص مشکل نہیں رہتی۔لہٰذا ہم یہاں پر ایک شعر کی بنیاد جاننے کی کوشش کریں گے کہ آخر ایک شعر کے اجزائے ترکیبی کون کونسے ہیں؟۔

بنیادی نکتہ : اگر آپ کے پاس کوئی اچھا سا تخیل موجود ہے تو آپ اسے ایک شعر کا روپ دے سکتے ہیں مگر یہاں پر یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ اپنے خیالات کو ایک ایسے مبذون الفاظ کا روپ دیں کہ پڑھنے والا آسانی سے سمجھ جائے کہ یہ ایک شعر ہی ہے۔عام مقولہ ہے کہ اچھا شعر ہمیشہ یاد ہو جاتا ہے۔ایک شعر لکھنے سے پہلے یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ "بحر" کسے کہتے ہیں؟۔

بحرکی تعریف : بحر کو ہم سادہ الفاظ میں شعر کا "پیمانہ" بھی کہہ سکتے ہیں۔علاوہ ازیں ایک ایسا سانچہ جس میں مربوط انداز سے الفاظ پرو دیئے جائیں"بحر" کہلاتا ہے۔اُردو میں معروف بحریں اُنیس ہیں جن میں سے بیشتر عربی اور فارسی سے آئی ہیں جبکہ کل بحور کی تعداد ایک سو نو سے بھی زائد ہے۔مگر زیادہ تر اُردو اور فارسی شاعری میں یہی اُنیس بحریں استعمال ہوتی ہیں۔ع

سالم بحریں

ہزج

کامل

رمل

و افر

متقارب

متدارک

مدید

سالم بحر سے مراد وہ بحر جس میں چار ارکان پائے جاتے ہوں۔ارکان سے مراد وہ مخصوص الفاظ جو کسی بحر کے ردھم کو ظاہر کرتے ہیں۔سالم بحر کے کسی بھی رکن میں زحافات نہیں ہوتے۔زحافات سے مراد بحر کے ایک یا ایک سے زیادہ ارکان سالم نہ ہوں مثال دیکھیں۔ع

بحر ہزج مثمن سالم کے ارکان

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

اب اسی بحر کی محذوف شکل ملاحظہ کریں۔

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

یہ بحر بھی ہزج کے قبیل سے ہے مگر یہ محذوف ہے۔مذکورہ بالا سالم بحور کی مختلف محذوف شکلیں ہیں۔ذیل میں ہم سالم بحور کے سالم اور محذوف ارکان بیان کرتے ہیں۔

بحر ہزج مثمن سالم

مثمن سے مراد آٹھ یعنی ایک شعر میں جملہ ارکان کی تعداد آٹھ ہو گی اور سالم سے مراد ہر رکن صحت مند یعنی کامل ہو گا۔

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

بحر کامل مثمن سالم

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

بحر رمل مثمن سالم

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

بحر وافر مثمن سالم

مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن

بحر متقارب مثمن سالم

فعولن فعولن فعولن فعولن

بحر متدارک مثمن سالم

فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

بحر مدید مثمن سالم

فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن

زحافاتِ ہزج

مثمن اخرب مکفوف محذوف

مفعول	مفاعیل	مفاعیل	فعولن

مثمن اخرب سالم

مفعول	مفاعیلن	مفعول	مفاعیلن

زحافاتِ رمل

مثمن مشکول

فعلات	فاعلاتن	فعلات	فاعلاتن

مثمن مخبون محذوف

فعلاتن	فعلاتن	فعلاتن	فعلن

زحافاتِ متدارک

مثمن مخبون

فعلن	فعلن	فعلن	فعلن

زحافاتِ مدید مثمن مخبون

فعلاتن	فعلن	فعلاتن	فعلن

زحافات مکمل کرنے سے پہلے عمومی نوعیت کی دو مستعمل معروف بحور کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے جس کی صورتیں تو محذوف ہیں لیکن وہ سالم میں شمار ہوتی ہے۔

بحر مضارع مکفوف محذوف

مفعول	فاعلات	مفاعیل	فاعلات

بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مقطوع

فاعلاتن	مفاعلن	فعلن

بحرخفیف دیگر بحور کے برعکس مسدس ہے یعنی اس کے ارکان آٹھ کی بجائے چھ ہیں یعنی بحرخفیف کے ایک شعر میں چھ ارکان ہوتے ہیں۔ اِسے عام اصطلاح میں "چھوٹی بحر" بھی کہا جاتا ہے۔ذیل میں بحر کی مکمل تفہیم کے لئے درج بالا بحور میں منتخب اشعار بیان کرتے ہیں۔

بحرہزج مثمن سالم

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مِرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بحرکامل مثمن سالم

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بحرہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفاء کیوں نہیں دیتے

بحرخفیف مسدس مخبون محذوف مقطوع

دل میں اِک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

تقطیع : تقطیع سے مراد قطع کرنا یا ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔اَدب کی اصطلاح میں کسی شعر کو بحر کے اُصول کے مطابق ٹکڑے ٹکڑے کرنا تقطیع کہلاتا ہے۔

اُصولِ تقطیع : ہر متحرک حرف کے مقابلے میں متحرک اور ہر ساکن کے مقابلے میں ساکن حرف آئے گا۔

بوقتِ ضرورت حروفِ علت (ا،و،ی،ے) اور دوچشمی ہائے (ھ) ہائے ہوز (ہ)۔ہمزہ (ء) جزمِ ثانی جیسے دوست کی ت اور واوَ معدولہ یعنی خواب کی واو اور نون غنہ (ں) تقطیع میں گر جائیں گے۔علاوہ ازیں تقطیع میں تشدید (ّ) دو حروف شمار ہوگی۔

مثال دیکھیں۔

بحر ہزج مثمن سالم

مفاعیلن

ہزاروں خوا

مفاعیلن

ہشیں ایسی

مفاعیلن

ک ہر خاہش

مفاعیلن

پ دم نکلے

تقطیع میں الفاظ کا صحیح تلفظ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔پس الفاظ کے صحیح تلفظ پر دسترس بہت ضروری ہے۔اگر شعر میں ایک لفظ کا تلفظ غلط استعمال کرلیا گیا تو پوری بحر ٹوٹ جائے گی۔مثال کے طور لفظ نرم ہے یعنی ن مفتوح را اور م ساکن ہیں۔اسے آپ نَرَ م یعنی ن اور ر مفتوح م ساکن نہیں پڑھ سکتے۔اگر ایسا کریں گے تو شعر کا وزن ٹوٹ جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

جہالت اور جنونیت کا اصل ذمہ دار کون؟

روزنامہ پاکستان 18 مئی 2017

پچھلے دنوں افغانستان سے ایک آرکیٹکٹ دوست نے ایک مختصر البم بھیجی جس میں چند ایک یادگار تصاویر تھیں۔ جن میں کابل یونیورسٹی کا وہ شاندار دور تھا جس میں مرد اور عورت ایک ہی بینچ پر بیٹھ کر تحصیل علم میں منہمک تھے۔ کابل کے شاندار ایئر پورٹ پر نیلے اور سفید رنگ کے طیارے جن کے ساتھ تازہ دم ایئر ہوسٹس اپنے چمکیلے روایتی لباس کے ساتھ کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔

شدید حیرت ہوئی کہ یہ واقعی افغانستان ہے یا کسی یورپی ملک کا ایئر پورٹ۔ خیر وہ دور تو چلا گیا۔ ہمیں اب اِسی دور کا ذکر کرنا ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ وقت اپنی چال اور ڈھال کبھی نہیں بدلتا۔ انسان ہی اپنے اطوار اور اقدار بدل لیتا ہے۔ یو ایس ایس آر کو لادینیت و عسکریت مار گئی اور اَمریکہ جان چکا تھا کہ رشین سوشل سسٹم کو توڑنا بہت آسان ہے اگر وہ پاکستان اور افغانستان کے باشندوں کی ذہنیت کو مذہبی اشتعال میں مبتلا کر دے تو گویا ایسے میں ہم یو ایس ایس آر کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ پس وہی ہوا جو اَمریکہ نے سوچا اور چاہا یعنی خود کو اہلِ کتاب کے روپ میں پیش کر کے اہلِ اسلام کو اپنا معاون بنا لیا اور پاکستان و افغانستان کے جذباتی مسلمانوں کو ملحدین رشیا کے خلاف برسرِ پیکار کر دیا۔ نتیجے میں یو ایس ایس آر ٹوٹ گیا اور اَمریکہ کے لئے سپر پاور بننے کی راہ ہموار ہوگئی۔ مجاہدین کو بدلے میں افغانستان کا اقتدار مل گیا اور پاکستان کو اَمریکہ کی سیاسی اور اقتصادی ہمدردی۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ معاملہ یہاں پر ختم نہیں ہوا۔ شیخ اُسامہ بن لادن جو یو ایس ایس آر کے خلاف اَمریکہ کا ہمنوا جنگجو تھا، مبینہ طور پر اَمریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر طیارے ٹکرا کر حملہ کرواتا ہے جس کے نتیجے میں اَمریکہ اُسامہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے افغانستان جا پہنچتا ہے۔ اَمریکہ افغانستان کے مقتدر طبقے یعنی طالبان سے کہتا ہے کہ ہمیں اُسامہ زندہ سلامت چاہیئے۔ جواب میں جب طالبان کا امیر اَمریکہ کو انکار کرتا ہے تو اَمریکہ اپنے سابقہ حامی مجاہدین کو دہشت گرد قرار دے کر افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے۔ اب اَمریکہ وہی صورت اختیار کر لیتا ہے جو صورت اس سے قبل یو ایس ایس آر اختیار کر چکا تھا۔

دریں اثناء پاکستان کی مُلّاملٹری الائنس امریکہ کو غدار اور دغاباز قرار دے کر اس کے خلاف افغانستان کی خفیہ مدد کرتی ہے لیکن اس خفیہ مدد کے باوجود بھی اَمریکہ افغانستان سے جانے کا نام نہیں لیتا حتیٰ کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے بعد افغانستان سے رُسوا و خوار ہو کر بھاگ جاتا ہے۔ مذکورہ بالا نقصان بھی کسی حد تک قابل برداشت ہے مگر سب سے زیادہ نقصان افغانستان بالخصوص پاکستان کو ہوا، اور وہ یہ کہ یہاں کی پُر اَمن ثقافت اور آزاد روایت عسکریت پسندی اور جہالت کے سامنے دم توڑ گئی۔

اَمریکہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ افغانستان کے جنگجو مزاج باشندوں کو استعمال کر کے اُنہیں کچھ عرصے کے لئے افغانستان کا اقتدار سونپ کر خود کو مستقل بنیاد پر سپر پاور بنالے گا۔ اِس لئے اَمریکہ کے نزدیک یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ مگر سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اَمریکہ نے پاکستان اور افغانستان کی ثقافت میں عسکریت اور جنونیت کی جس تباہ کن روش کو پروان چڑھایا، اُس کے منفی اثرات سے یہ خود بھی نہ بچ سکا۔ بہر کیف اَمریکہ پھر بھی سپر پاور ہونے کی حیثیت سے مسائل پر قابو پا چکا ہے مگر ہم ترقی پذیر ممالک عسکری روش اور مذہبی جنونیت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہمارے وہ قبائل جو کسی وقت انتہائی پُر امن اور محبت بانٹنے والے لوگ تھے اسلحہ بردار بن کر پاکستان اور افغانستان کی جمہوری حکومتوں کے خلاف خروج کرنے لگے۔

اِس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے بچوں کے ہاتھوں میں اَمریکہ ہی نے کلاشنکوف تھمائی۔ ہمیں جاہل اور خونخوار بھیڑیا بنانے والا صرف اَمریکہ ہی ہے۔ ہم پُر امن اور اخوت پرستی کے خوگر تھے۔ ہمیں اَمریکہ نے اپنے مفادات کے لئے یو ایس ایس آر جیسے بظاہر غریب پرور اور مزدور کے حقوق کے تحفظ پر مبنی سوشل سسٹم کے خلاف استعمال کیا۔ ہمارے اندر غیر ضروری مذہبی جنونیت اَمریکہ ہی نے انجیکٹ کی۔ ہمیں اسلحہ سے روشناس کرانے والا صرف اَمریکہ ہے۔ ہم جاہل اور جذباتی تھے۔ ہمارے عقائد اور ہمارے جذبات کا بدترین استحصال کیا گیا۔ اس عظیم قومی جرم میں ہمارے مولوی اور سابق ملٹری سربراہ بھی برابر کے شریک ہیں جنہوں نے اَمریکہ کے ایماء پر اپنے بچوں کو علم اور تعلیم کی بجائے اسلحہ اور بارود سے روشناس کرایا۔ ہمیں پتھر کے زمانے میں دھکیلنے والا صرف اَمریکہ ہی ہے۔ ہمارا مقتدر طبقہ اور جہادی مُلّا خود اَمریکہ کی گود میں جا بیٹھے۔ جہادی مولوی اپنے بچوں کو جہاد کی عملی تربیت سے دور رکھتے جبکہ دوسروں کے بچوں کی باقاعدہ محاذ پر تشکیل کرتے۔

ہم نے اپنے ملک کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے جہالت اور جنونیت کی طرف دھکیلا۔ ہم آج اُنہیں اپنا دوست سمجھتے ہیں جنہوں نے ہمارا گھر اُجاڑا۔ ہماری نسلیں تباہ کیں۔ ہماری ملٹری سروسز نے پینتیس سال پہلے قبائلیوں کی عسکری تربیت کر کے انہیں یو ایس ایس آر کے خلاف استعمال کیا۔ آج وہی جنگجو پاکستانی فورسز اور عوام کے دشمن بن چکے ہیں۔ اِنہیں اپنے سوا زمین پر کوئی بھی مسلمان نظر نہیں آتا۔ اسلحہ اور بارود کے رسیا ہمارے بغل بچے آج ہمیں ہی ناکوں چنے چبوا رہے ہیں۔ اِن پینتیس سالوں میں ہم نے جس عسکری روش کو پروان چڑھایا اُسی کا پھل آج ہم توڑ رہے ہیں۔ یہ جہالت اور جنونیت کا دور نہ معلوم کتنی دور جائے گا مگر اس کے حقیقی ذمہ دار اَمریکہ کو ہم اور ہماری آنے والی نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ ہمارا گھر اُجاڑنے والا، ہمارے بچوں کو عسکریت پسند بنانے والا اَمریکہ آج اپنے مقاصد میں کامیاب ضرور ہو چکا ہے مگر ایک دن اِسے اپنے تباہ کن انجام سے دو چار ہونا ہی پڑے گا بلکہ اُن تمام لوگوں کو بدترین انجام سے دو چار ہونا پڑے گا جنہوں نے اِن مکروہ عزائم کی تکمیل میں امریکہ کا ساتھ دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

کششِ ثقل اور نیوٹن

روزنامہ پاکستان 11 مئی 2017

مظاہرِ فطرت پر غور کر کے تکوینی نظم کے اُصول اخذ کرنا سائنس کہلاتا ہے۔ اِس کا دائرہ پوری کائنات پر محیط ہے۔ چنانچہ اس کا دائرہ ریاضی سے لے کر فلسفہ، میوزک، نفسیات، طبیعیات، حیاتیات، کیمیاء، مذہب اور دیگر تمام مروجہ علوم تک وسیع ہو چکا ہے۔ سائنس دراصل "کیا" کا سفر ہے جبکہ اِس کے برعکس فلسفہ "کیوں" کا سفر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ ناکام اور سائنس کامیاب ہو رہی ہے۔

ایک ہزار سال تک انسان "کیوں" کی گتھی سلجھاتا رہا مگر اِس "کیوں" نامراد کا عقدہ حل نہ ہو سکا۔ چنانچہ پھر انسان نے کیوں کو ترک کر کے "کیا" کا سفر اختیار کر لیا۔ پس "کیا" کا سفر اختیار کرتے ہی انسان کامیابی سے ہمکنار ہونے لگا اور آج کی تمام تر جدید سائنسی و تکنیکی ترقی اسی "کیا" کی مرہونِ منت ہے۔ سائنس اب اس نکتے پر غور نہیں کرتی کہ کائنات میں فلاں چیز کیوں ہے۔ اب یہ "کیوں" کی جستجو صرف فلسفے تک ہی محدود ہو گئی۔ سائنس یہ کھوجنے کی کوشش کرتی ہے کہ فلاں چیز کیسی ہے؟۔ پس وہ اس گہرائی تک پہنچ جاتی ہے کہ فلاں چیز کی حقیقت کن فطری اُصولوں پر مرتب ہے یعنی اگر ہم یہ کہیں کہ سائنس مقصد کی بجائے کسی چیز کی اساسی ہیئت معلوم کرنے کا نام ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

مقاصد، اقدار اور اخلاقیات کا براہ راست سائنس سے کوئی تعلق نہیں مگر آج تمام تر روحانی مضامین سائنس کا حصہ بن چکے ہیں اور اب سائنس کا سفر ان کے متعلق حقیقی جستجو کی طرف رواں بھی ہو چکا ہے۔ البتہ سائنس حقائق کی مقصدیت سے بالکل نابلد ہے جیسا کہ معروف طبیعیات دان آئن سٹائن بیان کر چکے ہیں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ سائنس سے منسلک اذہان اکثر روحانی خلفشار کا شکار رہتے ہیں کیونکہ وہ اقدار اور مقاصد سے فرار حاصل کر چکے ہوتے ہیں جو ایک منظم انسانی معاشرے کی بقاء کے لئے سمِ قاتل ہے۔

اسحاق نیوٹن ایک کسان کا بیٹا تھا۔ بچپن سے ہی غور و فکر کا عادی تھا۔ نیوٹن نے کائنات کے جس بنیادی اور انتہائی اہم عالمگیر اصول "کشش ثقل" کی جانب توجہ دلائی، اس کے اس اصول نے دنیا کا رخ بدل دیا۔ نیوٹن کی کھڑکی سے نظر آنے والے سیب کے لہلہاتے درخت سے جب تک سیب نہیں گرا تھا تو دنیا کو کشش ثقل کا بھی علم نہیں تھا۔

جب سیب گرا تو نیوٹن کی دور رس نگاہ نے اس سیب کا براہ راست زمین پر گرنا محسوس کر لیا۔ یوں وہ ثقالت (Gravity) کے عالمگیر اصول تک پہنچ گیا۔ چنانچہ نیوٹن کے جس درخت سے سیب گرا تھا وہ آج بھی صحیح سلامت ہے اور پھل بھی دے رہا ہے۔ برطانیہ میں واقع لنکولنشائر کے مقام پر موجود اس درخت کی عمر اب تقریباً تین سو پچاس سال ہو چکی ہے۔ ہزاروں برس سے انسان کو یہ بات معلوم تھی کہ بلندی سے گرنے والی چیزیں زمین کی جانب کھنچی چلی آتی ہیں۔ تاہم اسے یہ علم نہیں تھا کہ آسمان میں معلق چاند زمین پر کیوں نہیں گرتا اور چاند ستاروں کی طرح ہم آسمان پر کیوں نہیں پہنچ جاتے۔ 1666ء میں برطانوی سائنس دان اسحاق نیوٹن نے بتایا کہ اِن سب مظاہر کی وجہ کششِ ثقل ہے جس کا تعلق جسم کی کمیت سے ہوتا ہے۔ جو جسم جتنا بڑا ہوگا اُس میں یہ کشش بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

یوں کائنات کا ہر جسم ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ بڑے اجسام میں یہ قوت بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے جبکہ چھوٹے اجسام میں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ سورج کی کششِ ثقل نظامِ شمسی کو باندھے رکھتی ہے اور فاصلہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ کشش بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ قریب ترین سیارے عطارد پر اس کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

سورج سے زیادہ دور سیاروں پر کششِ ثقل زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی۔ جب چیزوں کو اُونچائی سے زمین پر گرایا جائے تو کششِ ثقل کی قوت کے باعث ان کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ سولہویں صدی میں اٹلی کے مشہور سائنس دان گلیلیو نے بتایا کہ بھاری اور ہلکی چیزیں ایک ہی رفتار سے گرتی ہیں اور ان پر کششِ ثقل ایک ہی طرح سے اثر کرتی ہے۔ تاہم ہوا کی مزاحمت کے باعث ہم انہیں مختلف وقفوں سے زمین پر گرتا دیکھتے ہیں۔ زمین کے جو حصے چاند کے قریب ہوتے ہیں اُن پر چاند کی کششِ ثقل کا اثر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں سمندر کا پانی اُوپر اُٹھ جاتا ہے۔ اِسی طرح جو حصے چاند سے دور ہوں وہاں سطحِ سمندر نیچے چلی جاتی ہے اس کیفیت کو مدوجزر کہتے ہیں۔ چونکہ زمین گھوم رہی ہے اِس لئے ہر چوبیس گھنٹے میں ایک بار زمین کا ہر حصہ چاند سے قریب اور دور ہوتا ہے یعنی سمندر ہر چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ مدوجزر سے گزرتے ہیں۔

زمین کی کشش کے حلقے سے باہر نکلنے کی صورت میں خلاباز بے وزن ہو جاتے ہیں ایسے میں ان کی کمیت میں کوئی کمی نہیں آتی لیکن کمیت پر کششِ ثقل اثر انداز نہ ہونے کے باعث ان کا وزن نہیں رہتا۔ خلائی جہاز سے باہر کام کرتے ہوئے خلاباز خود کو رسی سے باندھ لیتے ہیں۔

خلائی جہاز کے اندر کوئی بھی شے پینے کے لئے نلکی استعمال کرنا پڑتی ہے کیونکہ کششِ ثقل نہ ہونے کے باعث کوئی بھی مائع چیز گلاس میں نہیں رہ سکتی۔ نظامِ فلکیات میں سورج ایک بہت بڑا ستارہ ہے۔ اِسی لئے اس کی کششِ ثقل بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر آپ زمین پر ایک میٹر چھلانگ لگا سکتے ہیں تو سورج پر تین سینٹی میٹر اُونچا اُچھلنا بھی ممکن نہیں کیونکہ زمین کی کششِ ثقل مصنوعی مواصلاتی سیاروں کو اس کے مدار میں باندھے رکھتی ہے۔ چنانچہ ان سیاروں سے ٹکرا کر آنے والی ریڈیائی لہروں کی بدولت ہی ہم ٹیلی فون کالز سنتے، ٹیلی ویژن دیکھتے اور انٹرنیٹ پر کام کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

میرا مقدمہ

روزنامہ پاکستان 04 مئی 2017

میرے لئے یقیناًیہ اَمر انتہائی تعجب انگیز ہے کہ میں میکانکی روایت سے یکسر کٹ چکا ہوں۔میکانکی روایت سے مراد وہ مخصوص علمی تسلسل ہے جو عموماً دین کے مختلف مسالک میں پایا جاتا ہے۔اہلِ اسلام کے جتنے بھی مسالک ہیں دقیق تحقیق اور غیر متعصبانہ مطالعہ کے بعد معلوم پڑتا ہے کہ ہر ایک کے پاس اپنے مسلک کے حق میں زبردست دلائل موجود ہیں چنانچہ میرے لئے اہلِ اسلام کے کسی بھی مسلک کو گمراہ کن کہنا ممکن نہیں رہا۔

جستجوئے عمیق حق کے بعد معلوم ہوا کہ اختلاف کا بنیادی مرکز"علم" ہے۔جب تک سیل علم جاری رہے گا۔اُمت میں باہمی نزع و استدلالی جدل قائم رہے گا بلکہ ہم گزشتہ ایک ہزار سال میں اس مسلکی جدلیات کا مشاہدہ بھی کر چکے ہیں۔میرے نزدیک دین کبھی علمی نوعیت کی چیز ہوتا ہی نہیں بلکہ ہو ہی نہیں سکتا۔ایک سادہ سی بات ہے کہ دین کا بنیادی مقدمہ"ایمان" سے شروع ہوتا ہے اور ایمان ایک ایسی عام اصطلاح ہے کہ اس کی تعریف کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔میں سادہ سا جملہ عرض کئے دیتا ہوں کہ ایمان کا مطلب ہے"ماننا"۔

مجھے ایک عجیب مکالمہ یاد آ گیا جس کو یہاں بیان کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملائشیاء میں مختصر قیام کے دوران میری ملاقات وہاں کے ایک معروف اور انتہائی ذہین ملحد سے ہوئی جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تھیوریٹیکل فزکس کا پروفیسر تھا۔ایک شام دورانِ گفتگو وہ کہنے لگا کہ کیا آپ اپنے پاس وجودِ باری تعالیٰ کا کوئی ٹھوس تجرباتی ثبوت رکھتے ہیں یا ویسے ہی مانتے ہیں؟۔میں نے جھٹ سے جواب دیا کہ نہیں میں صرف مانتا ہوں۔کہنے لگے کہ وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق بہت سے مسلم سکالرز تو باقاعدہ منطقی استدلال قائم کرتے ہیں۔آپ اس قدر حساس ہونے کے باوجود بھی کوئی دلیل نہیں رکھتے؟۔میں مسکرایا اور عرض کیا کہ ہماری مذہبی کتاب قرآن میں ہے کہ" وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے واسطے غیب کے" تو غیب کا مطلب ہے کہ ایسا تیقن جو بنا منطقی استدلال اور تجرباتی افعال کے واقعہ ہو اور ایسا تیقن ہی ہمارے لئے کافی ہوتا ہے۔کہنے لگا کہ یقین کی کوئی منطق ہوتی ہے؟۔میں نے عرض کیا بالکل بھی نہیں۔پھر سوال کیا کہ پھر اختلاف کیسے رونما ہوتا ہے؟۔

میں نے عرض کیا کہ اختلاف کا بنیادی سبب "علم" ہے نہ کہ یقین۔ پھر میں نے اس کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا کہ دین فی الحقیقت قانونی نوعیت کی چیز نہیں بشمول تمام ادیان کے چاہے وہ الہامی ہوں یا اکتسابی۔ جب تک دین کے متعلق اِس بنیادی غلط فہمی کا ازالہ نہیں کیا جائے گا اختلاف اور نزع جاری رہے گا۔

قانون کا تعلق عقل سے ہے اور خدا نے انسان کو عقل دے کر اپنا نائب بنالیا تا کہ وہ دنیاوی اُمور میں عقل کی روشنی میں قوانین وضع کرے اور یہی انسان کا فطرتی شرف ہے۔ ایمان دراصل انسان سے خدا کا بنیادی مطالبہ ہے۔ ایمان کا عروج "عشق" ہے گویا خدا کو ماننے سے سفر شروع کرنے والا جب خدا کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ دین کی حقیقی روح تک پہنچ جاتا ہے۔ پس عشق دین کا حتمی درجہ ہے جیسا کہ ایک معروف حدیثِ رسول کا مفہوم ہے کہ "تم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک کامل ایمان تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ میں (رسول اللہ) اُسے دنیا کی ہر چیز اور رشتہ سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں"۔ گویا عاشق کامل دیندار ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ایمان، محبت اور عشق کا کوئی ضابطہ نہیں ہوتا بلکہ ممکن ہی نہیں۔ ع

کوئی فلسفہ نہیں عشق کا جہاں دل جھکے وہاں سر جھکا
وہیں ہاتھ جوڑ کے بیٹھ جا نہ سوال کر نہ جواب دے

ضابطہ اور دستور عقل کی پیداوار ہیں اور عقل ہمیشہ جدلیاتی روش کا شکار رہتی ہے۔ چاہے اس کا استعمال دینی امور میں ہو یا دنیاوی معاملات میں پس ہر دو صورتوں میں یہ شورش کی مرتکب ہوتی ہے۔ ع

عقل آمد دین و دنیا شد خراب
عشق آمد در دو عالم کامیاب

پروفیسر نے بڑے تعجب انگیز لہجے میں سوال کیا کہ خدا اور رسول کے عشق کا حامل کیا کسی انسان کی جان، مال اور آبرو

پرحملہ کرسکتا ہے کیونکہ یہ تو آپ کی مذہبی کتاب بھی کہتی ہے کہ" ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے"؟۔میں نے عرض کیا کہ قطعاً نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق اُس وقت تک واقع ہی نہیں ہوتا جب تک کہ عقل مکمل طور تحلیل نہ ہو جائے اور جب عقل تحلیل ہو جائے تو کوئی عاشق کیسے کسی دوسرے انسان یا آس پاس کی خبر رکھ سکتا ہے۔یقیناًیہ انتہائی مشکل مقام ہے مگر یہی دراصل دین کی حقیقی معراج ہے۔پروفیسر نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ کے ہاں دینی مدارس کے طلبہ یا اساتذہ بھی عشق کے حامل ہوتے ہیں؟۔میں نے مسکرا کر عرض کیا کہ ہمارے دینی مدارس میں علمِ دین پڑھایا جاتا ہے عشق نہیں سکھایا جاتا۔ع

آں علم کہ در مدرسہ حاصل گردد
کارِ دگر است عشق کارِ دگر است

میں نے عرض کیا کہ چند سو سال پہلے ہمارے ہاں گنتی کے چند علماء ایسے تھے جو عشق کی دعوت دیتے رہے اور ہم اُنہیں صوفیاء کے نام سے یاد کرتے ہیں۔جن میں زیادہ معروف ہیں جلال الدین رومی، حافظ شیرازی، شیخ سعدی، عبدالرحمن جامی، بابا فریدالدین مسعود گنج شکر، معین الدین چشتی اجمیری۔آپ سب نے تمام عمر مخلوقِ خدا کو دانشِ عشق کی طرف دعوت دی۔عشق بصیرتِ کلیہ پیدا کرتی ہے اور یہی بصیرت انسان کو جز سے نکال کر کُل میں داخل کر دیتی ہے۔جہاں خدمتِ خلق ہی دراصل خدمتِ خالق ٹھہرتی ہے۔پروفیسر نے بحث کو سمیٹتے ہوئے سوال کیا کہ کیا عشق عقل کے مخالف کوئی جذبہ ہے؟۔میں نے عرض کیا کہ یقیناً کیونکہ عشق تسلیم و رضا اور محبت و خدمت کا حتمی درجہ ہے اور ایک بار محبت و خدمت کا حتمی جذبہ بیدار ہو جائے تو پھر وہی جذبہ انسان کو سپر ہیومن بنا دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

گوگل اور جدید ذہن

روزنامہ پاکستان 27 اپریل2017

بچپن میں تاریخ کے ایک اُستاد سے مَیں نے جب یونان کے ایک فلاسفر ایپیکیورس کے متعلق سنا تو یقین کیجئے ایپیکیورس تک پہنچتے پہنچتے مجھے دس سال لگ گئے۔تب کہیں جا کے مجھے انکے کچھ خطوط ملے۔مگر آج ایسا کچھ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں آپ کو۔گوگل پر ایپیکیورس لکھیں اور پھر گوگل پلک جھپکتے ایپیکیورس کا کل کچا چٹھا آپ کے سامنے رکھ دے گا۔اِس کا فائدہ تو آپ کو فوری ہوا مگر اسی کا نقصان جو آپ کو بعد میں ہوگا اس کی تلافی ممکن نہیں اور وہ نقصان یہ کہ آپ کا ذہن زنگ آلود اور آسائش طلب ہو جائے گا جس کے سبب آپ علم کی محض سطح پر قائم رہیں گے یعنی گہرائی اور بصیرت سے بالکل بے بہرہ ہو جائیں گے۔

آج بلاشبہ ٹیکنالوجی نے ذہانت میں اضافہ کر دیا۔وہ دور جس میں ٹیکنالوجی اور سائنسی سہولتیں برائے نام تھیں ہر عشرے میں ایک ذہین ترین انسان نکھر کر سامنے آجاتا۔اب جبکہ ہر طرف ٹیکنالوجی اور علمی وسائل کی بھرمار ہے فلہٰذا اب ذہانت ناپید ہوگئی۔علم مشق سے پختہ ہوتا ہے نہ کہ سہولت سے۔اِس کو ہم ایک تمثیل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک شخص جو کراچی میں رہتا ہے وہ کوئٹہ کے متعلق آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہے تو قدیم ذرائع کے مطابق اُسے کراچی سے سفر کر کے کوئٹہ آنا پڑے گا۔اب جب وہ کراچی سے نکلے گا تو راستے میں طرح طرح کے حالات و واقعات سے اُس کا سامنا ہوگا جس کے سبب اُس کے تجربات اور مشاہدات میں اضافے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی تہذیب وتمدن کا براہ راست تجرباتی علم بھی حاصل ہو جائے گا۔چنانچہ وہ کوئٹہ پہنچتے پہنچتے کئی ایک تجرباتی علوم سیکھ چکا ہو گا۔اِس کے برعکس گوگل پر کوئٹہ کے متعلق محض معلومات حاصل کرنے سے وہ مذکورہ بالا تمام تجرباتی علوم سے محروم ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں علم حاصل کرنے کے لئے سفر اختیار کیا جاتا اور عالم کی مسلمہ نشانی یہی ہوتی کہ وہ ہر وقت حالتِ سفر میں رہتا جبکہ آج گھر بیٹھے ایک ہی کلک کے نتیجے میں ہم متعدد من پسند معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔یاد رکھئے یہ صرف معلومات ہیں علوم نہیں کیونکہ علم تجربہ کا متقاضی ہے اور تجربہ آج ناپید ہو چکا۔آج کیا ہے جو گوگل پر نہیں ملتا مگر اس قدر زبردست اور محیر العقل ٹیکنالوجی کے باوجود بھی ذہنی وسعت اور اصلی حقائق تک رسائی تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔

علم کو صرف مادہ میں مقید کر دیا گیا اور انسان ایک میکانکی آلہ بن کر رہ گیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سائنس روح کو سرے سے مانتی ہی نہیں اور اس کے لئے وہ یہی دلیل پیش کرتی ہے کہ یہ سائنس کا موضوع ہی نہیں جبکہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک چیز کے متعلق جب کوئی حتمی علم ہی نہیں تو پھر اُس کا انکار کس بنیاد پر کیا جا رہا ہے؟۔ عجیب بات ہے کہ دنیائے مادیت کے سرخیل آئن سٹائن کہتے ہیں کہ "عقل کی مثال ایسے مضبوط مسلز کی ہے جس کی کوئی شخصیت نہیں"۔ آپ کہتے ہیں کہ عقل مقاصد اور اقدار کے حوالے سے بالکل اندھی ہے۔

آئن سٹائن کے اس قول کو دراصل سمجھا ہی نہیں گیا۔ گوگل نے نئی نسل کو سوچنا تو سکھا دیا مگر حقیقت تو یہ ہے کہ تہذیب سے بالکل بے بہرہ کر دیا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں دو انتہائیں ابتداء ہی سے قائم رہیں۔ مذہب سے متعلق لوگ جذبات کو مطلق حقیقت جان کر غیر ضروری جنونیت کا شکار ہو گئے جبکہ اس کے برعکس آزاد منش لوگ ہر اخلاقی دائرے اور تہذیب سے آزاد ہو کر عام سطح کے ذہن کے لئے سوہانِ روح بن گئے۔

کائنات پر دقیق نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ ایک خاص قسم کے توازن پر قائم ہے۔ جیسے ہی یہ توازن تھوڑا سا بے ترتیب ہو تو نظم منہدم ہو جاتا ہے گویا نظم کی بنیاد بیلنس یعنی توازن ہی ہے۔ عقل جہاں انسان کے اندر اچھے اور برے میں تمیز پیدا کرتی ہے تو وہاں جذبہ انسان کو تہذیب اور محبت کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ مطلق عقل کی جانب لڑھک جانے والے ہمیشہ انتشارِ ذہن، فکری آوارگی اور روحانی اضمحلال کا شکار رہتے ہیں جبکہ مطلق جذبات کی رو میں بہہ جانے والے فساد فی الارض کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ دونوں کی روش تباہ کن اور انسانیت کُش ہے۔ انسان کو ہمیشہ عقل و جذبہ میں توازن رکھنا چاہئے اور یہ توازن ایک مہذب اور باشعور انسان پیدا کرتا ہے۔ گوگل نے جہاں انسان کے لئے لامحدود معلومات کے خزانے قائم کر لئے تو وہاں انسان کو کند ذہن بھی بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا تجربہ کیا جائے تاکہ اس کی حقیقت معلوم ہو سکے۔ محض اس کے خط و خال جان لینا علم نہیں۔ پس گوگل معلومات تو فراہم کر سکتا ہے حقیقی علم نہیں کیونکہ گوگل سے کسی چیز کی بنیادی نوعیت کی معلومات تو حاصل کی جا سکتی ہیں مگر اس چیز کی حقیقت نہیں جانی جا سکتی۔ حقیقت جاننے کیلئے تجربہ کرنا ضروری ہے جبکہ گوگل ایک غیر تجرباتی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ایک نکتہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک چیز کے متعلق سطحی معلومات اس کی حقیقت جاننے سے روک لیتے ہیں۔

اِس لئے آج جدید ذہن حقائق سے زیادہ سطحی آگاہی میں دلچسپی لے رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ذہانت کے اُس معیار تک نہیں پہنچ پا رہا جس تک ماضی کے چند ایک ذہین پہنچے ہیں۔ تجربہ علم کا تخم ہے اور تجربہ کی تعریف یہ ہے کہ "کسی طبعی و غیر طبعی افعال ونظریات کو انسانی وجود سے پریکٹس کرنا"۔ غیر طبعی سے مراد اخلاقیات اور شعائر و اقدار ہیں۔ پس یہ تجرباتی مشق گوگل پر نہیں ہوسکتی۔ اِس کے لئے انسانی وجود کو استعمال میں لانا ہوگا جبکہ گوگل حرکتِ وجود کی اہمیت کو کم کر کے اور سہولت کا نشہ دے کر انسان کو تھوک معلومات فراہم کر رہا ہے جس کے سبب جدید ذہن مہارت اور محنت سے جی چرانے لگا۔ گویا جدید ذہن کو کھوٹا کرنے میں آج گوگل ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

چراغ سب کے بجھیں گے

روزنامہ پاکستان 20 اپریل 2017

لاحول ولا قوۃ۔کسی برائے نام مسلمان سے بھی اِس انتہائی رذیل اَمر کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی خلافِ اَدب بات بھی کرے چہ جائیکہ وہ جو خود کو صوفی کہتا ہو۔ 13 اپریل کی صبح مردان کی یونیورسٹی عبدالولی خان میں جو باچا خان بابا کے فرزند اور آزاد منش خدائی خدمتگار ولی خان اور آپ کے والد کی نظریاتی وراثت کو دوام بخشنے کے لئے قائم کی گئی تھی۔دن دیہاڑے جدید تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کے جمِ غفیر نے ایک آزاد طبیعت صوفی منش نوجوان مشال خان کو انتہائی اندوہ ناک طریقے سے قتل کر دیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک دوٹوک اور دلیرانہ قتل ہے۔اِس کو شہادت جیسی مخصوص فقہی اصطلاح میں پرو کر لاقانونیت کو جواز بخشنے سے گریز کیا جائے۔دوسری بات یہ کہ توہین رسالت کا سہارا لینے سے یکسر گریز کیا جائے کیونکہ فی نفسہ یہ الفاظ روحانی اذیت سے کم نہیں۔رسالت رحمتِ عالم ہے۔ہدایتِ عالم ہے۔اِس مقدس اور انتہائی ارفع اصطلاح کے ساتھ توہین جیسا لفظ لگانا زبردست احمقانہ حرکت ہے۔محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات صوفیوں کی روح کا مرکز ہے لہٰذا توہین رسالت جیسی اصطلاح ہمارے لئے سوہانِ روح ہے۔اِس اصطلاح کو بولنے اور لکھنے سے یکسر گریز کر کے اس کی متبادل اصطلاح "خلافِ ادب" لکھی اور بولی جائے اور اس ضمن میں یہ بلاسفیمی ولاسفیمی لکھنا بولنا بھی ترک کر دیا جائے۔انگریزی کی اِس اصطلاح کا مطلب بھی انتہائی کراہت آمیز ہے۔

مقتول نوجوان مشال خان جس پر محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خلافِ ادب گفتگو کا الزام لگایا گیا تھا،سرکاری تحقیقاتی رپورٹ کے بعد اب یہ الزام ایک بہتان کی شکل اختیار کر چکا ہے۔اِس واقعہ کا بنیادی تعلق دراصل ایک سیاسی فضاء سے مربوط ہے مگر اس معاملے کو جس بے دردی اور دیدہ دلیری سے ایک بہتان کی شکل دی گئی،اس کی مثال تو بہر کیف کہنے دیجئے کہ صرف ہمارے معاشرے میں ہی مل سکتی ہے۔

پڑھے لکھے نوجوانوں کے جمِ غفیر نے مشال خان پر جس بے رحمی اور بے دردی سے وار کئے،شاید ہماری یادداشت میں ایسا انتہائی اندوہ ناک قتل کہیں نہیں ہوا کہ ایک بے گناہ شخص کی روح لکڑی کے تختے اور پکی مٹی کے گملے مار مار

کرنکالی گئی ہواور اسی پر بس نہیں بلکہ مقتول کی لاش پوری طرح مسخ کر دی گئی ہو۔ پڑھے لکھے مسلمان کفراور اسلام کی جنگ کا یہ بنیادی اُصول اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کسی مستند کافر کی لاش کا بھی مثلہ جائز نہیں یعنی قتل کے بعد اس کی لاش کو مسخ نہیں کیا جاسکتا۔ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں اور کہاں کے تربیت یافتہ ہیں ۔اقبال نے بالکل بجا فرمایا تھا۔ع

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغِ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

پاکستان میں قانون کی رٹ تو اب ایک افسانہ بن چکی ہے یعنی حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ہمارے تعلیمی ادارے جہاں ہمارے بچوں کی علمی و اخلاقی تربیت ہونا چاہئے تھی وہاں جہالت، درندگی اور لاقانونیت پروان چڑھ رہی ہے جبکہ ریاست لمبی تان کر سو رہی ہے بلکہ باہر ڈوناٹ ڈسٹرب کا نوٹس بھی لگا چکی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی جرم اس وقت تک صرف الزام ہی رہتا ہے جب تک کسی ملک کی عدالت اُسے ثابت نہ کر دے۔ چنانچہ ثابت ہوتے ہی عدالت سزا کا فیصلہ سنانے کا اختیار رکھتی ہے۔ الزام لگانے والا ایک فریق کی حیثیت سے اپنا مقدمہ پولیس اسٹیشن میں درج کرواتا ہے تاکہ پولیس عدالت سے مدعی کے Behalf پر باقاعدہ اجازت نامہ (اریسٹ وارنٹ) لے کر ملزم کو بحفاظت پکڑ لے۔ اِس دوران اگر ملزم فرار ہو جاتا ہے تو عدالت کو اختیار ہے کہ وہ ملزم کے ملک سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دے۔ اگر ملزم پکڑ لیا جاتا ہے تو مدعی کو پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ عدالت کے سامنے اپنے الزامات کی دہائی دے۔ اِسی دوران مدعا علیہ کو بھی اِس بات کا مکمل حق دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اوپر عائد کئے گئے الزامات کا مدلل جواب دے۔عدالت کو کلی اختیار ہوتا ہے کہ وہ فریقین کے بیانات سن کر کسی حتمی نتیجے پر پہنچ کر اپنا فیصلہ سنائے۔ایسا تو خیر دیگر دنیا میں ہوتا ہے ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ہمارے ہاں تو جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ۔فیض مرحوم کی زبانی سن لیجئے۔ع

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

ولی خان یونیورسٹی میں پڑھے لکھے نوجوانوں کے جمِ غفیر کی درندگی کا نشانہ صرف مشال خان نہیں بنا بلکہ ملک کی انتظامیہ،سیکیورٹی،قانون،عدالت اور پورا معاشرہ اس کی زد میں آچکا ہے۔ یہ وہ لوگ نہیں جو کسی فرسودہ حال مدرسے یا مکتب کے متعلم رہ چکے ہوں بلکہ آج کے جدید ترین تعلیمی اداروں کے پروردہ ہیں۔اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ یہ انتہائی ناپسندیدہ رویہ کس شدت سے پورے معاشرے میں اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے۔پس اب اس زعم میں نہ رہئے گا کہ انتہا پسندی صرف مدارس میں ہی پنپتی ہے اور صرف مذہبی نوعیت کی ہوتی ہے۔آپ نے سیاسی، بالخصوص نسلی انتہاء پسندی کا مشاہدہ نہیں کیا لیکن چونکہ اس وقت ملک میں رائج صرف مذہبی انتہا پسندی ہے اس لئے دیگر تمام تر انتہا پسندانہ معاملات اِسی میں ضم کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ اس کا ایفیکٹ فوری اور مسلسل ہے۔بے فکر مت رہئے۔ یہ رنگا رنگ انتہا پسندی اب صرف ایک ہی نوعیت میں آپ کے گھر تک پہنچے گی۔وہ دن دور نہیں جب لوگ اپنی انفرادی خباثت کو مذہبی انتہاء پسندی کی تلوار میں ڈھانپ کر آپ کا گلا کاٹ دیں گے۔اپنے چراغ کی لو پر نازاں نہ ہوں۔آپ کا چراغ بھی بجھا دیا جائے گا کیونکہ یہ ہَوا کسی کی نہیں۔ع

مَیں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہَوا کسی کی نہیں

☆☆☆☆☆☆☆

ڈی این اے میوٹیشن

روزنامہ پاکستان 13اپریل 2017

دنیا میں جتنے بھی صحت مند جاندار ہیں جیسا کہ سنگل سیل والے بیکٹیریا، امیبا، پھول، درخت، مچھلیاں اور انسان سب اپنی نسل کو آگے بڑھاتے ہیں اور اپنی ہی کاپیاں یعنی بچے پیدا کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کے دوران اصل میں ہم اپنے ہی ڈی این اے کی کاپیاں کر کے اپنی اگلی نسلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ہمارے جسم میں ہر سیل کے اندر ایک زنجیر نما کیمیائی مادہ ہوتا ہے جسے ڈی این اے (Deoxyribonucleic acid) کہا جاتا ہے۔ ہر سیل میں موجود ڈی این اے اسے یعنی سیل کو بتاتا ہے کہ وہ کیسے نشوونما کرے یعنی انسانوں سمیت ہر جاندار کے سیل میں ایک آپریٹر ہوتا ہے جو اُسے چلاتا ہے۔

ڈی این اے کے اندر کوڈ کی شکل میں انفارمیشن یا معلومات ہوتی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ ایک جاندار یعنی ایک انسان کیسے بنے گا۔ انسانی جسم میں پائی جانے والے ڈی این اے میں موجود انفارمیشن گلاب کے پھول کے ڈی این اے کی انفارمیشن سے مختلف ہوتی ہے۔ اِسی وجہ سے انسان گلاب کے پھول سے مختلف نظر آتا ہے اور مختلف انداز میں کام کرتا ہے۔ آپ کے جسم میں موجود ڈی این اے کی انفارمیشن راحت فتح علی خان کے ڈی این اے سے تھوڑی مختلف ہے ورنہ آپ بھی راحت فتح علی خان کی طرح گا رہے ہوتے یا اُن جیسے ہوتے۔

سنگل سیل والے سادہ جاندار اپنے خول کے اندر ہی اپنے ڈی این اے کی کاپی کرتے ہیں۔ جیسے ہی دو ڈی این اے بنتے ہیں وہ خول دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور یوں دو نئے جاندار بن جاتے ہیں۔ اُصولاً دونوں کو ایک دوسرے کی کاپی ہونا چاہئے تھا مگر فطرت ایسے کام نہیں کرتی۔ جب ڈی این اے کی کاپی ہوتی ہے تو زنجیر نما کوڈ میں معلومات کی کاپی کے دوران غلطیاں رونما ہو جاتی ہیں یعنی کچھ کوڈ والی معلومات آگے پیچھے ہو جاتی ہیں جسے بیالوجی میں ڈی این اے میوٹیشن کہا جاتا ہے۔

یہ ڈی این اے میوٹیشن حادثاتی طور پر ہوتی ہے اور بے ترتیب ہوتی ہے۔ ڈی این اے میں اِسی بے ترتیب حادثاتی غلطیوں کی وجہ سے جو نیا ڈی این اے بنتا ہے وہ اپنے پہلے والے ڈی این اے سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔

اس لیئے نیا بننے والا جاندار اپنے بنانے والے جاندار سے تھوڑا مختلف نکلتا ہے مگر مشابہ ضرور ہوتا ہے یعنی اگر کاپی کرنے سے پہلے والا سیل گول ہے تو میوٹیشن کاپی کے بعد نیا بننے والا ڈی این اے سیل گول تو ہوگا مگر ساتھ تھوڑا سا چپٹا بھی ہوگا۔ یوں ڈی این اے میں ذرا سی تبدیلی نئے بننے والے جاندار کی ساخت میں نیا پن لاتی ہے۔جانوروں، مچھلیوں اور انسانوں میں نئی نسلیں بنانے کا کام سنگل سیل والے جاندار سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔ہم لوگوں کو نئی نسل پیدا کرنے کے لیئے ایک پارٹنر ڈھونڈنا ہوتا ہے۔مثال کے طور پر اگر ایک بلی اور بلے نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا تو وہ نئے بچے پیدا کرنے کے لیئے ملاپ کرتے ہیں۔ملاپ کے دوران بلا اپنے ڈی این اے کا آدھا حصہ بلی کو اسپرم کی شکل میں منتقل کر دیتا ہے۔ڈی این اے کا بقیہ آدھا حصہ بلی اپنے اسپرم سے پورا کرتی ہے۔ یوں بلی اور بلا اپنے ڈی این اے کو مکس کرکے اپنا اپنا ڈی این اے نئے آنے والے بچے کو منتقل کر دیتے ہیں۔اِسی طرح بلی کے بچوں میں اپنی ماں اور باپ دونوں کی خصوصیات شامل ہو جاتی ہیں۔ بالکل یہی کام انسانوں میں بھی ہوتا ہے۔اسی لیئے انسانی بچوں کے نین نقش اپنے ماں باپ سے ملتے بھی ہیں اور مختلف بھی ہوتے ہیں یعنی ماں اور باپ اپنی خصوصیات اپنے بچوں میں منتقل کرتے ہیں جس میں بیماریاں بھی ہوتی ہیں اور لمبے قد، نیلی آنکھیں،سنہرے بال وغیرہ وغیرہ جیسی صفات بھی پائی جاتی ہیں۔

ڈی این اے میوٹیشن کی وجہ سے نیا پیدا ہونے والا بچہ بہت ساری نئی خصوصیات اپنے طور پر بھی لاتا ہے جو اُن کے والدین میں موجود نہیں ہوتیں۔ یوں اِس وراثت پذیر خصلتوں کو نئی نسلوں میں تبدیلی کے عمل کو ارتقاء کہا جاتا ہے جو کہ ہر روز ہمارے آس پاس ہوتا ہے۔

اگر ہم آج کے دور سے کچھ ہزار سال پیچھے چلے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ موجودہ نسل کے مختلف اقسام کے خوبصورت کتے اصل میں بھیڑیوں کی نسل سے ہیں جنہیں انسانوں نے افزائش نسل کے لیئے چن چن کر آگے بڑھایا۔ پرانے لوگوں نے حفاظت کے لیئے بھیڑیوں کو پالا اُن کے ہونے والے بچوں کو اپنی ضروریات کے حساب سے تقسیم کیا اور یوں ان کی نسل مختلف ہوتی گئی۔اِسی طرح انسانی مداخلت سے بھیڑیوں کے ارتقاء سے کتوں کا وجود رونما ہوا۔آج ہم کتوں کی مختلف اقسام دیکھتے ہیں جیسے چھوٹے کتے، موٹے کتے، لمبے کتے، تیز دوڑنے والے کتے، بالوں والے کتے، کم بالوں والے کتے، درحقیقت یہ تمام کتے ماضی میں بھیڑیوں کی ایک ہی قسم سے افزائش کیئے گئے ہیں۔

البتہ اِن میں کس نسل کو آگے بڑھانا ہے اور کسے نہیں بڑھانا یہ کام انسانوں نے خود کیا۔ اِسی طرح ایک خاص قسم کی گھاس کو مختلف عوامل سے گزار کر مکئی کو پیدا کیا گیا۔ بالکل اِسی طرح کیلے کو پیدا کیا گیا۔ سندھ کے آم کے پھل کو انسانی مداخلت نے ایک نیا روپ دے دیا جسے ہم قلمی یا سندھڑی آم کہتے ہیں۔ جینیٹکس، جیالوجی، بیالوجی اور میتھی میٹکس سمیت تمام جدید سائنس نے یہ دریافت کیا کہ جس طرح تمام کتے اصل میں بھیڑیوں کی ایک ہی خاص نسل سے ہیں اِسی طرح تمام جاندار بشمول انسان، جانور، مچھلیاں، پرندے پھول اور درخت وغیرہ بھی اصل میں ایک ہی نسل سے نکلے ہیں۔ اِس دنیا میں جو بھی جاندار چیز ہے اُس کی اصل شروعات ایک ہی جگہ سے ہوئی۔ کروڑوں کھربوں سال کے ارتقاء اور ڈی این اے میوٹیشن کی وجہ سے نئی نسلیں اور نئے اقسام بنتے گئے۔

ہمیں ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ اِس زمین پر زندگی کا پہلا بیج کس طرح آیا مگر اتنا پتہ تو چل چکا کہ جیسے ہی زندگی وجود میں آئی باقی سب اس سے وجود میں آتا گیا یعنی انسان ہو یا جانور، چرند پرند ہو یا نباتات سب شروع میں ایک ہی جاندار سے نکلے ہیں۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کتوں کی مختلف اقسام کو پیدا کرنے میں انسانی ہاتھ ہے اور جو ارتقاء کو کنٹرول کر رہا تھا تو کیا خود انسان یا دیگر جانوروں کی افزائش کو کنٹرول کرنے والا بھی کوئی تھا؟ یعنی ایک خوفناک بھیڑیئے کو ایک خوبصورت پپی میں بدلنے والا اور ارتقائی عمل کی نگہبانی کرنے والا انسان تھا تو خود ایک جاندار سے انسان کو وجود میں لانے والا کوئی تھا؟۔

ارتقاء بذات خود ایک بے ترتیب اور خودکار عمل ہے۔ اُنیسویں صدی میں چارلس ڈارون اور الفریڈ رسل والس نے جداگانہ طور پر سب سے پہلے یہ بات دریافت کی کہ ارتقاء کے عمل کو کسی نگہبان کی ضرورت نہیں ہوتی مگر ایک اور طاقتور فطری عمل موجود ہے جو ارتقاء کو کنٹرول کرتا ہے اور اس طاقتور خودمختار فطری عمل کو نیچرل سلیکشن کہتے ہیں۔ چارلس ڈارون نے اصل میں اِسی نیچرل سلیکشن کے عمل کو دریافت کیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت خواجہ سنگ

روزنامہ پاکستان 06 اپریل 2017

بہار جانے کو ہے اور لُو آنے کو ہے۔ ذہنی مصروفیات اور مادی وسائل کی دھکم پیل نے اتنا وقت ہی نہیں دیا کہ رنگِ بہار پر نظر دوڑا سکیں۔ بہار ہو اور حضرت امیر خسرو دہلوی اور آپ کے مشفق مرشد حضرت بابا صاحب نظام الدین اولیاء کا ذکر نہ ہو ہمارے لئے تو کم از کم ایسا ممکن نہیں۔ چیت کی سنگراند سے لے کر اب تک میں ہر رات گئے حضرت خسرو کی پُرسرور بندش جو راگ بہار میں ہے، سنتا رہا ہوں۔ راگ بہار کافی ٹھاٹھ کی کھاڈو سمپورن راگ ہے۔ اِس کا صحیح وقت تو آدھی رات ہے مگر چیت میں یہ ہر وقت سنی اور گائی جا سکتی ہے۔ وادی سُر اس کا مدھم اور سموادی سرج ہے۔ راگ بہار میں حضرت امیر خسرو کی یہ بندش بہت مقبول ہوئی۔ ع

حضرت	خواجہ	سنگ	کھیلیئے	دھمال
بائیس	خواجہ	مل	بن بن	آئے
تھامے	حضرت	رسول	صاحب	جمال
عرب	یار!	توری	بسنت	منائیو
سدا	رکھیو	لال		گلال

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ "تصوف مذہب کی روح ہے"۔ مگر آج نہایت پسندی نے ہم سے ہماری یہ روح چھین لی۔ ایک طرف الحاد اور فکری آوارگی کا وہ سیلاب اُمڈ آیا کہ نئی نسل ہر روحانی جذبے سے مفرور ہوگئی تو دوسری طرف مُلّائیت کے وہ غیر ضروری خشک ضابطے اور خود ساختہ قوانین ہیں کہ جن کی بدولت انسان ایک میکانکی آلہ بن گیا۔ علاوہ ازیں رہی سہی کسر جعلی پیروں اور خضر پوش نوسر بازوں نے پوری کر دی جو حالات کے مارے حماقت گزیدہ عوام کو دونوں ہاتھوں سے لُوٹ کر مقدس روحانی شعار کو تجارت بنا چکے ہیں۔

دین سے محبت و عشق نکال کر باقی جو کچھ بچتا ہے وہ جہالت اور نہایت پسندی کے سوا کچھ نہیں ۔ یہی وہ عشق تھا جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا ۔ع

اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

تصوف نے تو ہمیں محبت کا وہ روشن راستہ دکھایا جس میں عشق کی خوشبو حکمت و دانش سے وقوع پذیر ہوتی ہے ۔ جہالت اور ہٹ دھرمی کبھی مثبت نتائج سامنے نہیں لاتی ۔محبت کی روشنی دانش کے پل سے گزرتی ہے اور وہ پل مرشدِ حق کی ذات اعلیٰ صفات ہوتی ہے ۔ اِسی لئے تو صوفیاء فرما گئے کہ عشق کا سب سے پہلا مقام فنافی الشیخ ہے ۔حضرت سلطان العارفین سلطان باہو یہی مقام بیان فرماتے ہیں ۔ع

الف اللہ چنبے دی بوٹی من وچ مرشد لائی ہُو
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہُو
اندر بوٹی مشک مچایا جان پھلن تے آئی ہُو
جیوے مرشد کامل باہو جیں اے بوٹی لائی ہُو

محبت و عشق کے حوالے سے مجھے یہاں پر حضرت نظام الدین اولیاء کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے جو میں اپنے نوجوان طبقہ کیلئے بیان کر رہا ہوں بالخصوص اُن کیلئے جو عقلی بوقلمونیوں میں غرق ہو چکے ہیں اور اس وقت کسی روشن رستے کے متلاشی ہیں ۔ یاد رکھئے عقل کی حد ہی دراصل محبت کی ابتدا ہے ۔اقبال فرماتے ہیں ۔ع

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ نظر دراصل محبت و عشق ہی ہے ۔حضرت نظام الدین اولیاء اکثر ایک جملہ فرمایا کرتے کہ ”ہم سے تو دھوبی کا بیٹا ہی خوش نصیب نکلا ہم سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا“ ۔ پھر غش کھا جاتے ۔ایک دن آپ کے مریدوں نے پوچھ ہی لیا کہ حضرت یہ دھوبی

کے بیٹے والا کیا ماجرا ہے؟۔آپ نے فرمایا ایک دھوبی کے پاس محل سے کپڑے دھلنے آیا کرتے تھے اور وہ میاں بیوی کپڑے دھو کر استری کر کے واپس محل پہنچا دیا کرتے ۔اُن کا ایک بیٹا بھی تھا جو جوان ہوا تو کپڑے دھونے میں والدین کا ہاتھ بٹانے لگا۔کپڑوں میں شہزادی کے کپڑے بھی تھے جن کو دھوتے دھوتے وہ شہزادی کے نادیدہ عشق میں مبتلا ہو گیا۔محبت کے جذبے کے جاگ جانے کے بعد اُس نوجوان کے اطوار بدل گئے ۔وہ شہزادی کے کپڑے الگ کرتا اُنہیں خوب اچھی طرح دھوتا پھر انہیں استری کرنے کے بعد ایک خاص نرالے انداز میں تہہ کر کے رکھ دیتا۔سلسلہ چلتا رہا۔آخر کار نوجوان کی والدہ نے اس تبدیلی کو نوٹ کیا اور دھوبی کے کان میں کھسر پھسر کی کہ یہ لڑکا تو لگتا ہے سارے خاندان کو مروا کے رہے گا۔ یہ تو شہزادی کے نادیدہ عشق میں مبتلا ہو گیا ہے ۔والد نے بیٹے کے کپڑے دھونے پر پابندی لگا دی ۔اُدھر جب تک لڑکا محبت کے زیر اثر محبوب کی کوئی خدمت بجالاتا تھا تو محبت کا بخار نکلتا رہتا تھا مگر جب وہ اس خدمت سے ہٹا دیا گیا تو لڑکا بیمار پڑ گیا اور چند ہی دن بعد فوت ہو گیا۔

چنانچہ کپڑوں کی دھلائی اور تہہ بندی کا انداز بدلا تو شہزادی نے دھوبن کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا کہ میرے کپڑے کون دھوتا ہے؟۔ دھوبن نے جواب دیا کہ شہزادی عالیہ میں دھوتی ہوں ۔شہزادی نے کہا پہلے کون دھوتا تھا؟۔ دھوبن نے کہا کہ میں ہی دھوتی تھی شہزادی نے دھوبن سے کہا کہ یہ کپڑا تہہ کرو۔اب دھوبن سے ویسے تہہ نہیں ہوا جیسے اُس کا لڑکا کیا کرتا۔شہزادی نے اُسے ڈانٹا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔سچ سچ بتاؤ ورنہ سزا ملے گی ۔دھوبن کے سامنے کوئی رستہ بھی نہیں تھا، دوسرا کچھ دل بھی غم سے نڈھال تھا وہ زارو قطار رونے لگ گئی اور سارا ماجرا شہزادی کے گوش گزار کر دیا۔شہزادی یہ کہانی سن کر سکتے میں آ گئی اور پھر اُس نے فوری طور پر سواری تیار کرنے کا حکم دیا اور شاہی بگھی میں سوار ہو کر پھولوں سے بھرا ٹوکرا لیا اور مقتولِ محبت کی قبر پر سارے پھول چڑھا دیئے ۔چنانچہ پھر زندگی بھر اُس کا یہ معمول رہا کہ وہ اس دھوبی کے بچے کی برسی پر اس کی قبر پر پھول چڑھانے جاتی ۔یہ واقعہ سنانے کے بعد آپ فرماتے ”اگر ایک انسان سے بن دیکھے محبت ہو سکتی ہے تو بھلا خدا سے بن دیکھے محبت کیوں نہیں ہو سکتی“۔حضرت بابا صاحب نظام الدین اولیاء پھر فرماتے ”وہ دھوبی کا بچہ اِس وجہ سے کامیاب رہا کہ اُس کی محبت کو قبول کر لیا گیا“۔

☆☆☆☆☆☆☆

بیانیہ

روزنامہ پاکستان 30مارچ 2017

جب آپ بولتے ہیں تو آپ دو قسم کی کیفیات سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ایک کیفیت شعوری ہوتی ہے اور دوسری لاشعوری۔چنانچہ جب آپ شعوری کیفیت میں کچھ بیان کرتے ہیں تو وہ ایک مخصوص علت پر مقیم ہوتی ہے۔وہ مخصوص علت دراصل آپ کا بیانیہ ہے۔ہم اِسے استدلال بھی کہہ سکتے ہیں۔یعنی جب آپ اپنی بات کے حق میں دلیل بیان کرتے ہیں تو وہ دلیل دراصل آپ کا بیانیہ ہوتا ہے۔تلوار اور بندوق کے زمانے لد چکے اور ہم اِس وقت دلائل کے دور سے گزر رہے ہیں پس یہ دلیل کا آج کا بیانیہ (Narrative) ہے۔

یہ الفاظ اور قلم کا دور ہے۔پس سوچ سمجھ کر بولیں اور سوچ سمجھ کر لکھیں۔چند لمحوں کیلئے ہم قانون کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔دنیا کا ہر انسان چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب اور خطے سے کیوں نہ ہو حتیٰ کہ وہ لامذہب کیوں نہ ہو ہمیں اسکی بات دھیان اور تحمل سے سننی پڑے گی۔بولنے دیں اُسے اور سنیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔اپنے اندر بہر صورت برداشت اور بردباری کا مادہ پیدا کریں۔فتاویٰ اور استہزاء کو غلاف میں لپیٹ لیں اور یہ فیصلہ خدا پر چھوڑ دیں کہ کوئی کفر اور ایمان کے کس درجے میں واقع ہے۔یہ حق بلا شرکتِ غیرے خدا کا ہے کہ وہ انسانوں کے اندر کفر اور ایمان کو ٹٹول کر اُن کے حق میں یا خلاف فیصلہ صادر کرے۔ریاست صرف اُن جرائم کی سزا دے سکتی ہے جن کا تعلق انسانی جان، مال اور عزت سے ہے۔اعتقادات اور روحانی مشقات خدا کے حقوق ہیں اور وہی بخوبی جانتا ہے کہ کون اسکے حقوق ادا کر رہا ہے اور کون بغاوت کر رہا ہے۔ان معاملات میں انسان کو قطعی زحمت نہیں دی گئی کہ وہ فیصلہ کرے۔کچھ بھی بولا اور لکھا جا سکتا ہے مگر تہذیب کے دائرے کے اندر۔اگر آپ اعتقادات سے برگشتہ ہیں تو آپ پر میرے اعتقادات کا احترام فرض ہے اور یہ پہلا اُصول ہے بیانیہ کا۔مجھے اِس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ تسلیم و فرار کے کس مقام پر کھڑے ہیں مگر میرے تیقن پر استہزاء آپ کیلئے جائز نہیں اور یہ دوسرا بنیادی اصول ہے بیانیہ کا۔میں اگر کسی کی جان و مال اور آبرو کی حرمت کے ساتھ مروجہ عقائد سے مفرور اور روحانی ضوابط سے دور ہو گیا ہوں تو آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میرا مواخذہ کریں۔یہ اختیار خدا کا ہے اور وہی میرا مواخذہ کر سکتا ہے۔یہ تیسرا بنیادی اُصول ہے بیانیہ کا۔

عالمگیر بیانیہ : تمام انسان خدا کا کنبہ ہیں ۔انسانوں کے درمیان مذہبی ،نسلی اور جغرافیائی تفاوت خدا کی ازلی مشیت اور مجرد اختیار ہے ۔ چنانچہ کسی بھی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کا انفرادی اختیار استعمال کرے ۔کسی بھی انسان کا بدنی، مالی اور فکری استحصال عالمگیر جرم ہے ۔ چنانچہ اس اَمر کی تصویب کسی بھی صورت ممکن نہیں ۔
کسی بھی مذہب یا مسلک کو گمراہ کن کہنا اور انکے حاملین کو ناحق قتل کرنا فساد فی الارض کے مترادف اور یہ ہر زمانے میں اور ہر معاشرے میں ایک ناقابل تلافی جرم ہے ۔اصحابِ استدلال جو دلیل دینے کا فن جانتے ہیں کو تہذیب کے دائرے میں اپنی بات کہنے کا پورا حق حاصل ہے ۔ چنانچہ کسی کا یہ بنیادی حق غصب کرنا جرم اور اختیاراتِ خداوندی میں مداخلت ہے ۔زیادتی جس لحاظ سے بھی کیوں نہ ہو تباہی ہے ۔دین اور تہذیب میانہ روی کا نام ہے ۔ چنانچہ زیادتی کے خلاف قدم اٹھانا ہر انسان پر فرض ہے اس حال میں کہ وہ زیادتی کو ہوتا ہوا محسوس کرلے یا پھر مشاہدہ کر لے ۔غربت اور جہالت متعدی جرائم کے محرکات ہیں ۔اِن کا مکمل خاتمہ ہر ریاست کی اوّلین ذمہ داری ہے ۔مکالمہ انسانی معاشروں کی دیرینہ وراثت ہے ۔ چنانچہ مکالمہ کو فروغ دینا اور دلیل کی عادت ڈالنا ہر انسان کی بنیادی ذمہ داری ہے ۔اخلاقیات کا مورد شعور ہے پس شعور کی آبیاری انسان کو رفیع الخصائل بنا کر حیوان سے ممیز کر دیتی ہے ۔

طریقِ استدلال

فریقِ اوّل : بلاشبہ پاکستان کی نظریاتی اساس اسلام پر قائم ہے ۔مگر یہ وہ اسلام نہیں جو اُس وقت ہندوستان میں رائج تھا بلکہ یہ صدرِ اوّل کا اسلام تھا۔

دلیل : اگر یہ مروجہ اسلام ہوتا تو قائداعظم محمد علی جناح جمعیت علمائے ہند اور دیگر مذہبی جماعتوں کے ساتھ کھڑے ہوتے کیونکہ اُس وقت ہندوستان میں اسلام کی حتمی تعبیر کے دعویدار اور عوام کے معتمد ترین وہی علماء تھے مگر قائداعظم محمد علی جناح نے ایسا نہیں کیا۔

فریقِ ثانی : پاکستان اسلام کیلئے بنایا گیا ہے اور یہ کہنا غلط ہے کہ یہ کوئی اور اسلام تھا۔

دلیل : مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے جلیل القدر عالم بھی تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن رہے ۔وہ بھی مولوی تھے اُن سے تو ایسی کوئی بات ثابت نہیں ۔

ضرب علی الاستدلال فریق الثانی

تعجب ہے۔قائداعظم محمدعلی جناح کی نماز جنازہ پڑھانے سے کوئی تحریک پاکستان کا سرگرم رکن کیسے بن سکتا ہے؟۔ ہمارے نزدیک شبیر احمد عثمانی مرحوم سے بڑھ کر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، امیرِ شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا احمد سعید خان، سید ابوالاعلی مودودی اور مولانا مفتی محمود وغیرہم ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی۔عربی کی ایک معروف ضرب المثل ہے کہ" اکثریت کُل پر دلالت کرتی ہے"۔

دلیل قاطع عن الفریق الثانی

اِس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کے زیادہ تر علماء تحریک پاکستان کے مخالف تھے مگر شبیر احمد عثمانی کا انفرادی کردار تحریک پاکستان کے حوالے سے قابل ذکر رہا ہے۔آپ نے 1944ء میں مسلم لیگ میں بحیثیت ایک ممبر کے شرکت کی اور پھر تحریک پاکستان سے جڑ گئے حتیٰ کہ قیام پاکستان کے بعد قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔پاکستان کی قومی اسمبلی کے ممبر ہونے کے باعث آپ نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں قانون اسلامی کی تجویز" قرارداد ِمقاصد" کے نام سے پاس کرائی۔جمعیت علمائے ہند کے برعکس قیام پاکستان کے بعد جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے نام سے ایک مذہبی اور سیاسی جماعت کی بنیاد بھی رکھی جو قیام پاکستان کی نظریاتی معاون رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆

اُمید پاکستان

روزنامہ پاکستان 23مارچ 2017

قومیں خون سے بنتی ہیں اور ریاستیں آئین سے ۔لوگوں کو کسی ایک نکتے پر جمع کرنے کے لئے دنیا میں ایک ہی ذریعہ رائج رہا ہے اور وہ ہے قانون ۔لگ بھگ یہی نکتہ ہندوستان کے علماء کو قائداعظم محمد علی جناح نے سمجھانا چاہا مگر افسوس کہ وہ نہ سمجھ سکے ۔قیامِ پاکستان کے زبردست مخالفین میں پیش پیش جمعیت علمائے ہند، مجلسِ احرار اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت تھی ۔ اِس مخالفت کا بارہا ذکر ہو چکا ہوں اس لئے یہاں مزید وضاحت ضروری نہیں ۔ بالکل یہی قضیہ مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ محمد اقبال کے درمیان جاری رہا جو بلا نتیجہ اختتام پذیر ہوا۔ہمیں یہ بات قطعاً فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ قیامِ پاکستان کے حقیقی مخالف کون تھے اور اُن کے دلائل کیا تھے؟۔

پاکستان کے مبینہ نظریاتی بانی علامہ محمد اقبال تو قیامِ پاکستان سے دس سال قبل ہی انتقال کر چکے تھے لہٰذا اِن دس برسوں میں صرف ایک ہی سیاسی رہنما قائداعظم محمد علی جناح نے قیامِ پاکستان کی تگ و دو جاری رکھی ۔قیامِ پاکستان بادی النظر میں ایک قوم کی جنگ تھی مگر اِسے صرف ایک ہی شخص لڑ رہا تھا ۔اگر آپ تحریکِ پاکستان کا بغور جائزہ لیں تو محمد علی جناح کے ساتھ اِس پوری جدو جہد میں کوئی ایک شخص بھی کھڑا نظر نہیں آتا۔خواص میں اور نہ ہی عوام میں اور کیوں نظر آتا کہ جب ہندوستان کے علماء نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ تحریک پاکستان ایک گمراہ کن تحریک ہے اور اِس کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں ۔

احباب ! ہضم کیجئے میرے الفاظ ۔کیونکہ یہ میری رائے یا تنقید نہیں بلکہ تاریخی حقائق ہیں جن تک براہ راست رسائی آسان نہیں ۔خدا غریق رحمت کرے فرزندِ اقبال جاوید اقبال مرحوم کو، جہاں کہیں بھی تین چار ذہین یکجا نظر آجاتے آپ اِنہی حقائق پر بحث شروع کر دیتے ۔درحقیقت تحریکِ پاکستان محمد علی جناح کی شخصیت سے شروع ہو کر محمد علی جناح ہی کی شخصیت پر ختم ہو جاتی ہے تبھی تو آپ کانگریس کو ایک نظر نہیں بھاتے تھے ۔وہ ایک شخص جس نے تن تنہا سیاسی اور مذہبی اژدھوں کے منہ سے زمین کا ٹکڑا نکال کر ہمارے سپرد کیا اور ہم ہیں کہ پورا ہجوم ہو کر بھی اس کی حفاظت نہ کر سکے ۔کیا ہم نہیں جانتے کہ تقسیم کی کس قدر سنگین قیمت دونوں طرف سے چکائی گئی ۔

سرسید احمد خان نے ہندوستان کے مسلمانوں میں دوقومی نظریے کو پروان چڑھایا۔علامہ محمد اقبال نے اِسے فکری اساس فراہم کی اور محمد علی جناح نے اِسے عملی جامہ پہنایا۔سو اِس لحاظ سے پہلا پاکستانی سرسید احمد خان ہے۔یہ محض مقتدرہ کا بیانیہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج پاکستان کی باگ دوڑ اُنہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جنہوں نے سرسید کو بخشا نہ ہی جناح اور اقبال کو مگر آج ہم یہ حقائق بیان کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتے۔سچ پر جھوٹ کی دبیز تہہ چڑھا کر ہم نے اپنے سماج میں صرف انتہا پسندی اور جہالت ہی کی پرورش کی۔یاد رکھئے ہندوستان کے علماء نے نہ صرف سرسید احمد خان، محمد اقبال اور محمد علی جناح پر سخت تنقید کی بلکہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں بھی ایڑھی چوٹی کا زور لگایا۔ اُن تمام علماء کا تذکرہ میں اپنے متعدد مضامین میں کر چکا اس لئے دہرانے کی ضرورت نہیں۔مضحکہ خیز اَمر تو یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے پاکستان کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا آج اُن کی اولادیں خود کو پاکستان کا کلی وارث سمجھتی ہیں۔ تحریک پاکستان درحقیقت ملّائیت اور سرمایہ داری کے خلاف طبل جنگ تھی مگر افسوس کہ آج یہی دو طبقے پاکستان کے سیاہ وسفید کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر صحافتی حدود کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔

پاکستان سے ایک ہی شخص مخلص تھا اور وہ تھا قائداعظم محمد علی جناح۔ابھی تک اُس جیسا دوسرا مخلص اِس قوم کو نصیب نہیں ہوا جو محمد علی جناح کے نقشِ قدم پر چل سکا ہو۔ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اُن لوگوں کو پارلیمنٹ کی راہ دکھائی جن کے وجود سے پاکستان کو ابتداء ہی سے خطرہ لاحق رہا پھر اس سنگین غلطی کی سزا سود سمیت بھگت لی مگر اس سب کا نقصان جو اس قوم کو ہوا وہ آج بھی ناقابل تلافی ہے۔دنیا کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں۔ہر قوم ایک لیڈر سے وقوع پذیر ہو کر پھلتی پھولتی ہے۔اگر لیڈر نہیں تو قوم نہیں اور اُس قوم کو جس کی بنیاد محمد علی جناح نے رکھی، آپ کے بعد اس کو پھر آپ جیسا لیڈر نہ مل سکا۔یہی وجہ ہے کہ آج تک ہم ہر لحاظ سے تنزلی کا شکار ہیں۔

سیاست کو ہم کاروبار سمجھتے ہیں۔اخلاقیات کو ہم نے انتہاپسندی میں لپیٹ دیا۔متوازن مزاج ہونا یہاں جرم ہے کیونکہ ہر معاملے میں یہاں انتہاپسندی پائی جاتی ہے۔محرومیوں و ناکامیوں کا مارا یہ ہجوم جس نے اپنے محسنین کو بھی نہ بخشا۔ بدتہذیبی، فتوے بازی اور معمولی نزع پر مرنے اور مارنے پر آمادہ رہنے والی قوم جو درحقیقت ایک ہجوم ہے کی اگر اخلاقیات کا مشاہدہ کرنا ہو تو سوشل میڈیا پر تشریف لے جائیں۔

جہاں اعتقادات کی جنگ، دشنام طرازی اور لچر مباحثات کے انبار ملیں گے لیکن بہر حال فکری اور اخلاقی انحطاط کے اِس شدید ترین دور میں بھی اس معاشرے سے ہمیں نا اُمید نہیں ہونا چاہئے۔ صورت حال جس قدر بھی پستی کا شکار کیوں نہ ہو تنقید برائے اصلاح کا عمل ہر وقت جاری رکھنا چاہئے۔

اب تک جو کچھ ہوا یقیناً وہ دل دُکھا دینے والا ہے اور رُلا دینے والا ہے مگر پھر بھی ہمیں اپنے لوگوں سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ بلاشبہ ہم اِس وقت ایک گہری سیاہ رات سے گزر رہے ہیں لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہر رات کی ایک روشن صبح بھی ہوتی ہے۔ کبھی تو ہمارا سورج بھی چمکے گا۔ کبھی تو ہمارے عظیم اور مخلص رہنما محمد علی جناح کی طرح ہماری قوم کی بھی دنیا مثالیں دے گی۔ وہ وقت دور سہی پر آئے گا ضرور۔ آئے گا وہ وقت جب ہم اپنے محسن اعظم اور مخلصِ اعظم قائد اعظم محمد علی جناح کے سامنے اُونچی نظروں سے سر اٹھائے کھڑے ہوں گے کہ بابا آج ہم نے آپ کی سپرد کی گئی امانت کو اُس کے حقیقی مقام پر مزین کر دیا۔ وہ وقت آئے گا اور اسی وقت کی آس ہے۔ اُمید ہے۔ آشا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

تہذیب برائے سوشل میڈیا

روزنامہ پاکستان 16 مارچ 2017

غربت جہالت اور فراغت کسی بھی انسانی معاشرے کو گُن کی طرح کھا جاتے ہیں ۔مذہب کا بنیادی موضوع تہذیب النفس ہے مگر کمال حیرت ہے کہ آج ہم سب شدید مذہبی ہونے کا دعویٰ کرنے کے بعد بھی انتہائی پست اخلاقیات کا مظاہرہ کر رہے ہیں ۔یقیناً یہ محض دعویٰ ہی ہے ۔اخلاقیات کا انحصار معقولات پر ہوتا ہے اور معقولات کا مسلّمہ اعتقادات پر۔جن معاشروں میں عقل وشعور کو گمراہی تصور کیا جائے وہاں صرف جنونیت ہی پروان چڑھ سکتی ہے پھر وہ چاہے مذہبی جنونیت ہو یا پھر ملحدانہ جنونیت ۔انسان شعور سے وابستہ ہے اور شعور تہذیب سے ۔عقل، ذہانت اور شعور کی کوئی حقیقت نہیں اگر اخلاق نہیں ۔شعور وجود کو مزین کرتا ہے اور اخلاق روح کو۔سیدی رومی فرماتے ہیں ۔ع

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

ایک دور تھا جب اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کیلئے مکالمہ کا سہارا لیا جاتا ۔پھر پرنٹنگ پریس نے انسانی معاشروں میں کھلبلی مچا دی اور آج سوشل میڈیا نے تو انسان کو فکری آزادی کی اوج پر پہنچا دیا۔سوشل میڈیا ایک ایسا محاذ ہے کہ جہاں پر نہ صرف اپنی فکر کے لوگوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے بلکہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی فکر کی تظہیر وتشہیر بھی کی جا سکتی ہے ۔کسی زمانے میں انسان کے فکری مقام کی تعیین کیلئے معاشرتی اقدار کا مطالعہ کیا جاتا مگر آج اسکی ضرورت نہیں رہی ۔کسی بھی معاشرے کی نظریاتی تعیین کیلئے اب وہاں کے سوشل میڈیا کا مشاہدہ کر کے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ معاشرہ فکری لحاظ سے کہاں کھڑا ہے ۔سوشل میڈیا پر بے ہنگم فکری دھما چوکڑی کی بنیادی وجوہات کسی بیرونی سازش کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارا اپنا وہ اندرونی غبار ہے جو ہمیں فکری آزادی ملنے کے بعد باہر نکل رہا ہے ۔فکری آزادی جس کا اجتماعی طور پر ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے آج ایک کلک کی مار بن چکی ۔

گویا کچھ بھی لکھا اور شیئر کیا جا سکتا ہے۔ اب ایسی کامل اور حتمی آزادی کی دستیابی کے بعد انسان کا صرف اصل ہی باہر آئے گا اور آ بھی رہا ہے۔ مذہبی اقدار پر زبردست تنقید نہ صرف تنقید بلکہ تضحیک، ثقافتی پیراڈائمز کے پرخچے اُڑانا، تہذیب وشائستگی سے بیگانگی، مذہبی شخصیات اور روحانی اساتذہ پر استہزاء وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہے وہ فکری گرد وغبار جس سے سوشل میڈیا اِس وقت اَٹ چکا ہے اور یہ وہ سیل رواں ہے کہ جس کے آگے بند باندھنا اب ممکن ہی نہیں رہا۔

روکھی پابندی کے نتائج ہم پہلے بھی دیکھ چکے۔ سرکاری کاغذات میں تو یوٹیوب تین سال بند رہی مگر عوامی لحاظ سے یوٹیوب ایک گھنٹہ بھی بند نہ ہوسکی۔ چنانچہ ورچوئل پرائیویٹ نیٹ ورک سے نونہالانِ وطن کما حقہ مستفید ہوتے رہے۔ میں اسلام آباد میں مقیم ہوں لیکن میں وی پی این سنگاپور کا یوز کر رہا ہوں۔ تو اب ڈھونڈیئے مجھے چراغ لے کر۔ یہ فکاہیات نہیں بلکہ وہ سنگین مسائل ہیں جن کی طرف ہمیں سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینی چاہئے۔

سدِ ذریعہ فساد کے سوا کچھ نہیں۔ پابندی کی نفسیات انسان کے اندر بغاوت کا مادہ پیدا کرتی ہیں۔ کسی فکر یا عمل سے روک دینا دراصل دماغ میں اُس کا تخم بو دینا ہے۔ ہمیں اِس وقت صرف تربیت اور تہذیب پر توجہ دینی چاہئے۔ سوشل میڈیا پر پابندی ماضی کی طرح بے سود ہی رہے گی۔ انٹرنیٹ نے کمیونیکیشن کے وہ ناقابل تسخیر ذرائع دریافت کر لئے ہیں کہ اب کسی بھی صورت اس سیلاب کو نہیں روکا جا سکتا۔ ہمیں اگر اپنے معاشرے میں سوشل میڈیا کے کردار کو مثبت اور متوازن بنانا ہے تو اس کیلئے ہمیں فکری تربیت کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ پابندیاں عائد کرکے ہم صرف اپنے لئے مسائل ہی پیدا کریں گے۔ سوشل میڈیا پر پابندی عائد کرکے اگر ریاست یہ سمجھتی ہے کہ وہ اس طرح کے سنگین مسائل سے نجات حاصل کرلے گی تو یہ انتہائی مضحکہ خیز اقدام ہے۔

ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے کبھی اپنے معاشرے کو Own ہی نہیں کیا۔ جب نوجوان بدک جاتے ہیں بے مہار گھوڑے کی طرح تو پھر سزا کے طور پر ہم اُن پر کڑی پابندیاں لگا دیتے ہیں تاکہ انکی بغاوت سے نجات حاصل کرلیں حالانکہ ایسا کرنے سے نجات تو ایک طرف اُلٹا اپنے لئے مزید گھمبیر مسائل پیدا کر لیتے ہیں۔ سوشل میڈیا ایک محیر العقول روحانی سماج ہے جس میں ہر انسان کو اپنی بھرپور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے۔ ایک دوسرے سے سیکھنے اور سکھانے کا عمل بغیر زمینی فاصلہ طے کئے جاری رکھا جا سکتا ہے۔

ہمارے لئے اس وقت سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم سوشل میڈیا پر فکری آزادی کی تحدید کر دیں۔

تحدید برائے تہذیب یعنی اخلاقیات کا ایک باقاعدہ سیٹ تیار کیا جائے جس میں سوشل میڈیا پر ہونے والی غیر مہذب حرکتوں کا تجزیہ کر کے اُن کا محاسبہ کیا جائے۔ اسکے برعکس یوں سوشل میڈیا کو مکمل طور پر بین کر دینا کوئی دانشمندی نہیں۔ یہ ریاست کا کام ہے کہ وہ ایسے اخلاقی اقدار وضع کرے کہ جس کے وسیلے سے انسانی رویہ میں توازن لایا جاسکے۔ کسی بھی ایک خالص جمہوری ریاست میں عدالت کا کام جرم کی تعیین اور قوانین کا نفاذ کرنا ہوتا ہے۔ عدالت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ خود سے کوئی تعزیر یا حد وضع کرے۔ سوشل میڈیا پر پابندی عدالت کے اختیار میں نہیں بلکہ یہ فیصلہ پارلیمنٹ میں بیٹھے عوامی نمائندوں کو کرنا ہے کیونکہ کسی بھی منتخب جمہوری حکومت کے وزراء پارلیمنٹ کے اجتماعی فیصلوں کے بعد کہیں جا کے اجرائے احکام کا اختیار رکھتے ہیں مگر ہمارے ہاں ہر ادارہ اور ہر فرد اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہا ہے۔ جہاں عدالت کو سرگرم ہونا چاہیئے تھا وہاں عدالت اپنی ذمہ داریاں ملٹری کے سپرد کر رہی ہے۔ اسکے علاوہ جو اُمور علماء کے دائرے میں آتے ہیں اُن کا اختیار عدالت اپنے پاس لے چکی ہے جبکہ لیڈر چینلز پر بیٹھ کر اپنی صفائیاں پیش کر رہے ہیں۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ عدالت مولوی، ملٹری جج اور لیڈر اینکر بن چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

پیروڈی یعنی اِستہزاء

روز نامہ پاکستان 09 مارچ 2017

فارسی میں ایک ضرب المثل ہے کہ" بے حیاباش ہرچہ خواہد کرد"۔بے حیاء بن جا پھر جو چاہے کر گزر۔اخلاقیات سے تو خیر ہمیں کبھی کوئی علاقہ رہا ہی نہیں پر اب تو ہم اہانتِ صریحہ پر بھی اُتر آئے ہیں۔کامیڈی شوز کے نام پر ہم نے اپنے لیجنڈز کی توہین کا جو سلسلہ شروع کیا ہوا ہے اس کے لئے میں صرف ایک اصطلاح استعمال کرسکتا تھا جو یہاں بیان کرنا مناسب نہیں کیونکہ اُردو کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اِس میں کوی نئی اصطلاح وضع کرنے کے لئے عربی کا رخ کرنا پڑتا ہے یا پھر فارسی کا جبکہ میرے پاس جو اِس وقت ایک اصطلاح وہ سرائیکی میں ہے۔
پچھلے دنوں نجی چینل کے ایک کامیڈی شو میں معروف گائیک اور فن موسیقی کے شہنشاہ مہدی حسن خان صاحب مرحوم کی لچر پیروڈی دیکھ کر مجھے بے انتہاء تکلیف ہوئی۔تھیٹر کے ناہنجاروں کو لاکھوں روپے پر تعینات کرنے والے بے حس سرمایہ داروں کو علم،تہذیب اور اخلاقیات سے کوئی مطلب نہیں رہا۔مطلب ہے تو صرف کسی طور سے ٹی آر پیز بڑھا کر پیسہ کمانے سے۔علم و دانش کے نام پر اخلاقیات سے کھیلنے والے دانشوروں کو بھی شرم آنی چاہئے کہ وہ اس معاشرے میں نئی نسل کو کیا پیغام دینے جا رہے ہیں کہ اپنے قومی اثاثوں کے ساتھ تم بھی مستقبل میں کھلواڑ کرتے رہنا۔
ہر جمہوری ریاست میں اُس ملک کا میڈیا اپنے حکمران اور لیجنڈز کو دنیا کے سامنے ایک رول ماڈل بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ اس کا اثر پوری دنیا پر قائم ہو مگر ہمارے ہاں ہمارا ہی میڈیا ٹاک شوز میں مخالف سیاسی لیڈروں کو بلوا کر ان کو آپس میں لڑواتا ہے اور پھر پوری دنیا کو اپنے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہونے کا تاثر دیتا ہے کہ ہم تو ایسے بدتہذیب ہیں کہ جس تھالی میں کھا رہے ہیں اُسی میں چھید کر رہے ہیں۔
جنرل پرویز مشرف کی میڈیا پر پابندی بہت معنیٰ خیز تھی مگر اس کے بعد پھر کسی میں اتنی ہمت ہی نہ ہوئی کہ میڈیا کی خیر خبر لے سکے۔پیمرا سو رہا ہے اور حکمران اس قدر پاور فل نہیں کہ میڈیا کو لگام دے سکیں۔اظہارِ رائے انسان کا فطری حق ہے مگر کردارکشی اور استہزاء کو قطعاً اظہارِ رائے میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔بولنے پر کوئی پابندی نہیں کچھ بھی بولا اور لکھا جاسکتا ہے مگر تہذیب کے دائرے میں رہ کر۔

حمقاء کے اژدہام کو علم و دانش کے اسباق پڑھانے والے نام نہاد دانشوروں کو ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ مزاح اور استہزا میں کیا فرق ہے۔ ہمارے مشفق اُستاد اور جید مفسرِ قرآن حضرت اصلاحی مرحوم فرمایا کرتے کہ "علم جس قدر بھی راسخ کیوں نہ ہو جائے کبھی شخصیت پر تنقید یا تبصرہ مت کرنا کیونکہ بحث ہمیشہ نظریات پر کی جاتی ہے شخصیات پر نہیں"۔ مگر افسوس کہ اتنی سادہ سی بات ہمارے دانشور حضرات نہیں سمجھ سکے۔

مزاح کا قدیم اساسی اصول تمثیل سے وابستہ رہا ہے لیکن چونکہ ہم مزاح کی مبادیات سے نا آشنا ہیں اس لئے ہم مذاق اُڑانے کو مزاح سمجھتے ہیں۔ انگریزی کی اصطلاح پیروڈی (Parody) کا مطلب ہی استہزاء ہے۔ کسی کی نقل اُتارنا اخلاقی جرم ہے پھر چاہے وہ مثبت انداز میں ہی کیوں نہ ہو، چہ جائیکہ ایسی شخصیات کی نقل اُتارنا جو ملک وقوم کے لئے ایک اثاثے کی حیثیت رکھتی ہوں۔ کسی شخصیت کی جسمانی حرکات کی نقل اُتارنا اگر توہین نہیں تو کیا خراجِ تحسین ہے؟۔ پس پیروڈی کے نام پر جس کا چاہیں کچومر نکال کر رکھ دیں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ تو کامیڈی ہے۔ تف ہو ایسی کامیڈی پر۔ صحتمند مزاح ایک لطیف صنفِ ادب ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں اِس صنف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے مگر آج کل پیروڈی کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اِس کا صنفِ ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نرا استہزاء ہے۔ عقل کے پیادوں کو کوئی یہ بتائے کہ ہر اہم شخصیت سے انسانوں کے جمِ غفیر کے جذبات وابستہ ہوتے ہیں چنانچہ کسی اہم شخصیت کی نقل اُتارنا اس کے ارادتمندوں کے لئے سوہانِ روح ہوسکتا ہے۔ اب چونکہ ہم تہذیب و احساس سے عاری ہو چکے ہیں اس لئے ہمیں کسی کے جذبات مجروح ہونے کا کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔

یاد رکھیں انسانی معاشروں میں عدم برداشت کو پروان چڑھانے والے بنیادی اسباب میں سے ایک یہ بھی بنیادی سبب ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے دیگر انسانوں کے جذبات کا احترام نہ کرے۔ چلیں پھر اگر ہٹ دھرمی کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر اس کا کم از کم مظاہرہ یہ ہے کہ انصاف سے کام لیا جائے یہ نہ ہو کہ چند لوگوں کو تو خوب رگڑا جائے اور باقی سفید پوشوں سے ڈر کے مارے کنارا کر لیا جائے۔ گویا ہمارے ہاں سب سے کمزور طبقہ اداکار، گلوکار اور سیاسی لیڈر رہیں۔ دراصل ہم ایسے گئے گزرے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں کہ جہاں غلط کام بھی پوری بے ایمانی سے کیا جاتا ہے حالانکہ غلط کام میں غلطی کرنے کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ اس وقت ہمارا الیکٹرانک میڈیا اخلاقیات اور تہذیب سے بالکل عاری ہو چکا ہے۔ چینل کی ریٹنگز بڑھانے کے لئے کچھ بھی کیا جاسکتا ہے اور کر بھی رہے ہیں۔

ایک وقت تھا جب پی ٹی وی پر الف نون جیسا صحتمند اور سبق آموز مزاحیہ سیریل نشر کیا جاتا تھا اور جس میں کامیڈی کے ساتھ ساتھ ہر سیریل میں ایک بہترین اخلاقی پیغام بھی دیا جاتا۔ معاشرے کی اصلاح پر مبنی اس مزاحیہ سیریل کے روحِ رواں کمال احمد رضوی واقعی ایک با کمال اور ذہین انسان تھے جن کے قلم اور کردار نے معاشرے میں جدید اخلاقی اقدار وضع کر دی تھیں۔ ایسے لوگ آج ناپید ہو چکے ہیں۔ رفیع خاور، صلاح الدین طوفانی، زیبا شہناز، اسماعیل تارا اور اشرف خان جیسے مہذب اور شائستہ مزاج کامیڈین آج چراغ لے کر بھی نہیں ڈھونڈے جا سکتے۔ آج کل جو کچھ کامیڈی کے نام پر چل رہا ہے وہ تحقیر اور استہزاء کے سوا کچھ نہیں۔ اگر بہترین اور مثالی ظریفانہ نقل و حرکت کا مظاہرہ کرنا ہے تو پھر طویل دورانیہ پر مبنی پی ٹی وی کا مشہورِ زمانہ کامیڈی شو ''ففٹی ففٹی'' دیکھ لیں۔ با کمال فکاہیانہ تہذیب پر مبنی ''ففٹی ففٹی'' پہلے اَسّی کی دہائی میں جنوبی ایشیاء کا پاپ کلچر بن گیا تھا۔

نیشنل سیکیورٹی پلان کی ضرورت

روزنامہ پاکستان 23فروری 2017

ایک طویل عرصہ اَمن کے بعد پھر سے ملک مسلسل دھماکوں سے گونج اُٹھا۔ پچھلے ایک ہفتہ میں متعدد مقامات پر دھماکے ہوئے جس کے سبب سینکڑوں افراد لقمہ اجل بن گئے۔ فوج کا دہشت گردوں کے خلاف منظم آپریشن کافی حد تک کامیاب رہا مگر اِسی پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں مزید سے مزید تر حفاظتی اقدامات کی ضرورت ہے۔ ریاست کے خلاف بغاوت کوئی نئی بات نہیں، ہر جمہوری ریاست میں بغاوت اُبھرتی رہتی ہے مگر مغرب اور ہمارے ہاں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ مغرب میں باغی دلائل کی بنیاد پر احتجاج کرتا ہے اور ہمارے ہاں یہ احتجاج بارود سے کیا جاتا ہے۔

دہشت گردی کا تعلق کسی مخصوص مذہب یا عقائد سے نہیں ہوتا یہ ایک متشدد انسانی رویہ ہے جس کے سبب انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کا خون روا سمجھ لیتا ہے۔ ایک مسلمان جو قرآن کو سمجھتا ہے وہ خدا کے اِس دوٹوک اعلان کے بعد کہ "کسی ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے" کیسے کسی انسان کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے؟۔ درحقیقت ہمیں جہالت اور متشدد رویوں نے بھیڑیا بنا دیا۔ انسان میں فوقیت کی جبلت اِسے جانور بنا دیتی ہے اور بالکل یہی کچھ آج ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب کھنگال لیں کوئی ایک مذہب بھی بے گناہ انسان کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا چہ جائیکہ اسلام۔

پاکستان اور افغانستان کا المیہ یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جنہیں باقاعدہ عسکری تربیت دے کر سویت یونین کے خلاف بحیثیت مجاہدین استعمال کیا گیا آج وہی لوگ پاکستان اور افغانستان میں خانہ جنگی شروع کیئے ہوئے ہیں۔ اب اِس میں یہ لوگ کس حد تک قصوروار ہیں اِس کا تعین کرنے کیلئے گزشتہ حقائق کو من وعن قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ معاملات اتنے آسان ہوتے نہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ ملک جس زبردست خلفشار سے گزر رہا ہے، اس میں اب اندرونی مخالف محاذ تو کسی حد تک تباہ ہو چکا مگر بیرونی محاذ اب بھی سر اٹھا رہا ہے۔ آپریشن ضربِ عضب کافی حد تک کامیاب رہا اور اسکی شہادت اس اَمر سے آشکار ہو چکی کہ اب دشمن پڑوسی ملک کی سرحدوں کو محاذ بنا کر پھر سے پاکستان میں خون کی ہولی کھیلنے کے درپے ہے۔

اب ایسی صورت حال میں ہمارے حساس اداروں کو ایک بار پھر ایک انتہائی حساس اور زبردست سیکیورٹی پلان تیار کرنا ہوگا جس کے ذریعے ہم دشمن کا نہ صرف اپنے ملک میں سر کچل سکیں بلکہ آس پاس کے سرحدی علاقوں میں بھی دشمن کا اثر زائل کر سکیں۔ دشمن ہمارے بچوں کو انتہائی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار رہا ہے اور ہم ہیں کہ دشمن کے بچوں کو پڑھانے کے چکر میں ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ہر قسم کی رعایت کو بالائے طاق رکھ کر گڈ اور بیڈ کے سیاسی فارمولے سے آزاد ہو کر ہر قسم کی ملک مخالف سرگرمیوں کو کچل ڈالیں۔ ہمیں اُن تمام راستوں کو مسدود کرنا ہوگا جہاں سے دہشت گردی کے امکانات نظر آ رہے ہوں۔ سب سے پہلے تو ہمیں اندرونی طور پر ہر اُس سرگرمی کو روکنا ہوگا جس کے ذریعے انسانی رویہ میں تشدد کا امکان ہو۔ چاہے یہ تشدد سیاسی نوعیت کا ہو مذہبی نوعیت کا یا پھر تعلیمی نوعیت کا۔ سیکیورٹی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آپ بندوق اُٹھا کر کھڑے ہو جائیں۔ سیکیورٹی کی ابتداء تو انسانی سوچ سے کی جا سکتی ہے۔ ہر قسم کے ایسے لٹریچر پر کڑی پابندی لگا دینی چاہئے جس میں نظریاتی تشدد کا پرچار کیا گیا ہو چاہے وہ لٹریچر سیاسی ہو یا مذہبی۔ جہاد کی اہمیت اور فرضیت کا اعلان کوئی ایک مولوی یا پھر ایک گروہ نہیں کر سکتا۔ قرآن کے مطابق یہ اعلان صرف ریاست کے اختیار میں ہے اور یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب ظلم کا قلع قمع کرنا مقصود ہو۔

ہمارا انتہائی بنیادی المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں مختلف گروہ اپنے تئیں جہادی تربیت اور لٹریچر فراہم کر رہے ہوتے ہیں جس کے سبب کچے اذہان مرنے اور مارنے پر اُتر آتے ہیں اور جو انسانی استحصال کی بدترین شکل ہے۔ عسکری تربیت ریاست کا کام اور سرکاری عسکری اداروں کی ذمہ داری ہے۔

اگر کوئی عسکری طبیعت کا حامل ہے تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ملک وقوم کیلئے وقف کر دے۔ نجی عسکری تربیت کے مراکز کے خلاف سخت کارروائی کر کے ایسے ادارے قائم کرنے والوں کے خلاف زبردست قانونی چارہ جوئی کی جائے۔ مسئلہ جہاد کسی مخصوص گروہ یا فرد کا معاملہ نہیں یہ ایک عالمگیر اسلامی فریضہ اور سیلف ڈیفنس موومنٹ ہے۔ اسلام کی اس انتہائی اہم اور حساس ذمہ داری کو چند فسادیوں کے ہاتھوں پامال نہیں کیا جا سکتا۔ ریاست کی اوّلین ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے تمام افراد کو اپنی حراست میں لے لے جو پُرامن اسلامی تشخص کو خونخوار اور مکروہ تعارف میں بدلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ہر قسم کی غیر سرکاری عسکری تربیت پر پابندی لگا دی جائے۔ مذہبی عسکریت پسندوں کے جلسے جلوسوں پر پابندی لگا دی جائے۔

جبکہ خلاف ورزی کرنے پر گرفتار کر کے عمر قید کی سزا دینی چاہیئے تا کہ یہ لوگ دوسروں کیلئے عبرت کا نشان بن جائیں۔
دنیا کا کوئی بھی مذہب تشدد کا حامی نہیں اور نہ ہی کسی مذہب نے تشدد کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ متشدد انسانی رویے ہیں جو مذاہب کا تعارف انتہاء پسندی میں بدل دیتے ہیں۔ظلم کے خلاف مسلح جہد و جہد اسلام کا انتہائی اہم اور ایک بنیادی فریضہ ہے نہ کہ خود ظلم کر کمر کس لینا جہاد۔

اُصولی طور پر ہر وہ شخص جو مذہب کو کمرشلائز کر کے عوام کا استحصال کرے بلاشک وشبہ مجرم اور قابل مواخذہ ہے۔خدا اور انسان کے درمیان انبیاء کے علاوہ کسی بھی دوسرے انسان کی مداخلت روحانی جرم ہے۔انبیاء کا ظاہری وجود چونکہ اب نہیں رہا اِس لئے خدا اور انسان کے درمیان کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوسکتی۔ ہر انسان کو نیکی اور بدی کا جوہری ادراک عطا کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ کسی بھی انسان کو مذہب کے نام پر استعمال کرنا ناقابل تلافی جرم ہے بالخصوص اسے ایک لامحدود زندگی اور ہر قسم کی آسائش کا لالچ دے کر۔ایسے لوگ نہ صرف انسانیت کے ناسور ہیں بلکہ خدا کے بدترین مجرم ہیں جن کو خدا بھی اُس وقت تک معاف نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ تمام بے گناہ انسان معاف نہیں کر دیتے جن کا مذہب کے نام پر خون کیا یا کروایا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

پھاگن تے کندھیاں لاگن

روزنامہ پاکستان 16فروری 2017

دنیا کی ہر تہذیب ایک خطے سے وقوع پذیر ہوتی ہے اگر خطے کو الگ کر لیا جائے تو تمدن اپنی پہچان کھو بیٹھتا ہے۔ ہم انسان دراصل اپنی پہچان کے لئے جس بنیادی کلیہ کا سہارا لیتے ہیں وہ درحقیقت خطے پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک فارسی عرب میں اِس لئے فارسی کہلاتا ہے کہ وہ فارس سے ہے چنانچہ وہ عرب میں رہتے ہوئے بھی اپنی پہچان کے لئے اپنے خطے کا حوالہ دے رہا ہوتا ہے۔ اِس لئے منطقی لحاظ سے اقوام اَوطان سے بنتی ہیں گر وطن نہیں تو قوم نہیں گر قوم نہیں تو پہچان نہیں کیونکہ قوم دراصل پہچان کا بنیادی کلیہ ہے۔

ہم پاکستانی جو ایک منظم تہذیب سے کٹ گئے تھے ساتھ ہی اپنی تمدنی معرفت بھی کھو بیٹھے۔ نظریاتی طور پر اگر ہم عربی اور ایرانی تمدن کے مطیع ہیں تو تعلیمی، سماجی اور سیاسی طور پر انگریزی تمدن کے گرویدہ، اور کیوں نہ ہوں کہ یہی آج ہماری پہچان ہے۔ یہ پہچان ہماری اصلی ہے یا ملمعاتی، اِس بحث سے گریز کرتے ہوئے مجھے آج سنسکرتی تہذیب پر بات کرنی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہم آج اپنی سنسکرتی تہذیب سے بیگانہ ہو چکے ہیں بلکہ اس تہذیب سے اپنا تعلق جوڑنے کو قبیح اور باعثِ شرم سمجھتے ہیں۔ اِس میں ہماری کوئی غلطی نہیں کیونکہ ہمیں جو کچھ معاشرہ انجیکٹ کرتا ہے وہی سیکھتے ہیں اور جن معاشروں میں تحقیق و جستجو عام نہیں ہوتی وہاں تقلید ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم عرب نہیں ہیں اور نہ ہی عربی تہذیب ہماری آبائی تہذیب ہے مگر اس کے باوجود بھی ہم عربی تہذیب و تمدن پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ جبکہ اپنی آبائی تہذیب پر شرمندگی بلکہ کسی حد تک اسے مکروہ اور قبیح تک سمجھتے ہیں۔ آفاقی سچ تو یہ ہے کہ سوچ یا نظریہ تبدیل کر لینے سے رگوں میں دوڑتا ہوا خون رنگ نہیں بدلتا مگر ہم اپنی ترجیحات ضرور بدل لیتے ہیں چنانچہ ہم اپنے عقائد اور اُصول ضرور بدل لیتے ہیں۔ خیر یہ ایک عالمگیر انسانی مسئلہ ہے جس کی سچائی ہر نفس پر ظاہر نہیں ہو سکتی۔

پھاگن ہمارے بکرمی کیلنڈر جو فی الحقیقت ہمارا علاقائی کیلنڈر ہے کا آخری مہینہ ہے۔ جیسے عربی کیلنڈر کا ذوالحجہ اور گریگورین کیلنڈر کا دسمبر ہے۔ ہم نے بچپن میں اپنے بزرگوں سے ہمیشہ بکرمی مہینوں کے نام ہی سنے۔

ہمیں نہیں یاد پڑتا کہ کبھی ہم نے عربی یا گریگورین کیلنڈر کے مہینوں کے نام بزرگوں کی زبان سے سنے ہوں اور اسکی ایک ہی سادہ سی منطق سمجھ آتی ہے کہ انسان جتنا چاہے تہازیب بدل لے، بود و باش بدل لے مگر اپنے خطے کا تمدن اسکی فطرت سے نہیں نکل سکتا بلکہ اگر ایسا کہا جائے کہ انسانی فطرت دراصل علاقائی تہذیب کے خطوط پر ہی استوار ہوتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

پھاگن موسمی لحاظ سے بہت ہی خوبصورت اور معتدل مہینہ ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ بچپن میں جب ہمارے بزرگ کہتے کہ "پھاگن تے کندھیاں لاگن" تو ہم کافی حیران ہوتے کہ اِس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے مگر بعد میں سمجھ آئی کہ پھاگن میں چونکہ دھوپ گرم اور سایہ ٹھنڈا ہوتا ہے اِس لئے اس ماہ میں مسلسل دھوپ میں نہیں بیٹھا جاسکتا چنانچہ تھوڑی دیر دھوپ میں بیٹھنے کے بعد فوری سایہ کی جانب لپکنا پڑتا ہے۔ پھاگن آخری مہینہ ہے اِس کے بعد پھر بکرمی کیلنڈر کی سنگراند (ابتداء) ہوتی ہے۔ چیت۔ بیساکھ۔ جیٹھ۔ ہاڑ۔ ساون۔ بھادوں۔ اَسوج۔ کاتک۔ منگھر۔ پوہ۔ ماگھ۔ پھاگن۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ بکرمی کیلنڈر دراصل دنیا کا سب سے پہلا باقاعدہ کیلنڈر ہے۔ اِس کا آغاز ہندوستان کے انتہائی نیک دل بادشاہ وِکرم اَدتیا نے ستاون قبل مسیح میں کیا۔

ہندو یا سندھو تہذیب دراصل تاریخِ دنیا کی سب سے اوّلین تہذیب ہے۔ اِس کے آثار قدیم سمیری، فنیقی اور یونانی تہازیب سے بھی پہلے ملتے ہیں۔ قریباً دس ہزار سال پہلے ہندوستانی کھیتی باڑی اور اَناج اُگانا جانتے تھے۔ دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی ٹکشلا یونیورسٹی موجودہ ٹیکسلا پاکستان میں قائم کی گئی تھی اور جس میں قریباً دس ہزار سے زائد طلبہ اور دوسو کے قریب اساتذہ اُس زمانے میں طب، ریاضی، فلاسفہ، لسانیات، فلکیات، علم نجوم اور فنون لطیفہ کے علاوہ اَڑسٹھ مضامین پڑھایا کرتے تھے۔ اُن طلبہ کا تعلق یونان، مصر، حجاز، عراق، اور چائنہ سے تھا۔ ٹکشلا یونیورسٹی کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ نیست و نابود ہو جاتی ہیں وہ اَقوام جو اپنی تہازیب سے بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ گمراہ ہو جاتی ہیں وہ قومیں جو اپنی تہازیب بدل لیتی ہیں۔

نظریہ طبیعت بدل دیتا ہے مگر فطرت نہیں۔ فطرت کبھی نہیں بدلتی اور فطرت کے اجزائے ترکیبی درحقیقت جغرافیائی تمدن سے نمو پاتے ہیں۔ انسان علمی و تکنیکی ترقی کی اَوج پر پہنچ چکا مگر آج تک انسانی تعارف کی مبادیات نہ بدل سکا۔ انگریز دوسو سال ہندوستان میں حکومت کرگیا مگر رہا انگریز ہی۔

ہندوستانی نہ بن سکا اور کیوں بنتا کہ دنیا کا کوئی بھی نظریہ، اُصول اور قانون ایسا نہیں کہ جس کے ذریعہ سے انسان اپنی جغرافیائی پہچان بدل سکے۔تہازیب بدل جاتی ہیں۔رویے بدل جاتے ہیں مگر خطے سے گُندھی ہوئی انسانی فطرت نہیں بدلتی۔ یہ نہیں کہ انسان نے اِسے بدلنے کی کوشش نہیں کی، بارہا کر چکا مگر آج تک انسان ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اور نہ ہی مستقبل میں کامیاب ہونے کے امکانات نظر آرہے ہیں۔کیونکہ جغرافیہ محض زمین کا ٹکڑا ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک مدوّن تمدن کا ڈپو بھی ہوتا ہے۔نظریہ یا عقیدہ جس قدر بھی اہمیت کا حامل کیوں نہ ہوجائے انسان سے اسکی جغرافیائی پہچان نہیں چھین سکتا۔

نظریات اور عقائد انسان کو معاشرت سے ملتے ہیں جبکہ انسانی فطرت جغرافیائی تمدن اور عالمگیر انسانی شعور سے مرکب ہوتی ہے۔انسانی فطرت کی مبادیات میں بنیادی کردار نسلی طینت، جغرافیائی تمدن اور عالمگیر انسانی شعور کا ہوتا ہے۔عالمگیر انسانی شعور تو ہر خطے کے انسانوں میں قریباً یکساں ہوتا ہے۔تبدل دراصل نسلی طینت اور جغرافیائی تمدن سے پیدا ہوتا ہے اور یہی پھر انسان کی حتمی پہچان بن جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

راگ بھیم پلاسی

روزنامہ پاکستان 09فروری 2017

کائنات میں سُرور اور شعور ایسی مابعدالطبیعیاتی روشنیاں ہیں جن کے نمودار ہونے کے بعد انسان روحانی طور پر نہ صرف ضوفشاں ہو جاتا ہے بلکہ اخلاقی طور پر بھی ہر قسم کی آلائش سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ سُرور کے لئے مراقبہ اور شعور کے لئے تحصیل علم ضروری ہے۔ حضرت سیدی جلال الدین رومی جو دنیائے علم و معرفت کے فقید المثال والی ہیں، انسان کو سُرور کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

روایت ہے کہ جب آپ چھ گھنٹے مسلسل رقص کرنے کے بعد ہوش میں آئے تو ولایت کی روشنی آپ کا سینہ منور کر چکی تھی۔ موسیقی اور رقص جس کو قدیم عرب کی بدوی تہذیب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، ہندوستان میں بھی یہ جسمانی عبادت کا درجہ رکھتی تھی چنانچہ ہمارے خطے کے اَوتار تو ہمیشہ بانسری کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ خدا جاری و ساری ہے کائنات کے ذرے ذرے میں۔ خدا نمو یافت ہے۔ اسلام کا بنیادی سبق ہی دراصل صوفیا کے پاس ہے۔ وہ صوفی جو فرقہ واریت کی آلائش سے منزہ اور کائنات کے ہر ذرے سے ہم آہنگ ہیں کبھی انسانیت میں نظریاتی تفرقے کو فروغ نہیں دے سکتے کیونکہ خدا سے محبت کا بہترین اظہار دراصل کائنات سے محبت ہے۔ کائنات میں موجود ہر ذی روح سے محبت ہے اور انسان تو پھر اس کائنات کا سب سے بیش بہا سرمایہ ہے۔

صوفیاء کہتے ہیں کہ اصحابِ شریعت جب تک طریقت اختیار نہیں کریں گے اُن کا سینہ روشن نہیں ہو سکتا جبکہ اصحابِ طریقت جب تک معرفت کا سفر اختیار نہیں کریں گے تب تک اُنہیں اپنی ذات اور خدا سے کما حقہ آگاہی حاصل نہیں ہو گی کیونکہ من عرفہ نفسہ فقد عرفہ ربہ۔

سلاسل اَربعہ میں سب سے مسرور سلسلہ چشتیہ کا ہے جس کی بنیاد سُرود پر ہے۔ سرود محبت و عقیدت کا مظہر اور عشق کا تخم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے صوفی بزرگ حضرت معین الدین چشتی اجمیری المعروف رنگریز، حضرت فرید الدین مسعود المعروف گنج شکر، حضرت بابا نظام الدین اولیاء المعروف محبوبِ الہیٰ اور آپ کے ہونہار شاگرد اور ہندوستانی موسیقی کے باوا آدم حضرت امیر خسرو دہلوی اِس راہ کے مسافر تھے۔

اصنافِ موسیقی میں موجودہ ستار اور طبلہ حضرت امیر خسرو ہی کی ایجادات ہیں۔ اِس کے علاوہ متعدد راگ بالخصوص صنفِ موسیقی ترانہ آپ کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ چنانچہ آج بھی اچھا گانے والے خیال بغیر ترانے کے نہیں گاتے حتیٰ کہ ٹھمری میں بھی ترانے کی تڑک لگائی جاتی ہے بلکہ بعض گلوکار تو ترانے پر بندش ہی قائم کر لیتے ہیں۔

بھیم پلاسی صوفیوں کی ٹھاٹھ کافی کی اُوڈو سمپورن راگ ہے جس کی آروہی میں پانچ اور اَمروہی میں سات سُر لگائے جاتے ہیں۔ وادی سُر اِس کا پنچم اور سموادی کھرج ہے۔ اِس کی آروہی میں رکھب اور دھیوت سُر ورجت ہیں اس لئے بعض اوقات بھیم پلاسی کو سنتے ہوئے مالکونس کا گمان ہوتا ہے کیونکہ یہی دو سُر بھیم پلاسی میں تیو رہوتے ہیں جو آروہی میں حذف کر دیئے جاتے ہیں۔ باقی سُروں میں کھرج اور پنچم تو قائم ہوتے ہیں، مدھم شدھ ہوتی ہے۔ اِس راگ کی شکل گارے سا، نی دھا پا اور نی سا ما کی سُر سنگتیوں سے واضح ہوتی ہے۔ بھیم پلاسی کو گانے کا وقت دن کا تیسرا پہر ہے۔

آروہی : سا گا ما پا نی سا

اَمروہی : سا نی دھا پا ما گا رے سا

بھیم پلاسی میں مغل بادشاہ محمد شاہ کے کہنہ مشق درباری موسیقار خان صاحب اُستاد نعامت خان المعروف سدارنگ نے ایک بندش قائم کی جو بعد میں بہت ہی مقبول ہوئی جس کے بول ہیں۔ ع

جا جا رے اپنے مندروا
سن پاوے گی سانس نا نندیا
ہم تو سدا رنگ تم کو چاہت ہیں
تم ہم سے کیا ٹھگن کیا

اِس بندش کو بعد میں پنڈت جسراج جی، محترمہ آشوینی اور کوشکی چکرورتی نے بھی گایا جو موسیقی کی دنیا میں بے حد مقبول ہوئی۔ پاک و ہند کے زیرک موسیقاروں نے بہت خوبصورت دھنیں بھیم پلاسی میں ترتیب دی ہیں۔ بھیم پلاسی پر آدھارت میڈم نور جہاں کی آواز میں موسیقار ناشاد نے بہت ہی خوبصورت دھن "ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے" ترتیب دی۔ اِس کے علاوہ مہدی حسن خان صاحب نے فلم عظمت کے لئے قتیل شفائی کا ایک بہت ہی سندر گیت "زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں" بھی بھیم پلاسی میں گایا جو آج تک مسلسل مقبول ہے۔

بھیم پلاسی ایک سکون افزاء راگ ہے۔ اِس کے سُر بے ساختہ روحانی اطمینان نصیب کرتے ہیں۔ ذہن کے پرتوں میں انتہائی گہرائی سے عود کر جانے والی بھیم پلاسی سنتے ہوئے انسان پر مراقباتی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ سُر سمے سے جڑے ہوتے ہیں اس لئے ہر راگ کو اپنے وقت پر گانا چاہئے چنانچہ سارے دن کی تھکن اور اعصابی تناؤ کا شکار انسانی وجود جب دن ڈھلے بھیم پلاسی کے سروں سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو انسان کا وجود تھکن سے فرار حاصل کر کے ایک لامحدود روحانی سکون سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔صوفیاء کہتے ہیں کہ موسیقی انسانی رویہ میں ایک بہترین توازن پیدا کرتی ہے بالخصوص غصہ، بیزاری اور قنوطیت و لامقصدیت کی کیفیت طاری ہونے پر موسیقی ایک میٹافزیکل میڈیسن کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔رسل نے کہا تھا کہ آنے والے وقت میں انسان ایلوپیتھی کی بجائے موسیقی سے اپنے تمام تر ذہنی مسائل حل کرے گا اور آج واقعی انسان شعوری اور لاشعوری طور پر موسیقی سے ذہنی پراگندگی کا خاتمہ کر رہا ہے۔

یہ بھی قدرت کی عجیب حکمت ہے کہ انسانی گلا سرگم کے اصولوں پر ترتیب دیا گیا ہے اور یہ بلاشبہ ایک معجزاتی حقیقت ہے۔جب ہم الفاظ کو ایک خاص ترتیب سے باہر نکالتے ہیں تو یہ ترنم کہلاتا ہے اور ہر ترنم ایک مخصوص راگ میں واقع ہوتا ہے چاہے وہ الفاظ حمد کے ہوں، نعت کے یا پھر رومانیت پر مبنی اشعار کے۔

یہ ترنم دراصل موسیقی ہی کی ایک قسم ہے۔آلات تو محض انسانی گلے سے نکلنے والے ترنم کی اطاعت کرتے ہیں۔آلات موسیقی کی مبادیات نہیں ہیں نہ ہی موسیقی آلات کی محتاج ہے۔موسیقی تو انسانی گلے اور کائنات کے ذرے ذرے میں پائی جاتی ہے۔ پوہ کی لمبی لمبی راتوں میں رم جھم کی شپکار رات کے سکوت میں ایک کہنہ مشق گلوکار کا کردار ادا کرتی ہے۔اِسی طرح کوئل کی کوک، چڑیوں کی چہچہاہٹ، بادلوں کی گھن گرج اور جھرنوں کی جھنکار دراصل کائناتی موسیقی کے مختلف اعلیٰ مظاہر ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

فکشن میں مذہب کی آمیزش

روزنامہ پاکستان 02فروری2017

برصغیر کا اُردو ادب بہت گھمبیر اور کسی حد تک مسروقہ ہے۔تقریباًہر بڑے لکھاری نے انگریزی ادب کی مبادیات نقل کر کے اُردو فکشن لکھتے وقت مذہبی تڑکہ لگایا۔تبلیغ اور افسانہ نگاری میں جوہری فرق ہے۔آپ دعوتِ دین کے لئے الگ سے موضوعات منتخب کر سکتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ آپ افسانہ اور ناول میں تبلیغ شروع کر دیں۔
وہ جو کل ہمارے جید لکھاری (ممتاز مفتی،اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب وغیرہم) کرتے چلے آرہے تھے بالکل وہی آج بھی ہو رہا ہے۔مذہب ایک مقدس روحانی تجربہ ہے۔اِسے کسی بھی صورت کمرشلائز کر کے فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے اُردو ادب میں دل سوز اضافہ وہ چند قدیم ناول اور موجودہ اَن گنت ناول ہیں جن کی بنیاد مذہبی عقائد کو کمرشلائز کر کے رکھی گئی ہے۔خدا اور انسان کا انفرادی معاملہ اِس قدر لچر نوعیت کا نہیں ہوتا کہ اُسے سرِ عام رسوا کیا جائے۔مذہب کی عظمت اور اہمیت لابدی ہے مگر ایک افسانہ نگار اور ناول لکھنے والے کا اِس قسم کے انتہائی حساس اور انفرادی معاملات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔مجھے آج کے نوجوان لکھاریوں کے ناول پڑھ کر شدید دکھ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس دیدہ دلیری سے رگوں میں خون کی سرگرداں عقائد کو فکشن میں لپیٹ کمرشلائز کر کے بیچ رہے ہیں۔عقیدت کاروباری نوعیت کی چیز نہیں ہوتی کہ اِسے بیچ کر معاشی مسائل حل کئے جائیں۔
میں اکثر اپنے ذہین طلبہ سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ اگر کمانا ہو تو پوری ایمانداری کے ساتھ محنت کرو۔زندگی جس قدر بھی مشکل کیوں نہ ہو انسان کو کوئی نہ کوئی کام ایسا ضرور مل جاتا ہے جسے کر کے وہ کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ہر نظریہ اور عمل کا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے۔جب آپ کسی نظریہ یا عمل کو اُس کے اپنے مقام سے گرا دیتے ہیں تو اُس کا وجود باطل ہو جاتا ہے۔ماضی میں بھی ہمارے بڑے بڑے نامور لکھاریوں نے عقائد کو خوب فروخت کر کے نام کمایا، پیسہ بنایا۔ مگر ایسی شہرت اور دھن کس کام کی جو کسی نظریہ یا عمل کا استحصال کر کے کمائی جائے۔فکشن کا سادہ مطلب ہے کہ وہ چیز یا کام جو مسلمہ حقائق پر مبنی نہ ہو پس ادب میں افسانے کی یہی تعریف کی جاتی ہے۔مثال کے طور پر جل پری اور کوہ قاف وغیرہ جیسے استعارات جن کا کوئی فطری وجود نہیں افسانہ اور ناول کی بنیاد ٹھہرتے ہیں اور یہی فکشن کی حدود بھی ہیں۔

اب اگر اس سے تجاوز کیا جائے گا تو وہ فکشن کے زمرے میں ہرگز شمار نہیں ہوگا۔ ہر چیز اپنے ایک خاص دائرے میں تیر رہی ہے چنانچہ ادب کی ہر صنف اپنا ایک مخصوص دائرہ رکھتی ہے۔ ہم شعر اُسے کہتے ہیں جس میں وزن اور تخیل کی پابندی کی گئی ہو۔ محض تخیل ہے تو وہ نثر میں شمار ہوگا لیکن شعر نہیں کہلائے گا۔ اِسی طرح ناول میں کردارنگاری اور فکشن میں فینٹسی ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

ادب کی ہر صنف کی اپنی ایک حد ہے جس کی اطاعت کی جائے تو وہ صنف زندہ رہتی ہے۔ اب غزل میں آپ تخیل بیان کریں یا واقعہ، مگر وزن، قوافی اور ردائف کی تابعداری ضروری ہے نہیں تو وہ سرے سے غزل شمار ہی نہیں ہوگی۔ لکھنے میں تو کوئی پابندی نہیں آپ کچھ بھی لکھیں مگر آپ جب اپنی تحریر کو کسی مخصوص ادبی صنف کے ساتھ جوڑ کر پیش کریں تو عین لازمی ہے کہ آپ اُس ادبی صنف کے ہر ہر اصول کی اطاعت کر چکے ہوں، نہیں تو جاننے والے اُسے پڑھے بغیر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں گے۔ ہمارے ہاں لوگوں کا عوامی سطح پر ادب سے اس قدر مضبوط تعلق تو نہیں رہا مگر پھر بھی جاننے والے ہر کہیں موجود ہوتے ہیں۔ معیار پر سمجھوتہ کر کے لکھنے والے بہت جلد کافور بھی ہو جاتے ہیں۔ ادب بنیادی طور پر بے ضرر اور انتہائی ذمہ دارانہ شعبہ ہے۔ قلم کو آپ فساد اور دل آزاری کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں جبکہ یہ محبت و شعور کی اشاعت کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے۔

اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنے قلم کا رخ کس طرف موڑتے ہیں۔ ایک کہنہ مشق اور راست باز ناول نگار سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی تحریر کے ذریعے لوگوں کے جذبات سے کھیل کر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے۔ بالفرض اگر وہ ایسا کر بھی لے تو حقائق تک رسائی کے حامل اُس کی تحریر میں چھپی آلائش کو عیاں کر ہی لیتے ہیں۔

افسانہ لکھیں ناول لکھیں یا پھر غزل پس ہر صنف کے بنیادی اُصول آپ کو ازبر بھی ہونے چاہئیں اور ان کی اطاعت کا احساس بھی ہونا چاہئے۔ علم الہندسہ کے اُصول آپ ناول میں نہیں اپنا سکتے۔ اِسی طرح ایک خالص مذہبی تحریر میں آپ گل وبلبل کے قصے نہیں چھیڑ سکتے۔ فکشن میں آپ حساس فقہی مسائل نہیں بیان کر سکتے۔ یہ وہ چند ایک بنیادی ذمہ داریاں ہیں جن کی تکمیل ہر لکھاری پر واجب ہے، نہیں تو پھر فکشن، مذہب، نفسیات، تاریخ اور فلسفہ سب کچھ گڈ مڈ ہو جائے گا اور پڑھنے والے کو تحریر میں کنفیوژن کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اگر آپ لکھاری ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی تحاریر سے لوگوں کو مذہب کی طرف راغب کریں تو یہ ایک بہت عظیم ذمہ داری ہے۔

اِس کے لئے آپ افسانہ یاناول کی اصناف منتخب نہ کریں سادہ اور دوٹوک مذہبی مضمون باندھ لیں تاکہ سمجھنے والا بغیر کسی ابہام اور گھمن پھیری کے آپ کے پیغام تک پہنچ جائے کیونکہ اُصول یہی کہتا ہے۔ جبکہ اس طرح ادب کی کسی بھی صنف کا استحصال بھی ممکن نہیں ہو پائے گا اور لکھنے والے کا واضح سٹینڈ بھی پڑھنے والے کو نظر آجائے گا کہ میرا مخاطب کس مقام پر کھڑا ہے اور مجھ سے کونسی طلب کی جستجو لئے ہوئے ہے۔ یہ ہیں لکھنے کے چند آداب ورموز۔

یہاں پر مجھے جون ایلیاء کا ایک انتہائی خوبصورت جملہ یاد آرہا ہے۔ایک مقام پر آپ نے فرمایا تھا کہ" بہت سے لوگ جنہیں پڑھنا چاہیئے، وہ لکھ رہے ہیں"۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہکو الف تینوں درکار

روزنامہ پاکستان 26 جنوری 2017

سکون انسان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔سکونِ قلب ہی درحقیقت کائنات سے انسان کی حتمی طلب ہے،لیکن کیایہ طلب مثبت ہے؟۔علم ہو یا دانش بغیر اضطراب کے نہیں پیدا ہوسکتا۔دنیا میں جتنی بھی ادبی اور تکنیکی تخلیقات ہوئی ہیں انسان کے کمال اضطراب کی حالت میں وقوع پذیر ہوئیں۔اہلِ تسکین تو آنکھیں موند کر دنیا و مافیہا سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔پس اس کیفیت کے وقوع کو ہم عام اصطلاح میں دینیات بھی کہہ سکتے ہیں۔چنانچہ ادیانِ عالم انسان کی روح کو پرسکون کرنے کیلئے ہی تو نمودار ہوئے،لیکن علم و دانش اور تخلیق و اَدب صرف مضطرب لوگوں کی ہی اختراعات ہیں۔بچپن میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ لفظ شاعر کا کیا مطلب ہوتا ہے؟۔

جب شعور سنبھالا تو شعور کے ساتھ ہی شاعر ہونے کا نہ صرف لغوی بلکہ اصطلاحی مفہوم بھی سمجھ آ گیا کہ شعر دراصل شعور سے ہے اور شعور درحقیقت ایک مسلسل اضطراب کا نام ہے۔عجیب مضحکہ خیز حقیقت ہے کہ انسان اسی شعور سے نجات حاصل کرنے کیلئے جذبات کا سہارا لیتا ہے اور پھر آخر میں جذبہ بھی انسان کو وادیِ شعور میں لا کر بے یارو مددگار چھوڑ دیتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ جہالت میں تسکین ہے اور اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ انسان بہت زیادہ پڑھ لکھ کر بھی اِسی مقام پر آجاتا ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیائے علم و دانش کے مسلمہ عقلمند سقراط حکیم کبھی یہ نہ کہتے کہ" میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا"۔آپ نے ایک نہایت دقیق نکتہ واضح کر دیا۔کہتے ہیں کہ عقلمند اور جاہل دونوں ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ عقلمند اپنی جہالت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور جاہل اپنی جہالت سے آگاہ نہیں ہوتا۔ یہاں پر بلھے شاہ جیسے زیرک صوفی دانشور کا ایک بند مدعا واضح کر دے گا۔ع

ہکو الف تینوں درکار

علموں بس کریں اُو یار

بلھے شاہ کا یہ الف دراصل لاحاصل اور بے سود جستجو کا خاتمہ ہے۔آپ کے نزدیک والہانہ سپردگی ہی دراصل عقلمندی کی انتہاء ہےلیکن یہاں پر ایک بات یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کا شعور بیدار ہو جاتا ہے اُن کا جھکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ حضرت مرزا غالب بجا فرماتے ہیں۔ع

ڈبویا مجھ کو ہونے نے ، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

مگر بات تو تب تھی جب میں نہ ہوتا۔گویا تمام انتہائی ذہین لوگ بالآخر ”میں“ ہی سے بیزار ہو جاتے ہیں کیونکہ شعور انسان کو ذات کا فہم تو دے دیتا ہےلیکن تجزیہ ذات کا اختیار نہیں دے پاتا، اِس لئے پھر شعور ذہین کیلئے عذاب بن جاتا ہے۔ وہ لوگ جو تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے بہت مسرور رہتے ہیں کیونکہ اُنہیں کائنات کا ذرا ذرا سالم نظر آتا ہے اور سالم ہونے میں ایک تسکین ہے۔اِسی کو صوفیانہ اصطلاح میں وحدت الوجود کہتے ہیں۔لب لباب یہ کہ شعور اور ذات ایک ساتھ قائم نہیں ہو سکتے ، یا تو آپ خود غرض ہیں یا پھر بندہ پرور۔مطلب ایک وقت میں آپ دو مقامات پر نہیں رہ سکتے۔ذہین بہت حساس ہو جاتا ہے کیونکہ خود آگہی دراصل ایک انتہائی حساس ترین مقام ہے، اتنا حساس کہ یہ مفلسی کا بھی مقابلہ کرسکتا ہے۔حضرت اقبال کی گواہی ملاحظہ فرمائیں۔ع

اے طاہرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لاہوت دراصل حسین بن منصور الحلاج کی اصطلاح ہے جس کو آپ مقامِ معرفت کی انتہاء سمجھتے ہیں۔یہ مقام سراپا کرب اور وفورِ حیرت ہے۔جہاں پر جستجو جہالت سے ٹکریں مارتی ہے اور اِس دھکم پیل میں انسانی ذات بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔اِس مقام پر سلطان العارفین حضرت سلطان باہو کا درد بھی ملاحظہ فرمالیں۔ع

سینہ تاں میرا درد بھریا اندر بھڑکن باہیں ہُو
تیلاں باج نہ بلن مشالاں درداں باج نہ آہیں ہُو

یہ وہ آگ ہے جس میں ذہین ہر پل جلتا رہتا ہے اور کسی پل کسی طور اس جلن سے مفر حاصل نہیں کر سکتا۔ پس ذہین سراپا کرب بن کے رہ جاتا ہے۔ اِسی اضطراب کی کیفیت میں انسان وہ غیر معمولی اُمور سرانجام دے دیتا ہے جس کے متعلق عام کیفیت میں سوچنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اضطراب نہ ہو تو پھر علم و شعور یکسر بے سود رہ جائے۔ حضرت اقبال نے سچ ہی کہا۔ ع

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

ذہین جب جستجو کی معذوری سے آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ جذبات کا سہارا لے لیتا ہے۔ پس یہی وہ مقام ہے جہاں سے علم عشق کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حضرت سیدی رومی فرماتے ہیں۔ ع

آں علم کہ در مدرسہ حاصل گردد
کارِ دِگر است و عشق کارِ دِگراست

یہ اٹل حقیقت ہے کہ علم کی انتہاء جہاں پر ہوتی ہے وہاں سے عشق کی ابتداء ہوتی ہے اور عشق ہی پھر حتمی دانش بن جاتا ہے۔ یہاں پر ذہین فرزانہ سے دیوانہ بن جاتا ہے اور پھر وہ اپنی طلب کے آگے تمام معاشرتی و مذہبی مسلمات کو زیر کر دیتا ہے۔ حضرت بلھے شاہ اِس مقام کی بہترین تفسیر کرتے ہیں۔ ع

اے عشق بلھے شاہ اَوکھا اَولّہ
صورت ہے صنم دی عرشِ معلیٰ
بِن یار دے ہے نہ کوئی اللہ
بانویں رب نال لڑناں پے جاوے

یہ وہ مقام ہے جہاں پر انسان عزم واستقلال کا پیکر بن جاتا ہے اور وہ اپنی طلب کے حصول کی خاطر کچھ بھی کر گزرتا ہے کیونکہ یہ علم ومعرفت اور عشق وجنون کا بالکل آخری مقام ہے اور جس مقام پر حسین بن منصور الحلا ج نے اَناالحق کا نعرہ لگایا تھا۔اَناالحق خودی کی سب سے مدلل اور مفصل تعبیر ہے جس کاادراک عامی کیلئے بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہی سمجھ لیں ۔علم وعقل کے پیچ وتاب ایک انتہاءاور عشق کا سوز وگداز دوسری انتہاء،اگر انسان اِن دونوں کیفیات میں توازن پیدا کرلے تو زندگی جنت بن سکتی ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ انسان آخر کار کسی ایک جانب ڈھلک ہی جاتا ہے۔

کیونکہ خوب سے خوب تر کی جستجو انسان کو بالآخر عذاب ہی سے دو چار کرتی ہے چاہے وہ علم وعقل کی اندوہ ناک سرنگ ہو یا پھر عشق وجنوں کی پُر خار وادی ۔پس اضطراب ذہین کی میراث ہی رہتا ہے، البتہ عامی اِن دونوں کیفیات سے مبراء ہوتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ علم اور جذبہ کے حقائق سے دور ہو اور ایک بالکل آجرانہ زندگی بسر کر رہا ہو اور جس کی ترجیح صرف حصولِ دانہ ہی ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆

اُوشو

روزنامہ پاکستان 19 جنوری 2017

زندگی ایک غیر محفوظ کھیل ہے۔کل کا کوئی وجود نہیں آج میں جیو۔تعقل کو رد کرکے دھیان کی طرف بڑھو۔ یہ اقوال ہیں معروف روحانی اُستاد اورسد گرو بھگوان شری رجنیش المعروف اُوشو کے۔ پنجاب کی دھرتی عالمگیر تصوف میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے۔حضرت مسعود الدین گنج شکر المعروف بابا فرید،حضرت بابا بلھے شاہ،حضرت مادھولعل شاہ حسین،حضرت سلطان باہو،سائیں وارث شاہ،حضرت میاں محمد بخش سائیں،میاں علی حیدر ملتانی اور حضرت بابا غلام فرید سائیں جنہوں نے عالمگیر تصوف میں پوری دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔

اُوشو 31 دسمبر 1931ءمیں بریلی کے ایک گاؤں کچواڑا میں پیدا ہوئے۔جیسا کہ ہر بچہ اپنے والدین سے ایک مخصوص مذہب لیتا ہے اِسی طرح اُوشو نے بھی تاراپنتھی جین گھرانے میں آنکھ کھولی۔

اُوشو ابتداء ہی سے برہمچاریہ(آگہی و تربیت) کے شائق تھے۔وہ برہمچاریہ سے براہ راست سنیاسیت تک پہنچنا چاہ رہے تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ گرہستہ اور وانا پرستہ کو بائی پاس کرکے ساری عمر سنیاس میں رہے۔اُوشو نے ساگر یونیورسٹی سے فلسفہ میں ماسٹر کیا اور پھر بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر جبل پور یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔اُوشو بنیادی طور پر سنیاس کے پرچارک تھے مگر یہ وہ سنیاس نہیں تھا جو عموماً ہندو میتھالوجی میں صدیوں سے چلا آرہا تھا۔اُوشو جس سنیاس کا پرچار کرتے تھے اُسے وہ اپنی اصطلاح نیو سنیاس سے تعبیر کرتے تھے۔

نیو سنیاس ہمارے صوفیاء کے نزدیک عالمگیر تصوف کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔اُوشو ہمارے صوفیاء کی طرح مطلق تعقل پسندی کے سخت ناقد اور میڈیٹیشن یعنی مراقبہ کے انتہائی پرچارک تھے۔اُوشو اپنے دو امتیازی تجرباتی اقدار کی بدولت مشہور ہوئے۔جنسی آزادی اور اوراَمیروں کا گرو۔جنسی آزادی اُردو میں ایک غیر مکمل اور لچر اصطلاح ہے۔اُردو زبان جو کہ اپنے اصل کے لحاظ سے ہمیشہ دیگر زبانوں کی محتاج رہی ہے،میں ابتداء ہی سے موزوں اصطلاحات کا فقدان رہا ہے۔ چنانچہ ہمیں مجبوراً عربی، فارسی یا پھر انگریزی زبان کے کسی مادہ سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔پس جنسی آزادی سے بہتر عربی کی اصطلاح مباشرتِ مطلق ہے۔

اُوشو کہتے تھے کہ انسان جب تک اپنے اندر کی واسنا (ہوس) کو دبانے کی بجائے اُسے مکمل طور پر پراگھٹ یعنی سیراب نہیں کر لیتا تب تک وہ حقیقی روحانی سکون اور رفعت نہیں پا سکتا۔ اِسی کی تفصیل اُوشو کی سب سے پہلی باقاعدہ نگارش "سمبھوگ سے سمادھی کی اُور" میں منظرِ عام پر آئی۔ اُوشو امیروں کے گرو تھے کیونکہ اُوشو کہا کرتے کہ غریب آدمی مجھے نہیں سمجھ سکتا۔ انسان جب تک امارت کے سبب تمام مادی ضروریات پوری نہیں کر لیتا وہ دل جمعی کے ساتھ روحانیت کی طرف نہیں آ سکتا یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر اور بالخصوص یورپ کے زیادہ تر امیر آپ کے روحانی شاگرد تھے۔

اُوشو ایک جلیل القدر صوفی تھے وہ اپنے ابتدائی ہندی ڈسکورسز میں بابا فرید اور بلھے شاہ کے کلام پر گھنٹوں بیان کرتے۔ اُوشو کو دنیا میں بہت کم لوگوں نے سمجھا۔ اُوشو چاہتے تھے کہ انسان ہر لحاظ سے امیر ہو جائے اس لئے وہ ایک نئی اصطلاح نیو مین کا استعمال کرتے۔

آپ کے نزدیک وہ نیا انسان ہر لحاظ سے امیر اور ہر روحانی آلائش سے منزہ ہوگا۔ اُوشو کسی مخصوص عقیدہ یا نظریہ کے پرچارک نہیں تھے۔ وہ نظریہ کی بجائے میتھڈ کے قائل تھے اور اپنی ذات سے وابستہ لوگوں کو میتھڈز کی تعلیم دیتے۔ اُوشو نے میڈیٹیشن کے ایک سو بارہ نئے میتھڈز بتائے ہیں جن کے ذریعے ایک انسان روحانی بالیدگی اور دھیان کی روشنی حاصل کر سکتا ہے۔

اُوشو ایک جینئس تھے۔ آپ نے انسانی شعور کو روشن کرنے والے تمام ذہین لوگوں پر بات کی اور ہر مشکل سے مشکل سوال کا جواب دیا۔ اُوشو کہا کرتے کہ میں سوال کو بھسم کرتا ہوں جبکہ لوگ اُسے جواب سمجھ لیتے ہیں۔ اُوشو اکثر کہا کرتے کہ زندگی کوئی مسئلہ نہیں جسے حل کیا جائے بلکہ زندگی ایک راز جسے بسر کیا جائے۔ اُوشو ماضی اور مستقبل پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ آپ ہمیشہ ورتمان یعنی لمحہِ موجود میں جینے کی بات کرتے تھے۔ آپ کے نزدیک اصطلاح یقین کبھی سننے کو نہیں ملی۔ اُوشو کے نزدیک یقین دراصل انسانی شعور کی نقاہت پر مبنی ہوتا ہے۔

اُوشو نے دنیا کے تمام مذاہب اور اُن کے بانیوں پر کھل کر بات کی۔ گوتم بدھ کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ بدھ نے انسانی شعور کو بچپنے سے نکال کر شباب عطاء کیا۔ اُوشو مروجہ ازدواجی اقدار کے شدید ناقد تھے کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ انسان کی حتمی قدر آزادی ہے اور کوئی بھی انسان کسی بھی قیمت پر آزادی کو قربان نہیں کر سکتا جبکہ فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

اُوشو کا وصف یہ ہے کہ آپ نظریات یا عقائد کی بجائے میتھڈز پر بات کرتے اور میتھڈز ہی دیتے۔

اُوشو نے زندگی کے ہر شعبہ پر انتہائی مضبوط استدلال سے بات کی۔اُوشو کی حکمت انسانی فطرت کو بے ساختہ اپیل کرتی ہے۔اُوشو انسانی معاشروں میں مذہب،وطن،نسل اور رنگ کی تفریق کو غیر فطرتی اور غیر ضروری تصور کرتے تھے جیسا کہ ہمارے اکثر وجودی صوفیاء کا نظریہ ہے۔

اُوشو صوفیاء کی طرح ہمیشہ محبت کا درس دیتے،امن کا سبق سکھاتے مگر اُوشو ہر اُس قدر کے شدید ناقد تھے جو انسان کی فطرتی آزادی میں حائل ہو۔گویا اُوشو کے نزدیک شخصی آزادی پر کسی طور بھی کمپرومائزنگ نہیں ہو سکتی۔ہم پورے اطمینان کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اُوشو گزشتہ صدی میں انسانی شعور کو تروتازہ کرنے والے آخری بڑے آدمی تھے۔آپ نے انسانی شعور میں جس قدر چمکدار اور تازہ اضافہ کیا ہے آئندہ متعدد نسلیں آپ کی حکمت سے مستفید ہوتی رہیں گی۔اُوشو کو سمجھنا ایک سطحی ذہن کے حامل کیلئے یقیناً مشکل ہے مگر جو بیدار مغز ہیں اُن کے لئے اُوشو کے ڈسکورسز ایک دماغی ٹانک کا درجہ رکھتے ہیں۔اُوشو نے ہمیشہ دلیل اور منطق سے بات کی۔آپ کا لہجہ انتہائی دھیمہ اور پُر لطف ہوتا تھا۔سننے والا آپ کے الفاظ تک گن سکتا تھا۔دنیا کی مختلف زبانوں میں اُوشو کے ڈسکورسز کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

دنیا کے کسی بھی ذہین انسان کیلئے اُوشو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔بہت ہی پُر تعیش اور شفاف زندگی گزارنے والے اُوشو 19 جنوری 1990ء کو اپنے آشرم پونے میں شریر تیاگ دیتے ہیں۔آپ کے مزار پر چسپاں کتبے پر آپ کی وصیت کے مطابق ایک انتہائی پُر اسرار تحریر لکھی ہوئی ہے:

Osho

Never Born

Never Died

Only visited this planet earth between

Jan 19 - 1990–Dec 11 - 1931

جمہوریت پر تنقید کا جائزہ

روزنامہ پاکستان 12 جنوری 2017

ہمارے ہاں جمہوریت پر سب سے مضبوط اور منطقی اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جمہوریت میں ایک صاحب علم اور ایک اَن پڑھ کی رائے برابر ہوتی ہے جو کہ منطقی طور پر غلط ہے۔جبکہ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جمہوریت میں فرد گنے جاتے ہیں اخلاقی اقدار یا ذہانت کو معیار نہیں بنایا جاتا۔پہلے اعتراض کے جواب میں ایک سادہ سا سوال یہ ہے کہ جس ملک میں لٹریسی ریٹ سو فیصد نہ ہو وہاں جمہوریت کا کیا کام؟۔جبکہ دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جمہوریت کی بنیاد محض شخصی رائے پر قائم ہوتی ہے اور اِسی طرح وہ رائے جو اکثریت پر مشتمل ہو نظمِ اجتماعی کی حق دار ٹھہرتی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اگر جمہوریت بدترین نظام ہے تو پھر اس کے برعکس ایسا کون سا نظام دریافت ہوا اب تک جس میں ہر انسان کی رائے کا احترام کرتے ہوئے انتقالِ اقتدار محض عوام ہی کے پاس رہے؟۔

ہمارے ہاں جو جمہوریت ہے وہ فی الحقیقت جمہوریت نہیں بلکہ جمہوریت کی ڈمی ہے جسے مَیں دیسی جمہوریت سے تعبیر کرتا ہوں۔سوال یہ ہے کہ ہم نے اپنی عوام کو رائے دینے کا حق فراہم کرنے سے پہلے انکی تعلیم و تربیت کا اہتمام کبھی کیا؟۔ہمارے ہاں سالانہ صرف ڈیڑھ سے دو فیصد تک تعلیم پر خرچ ہوتا ہے اور باقی کا سیکیورٹی پر خرچ ہوتا ہے یا پھر بے جا اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے۔جس ملک میں صرف اٹھائیس فیصد لوگ پڑھے لکھے اور باقی اَن پڑھ ہوں تو وہاں واقعی ایک پڑھے لکھے اور اَن پڑھ کی رائے برابر نہیں ہو سکتی جبکہ جس ملک میں سو فیصد لوگ پڑھے لکھے ہوں وہاں یہ اعتراض کیسے کیا جا سکتا ہے؟۔واضح رہے کہ جمہوریت پڑھے لکھے اور باشعور معاشروں کا نظام ہے۔جہاں جہالت اور بدتہذیبی قومی سطح پر موجود ہو وہاں جمہوریت بدترین کرپشن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ہم جمہوریت پر اعتراض کرتے ہوئے ہر بار یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ایک اَن پڑھ اور عالم کی رائے برابر نہیں ہو سکتی مگر ہم نے آج تک اِس بنیادی مسئلے پر توجہ نہیں دی کہ آخر ہم نے ایک عالم اور اَن پڑھ کے درمیان موجود شعوری خلیج کو پاٹنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟۔شاید اِس لئے کہ ہماری سوچ اور نظریاتی حد بالکل سطحی اور ناقص ہو چکی ہے۔ہم نے سطحی عقلیت کو صراطِ دانش قرار دے کر بین الاقوامی مجرب اور مستحکم سیاسی نظام اور سماجی اقدار پر تنقید شروع کر دی ہے۔

ہمارا مطالعہ انتہائی فرسودہ اور جامد ہے۔ ہمارے افکار میں وسعت ہے نہ اقدار میں جدت۔ ہم آج بھی مختلف درآمدہ تہازیب کے فکری غلام اور دوسروں کی سوچ کے اسیر ہیں۔ درحقیقت ہم طرزِ کہن پر اَڑ چکے ہیں۔ اقبال کی نشاندہی دور رس اور زبردست عمق نظر پر مبنی تھی۔ ع

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

ابتداء ہی سے ہمارا بنیادی مسئلہ کرپشن رہا ہے۔ انگریزی کی اِس اصطلاح کو ہم نے آج صرف معیشت تک محدود کر دیا جبکہ کرپشن کے معنیٰ بہت وسیع ہیں۔ گویا ہر معاملے میں بے قاعدہ رویہ کرپشن ہے، چاہے یہ معاملہ اپنی ذات تک کا کیوں نہ ہو۔ درحقیقت یہ بے قاعدہ رویہ انسانی معاشروں کی اخلاقیات کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم اپنی ذات کے ساتھ کرپٹ ہیں۔ پھر اپنے خاندان اور اِسی طرح اپنی ریاست اور پھر پوری دنیا کے ساتھ۔
جمہوریت میں واقعی افراد کو گنا جاتا ہے مگر ایک جمہوری ریاست کا ہر شہری اعلیٰ ترین شعور کا حامل ہوتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں تعلیم و تربیت ہر انسان کا فطری حق سمجھا جاتا ہے۔ جس میں اَن پڑھ اور پڑھے لکھے جیسی غیر اخلاقی تفریق نہیں ہوتی۔ پس ایسے معاشرے میں افراد کی اکثریت پر مبنی رائے ہی کو اقتدار منتقل کیا جاتا ہے۔
جمہوریت کسی فرد کے وجود کی گنتی کا نام نہیں بلکہ معاشرے میں موجود انسانی شعور کی بالادستی کا نام ہے۔ گویا فی الحقیقت جمہوریت شعورِ عامہ کی حکومت کا نام ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کائنات میں ہر انسان یونیک ہے۔ پس ہر انسان کی رائے بھی یونیک ہے۔ اس لئے تعلیم و تربیت پر چند مقتدر گروہوں کا حق نہیں بلکہ ریاست میں موجود ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ پس جمہوریت سے پہلے تعلیم ضروری ہے۔
جمہوریت دراصل ایک تازہ انسانی شعور کی کاشت ہے جو ریاست میں موجود ہر شہری کی رائے پر مشتمل ہوتی ہے۔ ریاست کا کوئی بھی شہری جو اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کا حامل کیوں نہ ہو اُسے یہ مطلق حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ محض انفرادی حیثیت سے ریاست کے نظم پر قبضہ جما لے اور جیسے چاہے ریاست کے قوانین مرتب کرے۔

اقتدار انسانی معاشروں کا مشترکہ حق ہے اور یہ بنیادی سیاسی قدر انسان کو شعور کے سبب ہی حاصل ہوئی۔شعور انسان کے اندر حساسیت پیدا کر دیتا ہے اور حساسیت ایک انسان کو دوسرے انسان کے قریب کرتی ہے۔وہ انسان جو شعور کی روشنی حاصل کر لے وہ تمام تر اخلاقی بے قاعدگیوں سے باز آجاتا ہے کیونکہ اِسے سمجھ آجاتی ہے کہ جس عمل سے اُسے دکھ ہوتا ہے ٹھیک اُسی عمل سے دوسرے انسان کو بھی دکھ ہوتا ہے۔پس اِسی لئے تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے تا کہ انسان شعور حاصل کر کے انسانی ذات کی اصل سے آگاہ ہو جائے۔

جمہوریت ایک شعور طلب نظم ہے۔اِسے اَن پڑھ اور سطحی سوچ کے حامل نہ تو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اِس کی حکمت کی گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں۔نظمِ اجتماعی کسی کی میراث نہیں۔یہ شعور کے حامل ہر اُس فرد کا حق ہے جسے اُس جیسے دوسرے باشعور افراد انفرادی رائے سے منتخب کر لیں۔ایک خالص جمہوری ریاست میں انسانی شعور کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اختلافِ رائے کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔انسان کی رائے صرف اُس وقت ناقص ہوتی ہے جب وہ شعور کی روشنی سے محروم ہو۔شعور حاصل کرنے کے بعد انسان کی رائے بظاہر جس قدر بھی منفی کیوں نہ معلوم ہو پس قابلِ غور اور مرجعِ استدلال ضرور ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

تعلیم و تربیت میں تقابلی رویہ

روزنامہ پاکستان 05جنوری2017

شعور ایک تروتازہ اور متحرک توانائی ہے جس کی بنیاد پر انسان حیوان سے ممیز ہو جاتا ہے۔ یہ وہ روشنی ہے جو انسان کو دائمی نجات سے ہمکنار کرتی ہے۔شعور کا کوئی متبادل نہیں۔ یہ بیش بہا خزانہ اور تقویمِ اُنس کی مجرد حقیقت ہے۔اِس کائنات میں ہر انسان ایک مختلف شعور لیکر پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اگر سات ارب سے زائد انسان بستے ہیں تو کوئی ایک انسان بھی کسی دوسرے انسان کی کاربن کاپی نہیں کہلاسکتا۔فزیکل سٹرکچر کے لحاظ سے تو ممکن ہے کہ کچھ مشابہات ممکن ہو جائیں مگر شعوری طور پر دو انسانوں کا ایک ہی طرح کا مابعدالطبیعیاتی سٹرکچر ممکن نہیں۔ اِس لئے کسی ایک انسان کو دوسرے انسان سے موازنہ کی بنیاد پر پرکھنا حماقتِ صریحہ ہے۔

اِس لئے ماڈل کی فلاسفی بھی غیر ضروری اور اضافی ہے۔ ہر انسان اپنی ذات میں ایک ماڈل ہے۔زندگی کے کسی بھی شعبہ میں دو انسانوں کے درمیان موازنہ نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ یہ موازنہ تعلیمی میدان میں کیا جائے۔

ہم اجتماعی طور پر اپنے بچوں پر زبردست ذہنی دباؤ ڈالنے کی عادت اپنا چکے ہیں جس کا خمیازہ ہم بھگت تو رہے ہیں مگر احساس نہیں ہے۔ہمارے ہاں والدین اپنے بچوں کو ابتدائی کلاسز میں یہ باور کرادیتے ہیں کہ آپ نے اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لینی ہے اور فلاں کی طرح بننا ہے جبکہ یہ غیر فطری اور غیر ضروری دباؤ بچوں کی نفسیات پر بہت منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ ہر بچہ ایک مخصوص اساسی صلاحیت لیکر پیدا ہوتا ہے اور فطرت اُسے اپنی وہ خاص کوالٹی یوٹیلائز کرنے پر اُبھارتی ہے۔مگر ہمارے ہاں والدین، معاشرہ اور ماحول ہمارے بچوں کی اساسی صلاحیتوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں یا پھر لاعلمی کے سبب زنگ آلود کردیتے ہیں۔

ہر بچہ ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بن سکتا۔اگر ہمارے دوست کا بیٹا ایک کامیاب ڈاکٹر ہے تو ضروری نہیں کہ ہمارے بچے میں بھی ایک کامیاب ڈاکٹر بننے کی صلاحیت موجود ہو۔تعلیم اور بالخصوص تربیت میں ہمیں تقابلی رویہ بہت شدید قسم کے خسارے سے دوچار کرتا ہے اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ہم اپنے بچوں کی ناکامیوں کو دیگر وجوہات فراہم کر دیتے ہیں اور اصل مسائل سے لاعلم ہی رہتے ہیں۔

فرسٹ پوزیشن لینا یا یونیورسٹی ٹاپ کرنا حقیقی کامیابی کی علامت نہیں ۔ہمیں یہ بات ہمیشہ کیلئے ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ دنیا کے زیادہ تر عظیم ترین انسان رسمی تعلیم کے حامل نہیں تھے ۔ ہاورڈ یونیورسٹی سے نکالے جانے والے دنیا کے معروف بزنس ٹائیکون اور سافٹ ویئر کمپنی مائیکروسافٹ کے اُونر بل گیٹس کی یہ بات بہت اعلیٰ ہے ۔ایک جگہ کہتے ہیں کہ "میں کسی بھی یونیورسٹی کا ٹاپر نہیں ہوں مگر آج دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے ٹاپرز میرے ایمپلائز ہیں" ۔

قابلیت اور کامیابی کی بنیاد صلاحیت ہے نہ کہ فارمل ایجوکیشن مگر تعلیم انسان کی صلاحیتوں میں نکھار ضرور پیدا کرتی ہے ۔انسان کے اندر چھپے ٹیلنٹ کو ڈائریکشن فراہم کرتی ہے ۔اس لئے تعلیم ضروری ہے جبکہ تربیت انسان کی اخلاقی افزائش کیلئے لابدی ہے ۔ہمیں اِس وقت اپنے بچوں میں دو نفسیاتی علل کو دور کرنا ہے ۔ایک بچے کی فطری صلاحیت کے خلاف ایجوکیشن کے حصول کا سد باب کرنا ہے اور دوسرا تقابلی رویہ کا مکمل خاتمہ کرنا ہے ۔تقابلی اساس صرف اُس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب دو بچے ایک ہی طرح کے شعور کے حامل ہوں جبکہ ایسا ممکن ہی نہیں ۔اس لئے تقابلی رویہ بچوں میں منفی ذہنیت کو پروان چڑھانے کے مترادف ہے ۔ چنانچہ بچہ اپنی صلاحیت سے تعلیم کو سمجھنے کی بجائے ریڈی میڈ تعلیمی پیراڈائم کا عادی ہو جاتا ہے اور اسی طرح بچے میں فطری صلاحیتیں آہستہ آہستہ زنگ آلود ہو جاتی ہیں ۔

جب ہم اپنے بچوں کو انکی فطری صلاحیتوں کے سہارے چھوڑ دیں گے تو وہ اپنی صلاحیتوں کو یوٹیلائز کر کے اپنی پسند کے میدان میں امتیازی حیثیت پر مامور ہو جائیں گے ۔ہمارے ہاں زیادہ تر نفسیاتی مسائل کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ہم جو کچھ حقیقت میں ہوتے ہیں بظاہر ویسے ایکٹ نہیں کرتے کیونکہ ہمیں بچپن سے ظاہر اور باطن میں دوئی کا درس دیا جاتا ہے جس کا اثر مرتے دم تک ہمارے ساتھ رہتا ہے ۔ایک پیدائشی سنگر صرف اِس لئے انجنیئر بنا دیا جاتا ہے کہ یہ اُن کے والدین کی خواہش یا خاندان کی چوائس تھی ۔ایسا کرنے سے ہم اپنے بچوں میں ایک انتہائی سنگین نفسیاتی بیماری "Dissociative identity disorder" کی داغ بیل ڈال دیتے ہیں جو بعد میں ایک مستقل نفسیاتی علت کا روپ دھار لیتی ہے ۔ اِسے دوہری شخصیت بھی کہا جاتا ہے ۔ یہ ایک انتہائی خطرناک نفسیاتی بیماری ہے جس کے شکار افراد مختلف طرح کے انسان ہونے کا روپ دھار لیتے ہیں ۔ یہ دراصل ایک خاص سطح کا ذہنی دباؤ ہوتا ہے جو ارتقائی مراحل طے کر کے ایک مستقل بیماری کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔تقابلی رویہ بچوں میں احساسِ کمتری کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کا غیر ضروری گلٹ بھی پیدا کر دیتا ہے ۔

جس کے سبب بہت سے جذباتی طلبہ امتحانات میں کم نمبر لینے کے سبب خودکشی تک کر لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے ہاں تو ملک کے سب سے اہم اور انتہائی اعلیٰ ترین خدماتی مناصب بھی اِسی تقابلی اسلوبِ تعلیم کی بنیاد پر فراہم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ انگریز کے دور سے لیکر آج تک سی ایس ایس اور پی ایم ایس جیسے انتہائی لایعنی اور نا انصافی پر مبنی تعلیمی میتھڈز کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ سی ایس ایس ٹاپر حقیقی معنوں میں بھی ایک باشعور اور ذہین طالب علم ہو۔ پس قابلیت کو پرکھنے کا یہ تقابلی رویہ بہرطور انسانی نفسیات کیلئے ایک تباہ کن تعلیمی اسلوب ہے جس سے ہمیں جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہئے۔

علاوہ ازیں زندگی کے ہر شعبے میں تقابلی رویہ انسان کے اندر ایک مستقل منفی تحریک پیدا کر دیتا ہے جس کے سبب انسان آگے بڑھنے کیلئے ہر غلط حدود کو عبور کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقابلی رویہ ایک سنگین نفسیاتی علالت اور غیر سماجی حرکت ہے جو نہ صرف انسان کی انفرادی زندگی پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے بلکہ سماج میں نفرت و کینہ کی فضاء بھی پیدا کر دیتا ہے۔ تعلیمی میدان میں تقابلی رویہ کا مکمل خاتمہ کر دینا چاہئے تاکہ ہم اپنے بچوں کو مکمل آزادی کے ساتھ اُن کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع دے سکیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے بچوں کو اُن کی فطری صلاحیتوں کے سپرد کر دیں اور ایسا کر کے ہم اپنے بچوں کو ایک مکمل انسان بننے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین انجینئر، ڈاکٹر اور میوزیشن کے روپ میں بھی دیکھ سکیں گے۔ ایسا شخص جس کا ظاہر و باطن ایک ہو گا ایک پُر اعتماد اور نفسیاتی طور ایک بہت مضبوط شخصیت کا حامل ہو گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

رومانیت کی سفیر

روزنامہ پاکستان 29دسمبر2016

پاک و ہند میں صنفِ نازک کو ذہانت سے بالکلیہ روک لیا جاتا ہے جس کی بنیادی منطق اِس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہاں کی عورت کہیں علمی میدان میں مرد کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ہمارے ہاں ذہین عورتیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔دراصل ہماری معاشرت میں عورت کا مقام محض عائلی قوانین میں مقید کر کے رکھ دیا گیا ہے جبکہ فطرت کی اطاعت بہترین اسلوبِ زندگی فراہم کرتی ہے۔

پروین شاکر بھی فطرت کی مطیع، بذلہ سنج، ذہین سرشت اور رومانوی مزاج کی خاتون تھیں۔کچھ لوگ اِس دنیا میں ایک خاص قسم کی کوالٹی لیکر پیدا ہوتے ہیں اور پروین شاکر بھی نظم و غزل کیلئے پیدا ہوئی تھیں۔پروین شاکر بیک وقت زندگی کے مختلف الجہت پہلوؤں پر بات کرتی نظر آتی ہے، بالخصوص مرد کی طینت سے کما حقہ آگاہ ہونے والی پروین شاکر رومانیت، جذباتیت، مذہب، فلسفہ، نفسیات اور انتظامی معاملات پر کمال علمی گرفت رکھتی تھیں جس کا واضح اظہار آپ کے کلام سے ملتا ہے۔

پروین شاکر کے ہاں زندگی سے شکوہ بہت پایا جاتا ہے بلکہ کسی حد تک یاسیت بھی آپ کے کلام میں در آتی ہے۔مرد کا ہرجائی پن اور خود غرضی پروین شاکر کے ہاں ایک ادبی اسلوب کی حیثیت حاصل کر چکا ہے جبکہ یہ مسائل ایک خاص حد تک درست بھی معلوم ہوتے ہیں۔پروین کے ابتدائی کلام میں زبردست والہانہ سپردگی موجود ہے۔پروین کی طبیعت میں رومانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی حتیٰ کہ بعض اوقات ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے پروین نے رومانوی مزاج کی مبادیات امیر خسرو دہلوی کے کلام سے لی ہوں۔ع

اِس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو پیا تیری

پروین چونکہ ایک روایتی اثنا عشری تشیع خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اِس لئے آپ نے اپنے کلام میں کربلا کی گریہ وزاری اور کوفیوں کی بے حسی کو انتہائی مصنع قالب میں ڈھالا۔ فرماتی ہیں۔ع

آستیں سانپوں کی پہنیں گے گلے میں مالا
اہلِ کوفہ کو نئی شہر پناہی دیں گے

مرد کی خود غرضی اور اَنا پرستی کو پروین فطرت کے قالب میں ڈھال لیتی ہیں۔ع

بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

پروین شاکر زندگی کے اس مایا جال سے بخوبی آگاہ تھیں۔ وہ کائنات کے ذرے ذرے میں بے ثباتی کا کمال ادراک رکھتی تھیں۔ پروین کے مزاج میں کسی حد تک صوفیانہ عالمگیریت بھی پائی جاتی تھی۔ وہ مادیت کی حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ تھیں۔ع

کھینچا ہے جب بھی طول وراثت کی جنگ نے
وارث بھی تخت پر نہ رہا تخت بھی نہیں

پروین اپنے کلام میں عورت کے جذبات و احساسات کو بلا کم و کاست پیش کرنے کی عادی ہیں۔ اگر آپ کو عورت کی جمالیاتی حس کی نمائندہ شاعرہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ پروین کی نظم اور غزل جس قدر مضبوط اور مستحکم تھی اسکے برعکس پروین کی ازدواجی زندگی اُتنی ہی متنوع مسائل کا شکار رہی۔

مرد سے جذباتی وابستگی تو بہر حال عمر بھر آپ کے کلام میں جاری و ساری رہی البتہ مرد سے روایتی ربط زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور جس کا اظہار آپ برملا کرنے کی عادی ہیں ۔ع

کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اُس کے یہ دل ہو سکا ہے اب بھی نہیں

علم نفسیات میں ایک اصطلاح Inferiority complex استعمال کی جاتی ہے جس کا اُردو ترجمہ احساسِ حرماں نصیبی کیا جا سکتا ہے اور یہ مختلف الجھات ہوتی ہے ۔ یہ احساس دراصل ایک انرجی کی صورت ظاہر ہوتا ہے اور انسان کی جذباتی وابستگی کو اوجِ کمال پر لے جاتا ہے ۔ چنانچہ پروین کی ازدواجی احساسِ حرماں نصیبی فنِ اَدب میں آپ کو ایک امتیازی حیثیت دے گئی ۔ پروین خود آگاہ اور صاحبِ عرفان شخصیت کی حامل تھیں ۔آپ کی نظر میں وسعت آپ کے کلام میں عالمگیریت، ہمہ جہتی اور منطقی رسوخ پیدا کر دیتی ہے ۔ پروین کے اندر جو مخملیں درد کا احساس پایا جاتا ہے وہ اس کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور پھر پروین اور کائنات یک زباں ہو کر ہمکلام ہونے لگتے ہیں جس کی خوشبو پروین کے کلام میں واضح نظر آتی ہے ۔ع

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

پروین اپنے کلام میں ہر مقام پر عورت کے جذبات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے ۔آپ کا پہلا مجموعہِ کلام خوشبو جو 1976ء میں شائع ہوا دراصل ایک دوشیزہ کے نرمل اور کومل احساسات کا وہ گلدستہ ہے جس کی خوشبو کائنات میں چہار سو پھیل گئی ۔ یہ وہ خوشبو ہے جو ایک الھڑ دوشیزہ کے عین عنفوان میں مہکتی ہوئی الفاظ کا سہارا لیتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ زندگی کے تلخ تجربات سے آراستہ ہو کر ایک مراقباتی اُداسی میں ڈھل جاتی ہے ۔

پروین الفاظ اور تخیل کے ذریعے صنفِ نازک کو زندگی سے لڑنے کا حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ پروین روایت کے اسیر اپنے معاشرے کی عورت کو اپنے جذبات قربان کرنے کا درس دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پروین عورت کو ضبط سکھاتی ہے وہاں پر جہاں محبت اور معاشرہ باہم متصادم ہو جاتے ہیں۔ پروین بغاوت کی بجائے عورت کو صبر و استقامت کا پیکر بناتی ہے۔ع

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دلہن سجاؤں گی

سپرد کرکے اُسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی

بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی آنکھوں میں مسکراؤں گی

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے روٹھ سکوں گی کسے مناؤں گی

اب اُس کا فن تو کسی اور سے ہوا منسوب
میں کس کی نظم اکیلے میں گنگناؤں گی

وہ ایک رشتۂ بے نام بھی نہیں لیکن
میں اب بھی اُس کے اِشاروں پہ سر جھکاؤں گی

بچھا دیا تھا گلابوں کے ساتھ اپنا وجود
وہ سو کے اُٹھے تو خوابوں کی راکھ اُٹھاؤں گی

سماعتوں میں گھنے جنگلوں کی سانسیں ہیں
میں اب کبھی تری آواز سن نہ پاؤں گی

جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا کہ میں اُس کو بھول جاؤں گی

☆☆☆☆☆☆☆

اُردو ادب روشن خیالی کی راہ پر

روزنامہ پاکستان 08دسمبر 2016

پاکستان میں جب ہم اصطلاح روشن خیالی استعمال کرتے ہیں تو فوراً ہمارے ذہن میں ایک منفی تاثر قائم ہو جاتا ہے کیونکہ مغرب سے درآمدہ چندایک اصطلاحات ہمارے ہاں شجرِ ممنوعہ بن چکی ہیں بالخصوص سیکولرازم اور روشن خیالی۔ سیکولرازم کو ہمارے ہاں علماء لادینیت سے تعبیر کرتے ہیں اور روشن خیالی کو فحاشی سے۔الامان والحفیظ۔
جھوٹ اور مقدس دجل کی بنیاد پر قائم ہونے والے سماجی پیراڈائمز انسانی معاشروں کو اندر سے کھوکھلا اور نفاق و جہالت سے لت پت کر دیتے ہیں اور ہر زمانے میں روشن دماغ قومیں حماقت گزیدہ اقوام پر ٹھٹھہ مارتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ روشن خیالی کے لئے انگریزی زبان میں ایک بہت ہی جامع اور نہایت خوبصورت اصطلاح Enlightenment استعمال ہوتی ہے جس کے حقیقی معانی یہ ہیں کہ" ذہن ہر قسم کی پراگندگی سے فراغ حاصل کر کے جُز سے کُل کی روشنی میں سما جائے"۔اب اِس کو مزید واضح کیا تو بات پھیل کر تصوف اور سنیاسیت پر مقفل ہو گی لیکن اس مختصر سے مضمون میں مزید وضاحت ممکن نہیں۔
اُردو ادب جو کہ ابتداء ہی سے پُر اسرار یاوہ گوئی کا شکار ہو گیا تھا انگریزی ادب کے مقابلے میں نہایت مضحکہ خیز واقعہ ہوا ہے۔فینٹسی یعنی تخیلاتی لطف تو انگریزی ادب میں بھی بدرجہ اَتم موجود ہے مگر مغربی ادب میں فینٹسی بھی ایک مخصوص منطقی بنیاد پر چلتی ہے جبکہ ہمارے ہاں ایسا کوئی اہتمام موجود نہیں رہا۔البتہ بیسویں صدی کی ابتدا میں جب انسانی شعور نے ہند میں ہندوستانی انگریز دانشوروں کی وساطت سے انگڑائی لی تو ہمارے اُردو ادب کے پروانے بھی جھوم اُٹھے۔میں سمجھتا ہوں کہ اُردو ادب کو برصغیر میں روشن راستے پر لانے والے برصغیر کے پہلے پی ایچ ڈی سکالر ڈاکٹر محمد دین تاثیر ہیں۔آپ بیک وقت ایک مضبوط شاعر اور فقید المثال نقاد تھے۔اُردو ادب کو جدت اور منطق کی روشنی دینے والوں میں آپ کا نام ہمیشہ ایک روشن ستارہ کی مانند فلکِ ادب پر ضوفشاں رہے گا۔فی الحقیقت اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک ہندوستان میں کمیونسٹ موومنٹ کی وساطت سے وقوع پذیر ہوئی۔وہ اذہان جو بنیادی طور پر کمیونزم اور سوشلزم کے فکری حصار میں مبتلا تھے وہ اپنا فکری پیٹرن اُردو ادب میں بھی لے آئے۔

پس اِسی طرح اُردو ادب ایک مسلّمہ خیالی دنیا سے ٹھوس منطقی ڈگر پر روانہ ہوا چنانچہ ترقی پسند تحریک سے سوشلسٹ موومنٹ کو کسی بھی صورت الگ نہیں کیا جا سکتا۔

کمیونزم میں غریب پروری اور انسانی مساوات کا وہ آفاقی سلیبس موجود ہے جس کی بنیاد پر دنیا ستر سالہ ناقابل فراموش دور دیکھ چکی ہے اور جس کی مثال تاریخ میں اِس سے پہلے کہیں موجود نہیں۔ پس کمیونزم کی فکری اساس کی بدولت ہی اُردو ادب گل و بلبل کے فرضی قصوں سے نکل کر سماجی ناہمواریوں کے خلاف ایک منظم اور غیر مقصر آواز پر منتج ہوا۔ فلہٰذا اب نہ تو ایاغ و صہبا پر توجہ رہی اور نہ ہی محبوب کی مست نرگسی آنکھوں کی چمک پر ٹکٹکی باندھنے کا دور رہا۔

بیسویں صدی کی ابتداء درحقیقت اُردو ادب کی ایک اساسی انگڑائی کا دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سوشلسٹ موومنٹ پوری طرح ہندوستان میں عروج پر تھی۔ بایاں بازو کے زرخیز اذہان ایک ایک کر کے اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک کے ساتھ ملتے گئے۔ سید سجاد ظہیر جو بنیادی طور پر ایک نظریاتی کمیونسٹ تھے اور جن کی سوشلسٹ خدمات اپنا ایک الگ تعارف اور مقام رکھتی ہیں درحقیقت اُردو ادب کو ایک مضبوط معاشرتی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اب اُردو ادب کسی محفل میں پڑھے گئے مشاعرے یا کسی سلطان کے دربار میں لگائے گئے ادبی شغل کی بجائے ایک بامقصد جدوجہد کا روپ دھار لیتا ہے۔

ہندوستان میں یہ تحریک اُردو ادب کے لکھاریوں کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر مہارت رکھنے والے ہندوستانی ادیبوں کے لئے بھی ایک نظریاتی پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ انگریزی کے معروف ناول نگار احمد علی اور ملک راج آنند بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے نظریاتی بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ پس وہ اذہان جو بنیادی طور پر سوشلسٹ موومنٹ سے متاثر تھے اُردو ادب میں ایک نئی روشنی لیکر آئے۔ یہ دور بالکل ابتدائی دور تھا اور یقیناً اس دور میں مشکلات بھی کافی تھیں لیکن ایک قدیم اصول ہے کہ انسان کا ارادہ پختہ ہو تو حالات موافق ہو ہی جاتے ہیں۔

یہ تو تھا ہندوستان کا حال۔ پاکستان بنا تو بہت سے نامور ادیب اور صحافی جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے پاکستان ہجرت کر آئے جن میں سعادت حسن منٹو، حبیب جالب، جوش ملیح آبادی، سبط حسن اور حمید اختر کے نام نمایاں ہیں اور جنھوں نے پاکستان میں ترقی پسند ادب کی آبیاری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ کچھ ادیب جو اتفاق سے پاکستانی علاقوں ہی میں موجود تھے۔

اُن میں احمد ندیم قاسمی ،فیض احمد فیض ،احمد فراز نے بھی ترقی پسند تحریک میں اپنے تئیں بہتیرا حصہ ڈالا بالخصوص فیض کا ادبی اور اشتراکی کلام تو انتہائی مضبوط اور قابل ستائش ہے۔

پاکستان میں فیض احمد فیض آج بھی ترقی پسند تحریک کا ایک مضبوط حوالہ سمجھے جاتے ہیں۔عربی، فارسی، انگریزی اور بالخصوص رشین ادب پر کمال گرفت رکھنے والے فقیر طبع فیض نے اُردو ادب کے وسیلہ سے ملک میں وطن پرستی کے علاوہ آمریت کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا رواج پیدا کیا۔قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے باوجود بھی اپنے مقصد سے نہ ہٹ سکے۔ہندوستان میں اگر بیسویں صدی نے اُردو ادب وفکر کو کچھ دیا تو وہ ڈاکٹر محمد اقبال اور فیض احمد فیض کی صورت میں دیا۔اُردو ادب پر فیض کے احسانات اِس قدر ہیں کہ ترقی پسند تحریک کا محض نام یاد رکھنے والے بھی فیض کو نہیں بھول سکتے۔فیض کے بعد آج تک کوئی ایسا مضبوط کمیونسٹ ادیب پیدا نہ ہو سکا گو کہ اس ضمن میں احمد فراز کی کچھ جزوی جہد قابل ستائش ضرور ہے مگر اُردو ادب پر فیض کا اثر پھیکا کرنے والا میری دانست میں فیض کے بعد کوئی نہیں بلکہ ایسا شاید ہی اب کوئی پیدا ہو۔مجھے یہ بات کہنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کہ فیض اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے خاتم الشعراء ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

کیا فکری جمود میں ترقی ممکن ہے؟

روزنامہ پاکستان 17 نومبر 2016

فکر عمل کا سر چشمہ ہوتی ہے کیونکہ فکر وجود کو متحرک کرتی ہے اور پھر یہ تحریک مختلف افعال کی شکل اختیار کر لیتی ہے گویا انسان کا ہر عمل دراصل اُس کی فکر کا عکاس ہوتا ہے۔فکر جامد ہو جائے تو عمل ایک مخصوص دائرے میں قید ہو جاتا ہے۔ فکر فی نفسہٖ جامد نہیں ہوتی کیونکہ فکر ایک جاریہ قوت ہے جو تغیر کے مختلف مراحل سے گزر کر اپنے اندر جدت اور نکھار پیدا کرتی رہتی ہے۔پسماندہ معاشروں میں فکر کو غیر فطری طریقہ سے جامد کر دیا جاتا ہے چنانچہ جب فکر جامد ہو جاتی ہے تو انسان وقت کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی بجائے کسی کونے کھدرے میں جا بستا ہے جہاں اُس کی اپنی ایک الگ دنیا قائم ہوتی ہے جس میں وہ پھر کسی قسم کی ترمیم برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

انسان کا یہ غیر فطرتی اور خود ساختہ رویہ معاشرے میں علمی و اخلاقی اضمحلال کا باعث بن جاتا ہے۔انسان کے اس رویہ سے مطلق خود غرضی اور عدم برداشت کی ایک ایسی فضا قائم ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ پھر زبردست اخلاقی پسماندگی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔فکری جمود کی اساس دراصل تقلید اور رجعت پسندی پر قائم ہوتی ہے۔فکر اُس وقت تک جامد نہیں ہو سکتی جب تک کہ آپ اِسے تقلید یا رجعت پسندی کے حوالے نہ کر دیں۔تقلید دراصل رجعت پسندی کی عملی شکل ہوتی ہے۔رجعت پسند معاشروں میں تقلید آہستہ آہستہ مقبول تقدیس میں بدل جاتی ہے۔پس جب ایک بار نوبت تقدیس تک پہنچ جائے تو پھر فکری تحریک رجعت پسند معاشروں میں عموماً شجرِ ممنوعہ بن جاتی ہے۔

تقلید ایک غیر فطری اور غیر ضروری روش ہے کیونکہ شعور کی موجودگی میں تقلید ایک زبردست غیر ذمہ دارانہ رویے کا نام ہے۔اِس سے نہ صرف علمی ترقی اور اخلاقی تزئین کی راہ مسدود ہو جاتی ہے بلکہ انسان کی شعوری قوت بھی ناکارہ ہو جاتی ہے بقول ڈاکٹر علامہ محمد اقبال۔ع

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اِس کی حفاظت کہ یہ ہے گہر یگانہ

فکر کے جمود سے نہ صرف انسان علمی و اخلاقی طور پر پسماندہ ہو جاتا ہے بلکہ معاشرہ مجموعی طور پر معاشی و سیاسی زبوں حالی کا شکار ہو جاتا ہے۔فکری جمود کے سبب انسان جدید تعلیم وفنون کے حصول سے یکسر عاری ہو جاتا ہے کیونکہ فکری تحریک کے بغیر تعلیم و تعلم کا سلسلہ نہیں جاری رکھا جاسکتا۔انسان ایک مخصوص دائرے سے باہر نکلے بغیر تعلیم کی افادیت سے بہرہ مند ہو سکتا ہے نہ فنون سے آراستہ چنانچہ وسائل کی موجودگی میں بھی انسان دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی روش میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جن معاشروں میں سوچ آزاد نہیں وہ معاشی طور پر پسماندگی کا شکار ہو رہے ہیں ۔انسانی فکر کا سب سے بہترین پھل قانون ہے ۔جن معاشروں میں فکر جامد نہیں اُن معاشروں میں قانون کی بالادستی بھی قائم ہو چکی ہے ۔

دنیا کا مسلمہ اُصول ہے کہ پسماندہ ذہن معاشروں کا قانون بھی پسماندہ اور قانون کی بالادستی بھی برائے نام ہوتی ہے ۔

فکری جمود صرف انفرادی رویے میں تخریب کا نام نہیں بلکہ اِس سے تعلیمی، اخلاقی، سماجی، معاشی اور سیاسی نظام بری طرح متاثر ہو جاتا ہے۔ترقی کا پہلا زینہ جستجو ہے۔انسان ایک باشعور حیوان ہے جس نے ابتدائے آفرینش سے فکر کے ذریعے اپنے رویے میں تزئین پیدا کی ۔چنانچہ فکر سے تہذیب النفس کی راہ کھلی ۔

جہاں فکر جامد ہو جاتی ہے وہاں اخلاقی پسماندگی کا آغاز ہو جاتا ہے اور فکر جامد اُس وقت ہوتی ہے جب انسان ماضی کو حال اور مستقبل پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ فکر جامد نہ ہو تو کل کے تجربات سے حال میں بہتری لائی جا سکتی ہے اور باشعور انسان اَب تک یہی کرتا چلا آ رہا ہے ۔البتہ بعض اذہان آج بھی اِس نکتہ پر قائم ہیں کہ بہتری صرف ماضی کے حصے میں آئی تھی ۔آج ہم ماضی سے آگے نہیں بڑھ سکتے لہٰذا ماضی کو آج پر آویزاں کر کے آگے چلو ۔

انسان کا یہی غیر ذمہ دارانہ اور مبنی بر تساہل رویہ تعلیمی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی نظم میں زبردست جھول پیدا کر دیتا ہے ۔

انسان کی فطرت وقت سے ہم آہنگ ہوا چاہتی ہے لیکن انسان کا جامد رویہ اُسے شعوری تحریک سے روک لیتا ہے پس اِس رُکاوٹ کی وجہ سے انسان ہر لحاظ سے جمود کا شکار ہو جاتا ہے ۔

رجعت پسندی ایک لاعلاج ذہنی علالت ہے جو انسان کو بسترِ جمود سے اُٹھنے نہیں دیتی ۔دنیا میں وہ قومیں جلد صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہیں جو ماضی کا مزار بنی رہتی ہیں ۔ماضی انسان کے مضبوط ترین تجربات کا نام ہے انسان اِن تجربات سے سیکھ کر حال اور مستقبل کو بہتر بنا سکتا ہے لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب انسان ماضی کو تجربہ سمجھ کر حال کی فکر میں محو ہو جائے ۔

فکری جمود کا دوسرا اہم سبب دراصل تقلید ہے۔تقلید کا تعلق براہِ راست انسانی سوچ سے ہے۔انسانی سوچ جب ایک مخصوص دائرے میں مقید کرلی جائے تو یہ تقلید کہلاتی ہے جیسے کہ ہم عرض کرچکے۔تقلید فی نفسہٖ کوئی بُری روش نہیں لیکن تقلیدِ روایت مہلک عمل ہے۔روایت یہ ہے کہ انسان سنی سنائی باتوں پر قانون سازی یا اخلاقی اقدار کی بنیاد رکھنا شروع کردے۔پس ایسے تمام افعال انسان کی عقلی بصیرت سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔بصیرت انسانی اعمال میں خیر و برکت پیدا کرتی ہے۔روایت سے منسلک رہنے میں کوئی قباحت نہیں لیکن یہ کہ روایت کو درایت پر ترجیح نہ دی جائے نہیں تو حقائق خرافات میں کھوجاتے ہیں بقول ڈاکٹر علامہ محمد اقبال۔ع

یہ اُمت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

رجعت پسند معاشروں میں سب سے زیادہ مسائل اخلاقی نوعیت کے ہوتے ہیں کیونکہ رجعت پسند معاشروں میں اخلاقی اقدار وقتِ جاریہ سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں اِسی لئے معاشرے میں عمومی طور پر ایک زبردست ثقافتی گھٹن پیدا ہوجاتی ہے۔پس یہی ثقافتی گھٹن آہستہ آہستہ انسان کو مستقل طور پر ذہنی و اخلاقی پسماندگی کا حامل بنادیتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

قائداعظم کا پاکستان

روزنامہ پاکستان 11 اگست 2016

میں اکثر یہ عرض کرتا رہتا ہوں کہ آج تک ہمارے پاس تحریکِ پاکستان کی ایسی مستند تاریخ موجود نہیں جو بانی پاکستان کے رفقائے عظام میں سے کسی نے مدون کی ہو۔ اَلمیہ بصد حیرت واُفتاد یہ ہے کہ ہماری تاریخ دراصل 1947ء کے بعد شروع ہوتی ہے جبکہ اِس سے قبل کیا حالات تھے اور قیامِ پاکستان کے محرکین پر کیا بیت رہی تھی اِس کا تذکرہ ہمیں اپنی تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ ایسا کیوں ہوا یا کیوں کیا گیا؟ اِس کا جواب لکھنے کے لئے یہ مختصر سا کالم متحمل نہیں۔ یہاں پر مجھے قیامِ پاکستان کے ضمن میں چند معروضات پیش کرنی ہیں۔

سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا گیا تھا اور کن کی طرف سے کیا گیا تھا؟۔ یہ وہ سوال ہے جو پاکستان کی یک جہت اَساسی صورت ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ اِس سوال کا جواب ایک تو وہ ہے جو بچپن سے ہم روایتی انداز سے سنتے آرہے ہیں اور جس کو یہاں دہرانا ضروری نہیں جبکہ اِس سوال کا حقیقی جواب روایتی جواب سے بالکل مختلف ہے جس تک پہنچنے کے لئے مجھے خود ایک زمانہ لگ گیا اور تب کہیں جا کے قیامِ پاکستان کی اَساس کے معاملے میں میرا تمام تر اضطراب دور ہوا۔

بنیادی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ پاکستان اور اسلام لازم وملزوم ہیں۔ مطلب پاکستان اور اسلام کو کسی بھی صورت میں جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اِس نکتے کا دوسرا جزو یہ ہے کہ یہاں پر اسلام سے مراد روایتی اسلام ہر گز نہیں بلکہ صدرِ اوّل کا اسلام ہے اور اس اَمر کی وضاحت انتہائی ضروری ہے نہیں تو پھر اعتراضات کی بھرمار شروع ہو جاتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب پاکستان اسلام کے لئے بن رہا تھا تو پھر علمائے ہند کیوں قیامِ پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے تو اِس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہند کے مولویوں کے پیشِ نظر روایتی اسلام تھا جس کے تحت تحریکِ پاکستان فی نفسہ ایک گمراہ کن تحریک کے زمرے میں شمار ہوتی تھی۔ چنانچہ مولوی اور جناح کے اسلام میں جوہری فرق ہی دراصل قیامِ پاکستان کی مستند نظریاتی اساس ہے۔ یہاں پر میں اُن معروف علمائے ہند کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے قیامِ پاکستان کی نہ صرف ڈٹ کر علی الاعلان مخالفت کی بلکہ اِسے ایک غیر شرعی اور گمراہ کن تحریک بھی قرار دیا۔

جمعیت علمائے ہند کے سربراہ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا مفتی محمود وغیرہم۔ یہ وہ معروف اور مقبول عوامی و مذہبی پیشوا تھے جنہوں نے قیامِ پاکستان کی علی الاعلان مخالفت کی اور تحریک پاکستان کو ایک گمراہ کن تحریک قرار دیا۔ آج ان علماء کی حقیقی اور روحانی اولاد کس طرح جناح کے پاکستان پر اپنا نظریاتی حق ثابت کر کے قیامِ پاکستان کی حقیقی اساس مبتدل کر چکی اس کا حال لکھنے کے لئے کسی دوسرے کالم کا سہارا لینا پڑے گا۔ سرِ دست یہ بتلانا مقصود تھا کہ پاکستان کی حقیقی اساس کیا تھی اور کن مطالبات کے پیشِ نظر قیامِ پاکستان کی تحریک شروع کی گئی؟۔

اُصول یہ ہے کہ جن لوگوں نے پاکستان بنایا تھا صرف وہی لوگ بنیادی معلومات کے ضمن میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں علاوہ ازیں کسی بھی خارجی ذریعے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کا مطالبہ دراصل صدرِ اوّل کے اسلام کے نفاذ ہی کے لئے کیا گیا۔ اِس سے مراد دراصل وہ اسلام ہے جو حضرات خلفائے راشدین کے زمانے میں رائج تھا اور جس میں کسی بھی قسم کی کوئی عجمی آمیزش نہیں تھی۔ یہ وہ اسلام تھا کہ جس پر ملوکیت کی چھاپ نہیں پڑی تھی بلکہ اپنی اصل شکل میں جاری تھا چنانچہ بعد کے ادوار میں اصل اسلام ملوکیت کی زد میں آ کر دین سے مذہب بنا تو قرآن کی جگہ روایات نے لے لی اور یوں اصل اسلام نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دین سے مراد ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو حقیقی اسلام ہی کے پیشِ نظر تھا جبکہ اس کے برعکس مذہب جو عجمی ملوکیت کا پروردہ ہے اور جس کی ابتداء سب سے پہلے بنواُمیہ نے کی اور عباسیوں نے اس کو عروج تک پہنچایا، اس کا اصل اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وہ بنیادی نظریاتی اساس تھی جس کے تحت تحریکِ پاکستان برپا کی گئی۔ قیامِ پاکستان میں جس قدر رکاوٹیں خود ہند کے روایتی مسلمانوں اور بالخصوص علمائے ہند نے پیدا کیں ہندو یا دیگر اقوام کی مخالفت اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کیونکہ ہند کا مولوی عوام کے اندر کبھی اپنا مذہبی اثر رسوخ ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ایک سیکولر سٹیٹ کی بات کی تا کہ سیاسی اُمور مقتدر طبقے کے پاس اور مذہبی اُمور مولوی کے پاس رہیں جبکہ اس کے برعکس اسلام میں ایسی ثنویت کا کوئی جواز موجود نہیں۔ پاکستان کی نظریاتی اساس کو سیکولر کہنے والے مبنی بر باطل ہیں کہ سیکولر سٹیٹ کے لئے ایک الگ مملکت کا تصور ہی ممکن نہیں کیونکہ کوئی بھی سیکولر سٹیٹ ایک مخصوص نظریاتی اساس سے منہا ہوتی ہے جبکہ پاکستان کا قیام ہی ایک مخصوص نظریاتی اساس پر واقع ہے۔

اسلام ایک مستقل نظامِ حیات ہے جس کے تحت سیاست اور عبادت میں تفریق بے معنیٰ ہے بلکہ سرے سے ہے ہی نہیں چنانچہ اسی اَمر کی وضاحت کرتے ہوئے بانی پاکستان نے فروری 1948ء میں اَمریکہ کی عوام کو ایک براڈ کاسٹنگ پیغام کے دوران کہا کہ "پاکستان کو ہم کسی بھی صورت میں ایک تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے جس میں مولوی بزعمِ خویش خدائی مشن پورا کرتے ہیں"۔ پس یہی وہ بنیادی نکتہ تھا جس کے سبب ہند کے علماء نے قیامِ پاکستان اور بانی پاکستان کی مخالفت کی۔

مولوی جانتے تھے کہ جس طرز کا پاکستان جناح قائم کرنا چاہتے ہیں اُس میں ہمارا کوئی کردار نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ مخالفت ہی اُن کا واحد ہتھیار تھا اور اس ضمن میں وہ آخری حد تک بھی گئے۔قائداعظم محمد علی جناح کی ذاتی زندگی کے متعلق اکثر و بیشتر یہ اعتراضات اُٹھائے جاتے ہیں کہ جناح انفرادی زندگی میں تو خالص سیکولر تھے لیکن وہ کیونکر بھلا ایک اسلامک سٹیٹ کا قیام عمل میں لانا چاہ رہے تھے؟۔ اِس اعتراض اور اسلامک سٹیٹ کے قیام کی مطابقت ہم مذکورہ بالا سطور میں کر چکے ہیں کہ جناح کے پیشِ نظر کس طرز کی اسلامک سٹیٹ کا قیام ضروری تھا چنانچہ اگر ہم اسلامک سٹیٹ کے متعلق جناح کے انتہائی قریبی رفیق علامہ غلام احمد پرویز کی قیامِ پاکستان کے احوالے سے نگارشات کا مطالعہ کریں یا ویڈیو بیانات دیکھیں تو ہمیں صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ اسلام کی کونسی تعبیر جناح کے پیشِ نظر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

آدم کے ہر اِک درد سے وہ آشنا درویش

روزنامہ پاکستان 14 جولائی 2016

یہ دنیا حساس کے لئے درد اور دردمند کے لئے احساس ہے۔ایسے ہی ایک فقید المثال دردمند عبدالستار ایدھی اب ہم میں نہیں رہے۔ ہزاروں بچے یتیم اور لاکھوں مسکین لاوارث صحیح معنوں میں لاوارث ہو گئے۔ بخدا آج دل درد سے شکستہ اور آنکھیں نمی سے پُرسوز ہیں۔کاش زندگی کے ساتھ یہ موت کا لاحقہ نہ جڑا ہوتا تو آج ہم سے خدائی صفات کی حامل یہ شخصیت جدا نہ ہوتی مگر کیا ہے کہ یہ دستورِ قدرت ہے کہ ہر زندہ کو ایک نہ ایک دن موت سے ہم آغوش ہونا ہی ہے۔

عین جوانی میں جب انسان کے اندر خودنمائی اور جذباتِ فوقیت مچل رہے ہوتے ہیں ایسی عمر میں ایک فقیرزادبھی خود کو امیرزاد سمجھنے لگتا ہے۔کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اور وہ بھی کسی دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کے لئے بہرصورت ناممکن ہوتا ہے لیکن ایسے ہی عین شباب میں عبدالستار ایدھی نے دکھی انسانیت کی ضروریات پوری کرنے کے لئے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا شروع کیا اور پھر انسانیت کی خدمت کرتے کرتے زندگی کے پینسٹھ سال گزار دیئے۔

کسی کے سامنے محض صرف اپنی ضرورت کے لئے ہاتھ پھیلانا کس قدر اذیت ناک اَمر ہے یہ تو صرف وہی جان سکتا ہے جو اس کرب سے گزر چکا چہ جائیکہ کسی اور کی ضرورت پوری کرنے کیلئے ہاتھ پھیلانا۔تیئس سال کی عمر سے انسانیت کی خدمت کرنے والا وہ عظیم انسان دیکھتے ہی دیکھتے بے سہارا لوگوں کے لئے زندگی کا پیغام بن چکا۔زندگی بھوک اور دکھ کے درمیان واقع ہے۔بھوک کے بعد انسان جس چیز کی کمی شدت سے محسوس کرتا ہے وہ ہے رشتوں کے چھوٹ جانے کا دکھ۔رشتوں کے نہ ہونے اور اپنے بے سہارا ہونے کے درد سے آزاد کرنے والے ایدھی مرحوم انسانیت کا مجسم استعارہ بن چکے تھے۔ بلاشبہ آپ رہتی دنیا تک تاریخ انسانی میں انسانیت کی خدمت کے لئے ایک ماڈل کے طور پر زندہ وتابندہ رہیں گے۔ع

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

یہ بات کس قدر دکھ اور افسوس کی ہے کہ ایدھی مرحوم جیسے عظیم الفطرت انسان کے انفرادی عقائد اور شخصیت ایسے وقت میں تختۂ بحث بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جب آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اِس میں اب کوئی شک نہیں کہ ہم ایک محسن کُش قوم ہیں اور ہم آج تک اجتماعی طور پر تہذیب النفس اور حفظِ مراتب سے غافل ہیں۔ ایک منظم جہالت ہمارے ذہن اور اعصاب پر سوار ہو چکی ہے۔ خود تو کوئی اچھا کام کرتے نہیں اور اچھا کام کرنے والے کو بھی اس حد تک لے آتے ہیں کہ وہ بھلائی سے منہ موڑ کر ہم جیسا جاہل اور تنگ نظر بن جائے۔ ابھی ایدھی مرحوم کا جنازہ بھی نہیں پڑھا گیا تھا کہ سوشل میڈیا پر آپ کی ذات چند ایک پیشہ ور جہلاء کے ہاتھوں زبردست تنقید کا باعث بن گئی۔ شرم و حیاء سے تو ہم ایک عرصہ سے بے نیاز ہو چکے اب سوشل میڈیا کی برکت سے ہم رہے سہے اخلاق سے بھی جاتے رہے۔
ہفتہ کی صبح سے سوشل میڈیا پر مختلف عناد پرست اور شر پسند مولوی مختلف مذہبی فورمز اور سوشل میڈیا پر ایدھی مرحوم کی شخصیت پر اپنی جہالت اور تعصب کی آلائش پھینک رہے ہیں۔ یہ مولوی اور مفتی بلاشبہ نفرت و کدورت اور منظم جہالت کے پیروکار اور تعصب و فرقہ واریت کے بوسیدہ مزار ہیں۔ اخلاق و کردار کے یہ دیوالئے صرف اپنے مسلک تک ہی محدود رہتے ہیں۔ انہیں ساری نیکیاں محض اپنے ہم مسلک میں ہی نظر آتی ہیں اور اپنے مسلک کے باہر انہیں کفر اور ارتداد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اِن کے نزدیک نیکی طہارت سے شروع ہو کر دو رکعت پر ختم ہو جاتی ہے۔
اِنہیں انسانیت کی خدمت سے کوئی غرض نہیں۔ یہ نفرت کے پالنہار اور انسانی معاشروں کے ناسور ہیں۔ اِن کے نزدیک عبادت محض جسمانی مشقات ہیں جن کا انسانیت سے براہ راست کوئی لینا دینا نہیں۔ بخدا یہ عتاب نہیں درد ہے جو ایسے دردناک موقع پر مولویانہ کدورت پر محسوس ہو رہا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا سلیم الفطرت انسان نہیں جو ایدھی مرحوم کی شخصیت اور انسانی خدمات سے متاثر نہ ہو۔ سوشل میڈیا پر بیٹھ کر ایدھی مرحوم پر الحاد اور لادینیت کے فتوے لگانے والے وہ حیاء باختہ جہلاء ہیں جن کا دین صرف پیٹ سے شروع ہو کر پیٹ پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔
جنہیں انسانیت سے کوئی غرض نہیں۔ جن کے نزدیک ایک آزاد منش درویش اور انسانیت پرست کافر اور ایک تنگ نظر جاہل مومن ہے۔ کفر و اسلام کے اُصول اِن کے خانہ ساز ہیں۔ یہ اتنے حیا سوز ہیں کہ کسی نیک انسان پر کفر و الحاد کا فتویٰ لگاتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرماتے۔ نہ خدا سے نہ ہی اپنے آپ سے۔ جس ملک میں مولوی کی جہالت لوگوں کا دین بن جائے۔ حکمرانوں کی بد دیانتی لوگوں کی رائے بن جائے وہاں ایدھی جیسے انسانیت پرست کا کیا مقام؟۔

منافقت، جہالت اور نفرت سے گُندھا ہوا یہ معاشرہ ایدھی جیسے جلیل القدر انسان کی عظمت کو نہیں پہچان سکتا جس کی زندگی کا مقصد صرف انسانیت کی بے لوث خدمت تھا۔ میں اُن لوگوں کی جہالت پر نوحہ ہی کر سکتا ہوں جن کے نزدیک انسانیت سے پہلے ایمان کا مقام آتا ہے۔ کیا عقیدہ انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہے؟۔ ہرگز نہیں۔ جب انسان ہی زندہ نہیں رہے گا تو عقائد و قوانین کی کیا وقعت؟۔ لیکن خیر ہمارے ہاں تو عقائد پر انسانیت کو قربان کرنے کی روایت بھی موجود رہی ہے پھر اعتراض کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید معاشروں میں مذہب کو ریاست سے الگ کر دیا گیا کہ مذہب اور ریاست ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔

ایدھی مرحوم اُن معصوم بچے اور بچیوں کا باپ تھا جن کو بدطینت مسلمان جنسی بے راہروی کے بعد کوڑے میں پھینک جاتے تھے۔ ایدھی مرحوم اُن غریب بے سہارا اور لاچار لوگوں کا اکلوتا سہارا اور وارث تھا جن کو سرمایہ دارانہ نظام نے کچل کے رکھ دیا۔ ایدھی مرحوم نے اکیلے وہ کام کر دکھایا جو کام ایک منظم ریاست سرانجام نہیں دے سکتی۔ پاکستان کے بددیانت اور انسانیت کُش حکمرانوں کا کام ایک اکیلے ایدھی نے کر دکھایا۔ ایدھی مرحوم نے ہر دکھ درد میں پاکستان کا ساتھ دیا۔ ہر آفت و مصیبت میں پہلے ایدھی کی خدمات پیش پیش رہتیں۔ قدرتی آفات، دھماکے، ٹارگٹ کلنگ اور ہر طرح کی خونریزی میں ایدھی مرحوم خود موجود ہوتے اور اپنے ہاتھوں سے متاثرین کی خدمت کیا کرتے۔ ایدھی ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ انسانیت پرستی کی ایک روشن تحریک کا نام ہے جو رہتی دنیا تک تابندہ و ضوفشاں رہے گی۔ ایدھی نام ہے حاکم کے خلاف محکوم کی جنگ کا۔ ایدھی نام ہے ظالم کے خلاف مظلوم کی جنگ کا۔ کیا خوبصورت الفاظ آپ نے فرمائے "میں تعلیم حاصل نہ کر سکا مگر میں نے مارکس اور لینن کی کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے کربلا والوں کی زندگی کو پڑھا ہے۔ میں نے ابوذر غفاری کی تاریخ پڑھی اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اصل جنگ ظالم اور مظلوم کی ہے۔ حاکم اور محکوم کی ہے"۔ ایدھی کی یوں اچانک رحلت پر بے اختیار یہ بند میرے ذہن میں گھوم رہا ہے۔ ع

آدم کے ہر اِک درد سے وہ آشنا درویش
سکھلا گیا بندے کو عجب بندہ نوازی

☆☆☆☆☆☆☆

تہذیب النفس

روزنامہ پاکستان 30 جنوری 2016

جذبہ انسانی وجود کا اصلی محرکہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جذبات ہی انسانی وجود کو ڈرائیو کر رہے ہیں۔ جذبات کے دو پہلو ہیں ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ مثبت کا تعلق روح سے اور منفی کا تعلق نفس سے ہے۔ محبت، شفقت، اَدب، احترام اور بردباری مثبت جبکہ حسد، غصہ اور نفرت دراصل منفی جذبات ہیں۔ جذبہ فی نفسہٖ منفی نہیں ہوتا۔ جذبات کے سیاق ہی اِسے منفی بنا دیتے ہیں۔ جذبات کے منفی پہلوؤں کو مثبت پہلو میں تبدیل کرنا علم الاخلاقیات میں تہذیب النفس کہلاتا ہے۔ چنانچہ حسد کی جگہ آپ رشک، غصہ کی جگہ تادیب اور نفرت کی جگہ تنقید برائے اصلاح کر لیں تو جذبات میں ہر قسم کی آلائش کو دور کر سکتے ہیں۔

انسانی جذبہ اپنے اصل کے لحاظ سے ایک بے لگام قوت ہے اور عقل ہمیشہ اس قوت کی تابعداری کرتی آئی ہے چنانچہ انسان جب کوئی منفی عمل سرانجام دیتا ہے تو عقل اُس عمل کی مثبت انداز سے جانبداری کرتی ہے تاکہ معاشرے کے لئے اس رویہ کو قبول کرنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ معاشرے میں بہت سے جرائم اس لئے جرم معلوم نہیں ہوتے کہ انسانی عقل ایسے تمام منفی اعمال کے لئے مضبوط منطق گھڑ چکی ہوتی ہے چنانچہ جب کبھی منفی رویہ پر تنقید کی جاتی ہے تو عقلی دلائل اُس تنقید کا منطقی جواب دے کر انسان کے اندر جرم کو جرم سمجھنے کا احساس ہی ختم کر دیتے ہیں۔

جب کوئی جرم منطق کی سند حاصل کر لے تو وہ پھر عموماً انسانی معاشروں میں نیکی کی طرح مروج ہو جاتا ہے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اُس عمل پر تقدیس کا غلاف بھی اوڑھ دیا جاتا ہے تاکہ کوئی ذہن اس پر تنقید کی ہمت نہ کر سکے۔ اگر تنقید کرنے کی ہمت بھی کرے تو اپنے لئے مسائل پیدا کرنے کے مترادف ہو۔ پس ایسے ہی انسانی معاشروں میں برائی نیکی اور نیکی برائی بنتی رہتی ہے اور یہ ایک خالص فطری عمل ہے۔

اخلاقی اقدار جامد رویوں کا نام نہیں۔ انسانی فکر کی طرح انسانی رویہ بھی بہتری کے مختلف النوع مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔ وہ انسانی رویہ جو کسی زمانے میں برائی کا عکس لئے ہوئے تھا آج وہ نیکی کی علامت بن چکا ہے۔ سنہری اُصول کے علاوہ اخلاقیات کا کوئی ضابطہ جامد نہیں۔

سنہری اُصول دراصل اخلاقیات کا غیر متبدل جز ہیں۔ غیر متبدل اخلاقیات سے مراد دراصل انسان کے اندر موجود اُس فطری قوت کی طرف اشارہ ہے جو کسی بھی خارجی شعور کی محتاج نہیں یعنی وہ فی نفسہٖ ہے۔ اس قوت کے ہاں جو اَٹل اُصول پائے جاتے ہیں وہ دراصل روئے زمین پر موجود تمام انسانی معاشروں میں بلاکم وکاست یکساں ہیں۔ آج اِن اُصولوں کو جدید زبان (Golden Rules) یعنی سنہری اُصول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف تمام انسانی معاشروں میں یکساں ہیں بلکہ تمام مذاہب میں بھی یکسانیت و عالمگیریت لئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ فلاسفہ اور انبیاء کرام علیہم السلام نے اِسے مختلف اسلوب میں بیان کیا ہے لیکن اُصول وہی ایک ہی نوعیت کے ہیں۔

"دوسروں کو تکلیف نہ دو تاکہ دوسرے بھی تمہیں تکلیف نہ دیں"۔ (پیغمبرِ اسلام حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم)

"دوسروں کے لئے وہی کرو جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں"۔ (پیغمبرِ مسیحیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام)

"تم اپنے ہمسائے سے محبت کرو جیسا کہ تم اپنے آپ سے کرتے ہو"۔ (پیغمبرِ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام)

"یہ کام کا اُصول ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہ نہ کرو جو تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی کیا جائے"۔ (مہابھارت)

"جو تمہیں اپنے لئے پسند نہیں ہے وہ دوسروں کے لئے نہ چاہو"۔ (کنفیوشس)

انسانی اخلاقیات کے یہ بنیادی اور آفاقی اُصول دنیا کے تمام انسانوں میں بلا کسی معمولی تبدیلی کے مِن وعَن ایسے ہی پائے جاتے ہیں چنانچہ اِس میں انسانی شعور ابتدائے آفرینش سے کوئی داخلی یا خارجی ترمیم نہ کرسکا۔ ہم اِسے انسانی معاشرت کا مشترکہ شعور بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہر انسان پیدا ہوتے ہی یہ قوت لیکر پرورش پاتا ہے چاہے اُس کا تعلق کسی بھی خطے تہذیب یا دین سے ہو، اخلاقیات کا یہ بنیادی جز اُس کے ہاں ایسے ہی اٹل اور مصمم رہتا ہے۔

اخلاقیات کا تعلق چونکہ انسان کے رویہ سے ہوتا ہے تو یہ بنیادی قوت انسان کے رویہ میں پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ "فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا"۔ یعنی نیکی اور برائی کا شعور خدا نے انسان کو الہام کردیا ہے۔ پس کسی بھی معاشرتی دباؤ، طبقاتی ناہمواری، شعور سے دوری یا شعور کی بلندی اِس میں تبدیلی نہیں لاسکتی۔ یہ قوت نہ صرف اپنے ہونے کا ادراک پیدا کرلیتی ہے بلکہ معاشرے میں اس کی عملی شکل بھی رونما ہونے لگتی ہے چنانچہ بہت چھوٹی عمر میں انسان اس قوت کے زیرِ اثر آکر اپنے رویے میں بہتری کا خواہاں ہونے لگتا ہے۔ یہاں پر اگر والدین اور معاشرہ باشعور ہو تو انسان اخلاقیات کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔

انسانی نفس کی اَوج دراصل یہی ہے کہ انسان اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہو جائے یعنی وہ اپنے جیسے دوسرے انسان کی جان مال اور عزت کا محافظ بنا رہے۔

تہذیب النفس کا بہترین اور جامع مظہر یہی ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی جان مال اور عزت کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لے۔ اخلاقیات کے کل وجزاِسی ایک ضابطے میں سمٹ جاتے ہیں کیونکہ انسانی جان دراصل اس کا ظاہری وجود ہے۔ مال اس وجود کی محنت اور عزت اُس کی روح ہے۔ چنانچہ انسان کا کل وجز انہی تین عناصر میں مکمل ہو جاتا ہے۔ باقی کی جزیات انہی تین بنیادی عناصر سے مربوط ہیں۔ اگر کوئی انسان اپنے رویہ کو انہی سنہری اُصولوں کا پابند کر دے تو وہ تمام تر اخلاقی آلائشوں سے خود کو محفوظ کر کے تہذیب النفس کی اَوج پر پہنچ سکتا ہے۔ ہمارے ہاں جزیات پر تو توجہ دی جاتی ہے لیکن اخلاقیات کی مبادیات کو ہم یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے اخلاقیات کی مبادیات کا ادراک حاصل کر کے ان پر توجہ دے کر عمل شروع کر دیں۔ تہذیب النفس کے لئے نفس کا کما حقہ ادراک اور اس کی تہذیب کے قواعد جاننا ہر خاص وعام کے لئے ضروری ہے۔ پس ان قواعد کو ریاست بنیادی تعلیمی نصاب میں شامل کر کے معاشرے میں اخلاقی تزئین کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مذہبی قوانین اور ریاست

روزنامہ پاکستان 23جون 2016

یہ بات انتہائی قابل غور ہے کہ آخر مذہب اور دین میں کوئی فرق ہے بھی یا نہیں؟ تو اِس سوال کا سادہ جواب یہ ہے کہ مذہب اور دین میں جوہری فرق ہے۔قرآن میں اصطلاح دین استعمال ہوئی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔"اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ "۔یعنی اللہ کے نزدیک دین تو بس اسلام ہی ہے۔پس اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اور اس کا حتمی مآخذ قرآن اور صحیح حدیث ہے۔

مذہب کا تعلق عقائد اور میٹا فزیکل پیراڈائم سے ہوتا ہے جبکہ دین دنیاوی زندگی سے فلاح کا ضامن ہوتا ہوا آگے کو بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ دین میں دنیاوی زندگی کی کامیابی ہی دراصل اخروی زندگی کی کامیابیوں سے مشروط کر دی جاتی ہے۔جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے"اللھم ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ، وفی الآخرۃ حسنۃ۔ذرا غور کیجئے احباب سب سے پہلی کامیابی دنیاوی زندگی کی سکھائی جارہی ہے۔پس ضروری ہے کہ مذہب اور دین میں فرق روا رکھا جائے تاکہ آگے کی منزل آسان ہوجائے۔

مذہب خالص انفرادی رسومات اور خشک عقائد سے متعلق ہوتا ہے جس میں انسانیت کیلئے کوئی منظم فلاحی پروگرام نہیں ہوتا بلکہ اپنی ذات کی بہتری یا زیادہ سے زیادہ اخلاقی تربیت کے ضوابط دیئے جاتے ہیں۔مطلب اپنا آپ بخشواؤ اور چلتے بنو جبکہ دین معاش سے لیکر معاشرت کے تمام پہلوؤں کو سدھارنے اور اُن میں ہمہ جہت بہتری کے احکامات صادر کرتا ہے کیونکہ جو دنیا میں کامیاب وہی آخرت میں بھی کامیاب اور جو کوئی دنیا میں خوار اُس کا آخرت میں بھی رسوا ہونا لازم ہوجاتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔" وَمَنۡ کَانَ فِیۡ ھٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی "۔یعنی جو اِس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔

پاکستان کے ساتھ ایک بنیادی المیہ یہ ہوا کہ اسے بنانے والا زیادہ تر دیر تک بقیدِ حیات نہ رہ سکا۔نہیں تو آج پاکستان کی صورت حال کچھ اور ہوتی۔قائداعظم محمد علی جناح جو ایک آزاد منش اور درویش صفت انسان تھے نے زمین کے ٹکڑے کا مطالبہ ہی اِسی لئے کیا تھا کہ اِس میں خالص قرآنی اُصول وقوانین نافذ کرکے صدرِ اوّل کے اسلام کو نافذ کیا جاسکے۔

مگر افسوس کہ مُلّا نے پاکستان کی نظریاتی اساس ہائی جیک کر کے نظریہ پاکستان ہی بدل ڈالا۔مذہب کیلئے کسی مملکت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ مذہبی ریاست میں اقتدار مذہبی پیشوائیت کے پاس ہوتا ہے جبکہ دین کے نفاذ کیلئے ریاست کا ہونا بنیادی شرط ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جس کی بنیاد پر قیامِ پاکستان کی جدو جہد عمل میں لائی گئی۔آج کسی میں اتنی ہمت ہے کہ وہ کسی مولوی کو گریبان سے پکڑ کر کہے کہ آج کس منہ سے پاکستان کے سیاہ وسفید کے مالک بنے بیٹھے ہو جبکہ قیام پاکستان میں ہر ممکنہ رکاوٹ تمہی لوگوں نے پیدا کی؟۔

اِنہی لوگوں نے بانی پاکستان اور آپ کے رفقائے عظام پر ملامت و اِستہزاء کے پہاڑ گرائے لیکن آج چونکہ یہ لوگ ریاست پر فکری و اخلاقی ہر دو لحاظ سے قابض ہو چکے ہیں۔ریاست میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکے ہیں لہٰذا اِن کے خلاف بات کرنا ہی زندگی سے محرومی کے مترادف ہے۔بھٹو نے مولوی کو پارلیمنٹ کی راہ دکھا کر نہ صرف پاکستان میں ہر قسم کی بہتری کو روند ڈالا بلکہ اپنی موت کے پروانے پر بھی دستخط کر دیئے۔

قائد اعظم جس تھیوکریسی سے اِس ریاست کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے بھٹو مرحوم نے اپنے سیاسی مفادات کی خاطر مولوی کے طفیل ریاست کو اسی تھیوکریسی کے سپرد کر دیا اور ریاست کی آئین سازی مولوی کے رحم و کرم پر چھوڑ دی۔وائے شومئ قسمت کہ جناح کے پاکستان کی قانون سازی مولویوں کے ہاتھوں ہوئی اور قانون سازی بھی بالکل روایتی منہج کے مطابق یعنی فقہی قوانین کو آئین پاکستان کا درجہ دے دیا گیا۔

اس کے بعد پھر وہی ہوا جو ایک مذہبی ریاست میں ہوتا ہے۔بھٹو سیاسی طور پر کمزور ہوا تو جنرل ضیاء الحق نظمِ اجتماعی پر چڑھ دوڑا،صرف اتنا نہیں بلکہ بزعم خویش اسلام کا سپاہی بھی بن بیٹھا۔سو کسی کی کیا مجال جو چوں چرا کرتا۔مولویوں کو جمع کر کے اُنہوں نے مذہبی قوانین کے انبار لگا دیئے اور پھر ایسی مضحکہ خیز قانون سازی ہوئی کہ جو خدائی قانون کے کسی بھی اُصول پر پورا نہیں اُترتی۔وہ ریاست جس میں ستانوے فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے وہاں اہانتِ مذہب کے قوانین مرتب کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟۔بھلا کسی نامراد مسلمان سے اِس قبیح اَمر کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک مذہبی ریاست میں رہتے ہوئے پیغمبرِ اسلام یا دیگر مسلمہ اسلامی شعائر کی توہین کرے گا؟ مگر پھر بھی اہانتِ مذہب کے قوانین بنائے گئے چونکہ قوانین بن گئے تھے اِس لئے ان کا استعمال بھی تو کیا جانا چاہئے تھا۔پس اہلِ اسلام نے اُن قوانین کو اپنے مفادات کی تکمیل کی خاطر خوب استعمال کیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔

نیت پر شک کرنا میرا وتیرہ نہیں رہا۔عین ممکن ہے کہ جنرل ضیاء الحق پاکستان کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہوں لیکن پھر بھی اِس جدو جہد کو عمل میں لانے سے پہلے کیا جنرل ضیاء الحق نے بانی پاکستان کے نظریاتی پروگرام کا ایک بار بھی جائزہ لیا تھا؟۔ ہر گز نہیں ۔ پاکستان کس بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔قائد اور اقبال کی تمنا کیا تھی؟۔

غور کیجئے گا احباب ہند کے مولوی سے بانی پاکستان کا بنیادی اختلاف ہی اسی نکتہ پر تھا کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے ایک کامل اسلامی ریاست وجود میں نہیں لائی جاسکتی جبکہ مولوی بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ مسلمان ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت ہیں اور ہم متحدہ ہندوستان میں اپنا ملی اور اسلامی تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں ۔لیکن بات صرف ملی یا اسلامی تشخص کی نہیں تھی اصل بات تو اسلامی ریاست قائم کرنا تھی جس کا قیام متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے ممکن نہیں تھا۔آج تک دنیا حیران ہے کہ اتنے سالوں بعد بھی پاکستان آخر ترقی کیوں نہیں کر رہا حالانکہ ہم سے کل کا ٹوٹا بنگلہ دیش جسے ٹوٹا کہنا مناسب بھی نہیں بلکہ توڑ دیا گیا کہنا زیادہ بہتر ہے آج ایک منظم ریاست کی شکل اختیار کر چکا ہے اور ہندوستان کی تو بات ہی رہنے دیجئے ۔

آخر کیوں ہم ہر آئے دن تنزلی کی گہری کھائی میں گرتے چلے جا رہے ہیں؟۔اِس کی وجہ صرف ایک ہے کہ ہم نے پاکستان کی نظریاتی اَساس ہی بدل ڈالی ۔ ہم نے قائد اعظم کی جدوجہد اور اقبال کی فکر کو فراموش کر ڈالا۔ہمیں اپنے اصل کی جانب لوٹنا ہوگا۔اپنے آئین کو عباسی فقہاء کی آراء سے ہٹا کر خالص قرآنی طبع میں ڈھالنا ہوگا۔ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کافر وہ نہیں جو مذہبی رسومات سے آزاد ہیں یا پھر کسی مذہبی فرقہ سے متعلق نہیں بلکہ اصل کافر وہ ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ۔ارشاد ہے۔" وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ " یعنی اور جو اللہ نے نازل کیا ہے اُس کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہی لوگ کافر ہیں ۔آیئے ذرا ہم اپنے آس پاس کا جائزہ لیں کہ کون ہیں وہ لوگ جو اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کر رہے ۔

☆☆☆☆☆☆☆

اسلام اور مذہبی رسومات

روزنامہ پاکستان 16 جون 2016

دنیا کے تمام مذاہب میں عقائد کے لحاظ سے نافہمیدہ غیر مرئی قوتوں کا لاشعوری خوف ضرور پایا جاتا ہے اور یہ خوف انسان کو اُن غیر مرئی قوتوں کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہودی خدا کے حضور اپنے بچے قربان کر دیا کرتے بالکل یہی صورتحال قدیم سمیریوں، بابلیوں اور فنیقیوں میں بھی موجود تھی جبکہ ہندی تہذیب میں بھی بلی اور بھینٹ کی رسومات آج بھی موجود ہیں۔ یہودیت میں جب مذہبی پیشوائیت نے عوام پر مذہبی رسومات کی آڑ لے کر ظلم و وحشت کی انتہاء کر دی تو اِس کی اصلاح کیلئے حضرت مسیح علیہ السلام کھڑے ہوئے۔ آپ نے یہودی احبار و رہبان کی مذہبی دہشت سے عوام کو نجات دلائی۔ آپ نے یہودی مذہبی عقائد کا قلع قمع کر کے عوام کیلئے اپنا آپ بطورِ ایک مصلح کے پیش کیا اور ایثار کے آخری درجے پر پہنچ کر اپنی انبیائی و معاشرتی ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے۔

اہلِ مسیح جب حضرت مسیح کے آفاقی انسان پرستی کے پیام کو بھلا کر یہودیوں کی طرح خود احبار و رہبان بن بیٹھے تو حضرت ابراہیم کے فرزند حضرت اسماعیل کی اولاد میں حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ اَرفع ہوئی۔ آپ نے بھی اپنے پیش رو نفوسِ مقدسہ کی طرح معاشرتی اصلاح کی کوشش کی۔ یاد رکھئے اسلام اپنی حقیقی شکل میں کوئی مذہب نہیں ہے۔ اسلام اگر کوئی مذہب ہوتا تو اہلِ قریش جو پہلے ہی سے مذہب کے رسیا تھے کبھی آپ کی دعوتِ حق کو نہ ٹھکراتے۔ اسلام تو ایک معاشرتی فلاحی تحریک تھی۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے دنیا میں پہلی بار ویلفیئر سٹیٹ کا تصور پیش کیا چنانچہ اِسی ویلفیئر سٹیٹ کی خاطر محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کر کے ایک نئی ریاست مدینہ قائم کرنا پڑی کہ مکہ میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔ یعنی یہ اللہ کی طرف سے ایک اصلاحی معاشرتی اسکیم تھی۔

عرب معاشرے میں معاشی اور طبقاتی ناہمواریاں دور کرنے کی خاطر آپ نے بہ نفسِ نفیس ستائیس جنگیں لڑیں تاکہ معاشرے میں ہر قسم کی طبقاتی تفریق کا خاتمہ کر کے مستقل امن و سلامتی قائم کر لی جائے۔ چنانچہ قرآن میں اصطلاح مومن بھی اُنہی غیور نفوس کیلئے استعمال کی گئی جو آپ کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے رہے۔ آپ طویل صبر آزما اور اذیت ناک جدوجہد کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور رہتی دنیا تک انسانیت کو قرآن کی شکل میں ابدی انتظامی معاشرتی

اُصول مرحمت فرما گئے ۔آئیے اب یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تحریکِ اسلام مذہبی رسومات کی شکل میں کب ڈھالی گئی اور کب اسلام ایک دین کی حیثیت سے غیر مؤثر ہوا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی مذہبی رسم خالص انفرادی نوعیت کی ہوتی ہے اس میں اجتماعیت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا جبکہ دین یا اصلاحی تحریکیں ایک اجتماعی نظریہ پر مبنی ہوتی ہیں ۔جیسے قرآن میں ہے "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً" ذرا غور کیجئے احباب لفظ اُمت کے آگے الناس ہے اور الناس سے مراد تمام انسانیت ہے ۔اِس میں کوئی تخصیص موجود نہیں ۔اَموی سلاطین جنہوں نے خلافت کا خاتمہ کر کے اسلام کو انتقالِ اقتدار کا وسیلہ بنایا، اِنہیں اور عباسیوں کو خلفاء کہنا ہی خلافت کی روح کے منافی ہے ۔خلافت کا کامل حق آپ کے رفقائے عظام حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے اَدا کیا۔اَمویوں کو چونکہ اقتدار سے مطلب تھا اِس لئے اُنہوں نے تخت پر بیٹھنا ہی مناسب سمجھا۔چونکہ یہ لوگ زبردستی اقتدار تک پہنچے تھے اِس لئے اِن میں ایک آدھ سلاطین کو چھوڑ کر باقی تمام سلاطین تقویٰ اور عدل سے کوسوں دور تھے ۔

عوام چونکہ عدلِ فاروقی کے رسیا ہو چکے تھے اِس لئے اُن کیلئے اَمویوں کا جور و استبداد ایک اذیت ناک تبدیلی کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن یہ ایک فطری اُصول ہے کہ انسان ظلم کے آگے بے بس ہی ہو جاتا ہے ۔اِس لئے وہ حالات کا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنے اندر لچک پیدا کر کے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے ۔اَمویوں نے ظلم وستم کی انتہاء کر دی ۔آپ اگر اسلامی تاریخ کے ادنیٰ سے بھی طالب علم ہیں تو آپ یقیناً جانتے ہونگے کہ اَمویوں کے دور میں وحشت کس انتہاء کو پہنچ گئی تھی ۔

امام ابو حنیفہ جیسے جلیل القدر عالم کو زدوکوب کیا گیا اور سالوں قید و بند میں رکھا گیا جبکہ اِس سے قبل کربلا کی زمین پر اَولادِ رسول کا بہیمانہ قتل عام کرنے والے، خانہ کعبہ پر سنگ باری کر کے غلاف کعبہ جلانے والے، مکہ اور مدینہ کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہانے والے اور اسلام کا حُلیہ بگاڑ کر رکھنے والے اَموی ہی تھے ۔پس اَموی دور میں اسلام کی محمدی شکل بالکل مسخ ہو کر رہ گئی تھی ۔

اِس کے بعد اَمویوں پر عباسی چڑھ دوڑے تو انہوں نے سرے سے اسلام کو مدینہ سے منتقل کر کے ایران پہنچا دیا۔ چونکہ وہ خود ایران میں مقیم تھے اس لئے انہوں نے نئے اسلام کی بنیاد بھی ایران میں ہی رکھی ۔ذرا اندازہ لگائیے احباب کہ سینتیس کے سینتیس عباسی سلاطین ایرانی لونڈیوں کی اولاد تھے ۔

چنانچہ ایسے میں محمدی اسلام کے احیاء کی توقع رکھنا کس قدر عبث معلوم ہوتا ہے۔ پس وہی ہوا جو ہونا تھا۔ عباسی سلاطین کو اپنے پیشرو اُمویوں کی طرح محض اقتدار سے مطلب تھا سو انہوں نے بھی اقتدار کو تھام کے رکھا۔ یہی وہ دور تھا جب ایرانی علماء کی مدد سے اسلام اور بالخصوص قرآن کے حقیقی معانی ومفاہیم بدلے گئے۔ چنانچہ اسلام کے مرکزی قانون الصلوٰۃ کو فارسی اصطلاح نماز میں بدل دیا گیا۔ معاشرے کی مستقل پرورش کو ڈھائی فیصد کی بھیک میں تبدیل کر دیا گیا۔ عسکری تربیت الصیام کو فارسی کی اصطلاح روزہ میں تبدیل کر دیا گیا اور دنیا میں تحریک اِسلام کی منطقی حجت قائم کرنے کیلئے فریضہ حج کو ایک روحانی سیاحت میں بدل دیا گیا۔

ذرا غور کیجئے احباب قرآن کی آفاقی اُصولی اصطلاحات کے معانی اور مطالب مرتب کرنے والے بھی ایک عباسی معتمد ایرانی الاصل راغب اصفہانی تھے جن کی معروف قرآنی لغت مفردات القرآن آج بھی دنیا میں مصفہ الاستناد سمجھی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اوّلین سیرت نگار ابن اسحاق، ابن ہشام، مستند مورخ ابن جریر طبری، مستند مفسرین قرآن فخر الدین رازی، محمود زمخشری، احادیث کے مستند مرتبین بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداوٗد، احمد نسائی اور ابن ماجہ، حاکم نیشاپوری سب کے سب ایرانی تھے۔ عباسی سلاطین کی نظریاتی وحشت بعض اوقات عروج پر پہنچ جاتی۔

پس وہ ریاست میں زبردستی اپنے نظریات نافذ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مامون الرشید کی نظریاتی وحشت اِس ضمن میں ہمیشہ ہمیں اسلام کا ایرانی تسلط یاد دلاتی رہے گی۔ امام ابوحنیفہ کی طرح عباسی دور میں امام احمد بن حنبل کو بھی نہ بخشا گیا اور سرِعام زدوکوب کیا گیا۔ عباسیوں نے اسلام کو مذہب بنا کر عوام کو مفتیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر یہودیت اور مسیحیت کی طرح اسلام میں بھی احبار ورہبان کا تسلط قائم کر دیا اور خود تخت پر خدا کا سایہ بن کر بیٹھ گئے۔ پس حق بزورِ قوت باطل کر دیا گیا اور باطل کو جبراً دوام دے دیا گیا مگر باطل ہمیشہ سے حق کے مقابلے میں پسپا ہوا۔

اُمویوں اور عباسیوں نے اسلام کی آفاقی تحریک کو چند مذہبی رسومات میں بدل کر آج باطل کو یہ موقع دے دیا کہ وہ خدا کے قانون کے مقابلے میں اپنے قوانین وضع کر کے انسانیت کو اپنا فکری اور معاشی غلام بنا کے رکھے۔ یہ باطل قرآن کی زبان میں طاغوت ہے اور جو انسانیت پر ظلم وستم کا حتمی استعارہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ "وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَن يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ" ۔ یعنی جن لوگوں نے طاغوت (ظلم وستم) کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔ اُن کے لیے خوشخبری ہے۔ پس (اے نبیؐ)

بشارت دے دو میرے اُن بندوں کو۔طاغوت دراصل خدا کے نظام کے مخالف ایک متوازی معاشرتی نظام ہے جس کی بنیاد ظلم و جبر پر قائم ہوتی ہے چنانچہ مذہبی پیشوائیت، ملوکیت، سلطانیت، آمریت، پاپائیت، سرمایہ دارانہ نظام اور نام نہاد جمہوریت وغیرہ تمام تر طاغوتی نظام ہیں اور جس میں صرف غریب اور بے بس ہی پستا ہے۔

اسلام فی الاصل ظلم پر مبنی ایسے تمام نظام ہائے زندگی کو مسترد کرتا ہے اور خدائی بصیرت جو انسانی شعور کی مشترکہ میراث ہے کی بنیاد پر معاشرتی نظام قائم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ وہ دن دور نہیں جب اصل اسلام کا بول بالا ہوگا اور انشاءاللہ یہیں سے ہوگا۔ اِسی خطے سے جس کو سر سید احمد خان نے قرآنی فکر سے سیراب کیا۔جس کو قائداعظم محمد علی جناح نے وجود بخشا اور جس کی تمنا ڈاکٹر علامہ محمد اقبال جیسے درویش نے کی۔

☆☆☆☆☆☆☆

مذہبی تجارت اور ہمارا میڈیا

روزنامہ پاکستان 09 جون 2016

یہ میرے جنون کا ہی نتیجہ تھا کہ میٹرک کے فوری بعد مجھے ایک معروف مقامی اخبار میں بحیثیت رپورٹر کے خدمت کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ زمانہ حفظِ مراتب کا تھا۔ کچھ اُصول اور آدرش اُس وقت تابندہ تھے۔ اخبار کا نمائندہ اُن دنوں بہت وقعت رکھتا تھا گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج جو وقعت ایک اخبار کے مدیر کی ہے اُن دنوں ایسی وقعت ایک رپورٹر کی ہوا کرتی۔

میرا یہ حال تھا کہ صبح کالج، ظہر سے شام تک دینی مدرسہ اور شام سے رات بارہ بجے تک صحافت کا ہوا کرتا۔ صبح کالج میں وقت ملتے ہی اپنے علاقہ کی چند گرما گرم خبریں کاغذ کے ایک طرف لکھ کر مُہر لگا دیتا۔ پھر شام سے پہلے پہلے ادارے کو فیکس کر دیتا۔ اُس وقت بعض ہنگامی خبروں کیلئے ہمیں گاؤں سے شہر سفر بھی کرنا پڑ جاتا۔ میں چونکہ ایک دینی مدرسہ کا باقاعدہ طالب علم تھا اِس لئے مدرسہ ہی کے ہمارے اُستاد اور جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دستِ راست مرحوم سینٹر مولانا قاضی عبداللطیف کلاچوی صاحب اکثر مجھے خبریں لکھوا دیتے۔ لیکن پھر دوسرے دن بُلا کر ڈانٹ دیتے کہ خبر اخبار میں کیوں شائع نہیں ہوئی۔ تب مسکراتے ہوئے میرا ایک ہی جواب ہوتا کہ اُستاد جی اخبار میں خبریں شائع ہوتی ہیں خطبے نہیں۔ جواب میں اُستاد مرحوم ایک معنیٰ خیز قہقہہ لگا دیتے۔ اِس طرح کا سپاٹ جواب دینا اُس وقت کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُن دنوں صحافت اپنی مخصوص حدود میں مزین تھی۔

جب تک خبر فی نفسہٖ خبر کے دائرے میں نہ آتی نیوز ایڈیٹر اُسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا مگر افسوس کہ آج ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا کیونکہ آج صحافت میں ہر طرح کی ملاوٹ کی جا چکی ہے۔ چنانچہ آج صحافت مذہبی سورماؤں کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہے۔

رمضان شروع ہو چکا ہے اور آجکل ہر چینل پر کوئی نہ کوئی رمضانی مولوی وعظ کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ پرنٹ میڈیا میں مذہبی ایڈیشن کے علاوہ کسی بھی مولوی کی کوئی بھی تقریر یا خطبہ شائع نہ کیا جاتا اور آج اخبار تو درکنار چینلز بھی مخصوص مذہبی اداروں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

مولوی کیلئے مفت کی پروپیگنڈہ مشینری لاؤڈ سپیکر کم تھی جو اب سکرین پر بھی قبضہ کر چکا ہے۔اَموی اور عباسی دور میں جب اسلام باقاعدہ ایک مذہب بنا تو عوام کو فقہاء کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ورنہ خلفائے رسول کے دور میں مُلاّ انسٹی ٹیوشن کا کوئی وجود تک نہیں تھا۔اہلِ اَمر بذاتِ خود اہلِ اسلام کی فکری و اخلاقی تربیت کیا کرتے۔مطلب حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے کوئی مفتی یا فقیہہ نہیں رکھے ہوئے تھے۔البتہ بعد میں اَمویوں نے بزورِ شمشیر اقتدار پر قبضہ کر کے اسلام مفتی کے سپرد کر کے عوام کو آج تک مولوی کا محتاج بنا دیا۔افسوس قرآن جن احبار و رہبان کا خاتمہ کرنے آیا تھا اُسی قرآن کے ماننے والے خود احبار و رہبان بن بیٹھے۔کوئی بھی چینل لگا کر دیکھ لیں کوئی نہ کوئی روایتی مُلاّ یا پھر فیشنی مُلاّ جس نے چہرے پر کاسمیٹیکل نور کی دبیز تہہ چڑھائی ہوئی ہو گی کسی مذہبی مسئلہ پر بات کر رہا ہو گا۔ریٹنگز اور بزنس کلیکشن کی خاطر صحافت کو مذہبی جگاڑ بنا دیا گیا۔اُدھر دین پیشہ بن گیا تو اِدھر اعلیٰ ترین خدمت صحافت ایک پیشہ بن گئی۔

صحافت معاشرے کی سب سے اہم اور حساس ترین ذمہ داری ہے۔ یہ ایک بے لوث خدمت ہے۔ایک صحافی معاشرے کا معمار ہوتا ہے وہ عوام کی اخلاقی تربیت کرتا ہے۔جھوٹ منافقت اور دغابازی کے تمام پردوں کو چاک کر کے حق کا علم بلند کرتا ہے مگر کیا کیجئے صاحب کہ یہ لفافہ صحافت کا دور ہے۔

دنیا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی جا رہی ہے اور ہم وقت کو آگے دھکا دے کر خود پیچھے کا رخ کرتے جا رہے ہیں۔مذہبی رسومات کا تعلق ایک انسان کی انفرادی زندگی سے ہے گویا یہ انسان کی انفرادی روحانی آسودگی کے ذرائع ہیں چنانچہ ان معاملات کو کمرشلائز کر کے ہم صرف زیرک اذہان کو روحانیت سے برگشتہ کرتے جا رہے ہیں۔ ہماری نئی پود بھانت بھانت کی مذہبی بھول بھلیاں دیکھ کر سرے سے روحانی ضوابط سے ہی کنارہ کر رہی ہے اور اس ضمن میں ہمارا میڈیا برابر کا قصوروار ہے۔ملک میں اِس وقت صحافت بدترین کاروبار کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

ہماری عمومی ذہنی فضاء چونکہ مذہب پرستی میں مبتلا ہے اس لئے میڈیا مالکان اس ذہنی بوسیدگی کا استحصال کر کے اپنے کاروبار کو وسعت دینے میں مصروف ہیں۔بے شک کوئی دانشور یا مذہبی سکالر ہو یا نہ ہو خوبصورت مذہبی سیٹ لگا کر اُسے قیمتی صوفہ پر بٹھا کر عالم بنا ہی دیا جاتا ہے۔میں شخصیت پر تنقید سے حتی الوسع اعتناء برتتا ہوں مگر کیا ہم لوگ ان خدارسیدہ حضرات سے واقف نہیں ہیں جو پورا سال ڈسکو شو کر کے رمضان میں عالم دین بن جاتے ہیں۔کیا ہم میں اتنی بھی غیرتِ ایمانی نہیں ہے کہ ہم ایسے ڈھکوسلہ باز لوگوں کو کان سے پکڑ کر سائیڈ پر کر دیں؟۔

چند ٹکوں کی خاطر ایک چینل سے دوسرے چینل پر پھدکنے والے حادثاتی دانشور کیا عوام کی نظروں سے اوجھل ہیں؟۔ اصل میں ہم خود اِس قدر بے حس اور ڈھیٹ بن چکے ہیں کہ ہمیں اب کچھ بھی غلط نہیں نظر آتا۔مخصوص جسمانی حرکات کے ذریعے دقیق مذہبی مسائل بیان کرنے والوں کی ذرا تنخواہوں پر نظر دوڑا لیں تو بندے کی سیٹی گم جاتی ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی بات تو کافی پرانی ہو چکی۔ اب کھیل کروڑوں کا ہے۔میڈیا ہاؤسز سے ایک ماہ میں کروڑوں روپے بٹورنے والے سحر و افطار میں خدا خوفی اور قناعت کی ایسی دل خراش اداکاری کرتے ہیں کہ بندہ ایک دم سکتے میں پڑ جاتا ہے کہ سکرین پر نظر آنے والے علامہ صاحب کے گھر میں تو تین دن سے چولہا نہیں جلا ہو گا۔

بے حیائی کی بھی حدود ہوتی ہیں مگر ہمارے ہاں یہ لامحدود سطح پر پائی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک طویل عرصے سے ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔رمضان میں تو خیر رمضانی دانشوروں کی بھرمار ہوتی ہے عام دنوں میں بھی پاکستانی ٹی وی چینلز سے دور ہی رہتا ہوں۔ ہر ماہ چھ چینلز لاؤنچ ہو رہے ہیں مگر معیار ہے نہ ہی احساسِ ذمہ داری اور ذہانت کا تو رہنے ہی دیجئے کہ ہمارے ہاں چٹی چمڑی ذہانت کا حتمی معیار بن چکی ہے۔

کوئی بھی نیوز چینل لگا کر دیکھ لیں کوئی نہ کوئی حسین دوشیزہ پرکشش لباس میں ملبوس چمکیلے سیٹ پر براجمان ہو گی اور اپنے مخصوص وِنگے دوہڑے انداز میں خبروں سے آگاہ کر رہی ہو گی۔گویا نیوز روم کسی فیشن شو سے کم نہیں لگتا اور بالکل یہی حال فصلی علامہ صاحبان کی نشست میں ہوتا ہے۔اینکرز کے کاسٹیومز تو بہت پرانی بات ہے اب تو مولوی اور علامہ صاحبان کے کاسٹیومز بھی موجود ہیں۔زرق برق لباس اور گہرے رنگ کی شفاف پگڑیاں اور ٹوپیاں سیٹ کے پیچھے درجنوں کی تعداد میں پڑی ہوتی ہیں اور ضرورت کے مطابق اُن کا استعمال عمل میں لایا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سیکولرازم، امپیئریالزم اور تھیوکریسی

روزنامہ پاکستان 02 جون2016

سیکولرازم جسے روایتی مُلّاانسٹی ٹیوشن نے لادینیت بنادیا ایک جدید انتظامی نظریہ ہے جس کے تحت مذہب کو ریاستی عمل دخل سے الگ کردیا جاتا ہے۔لادینیت کے لئے انگریزی زبان میں الگ سے ایک اصطلاح (Atheism) موجود ہے پس ہمارے ہاں ابتداء ہی سے سیکولرازم کا غلط ترجمہ کیا گیا۔اگر ہم اس کی اُردو میں موزوں تعبیر کریں تو ہم اسے خیارِ فکر کی اصطلاح سے تعبیر کرسکتے ہیں لیکن سیکولرازم کے معنیٰ لادینیت قطعاً نہیں کئے جاسکتے۔

قدیم زمانے میں انتقالِ اقتدار کا کوئی مناسب اور جائز وسیلہ وضع نہیں ہوا تھا چنانچہ جس کے پاس طاقت ہوتی وہ دھڑلے سے اقتدار پر قابض ہوجاتا۔اِسے انگریزی زبان میں Imperialism یعنی ملوکیت کہا جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ مذہب کے وسیلے سے لوگوں پر حکمرانی کی جاتی یعنی عوام کو یہ باور کرایا جاتا کہ ریاست کے حل وعقد خدا کے خاص بندے ہیں اور وہ خدائی مشن پورا کرنے کیلئے حکومت کررہے ہیں۔ایسے نظمِ اجتماعی کو انگریزی زبان میں Theocracy کہا جاتا ہے۔ہم اگر اپنے دورِ ملوکیت کو دیکھیں تو امپیئریالزم اور تھیوکریسی اُموی دور میں شروع ہوتے ہوئے عباسی دورِ حکومت میں عروج پر نظر آتی ہے۔اسلام میں امپیئریالزم یعنی ملوکیت کا سلسلہ حضرت عمرؓ کے دور میں بنائے گئے دمشق کے گورنر معاویہ بن ابوسفیان نے شروع کیا۔آپ نے اپنے بعد حکومت کی باگ دوڑ اپنے فرزند یزید کے سپرد کرکے اسلام میں ملوکیت اور تھیوکریسی کا آغاز کردیا۔

تھیوکریسی جسے ہم اُردو میں شریعت کی اصطلاح سے تعبیر کرسکتے ہیں، دراصل اُن قوانین کے مجموعہ کو کہتے ہیں جن کا تعلق عوام کی انفرادی زندگی سے ہوتا ہے۔یہ قوانین اربابِ حل وعقد کیلئے غیر موثر ہوجاتے ہیں۔تھیوکریسی میں مذہبی قوانین سلاطین کی خواہشات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں اور مذہبی پیشوا عوام کو یہی سمجھاتے رہتے ہیں کہ سلاطین زمین پر خدا کے نائب ہیں اس لئے انہیں کچھ بھی کرنے کا حق حاصل ہے۔چنانچہ عباسی دور میں وضع کئے گئے خطبہ کو آج بھی ہمارا روایتی مُلّا دھڑلے سے منبر پر رٹ رہا ہوتا ہے کہ" السلطان ظل اللہ من اھانہ اھان اللہ" سلطان زمین پر اللہ کا سایہ ہے جس نے سلطان کی توہین کی اُس نے اللہ کی توہین کی۔

اب عقل کے اندھوں سے کوئی پوچھے کہ آج زمانۂ جمہور میں آپ یہ کس سلطان کی مدح سرائی میں مشغول ہیں؟۔ ہر امپیئریل سٹیٹ میں تھیوکریسی لابدی ہے گویا ملوکیت کے ساتھ شریعت کا نفاذ لازم ہو جاتا ہے۔ سلطان عوام کے وجود پر حکومت کرتا ہے تو فقیہہ عوام کے ذہن پر پس یہ دونوں مل کر عوام کا خون چوستے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کی زیادہ تر ریاستیں ایسے ہی نظمِ اجتماعی کے تحت چل رہی ہیں جہاں سلطان اور مذہبی پیشوا عوام پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں۔

اگر ہم اپنے ملک کی بات کریں تو تحریک پاکستان سیکولرازم، امپیئریالزم اور تھیوکریسی کے خاتمے کی جدو جہد کا نام تھا۔ بانی پاکستان اکثر و بیشتر یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں مغربی اقدار اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس ابدی اُصولوں کا مجموعہ قرآن موجود ہے۔ پس ہمارا دستور قرآن ہی سے مرتب ہوگا۔ اِسی طرح آپ نے تھیوکریسی کی مخالفت بھی کی کہ ہم کوئی تھیوکریٹک سٹیٹ نہیں بنانے جا رہے اور یہ نکتہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہند کی تمام مذہبی جماعتیں بانی پاکستان اور تحریک پاکستان کی سخت مخالف تھیں تو پھر تھیوکریٹک سٹیٹ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ پاکستان کا وجود صدرِاوّل کے اسلامی اُصولوں کی بنیاد پر قائم ہوا۔ ایک سیکولر سٹیٹ میں ہمیشہ انسانوں کی حکومت ہوتی ہے جہاں پر قوانین انسانوں کی مرضی سے بنتے ہیں۔ دین کو ریاست سے الگ کر لینے سے قانون انسانی خواہشات کے تابع ہو جاتا ہے اور انسانی خواہشات کبھی راستی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے کہ خواہش اُصول بن جائے تو انسان ہوائے نفس کا شکار ہو جاتا ہے اور جہاں پر جائز اور ناجائز، صحیح اور غلط اپنی حتمی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہر وہ عمل جو انسانی نفس کو گمراہ کرے جائز بن جاتا ہے۔

یہ مطلق آزادی ایک زبردست روحانی اذیت اور تباہ کن گمراہی پر منتج ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بہترین انتظامی، سماجی اور معاشی اصول فراہم کرتا ہے۔ یہ وہ اُصول ہیں جن کی بدولت دورِ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں نافذ ہوئے اور سیاست و حکومت کی ایسی فقید النظیر تاریخ رقم کر دی کہ رہتی دنیا تک اِس کی مثال ممکن نہیں۔ واضح رہے کہ اسلام دورِ اُموی اور بالخصوص عباسی دور میں مذہب بنا اور اصل اسلام کا پورا نقشہ ہی بدل دیا گیا۔ چنانچہ صدرِ اوّل کے اسلام اور اُموی و عباسی اسلام میں جوہری فرق پایا جاتا ہے۔ اسلام کی عظمت اور رفعت یہی تھی کہ یہ کوئی وراثتی مذہب یا محض اصلاحی تحریک نہیں تھی بلکہ یہ نظمِ اجتماعی کا وہ شاندار اور بے مثال ماڈل تھا جس کو بعد میں اُموی اور عباسی سلاطین نے من پسند روایات سے شریعت بنا کر محض انفرادیت تک

محدود کر دیا تاکہ ریاست کے انتظامی اُمور سلاطین اپنی مرضی سے مرتب کر سکیں۔ جب فقیہ نے کہا کہ اسلام مذہبی رسومات کا نام ہے تو پھر کوئی بھی مردِ مجاہد اِس نئے اسلام کے خلاف کھڑا ہونے کی ہمت نہ کر سکا۔ پس اِسی اسلام کو شریعت بنا کر انتظامی اُمور سے منہا کر دیا گیا۔

اُصول کچھ ایسے بنے کہ انتقالِ اقتدار محض قوت کی بنیاد پر حاصل کیا جانے لگا چنانچہ جس کے پاس قوت ہوتی وہ اقتدار پر قابض ہو جاتا نہ صرف یہاں تک بلکہ پھر آگے سے اس کی نسل یونہی اقتدار کی والی ٹھہری رہتی۔ پس یہ بدترین امپیئر یالزم تھی جبکہ اس کے ساتھ ساتھ شریعت بھی وضع کی جاتی رہی۔

ہر فقیہ وِقت نے اپنے دور کے سلطان کی مرضی و منشاء کے مطابق شرعی قوانین مرتب کر کے اِسے اسلام کا نام دے کر عوام کو مذہبی رسومات میں مصروف رکھا اور اِس کا براہ راست فائدہ سلاطین کو ہوا۔ پس یہ بدترین تھیوکریسی تھی۔ وہ اسلامی ریاست جس کی بنیاد تقویٰ اور عدل پر قائم تھی جابر سلاطین کے تسلط میں آ کر دیگر مروجہ مذاہب کی طرح محض ایک مذہب کی شکل اختیار کر چکی۔ تمام قرآنی اُصولوں کو سلاطین کی منشاء کے مطابق ڈال کر ان کی لفظی اور معنوی تاویل کی گئی۔ عربی چونکہ ایک وسیع المطالب زبان تھی اِس لئے فقہائے سلاطین قرآنی اُصولوں کے من پسند اور ضرورت کے مطابق تراجم کرتے گئے چنانچہ تقویٰ کا ترجمہ محض خدا کا خوف کر دیا گیا تاکہ عوام پر سلاطین کا مذہبی تسلط قائم رہے جبکہ عدل کو سلطان کی خواہش سے متعلق کر دیا گیا۔

معاملہ کچھ یوں ہوا کہ جو شخص نماز روزہ اور دیگر مذہبی رسومات سے پہلوتہی کرتا تو وہ تقویٰ سے انحراف کا مرتکب ہو جاتا اِسی طرح جو شخص فقہاء کے بنائے گئے قوانین کی تابعداری نہ کرتا تو وہ ظالم کہلاتا۔ بالکل یہی صورت آج بھی جاری وساری ہے۔ اِس کے برعکس صدرِ اوّل میں تقویٰ سے مراد یہ تھی کہ دوسرے انسان کے معاملے میں خدا سے ڈرنا اور عدل سے مراد اہلِ اَمر کا رعایا اور اپنی ذات میں امتیاز مٹا کر عوام کو بنیادی ضروریات بہم پہنچانا۔

فرمایا اے بڑھیا! خدا آپ کے حال پر رحم کرے عمر کو کیا خبر کہ آپ کے ساتھ کیا بیت رہی ہے؟۔ عرض کیا۔ اگر عمر امیر المومنین ہو کر بھی میرے حال کی خبر نہیں رکھتے تو اُنہیں کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اہلِ اَمر بنیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

قیامِ پاکستان کی حقیقی جنگ

روزنامہ پاکستان 26 مئی 2016

بانی پاکستان جس قدر دلیر خوددار اور مخلص شخصیت تھے آپ کے بعد ریاست کے حل وعقد اُس قدر بے حس منافق اور بزدل واقع ہوئے۔گویا ہمارے ایک لیڈر کو بھی قائداعظم کے کردار کی ہوا تک نہ لگ سکی اور اِس سے زیادہ دکھ کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟۔ہمارا سنگین ترین المیہ یہ ہے کہ ابھی تک تحریکِ پاکستان کی مستند اور اصل حقائق پر مبنی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی جسے پڑھ کر ہماری نئی نسل بانی پاکستان اور آپ کے رفقاءعظام کے مصائب ومشکلات اور جدوجہد سے پوری طرح آگاہ ہوسکے۔

اصل میں ایسا اِس لئے بھی نہیں ہوا کہ قیامِ پاکستان کے فوری بعد بانی پاکستان کی موجوگی ہی میں اِس نوزائیدہ ریاست کی فوج بانی پاکستان کی اطاعت سے منکر ہوگئی۔چنانچہ جنرل گریسی کا کشمیر کے معاملے میں بانی پاکستان کے احکامات ماننے سے انکار اب کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہا۔بالکل وہی صورتحال بعد کے ادوار میں بھی جاری رہی اور آج بھی جاری ہے۔پس جس ریاست میں پانچ بار فوجی آمروں نے مارشل لاء اور آئین معطل کر کے ایمرجنسی لگائی ہو وہاں ایک زرخیز ذہن اور نڈر سیاسی رہنما کی پیدائش اور اصل حقائق پر مبنی تاریخ کا اہتمام بھلا کیونکر ممکن ہوسکتا تھا۔پاکستان کی ابتداء بانی پاکستان نے جس عزم واستقلال سے کی تھی یقین کیجئے بعد کے ادوار میں وہ عزم واستقلال کسی بھی سیاسی لیڈر میں نہیں دیکھا گیا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ بانی پاکستان کے بعد اِس ریاست کو کوئی سیاسی لیڈر نصیب ہی نہیں ہوا تو بے جا نہ ہوگا۔البتہ بانی پاکستان کے بعد ایک مخلص مدبر مگر فوجی آمریت کے پروردہ ذوالفقار علی بھٹو اِس قوم کو نصیب ہوا تھا جس کی گوناں گوں سیاسی غلطیاں اُسے لے ڈوبیں۔بھٹو نے فوجی آمریت کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کے ساتھ منافقانہ رویہ اختیار کر کے اور روایتی مُلّا کو پارلیمنٹ کی راہ دکھا کر اپنی تمام تر بے لوث سیاسی جدوجہد پر پانی پھیر دیا۔بھٹو نے اپنے سیاسی اقتدار کو دوام بخشنے کیلئے جو کہانی مُلّا کے ہاتھوں شروع کی تھی آپ ہی کے دست راست جنرل ضیاءالحق نے اس کو عروج پر پہنچا کر دم لیا۔عوام چونکہ مذہبی لیڈروں کے ہاتھوں فکری وسیاسی طور پر یرغمال بنے ہوئی تھی اِس لئے جنرل ضیاءالحق نے مذہبی پیادہ بن کر وزیر (مُلّا) کے ہاتھوں شہ کو مات دی اور پھر خود ہی شہ

کی جگہ لے لی۔ملکی سیاست میں فوج کا یہ انتہائی بھیمانہ اثر ورسوخ ہر دور میں انتہائی مکروہ رہا ہے۔ مجھے یہاں پر سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ایک بار فوجی آمر جنرل ایوب نے مودودی صاحب سے کہا کہ مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی کہ آخر اسلام کا سیاست سے کیا تعلق ہے؟۔جواب میں مودودی صاحب نے کہا کہ یہ تو آپ اکیلے کو سمجھ نہیں آ رہی کہ اسلام سے سیاست کا کیا تعلق ہے جبکہ یہاں تو پوری قوم کو سمجھ نہیں آرہی کہ فوج کا سیاست سے کیا تعلق ہے۔وہ لوگ جنہوں نے تحریکِ پاکستان اور بانی پاکستان کے راستے میں ہر ممکنہ رکاوٹ پیدا کی وہی لوگ آج پاکستان کے سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے۔تحریک پاکستان کی تمام تر جدو جہد کا ماحصل یہی تھا کہ کسی طریقے سے ہند کے مُلّا اور پنڈت سے نجات حاصل کر کے ایک الگ شفاف ریاست قائم کی جائے اور جہاں صدرِاوّل کے اسلامی اُصولوں کو نافذ کیا جاسکے۔پس یہی اصل مدعا تھا نظریہ پاکستان کا۔علاوہ ازیں وہ سب جھوٹ اور منافقت پر مبنی ہے جو آج مذہبی جماعتیں بڑی دیدہ دلیری سے عوامی جلسوں میں بیان کر رہی ہیں۔

پچھلے دنوں ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک عوامی جلسے کے دوران مولانا فضل الرحمن کی زبانِ اقدس سے یہ الفاظ سن کر میں سکتے میں پڑ گیا کہ ہم جمہوریت کو بچانا چاہتے ہیں اور جماعت اسلامی والے تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے کہ ہم قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔کیسی آخری درجے کی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہیں یہ لوگ۔ اصل میں سارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے عوام شعور سے نابلد ہیں۔کون بتائے اب اِن معصوم لوگوں کو کہ قیامِ پاکستان کی شدید ترین مخالفت اِنہی سیاسی پنڈتوں کے بزرگوں نے کی تھی جبکہ اِس کے برعکس ملک کا لبرل طبقہ یہ ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے کہ پاکستان ایک سیکولر سٹیٹ قائم کرنے کے لئے وجود میں لایا گیا حالانکہ ذراسی عقل استعمال کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اکھنڈ بھارت پہلے ہی سے ایک سیکولر سٹیٹ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔جمعیت علمائے ہند کے اکابر تو یہی کہہ رہے تھے کہ ہم سیکولرازم کے ذریعے متحدہ ہند میں پوری آزادی کے ساتھ اپنی شناخت اور سالمیت قائم رکھ سکتے ہیں بلکہ یہ سیکولرازم تو کانگریسی مولویوں کی بنیاد تھی چنانچہ یہ کہنا کہ پاکستان کا مطالبہ ایک سیکولر سٹیٹ کے لئے کیا گیا تھا صریح جھوٹ اور افتراء ہے۔تحریک پاکستان کی حقیقی جنگ ہی یہی تھی کہ ہم اہلِ اسلام ہیں اور ہماری بقاء قرآنی اُصولوں پر مبنی ایک الگ مملکت قائم کرنے میں ہے بلکہ یہی بات بانی پاکستان نے اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے ایک خطاب کے دوران کہی تھی۔واضح رہے کہ قرآنی اُصولوں کی بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست

ملوکی اور فقہی اسلام سے بالکل مختلف تھی ۔پس یہی تو وہ جنگ تھی کہ جس کی بنیاد پر بانی پاکستان پر کانگریسی مولویوں نے من گھڑت بہتان لگائے اور آپ پر ارتداد کے فتاویٰ تک جاری کئے ۔اگر بانی پاکستان نظریاتی طور پر ان کانگریسی مولویوں کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا اور پھر قیام پاکستان کا مطالبہ ہی سامنے نہ آتا ۔یہ الگ سٹیٹ کی جدو جہد دراصل زبردست نظریاتی اختلاف تھا جس کو کانگریسی مُلّا ذاتی عناد اور بہتان تراشی تک کھینچ لایا تھا۔
تاریخ شاہد ہے کہ بانی پاکستان نے کبھی اِن مولویوں کے خلاف کوئی ناروا بات نہیں کہی لیکن اِس کے برعکس مولویوں نے آخری دم تک نہ صرف قیام پاکستان کو گمراہ کن تحریک قرار دیا بلکہ مسلم لیگ میں شرکت اور بانی پاکستان کی حمایت کو کفر کے ارتکاب سے تشبیہ دی ۔بانی پاکستان کی دوررس نگاہ ایک جدید قوم کی تعمیر پر مرتکز تھی ۔وہ چاہتے تھے کہ ہم اُس اسلام کو زندہ کریں جو صدرِ اوّل میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ دنیا میں جلوہ گر ہوا۔وہ اسلام جو محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ظاہر ہو کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیاسی بصیرت اور اعلیٰ ترین عدل پر عروج کو پہنچا ۔چنانچہ جب ہم نظریہ پاکستان کی بات کرتے ہیں تو اِس سے مراد اُموی یا عباسی اسلام نہیں ہوتا بلکہ صدرِ اوّل کے اسلام کی طرف اشارہ ہوتا ہے ۔پاکستان کا مطالبہ کسی تھیوکریٹک سٹیٹ کے لئے نہیں کیا گیا تھا کہ جس میں مذہبی پیشوائیت بزعم خویش خدائی مشن کو پورا کرتی ہے بلکہ یہ وہ اسلام تھا جس میں کوئی انسان کسی پر حکومت نہیں کرسکتا۔جہاں قانون انسانی خواہشات پر مرتب نہیں ہوتے بلکہ قرآنی اُصولوں کی بنیاد پر مرتب کئے جاتے ہیں ۔
جہاں حکومت کا کوئی تصور نہیں ہوتا بلکہ خدمت اور ذمہ داری کے فرائض ہوتے ہیں ۔جہاں رائے کا معیار اکثریت نہیں ہوتی بلکہ تقویٰ اور عدل ہوتا ہے ۔جہاں اہلِ اَمر کو یہ فکر ہوتی ہے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کا احتساب کیا جائے گا۔جہاں گندم کی روٹی اِس لئے نہیں کھائی جاتی کہ رعایا میں ابھی تک گیہوں کھانے کا رواج نہیں ہوا۔چنانچہ ایسا شاندار سماجی عدل قائم کرنے کے لئے پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا مگر افسوس کہ آج نظریہ پاکستان مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں یرغمال ہو کر ایک تھیوکریٹک سٹیٹ کے مطالبے کی صورت اختیار کر چکا یا پھر لبرل طبقہ کی خواہشات کے مطلق سیکولر سٹیٹ کی جدو جہد بن کے رہ گیا جبکہ افکارِ بانی پاکستان اور آپ کی عدیم النظیر جدو جہد گڑ گا جر ہو گئی ۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہمارا فرسودہ نظامِ تعلیم

روزنامہ پاکستان 19 مئی 2016

پاکستان ایک ایسی عظیم الشان ریاست ہے جو نظریاتی ڈگر میں سرسید احمد خان کی عملی جدوجہد کا ثمرہ علامہ محمد اقبال کی دیرینہ تمنا کی تکمیل اور قائداعظم محمد علی جناح کے نظریات کی عملی شکل تھی مگر یہ ساری ریاستی فضیلت اُس آزاد منش درویش محمد علی جناح کی رحلت کے ساتھ ہی فرو ہوگئی۔ لامحالہ یہ بات کہنا پڑ جاتی ہے کہ محمد علی جناح اور اُن کے ٹائپ پسٹ نے پاکستان بنایا تھا۔ ہماری بدبختی تو اُسی دن سے شروع ہوگئی تھی جب روایتی مُلّا بزعمِ خویش نظریہ پاکستان کا حتمی وارث بن بیٹھا اور سرسید، اقبال اور جناح کی اصلی جدوجہد کو غبن کر کے عوام کو ملوکی اسلام والی رتی بتی کے پیچھے لگا دیا۔
نظریہ پاکستان کے اکلوتے وارث ذرا حیاء کے ناخن لیں تو یہ لوگ پاکستان میں رہنے کے قابل بھی نہیں۔ یقین کیجئے ایک بھی معروف ہندی مولوی ایسا نہیں تھا جس نے ڈٹ کر نظریہ پاکستان اور قیامِ پاکستان کی مخالفت نہ کی ہو، ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ یہ کوئی پکی روٹی کچی روٹی والے مولوی نہیں تھے بلکہ اپنے وقت کے جید علماء تھے۔
چنانچہ مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید خان، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے پیچھے عالم اسلام کا ایک جمِ غفیر کھڑا تھا۔ چونکہ جھوٹ ہمیں بڑی دیانتداری کے ساتھ پڑھایا، رٹایا اور سمجھایا گیا اِس لئے ہمیں اب سچ سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت کے بعد جب ملوکی اسلام کے حاملین نظریہ پاکستان کو ہائی جیک کر کے ریاست پاکستان پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے تو پاکستان کی اساس کو اپنی عملی جدوجہد کی خوشبو سے معطر کرنے والے یا تو پاکستان سے نکل گئے یا پھر پاکستان میں انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔
بہت جلیل القدر لوگ تھے اُس عظیم کارواں میں۔ یہ وہ نفوسِ حقانیہ تھے جنہوں نے پاکستان کو اپنی علمی اور عملی جدوجہد سے وجودِ زہیر بخشا لیکن اُن لوگوں کے ساتھ ہمارے روایتی مُلّا اور سرمایہ دار طبقہ نے کیا کچھ کیا۔ اب یہ سب اِس چھوٹے سے کالم میں بتانے کی باتیں نہیں۔ مجھے یہاں پر کوئی اور رونا رونا ہے۔ اَلمیہ ملاحظہ ہو۔
مجھے اپنے خاندان کا ایک بچہ کہتا ہے کہ بابا میں نے میٹرک کا امتحان امتیازی پوزیشن سے پاس کرلیا ہے لیکن میں

آگے پڑھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔میں نے قدرے توقف کے بعد بہت دھیمے لہجے میں پوچھا کیوں بچے؟۔کیا ہوا ایسا کہ اتنی شاندار قابلیت کے باوجود بھی تم یہ کہہ رہے ہو؟۔کہنے لگے بابا میٹرک کے بعد آگے کے دو سال میں میرے کام کی کوئی چیز نہیں پڑی ہوئی۔مجھے بس فارمل ایجوکیشن بھی پوری کرنی ہے۔میں کیا کروں مجھے سمجھ نہیں آ رہی؟۔

میں نے عجلت سے پوچھا بتاؤ بیٹا مسئلہ کیا ہے؟۔پوری بات تحمل اور دلیری کے ساتھ بتاؤ۔کہنے لگے بابا میں نے میوزیشن بننا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ میوزک میرا جنون ہے،۔دن میں تین بار کی بورڈ پر اُنگلیاں نہ پھیروں تو میرا دن نہیں گزرتا لیکن بابا آپ خود انصاف کریں میرے پاس میٹرک کے بعد صرف دو ہی آپشن ہیں۔ایف ایس سی پری میڈیکل اور ایف ایس سی پری انجینئرنگ۔لیکن بابا (کمال معصومیت سے روتے ہوئے) مجھے نہ تو ڈاکٹر بننا ہے نہ ہی انجینئر۔مجھے صرف اے آر رحمان بننا ہے۔مجھے انو ملک بننا ہے۔وہ بابا آپ کے پسندیدہ میوزیشن کون سے والے ہیں؟۔وہ کیا نام ہے۔ہاں بزمی صاحب۔نثار بزمی؟۔ہاں جی بابا بالکل وہی مجھے نثار بزمی بننا ہے۔آپ خود بتائیں بابا میں اپنے اِس انتہائی قیمتی وقت کے دو سال کیسے ضائع کرلوں۔بابا میں کیا کروں؟ بابا میں آپ کو چھوڑ کر پاکستان سے باہر نہیں جا سکتا۔آپ اجازت بھی دیں تو میں تب بھی آپ کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ میرا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔مجھے اپنے ملک میں پڑھنا ہے بابا۔مجھے انٹر میوزک سائنس میں کرنی ہے۔مجھے نہیں پتہ بابا۔بس مجھے میوزک پڑھنی ہے اور بہت قابل میوزیشن بننا ہے۔

اُف یار رومی پریشان کر دیا۔میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہماری نئی نسل ہمارے تعلیمی نظام سے اِس قدر نالاں ہو سکتی ہے۔نہیں بابا میں نالاں نہیں ہوں لیکن میں جو اپنے اندر صلاحیت دیکھ رہا ہوں میں اُسے اپنی فارمل ایجوکیشن کے ذریعے ڈیویلپ کرنا چاہتا ہوں۔کیا میری یہ خواہش غیر قانونی یا ناجائز ہے؟۔میں نے اب قدرے توقف کے بعد گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔نہیں بالکل بھی نہیں۔بابا ہمارے ایجوکیشن سسٹم میں کب یہ تبدیلی آئے گی کہ ہمیں زبردستی ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کی بجائے میوزیشن، رائٹر یا آرٹسٹ بننے کا بھرپور موقع دیا جائے گا؟۔

بابا آپ لکھتے کیوں نہیں ہیں اس ٹاپک پر؟۔شاید گورنمنٹ کوئی اہم سٹیپ لے لے۔میں نے مسکرا کر جواب دیا۔نہیں میرے بچے۔پاکستان میں مخصوص طبقے کے سوا کسی کی بات پر توجہ نہیں دی جاتی اور وہ مخصوص طبقہ یا تو پگڑی باندھے ہوئے ہے یا پھر بلیک بوٹ پہنے ہوئے ہے اِس کے سوا کسی کی کوئی بات قابل توجہ نہیں سمجھی جاتی۔

تو بابا کیا میں ضائع ہو جاؤں؟۔نہیں میری جان ایسا تو میں نے نہیں کہا،لیکن مسئلہ انٹر کا بھی تو نہیں ہے نا۔اگر تم انٹر انجینئرنگ یا میڈیکل سائنس میں کر بھی لیتے ہو تو پھر آگے بھی تو میوزک پڑھنے کیلئے کسی بھی یونیورسٹی میں میوزک پروگرام موجود نہیں ہے۔اِس لئے آپ کا خواب اِس ملک میں پورا نہیں ہوسکتا۔میرے بچے آپ کو باہر جانا ہی ہوگا اگر تم اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو؟۔

نہیں بابا پلیز مجھے باہر نہیں جانا مجھے یہاں رہنا ہے۔مجھے یہاں پڑھنا ہے۔آپ سے دور نہیں ہونا۔پلیز بابا آپ پتہ کریں نا۔ہوسکتا ہے کوئی آپشن نکل آئے۔بابا میں چاہتا ہوں انٹر میں دو سال لگانے کی بجائے اگر میں یہ دو سال میوزک کو دے دوں تو آگے کیلئے میری مشکلات بہت حد آسان ہو جائیں گی۔

ہمارے ہاں میوزک کو بہت لائٹ لیا جاتا ہے لیکن بابا یہ ایکسٹرا آرڈنری جینئس لوگوں کا کام ہے۔میں نے جھٹ سے مسکرا کر جواب دیا۔یہاں پر لوگ ابھی اِس قدر باشعور نہیں ہوئے کہ وہ میوزک جیسے انتہائی لطیف فن کے احساس کو سمجھ سکیں،تبھی تو ہمارے ایجوکیشن سسٹم میں اِس کو شامل نہیں کیا گیا۔بابا کب ایسا ہو گا کہ ہمیں زبردستی کچھ پڑھانے یا بنانے کی بجائے ہمیں اپنے Aptitude کو فالو کرنے کا موقع کب دیا جائے گا؟۔

کب ہمیں اپنی قدرتی آزادی کے ساتھ اپنا آپ ڈیویلپ کرنے کا موقع کب دیا جائے گا؟۔بابا کیا کبھی ہمارے ملک میں ایسا ممکن ہو پائے گا؟۔میں نے ایک انتہائی گہری سانس لیتے ہوئے ایزی چیئر کی ٹیک کو کمر سے دھکا دینے کے بعد کہا۔نہیں معلوم میرے بچے۔

☆☆☆☆☆☆☆

لبرل مُلّا اِنسٹی ٹیو شن

روزنامہ پاکستان 12 مئی 2016

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے چنانچہ اِس میں کسی اضافہ کی اجازت ہے نہ ہی ضرورت اور کیوں ہو جب کہہ دیا گیا کہ "اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِینَکُمْ "۔یعنی آج کے دن دین مکمل ہوگیا۔محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصدِ اصلی احبار و رہبان کی من پسند تاویلات کا خاتمہ اور مذہبی تفرقہ کو ناپید کرنا تھا جس نے عرب قوم کو ذہنی وفکری غلامی میں جکڑ لیا تھا۔پیغمبرِ اسلام کی دعوت کسی قوم یا قبیلے کیلئے تو ہر گز نہ تھی لیکن بعد میں ملوکیت نے اِسے وہی مذہب بنا دیا جس کے انہدام کیلئے پیغمبرِ اسلام کی بعثت ہوئی تھی۔

اگر ہم باشعور ہو کر قرآن پر غور کریں تو ہمیں متعدد مقامات پر ایک ہی حکم بار بار نظر آئے گا "وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ"۔یعنی نظامِ صلوۃ و زکوٰۃ قائم کرو۔لیکن اِس کا عام مطلب اصطلاح میں یہ ہے کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو جبکہ قرآن شناس جانتے ہیں کہ اِس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ زمین پر خدا کا نظام قائم کر کے لوگوں کی پرورش کرو۔پس یہی دین کی اصل ہے۔اِس کے برعکس اسلام کو دین سے مذہب بنا کر ملوکیت کا نافذ شدہ مذہب یا تو بالکل اندھا پن ہے یا پھر عقلی بوقلمونیاں۔دونوں طرح کے مذاہب آج اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں۔وہ لوگ جو دین کو اندھا ایمان سمجھتے ہیں وہ بھی اپنی بات پر اَڑے ہوئے ہیں اور وہ لوگ جو دین کو عقل کی گرفت میں لانا چاہتے ہیں وہ بھی اپنے نظریات کو حق ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔میں اِن بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن دکھ ہوتا ہے کہ آج مملکت عزیز میں دین کے نام پر کیا کچھ نہیں ہو رہا۔وہ جو اندھے ایمان والے ہیں وہ تو ایک باقاعدہ انسٹی ٹیوشن کی شکل میں پہلے سے موجود تھے جنہیں میں روایتی مُلّا اِنسٹی ٹیوشن کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہوں اِس کے برعکس وہ لوگ ہیں جو اِس نکتہ پر مُصر ہیں کہ دین محض عقل کے ذریعے سمجھنے کی چیز ہے اور ہر معاملے میں عقلی دلائل کی بھرمار لگا دو چاہے وہ ٹامک ٹوئیاں ہی کیوں نہ ہوں، وہ بھی آج لبرل مُلّا اِنسٹی ٹیوشن کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

لبرل مُلّا انسٹی ٹیوشن کے علمبردار جن کی روش معتزلانہ ہے اب دین میں خود ساختہ جدت پیدا کر کے ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کے چکر میں ہیں گویا ابھی تک تفرقہ کی کوئی کسر رہ گئی تھی جس کو اب پورا کیا جا رہا ہے۔

لبرل مُلّا انسٹی ٹیوشن کے اِس استدلال کا کہ دین کو ریاست سے الگ کرلیا جائے سادہ مطلب یہ ہے کہ سیاست میں اقتدار اشرافیہ کے پاس اور مذہبی معاملات پاپائیت یعنی لبرل مُلّا انسٹی ٹیوشن کے پاس رہیں۔ بلاشبہ عوام کیلئے جس قدر روایتی مُلّا انسٹی ٹیوشن خطرناک ہے بعینہٖ آج کا یہ عقلی مذہب بھی ویسے ہی خطرناک ہے کہ اِس سے تو ایک عام سا علمی مسئلہ بھی ایک منطقی جدل میں تبدیل ہوجاتا ہے اور جو بالآخر معاشرے میں فکری انتشار کا سبب بن جاتا ہے۔ بات مختصر اور جامع بس اتنی سی ہے کہ اسلام ون مین شو کا خاتمہ کرنے آیا تھا چاہے وہ اقتدار میں ہو یا مذہب میں۔ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر دعوتِ اُنس و یکجہتی ہے۔ اسلام انسان کو مخاطب کرتا ہے کہ اے انسانو! رب کی عبادت کرو اور اُس کے احکامات معاشرے میں نافذ کرکے انسانیت کی پرورش کرو چنانچہ اسلام غربت اور طبقاتی تفریق کا خاتمہ کرنے آیا ہے نہ کہ اشرافیہ کو انتقالِ اقتدار کی خوشخبری سنانے اور نہ ہی روایتی مُلّا انسٹی ٹیوشن یا لبرل مُلّا انسٹی ٹیوشن قائم کرنے۔

اسلام ون مین شو کے خاتمے کا نام ہے۔ اسلام اُمتِ واحدہ کی بات کرتا ہے اور اُمتِ واحدہ سے مراد صرف اہلِ اسلام نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو اسلام کے قوانین کو سچے دل سے تسلیم کرکے اُسے معاشرے میں نافذ کرنے کیلئے جدوجہد کرے گویا اسلام ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ ایسی جدوجہد جس میں ہر قسم کی طبقاتی تفریق کا خاتمہ ہوجائے نہیں تو یہ ذکرِ صبحگاہی کسی کام کی نہیں۔ اقبال فرماتے ہیں۔ ع

رِشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصاء نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

روایتی مُلّا انسٹی ٹیوشن ہو یا لبرل مُلّا انسٹی ٹیوشن دونوں عوام کیلئے سمِ قاتل ہیں اور دونوں اسلام کیلئے شدید خطرے کا باعث ہیں۔ روایتی مُلّا انسٹی ٹیوشن جہاں نئی نسل کو دین سے متنفر کررہا ہے تو وہاں لبرل مُلّا انسٹی ٹیوشن جدید طبقہ کو اُن کے مزاج کے عین مطابق دین بنا بنا کے پیش کررہا ہے۔ نیت پر شک کرنا میرا و تیرہ نہیں لیکن یہ دونوں انسٹی ٹیوشن معاشرے میں مزید فکری و اخلاقی انحطاط کا باعث بن رہے ہیں۔ دین کا بنیادی مطالبہ معاشرے میں ایک منصفانہ معاشی نظام قائم کرنا ہے جس کے بعد معاشرہ جنت بن جاتا ہے۔

پھر اُس جنت میں کسی قسم کی لغویات یا طبقاتی تفریق کا امکان باقی نہیں رہتا اِس لئے ضروری ہے کہ دین اور سیاست میں موجودہ خلاء کا خاتمہ کر کے اِسے صدرِ اوّل کی طرح ایک کر دیا جائے اور معاشرے میں ہر قسم کی طبقاتی تفریق کا خاتمہ کر دیا جائے کہ حقیقتاً پاکستان اِسی مقصدِ عظمیٰ کیلئے قائم کیا گیا تھا۔آپ پوری دنیا کا بغور جائزہ لے لیں ۔کہیں بھی آپ کو طبقاتی تفریق کا خاتمہ نہیں ملے گا۔دین کو سیاست سے الگ کر لینے سے انسان دین سے یکسر بیگانہ ہو گیا ہے ۔انتہائی آزاد فکری روش میں پلنے والا انسان اخلاقیات سے ماوراء جانوروں سے بھی بدتر ہوتا چلا گیا اِس کے برعکس دین پر روایتی اور لبرل مُلّا انسٹی ٹیوشن نے قبضہ کر کے انسان کو اپنے مفادات کیلئے استعمال کرنا شروع کر دیا چنانچہ ایک عام انسان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان بڑی بے دردی سے پس رہا ہے ۔

یاد رکھیں اسلام محبت اور انصاف کا نام ہے ۔ہر روایتی یا لبرل مُلّا، جاگیردار، سرمایہ دار اپنی سرشت میں بے دین ہوتا ہے ۔ظلم کے خلاف لمبی لمبی دلیلیں پیش کرنے والا عالم دین نہیں بلکہ ظلم کا محافظ ہوتا ہے ۔دین طہارت کے مسائل کا نام نہیں ۔محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سمیت ستائیس غزوات اِس لئے نہیں لڑے تھے کہ آپ کے مخالفین موسیقی سنتے تھے یا اپنی عورتوں سے مصافحہ کیا کرتے تھے بلکہ وہ ظالم تھے ۔وہ چاہتے تھے کہ ہم سے ہمارا اقتدار کوئی بھی نہ چھینے اور یونہی ہم اپنے لوگوں کو فکری و معاشی غلام بنا کر رکھیں اور ہماری اُجارہ داری قائم رہے ۔پس یاد رکھیں محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُس تمام نظام کو پاش پاش کرنے آئے تھے ۔محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے تصور پر قیل و قال کرنے نہیں آئے تھے ۔اللہ کا تصور عرب میں آپ کی بعثت سے قبل بھی موجود تھا۔آپ کے والد گرامی کا نام بھی عبداللہ تھا چنانچہ عرب جانتے تھے کہ اللہ کون ہے اور عقائد کیا ہوتے ہیں اِس لئے روایتی یا لبرل مُلّا انسٹی ٹیوشن کی منطقی ٹامک ٹوئیاں دین کی روح سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں ۔مُلّا کا دین قیل و قال اور ذکر و اذکار کے سوا کچھ نہیں اِس لئے یہ نہیں چاہتے کہ عوام دین کی روح تک پہنچ سکیں ۔اقبال ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا احوال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔ع

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

☆☆☆☆☆☆☆

بِرہا دا سلطان

روزنامہ پاکستان 05 مئی 2016

اخلاص ایک انمول روحانی قدر ہے اور یہ فاصلے سے پیدا ہوتی ہے یعنی دو انسانوں کے درمیان فاصلہ اخلاص پیدا کرتا ہے پس یہی فاصلہ سنسکرت میں برہا کہلاتا ہے جسے ہم عام اصطلاح میں جدائی بھی کہتے ہیں۔فاصلے کو مٹانے کی شدت جنون(Passion) کہلاتی ہے اور اِس شدت سے جو روحانی اضطراب پیدا ہوتا ہے اُسے دردِ ہجر یا انگریزی میں Pathos کہا جاتا ہے۔

پنجاب کے وکھرے دل سوز و ملال شاعر شیو کمار بٹالوی بڑا پنڈ تحصیل شکرگڑھ ضلع نارووال میں 23 جولائی 1937ء کو دنیا میں آئے۔بچپن سے ہی مستقل اضطراب میں رہتے تھے۔سالوشن آرمی ہائی سکول بٹالہ سے میٹریکولیشن کرنے کے بعد بیرنگ یونین کرسچن کالج بٹالہ سے ایف ایس سی میں داخلہ لیتے ہی رسمی تعلیم سے بیزار ہو گئے۔اِسی طرح باقی ماندہ تعلیم سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہ رہا جبکہ آپ کے باپ روایتی فضاء کے زیرِ اثر لا کر آپ کو ایک بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے چونکہ وہ خود پٹواری رہ چکے تھے اِس لئے وہ چاہتے تھے کہ شیو کم سے کم تحصیلدار تو بن جائے مگر یہ سب شیو کی منزل نہیں تھی۔شیو کی منزل کچھ اور تھی کیونکہ وہ ایک مخصوص روح لے کر اِس دنیا میں آئے تھے اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ بھی وہی سب کام کریں جو دنیا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ عملی زندگی میں بھی آپ کافی اضمحلال کا شکار رہے۔

آپ بلاشبہ پنجاب کے جلیل القدر صوفی شعراء وارث شاہ، بلھے شاہ، سلطان باہو، میاں محمد بخش اور شاہ حسین مادھو لال کے پایہ کے شاعر تھے یعنی آپ مذکورہ صوفیاء کی طرح مخصوص وضع قطع کے حامل تو نہیں تھے لیکن علم و آگہی میں آپ کا قد اِنہی کے برابر ہے۔

اگر عقائد اور خاردار حدود آڑے نہ آئیں تو پنجاب ایک ہی مغز لئے وہ عظیم خطہ ہے جس نے دنیا کو وہ لازوال روشن فکر عطاء کی کہ جس کی مثال اب مفقود ہی ہو چکی لیکن افسوس کہ انسان نفرت کے زیرِ اثر رہ کر دو چولہوں کے درمیان دیوار کھڑی کر کے سمجھتا ہے کہ اب پیٹ الگ ہو گیا ہے حالانکہ پیٹ الگ ہونے سے خون کب رنگ بدل سکتا ہے۔

اَمریتا پریتم کہتی ہے۔ع

کسے نے پنجاں پانیاں وِچ دِتی زہر رَلا
تے اُنہاں پانیاں دھرتی نوں دِتا پانی لا

شیوکمار وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے پنجابی شاعری کی طرز میں جدت اور اسلوب میں ندرت پیدا کی۔آپ کا کلام گویا جدید پنجابی شاعری کا ایک روحانی قمقمہ ہے جو صدیوں تک پنجاب واسیوں کے لئے بمثل مشعل روشن رہے گا۔شیوکمار کو جہاں اپنی دھرتی سے شدید ترین محبت تھی تو وہاں اپنے فرسودہ اور غیر فطرتی روحانی اقدار سے کافی شکایات بھی تھیں۔
وہ ایک آزاد صفت درویش تھے جس کے شعور میں اضطراب اور جذبات میں وارفتگی تھی۔محبت وعشق میں گُندھے ہوئے تزئین خو کے وہ پیکر کہ جس نے زندگی میں کبھی نفاقِ غرض اور فکری مغلظات کو اپنا طریق نہیں بنایا۔شیومحض شکل وشباہت کے دلکش نہیں تھے بلکہ روحانی طور پر بھی وہ حسن والتفات کا مجسمہ تھے۔وہ عشق کے مضراب سے حسن کا ستار بجانا جانتے تھے لیکن افسوس کہ اُنہیں دنیا والوں نے کبھی تانت تک پہنچنے نہ دیا۔وہ نالاں تھے اپنے لوگوں کی پست فکری اور خودغرض رویوں سے مگر وہ جی رہے تھے۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ضائع ہو جائیں مگر وہ ضائع کر دیئے گئے۔
شیوکمار ذہانت کو ایک اذیت ناک مرض تصور کرتے تھے۔وہ اکثر کہا کرتے کہ ہر ذہین ذہنی اضطراب کا شکار رہتا ہے اور وہ بتدریج نہایت سلیقے سے خودکشی کر رہا ہوتا ہے کیونکہ وہ اِس قدر حساس ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرے میں موجود ناانصافی،معاشی واخلاقی اضمحلال پر اندر سے کڑھتا رہتا ہے۔
ایامِ جوانی میں صنفِ نازک کی طرف کھنچاؤ ایک خالص فطرتی عمل ہے جس میں کسی قباحت کا پہلو نکالنا ایک بیمار ذہنیت کی پیداوار تو ہو سکتی ہے مگر ایک ارفع فکر کے حامل کا وتیرہ نہیں۔شیو ارفع فکر،وارفتہ قلب اور اخلاص گزیدہ انسان تھے۔وہ بیج ناتھ گاؤں کی الھڑ کنیا مینا کی محبت میں گرفتار ہوئے مگر جب اُس کی محبت نے عشق کی دل سوز راہ لی تو آپ کو کسی نے خبر دی کہ مینا اِس دنیا سے رخصت ہو چکی چنانچہ اس اعصاب شکن اور شوریدہ روح حادثہ نے آپ کی زندگی میں سے رنگینی چھین کے رکھ دی۔بعد میں یہی بیزاری آخری عمر تک آپ کی روح میں مچلتی رہی اور آخری عمر بھی کیا کہ آپ تو عین جوانی میں چل بسے۔اُس عمر میں جس میں انسان محبت وسرور اور گرہستی کے آنگن میں قدم رکھتا ہے۔
شیو آنند کی تلاش میں محبت پر مداومت کے قائل تھے مگر وہ اس بات کا بھی پوری طرح ادارک رکھتے تھے کہ انسانی طبع

اور روحانی طمانیت اپنا رخ بدلنے میں دیر نہیں کرتی۔ وعدہِ وفا کب غیر معینہ مدت کے لئے اذیت ناک ہجر و فراق میں بدل جائے، کوئی نہیں جانتا۔ انسان فطرت کے آگے سپر ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔ شیو کمار نے 1961ء میں ایک نظمیہ ڈرامہ "لُونا" لکھا جس کی مقبولیت اور شہرت اِس قدر ہوئی کہ 1967ء میں آپ کو صرف تیس سال کی عمر میں ہندوستان کا سب سے اہم ایوارڈ سہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا۔ شیو کمار نے بلھے شاہ اور وارث شاہ کے درد کو نیا رخ اور جدید طرز دیا۔ بلاشبہ آپ جدید پنجابی زبان کے پہلے اور آخری شاعر ہیں۔ محبوب کی بے رخی، ہجر و فراق کی اذیت ناک کیفیات، آگہی کی کوک، معرفت کا اضطراب اور وچھوڑے کی پیڑ آپ کی شاعری کا خاصہ ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ع

کی پچھدے ہو حال فقیراں دا
ساڈا ندیوں وچھڑے نیراں دا

قدرت کے کام نرالے ہیں۔ وہ کام جو کوئی سو سال کی عمر میں بھی نہ کر پاتا وہ شیو کمار نے صرف چھتیس سال کی عمر میں کر دکھایا۔ آپ کے گیت بے حد مقبول ہوئے۔ بے پناہ پیار ملا، ہر خاص و عام سے لیکن شیو شریر کے قفس میں اپنی مضطرب آتما کو زیادہ دیر تک قید نہ رکھ سکے اور 7 مئی 1973ء کو صرف چھتیس سال کی عمر میں شریر تیاگ گئے۔ یوں تو شیو کا سارا کلام بہترین ہے مگر مجھے ذاتی طور پر شیو کا وہ گیت جو ہمارے اُستاد نصرت فتح علی خان صاحب مرحوم نے کمپوز کیا، بے حد پسند ہے۔ میری خواہش ہے کہ شیو کا یہ گیت میں یہاں پر پیش کروں۔ ع

مائے نی مائے میرے
گیتاں دے نیناں وچ
برہوں دی رڑک پوے
اَدھی اَدھی راتیں اُٹھ
رون موئے متراں نوں
مائے سانوں نیند نہ پوے

پے پے سوگندھیاں وچ
بنھاں پے چاننی دے
تاں وی ساڈی پیڑ نہ سوے
کوسے کوسے ساواں دی میں
کراں جے ٹکور مائے
سگوں سانوں کھان نوں پوے

آپے نی میں بالڑی ہاں
حالے آپے متاں جوگی
مت کیہڑی ایس نوں دوے
آکھ سونی مائے اینوں
رووے بُل چتھ کے نی
جگ کتے سن نہ لوے

آکھ سونی کھائے ٹک
ہجراں دا پکیا
لیکھاں دے نی پٹھڑے توے
چٹ لے تریل لونی
غماں دے گلاب توں نی
کالجے نوں حوصلا رہوے

کیہڑیاں سپیریاں توں
منگاں کنج میل دی میں
میل دی کوئی کنج دوے
کیہڑا اِناں دماں دیاں
روگیاں دے دراں اُتے
وانگ کھڑا جوگیاں روے

پیڑے نی پیڑے اے
پیار ایسی تتلی ہے
جیہڑی سدا سُول تے بوے
پیار ایسا بھور ہے نی
جہندے کولوں واشنا وی
لکھاں کوہاں دور ہی روے

پیار اُو محل ہے نی
جہندے وچ پنکھوواں دے
باجھ کجھ ہور نہ روے
پیار ایسا آنگڑاں ہے
جہندے وچ وصلاں دا
رتڑا نہ پلنگ ڈوے

آکھ ماۓ اَدھی اَدھی
راتیں موہے متراں دے
اُچی اُچی ناں نہ لوے
متاں ساڈے مویاں پچھوں
جگ اے شریکڑا نی
گیتاں نوں وی چندرا کوے

☆☆☆☆☆☆☆

آسباقِ معیشت

روزنامہ پاکستان 28اپریل 2016

بچپن میں اپنے بزرگوں سے ایک پنجابی کہاوت سنتے تھےتو ذرا بھی سمجھ نہیں آتی تھی اب وہ کہاوت روز یاد آتی ہے زبردست فہم کے ساتھ۔ع

پیٹ نہ پیّاں روٹیاں
تے سبھے گلاّں کھوٹیاں

معیشت دراصل انسان کے زندہ رہنے کا وہ خاطرخواہ انتظام ہے جس میں کسی ایک انسان کو دوسرے انسان پر کوئی برتری حاصل نہ ہو۔ایسا نظام ابتدائے آفرینش سے انسان کی آرزو رہا ہےلیکن اس کی عملی شکل تاریخِ سلام میں صرف ایک باراسلام کے جلیل القدر انتظامی لیڈر حضرت عمرابن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں نظرآتی ہے۔اِس کے بعد اسلام میں ملوکیت کا وہ بدترین دورشروع ہواکہ جوآج تک جاری وساری ہے۔اگر دنیا میں ہم منصفانہ معاشی انتظام کا جائزہ لیں تو سب سے پہلے یہ نظام ہمیں ایران میں ملتا ہے۔تحریکِ مزدکیت کے نام سے، جوطلوعِ اسلام سے کچھ عرصہ قبل رونما ہوئی تھی۔اِس تحریک نے اہلِ عرب کے اذہان پر انتہائی گہرااثر مرتب کیابلکہ جب پیغمبرِ اسلام نے اسلام کی دعوتِ مساوات کا پرچار کیا تو متمولین قریش نے سب سے پہلے یہی اعتراض کیا کہ یہ شخص تو امیراورغریب کا فرق مٹانا چاہتاہے۔ہمیں بھی وہیں بٹھانا چاہتا ہے جہاں پر یہ اپنے قلاش ساتھیوں کو بٹھاتا ہےیعنی طبقاتی تفریق کا خاتمہ کرنا چاہتاہے۔پھر قریش مکہ میں چرچا ہواکہ دیکھیں یہ مساوات کا سبق تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی سے سیکھا جوایران سے سیکھ کر یہاں آگئے ہیں۔اِسی کے متعلق اقبال فرماتے ہیں۔ع

ایں مساوات ایں مواخات عجمی است
خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

پس یہی وجہ ہے کہ پچھلے ایک ہزار سال سے منصفانہ معاشی نظام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ روایتی مُلّا انسٹی ٹیوشن ہے جو سلاطین کے ساتھ مل کر عوام کا خون چوسنے میں مصروف ہے۔ جب علی الاعلان یہ کہہ دیا جائے کہ غریب کو غریب اور امیر کو امیر صرف خدا نے بنایا ہے تو پھر ایک غریب کے لئے اِس سے بڑھ کر اذیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ پوری اطاعت کے ساتھ امیر کی امارت کی پاسداری کرے یا پھر چپ کر کے بیٹھ جائے؟۔ پھر اقبال یاد آ گئے، کیا جلیل القدر شخصیت کے حامل تھے جن کی نظر کی وسعت نہ معلوم کہاں کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ فرماتے ہیں۔ ع

جانتا ہوں میں یہ اُمت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

قرآن جس نے دنیا کے ہر انسان کو شخصی غلامی سے آزاد کرایا جس نے مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے انسانیت کو نکال باہر کیا آج وہی قرآن روایتی مُلّا انسٹی ٹیوشن کے ہاتھوں محض مجمع تبرک کی حیثیت حاصل کر چکا۔ اگر ہم دنیا میں معیشت کا بغور جائزہ لیں تو آج ہمیں دنیا میں کہیں بھی کوئی منظم منصفانہ معاشی نظام نظر نہیں آ رہا جبکہ مسلم ریاستوں کی حالت تو اِس معاملے میں انتہائی بدتر ہو چکی ہے جہاں اہلِ اسلام کے جسموں پر اشرافیہ کا قبضہ اور ذہنوں پر روایتی یا لبرل مُلّا انسٹی ٹیوشن کی گرفت نظر آتی ہے اور آج بھی مسلمانوں کے اہم مسائل یہ ہیں کہ کیا مرد نامحرم عورت سے مصافحہ کر سکتا ہے یا نہیں اور کیا عورت حجاب پر اکتفا کرے یا نقاب اوڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ہم اصل مسائل سے دور ہیں اور ہماری فکر مسجد و محراب سے آگے نہیں جا رہی حالانکہ اگر انسانی ذات کا گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا بنیادی مسئلہ معیشت ہے اور معیشت کی بہترین تعبیر یہ ہے کہ حصولِ معاش کا وہ صحت مند ذریعہ جس کے حصول میں انسان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو نہیں تو۔ ع

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

قرآن نے جس معاشی نظام کے اُصول دیئے ہیں اُن کی رو سے انسان کی عزتِ نفس بھی قائم رہتی ہے اور حصولِ معاش سے بھی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی تمام تر روحانی اقدار اور اخلاقیات انسان کی معیشت سے وابستہ ہیں۔ اگر انسان معاشی طور پر مضمحل ہو جائے تو انسان کی تمام تر اخلاقیات ناپید ہو جاتی ہیں۔ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر اِس کی بہترین توجیہ فرماتے ہیں۔ ع

پنج رکن اسلام دے تے چھیواں فریدا ٹک
جے نہ لبھے چھیواں تے پنجی ویندے مک

قریبی زمانے میں دنیا میں ایک منصفانہ معاشی نظام معروف جرمن فلاسفر کارل مارکس نے بھی پیش کیا تھا اور جس نے سب سے پہلے معاشرے میں پاپائیت جسے ہم روایتی مُلّا انسٹی ٹیوشن کی اصطلاح سے تعبیر کر رہے ہیں کا خاتمہ کیا تھا اور یہی اعتراض کیا تھا کہ جب تک سرمایہ دار کو مذہبی پیشوائیت کا فکری و روحانی سہارا ملتا رہے گا تب تک عوام کی بھلائی ممکن نہیں۔ پس پہلے اِسی انسٹی ٹیوشن کی مخالفت کر کے اِس کا قلع قمع کیا جائے بعد از اں سرمایہ دار بھی اپنی موت آپ مر جائے گا۔ یہ تحریک بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا پر زبردست اثر رکھ چکی ہے۔ چونکہ دنیا میں سرمایہ دار طبقہ طبقاتی تفریق کے خاتمے کا شدید مخالفت رہا ہے اِس لئے کارل مارکس کی یہ معاشی انقلابی تحریک زیادہ دیر نہ چل سکی۔ کارل مارکس کی اِس عظیم معاشی تحریک کی مسلم فلاسفہ نہ صرف تائید کرتے رہے بلکہ زبردست طریق سے سراہا بھی ہے کیونکہ اسلام کا اصل مدعا یہی ہے کہ معاشرے میں معاشی امتیاز ناپید ہو جائے۔ اقبال اپنی معروف نظم ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں کارل مارکس کا تذکرہ اِن الفاظ میں کرتے ہیں۔ ع

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

اگر ہم باشعور اور حساس ہیں تو ہمیں قرآن پر براہِ راست غور کرنا چاہئے۔ قرآن میں ہمارے لئے ایک منصفانہ معاشی نظام کے اُصول موجود ہیں لیکن بدقسمتی سے جس کی طرف آج تک توجہ نہیں دی جاسکی اور یوں دی جاتی کہ اُموی اور عباسی ملوکیت نے مُلّا انسٹی ٹیوشن کے ذریعے عوام کو قرآن سے کاٹ کے رکھ دیا تھا اور کہہ دیا گیا تھا کہ اُمورِ مملکت سلاطین کے پاس رہیں گے اور اُمورِ شریعت فقہاء کے پاس اور فقہاء بھی وہی جو سلاطین کے منظورِ نظر ہوں گے اور وہ کسی بھی معاملے میں سلاطین کی سرزنش کا اختیار نہیں رکھتے ہوں گے کیونکہ سلاطین تو زمین پر خدا کا سایہ ہیں اور یہ بات عوام کو فقہاء نے جمعہ کے خطبوں کے ذریعے بھی باور کرائی کہ "السلطان ظل الله من اهانه اهان الله" کہ سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہے اور اِس کی اہانت خدا کی اہانت کے مترادف ہے۔

پس یہ وہ اسلام ہے جس کا صدرِ اوّل کے اسلام سے دور دور کا تعلق نہیں۔ یہ حضرات ابوبکر و عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا اسلام نہیں تھا۔ ایسی زبردست فکری غلامی کی صورت میں کسی کی کیا مجال جو وہ ان سلاطین کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ اِسی کے متعلق اقبال فرماتے ہیں۔ ع

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

پس وہی ملوکیت آج بھی اُمت میں اُسی تواتر سے جاری ہے اور اب تو اِسے سبب برکت مان کر مزاحمت کی توفیق بھی جاتی رہی۔ منصفانہ معاشی نظام کے لئے جدوجہد کسی ایک دن کی محتاج نہیں بلکہ قرآن کی رو سے یہ وہ قانونِ خداوندی ہے جس کے کماحقہ نفاذ تک یہ جہد جاری رہنی چاہئے۔

بلاشک وشبہ یہ جہادِ اصلی ہے کہ معاشرے میں طبقاتی تفریق کا خاتمہ کر کے منصفانہ قرآنی معاشی نظام قائم کر دیا جائے جس کے اُصول قرآن میں بیان کر دیئے گئے کہ "يَسْئَلُونَكَ ما ذا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ"۔ یعنی آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟۔ فرما دیجئے کہ جو ضرورت سے زائد ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سائبر کرائم بل اور ہمارا معاشرہ

روزنامہ پاکستان 21اپریل2016

پیدائشی اندھا سمجھتا ہے کہ کائنات میں بینائی کا کوئی وجود نہیں ۔بینائی سے مراد تعقل کی روشنی ہے اور عقل کہتے ہیں تجزیہ کرنے کی صلاحیت کو۔وہ معاشرے جو علم واخلاق کی اَوج پر مزین ہیں وہاں عقل کی روشنی ہر گلی کوچے میں فوارے کی طرح پھوٹ رہی ہے ۔لوگ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق کے بھی حامل ہیں۔ایسے ممالک کی فہرست میں سکینڈ ینیوین ممالک قابل ذکر ہیں جہاں بلا شبہ مثالی عوامی جمہوری حکومت کام کر رہی ہے جبکہ ہمارا معاشرہ فی الحال علمی اور اخلاقی سفر کے موڈ میں بھی نہیں ،منزل تو دور کی بات ہے۔

مثالی حکومت اگر کسی قومی ادارے یا قانون پر تنقید کو ممنوع قرار دیتی ہے تو پہلے حکومت اُن تمام مواقع کا سد باب کر دیتی ہے جو کسی بھی شہری کو اُس ادارے پر تنقید کرنے پر اُبھارتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب اسلام چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا ہے تو ساتھ میں یہ شرط بھی عائد کرتا ہے کہ قحط کے زمانے اور ایامِ افلاس میں چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔واضح رہے کہ مذہب یا کوئی ایک نظریاتی اجتماع جب قوانین وضع کرتا ہے تو اُن قوانین کا مقصدِ اصلی انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے چاہے وہ قوانین کسی شخصی بصیرت پر مبنی ہوں یا الہیاتی تحریک کے احکامات ہوں،ہر دو صورتوں میں سے انسانیت کی بہتری مقدم سمجھی جاتی ہے۔

قانون فی نفسہٖ کچھ نہیں سوائے تہذیب النفس کے اور تہذیب النفس سے مراد انسانی رویہ میں منفی اثرات کا خاتمہ کرنا ہے۔واضح رہے کہ دنیا کے کسی بھی قانون یا نظریہ کو انسانی ذات پر تقدیم حاصل نہیں چنانچہ جب انسان اور قانون مدِمقابل آئیں گے تو قوانین کو بالائے طاق رکھ دیا جائے گا کہ نظریہ انسان کیلئے ہے انسان نظریات کیلئے نہیں۔جن معاشروں میں نظریات پر انسانیت کو قربان کر دیا جاتا ہے یاد رکھیں تاریخ میں ایسے معاشرے کل بھی مکروہ تھے اور آج بھی باعثِ نفرت کیونکہ ظلم سے نفرت انصاف کی جیت ہے۔بلا شبہ یہ ایک عظیم ظلم ہے کہ کسی بھی نظریہ یا قانون پر انسانیت کو قربان کر دیا جائے اور ظلم یہی ہوتا ہے کہ کسی چیز کو آپ اُس کے اصل مقام سے دور کر دیں۔

سائبر کرائم بل بلا شبہ ایک مثبت اقدام ہوسکتا ہے لیکن اس بل کو پاس کرنے سے پہلے جو ذمہ داریاں عوامی نمائندوں

پر لاگو ہوتی ہیں وہ کس حد تک پوری کی جا چکی ہیں اِس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔فقہ میں فقہاء نے ایک فقہی اصطلاح سدِ ذریعہ وضع کی تھی تاکہ معاشرے میں مباحات کے منفی اثرات کو ختم کیا جاسکے اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج سب کچھ ممنوع ہو چکا، چاہے وہ نصوص و روایات میں جائز بھی قرار دیا جا چکا ہو۔اِس میں کوئی شک نہیں کہ انسان فطری آزادی لے کر پیدا ہوا ہے اور دنیا کا کوئی بھی قانون یا نظریہ انسان کو اُس کی فطری آزادی سے محروم نہیں کر سکتا۔آزادی ایک مجرد قدر ہے جس کا اظہار انسان کسی نہ کسی شکل میں ضرور کرلیتا ہے پس قوانین ساقط ہو جاتے ہیں اور نظریات بدل جاتے ہیں لیکن انسان کی آزادی ہر دور میں قائم رہتی ہے۔

میں سائبر کرائم بل کے چیدہ چیدہ نکات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بل کا مسودہ تیار کرنے والوں کا انفارمیشن ٹیکنالوجی سے دور دور کا تعلق نہیں تھا۔اگر سوشل میڈیا پر حکومت یا قومی اداروں پر تنقید کی پاداش میں سزا دی جائے گی تو اِس کا کیا حل ہے کہ تنقید کرنے والے فیک آئی ڈی سے نمودار ہو جائیں؟۔بل کا مسودہ تیار کرنے والے شاید آئی پی خفیہ رکھنے والے وی پی این اور ہاٹ سپاٹس جیسی سافٹ ویئرز سے نابلد تھے۔نیٹ کی دنیا میں کسی کو ٹریس کرنے کیلئے آئی پی ایڈریس کا سہارا لیا جاتا ہے اور آئی پی ایڈریس کو خفیہ رکھنا ذرا بھی مشکل کام نہیں۔پراکسی سرور کے ذریعے آپ جس ملک کی لوکیشن چاہیں شو کرواسکتے ہیں اور یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں مطلب اگر مشکل ہے بھی تو اب مشکل نہیں رہے گا جیسا کہ ماضی میں یوٹیوب پر پابندی کے باوجود بھی پورا ملک یوٹیوب سے محظوظ ہوتا رہا۔ویسے ایک بات یہ بھی ہے کہ پاکستان میں سوشل میڈیا پر جو لوگ مذہب، حکومت یا اسٹیبلشمنٹ پر تنقید کرتے ہیں اُنھوں نے بڑی مہارت سے فیک آئی ڈیز بنا رکھی ہیں گویا یہ لوگ بل پاس ہونے سے پہلے اور بعد میں ہر طرح سے محفوظ ہیں بلکہ جنھوں نے نہیں بنائی تھیں وہ بھی اب حفظ ما تقدم کے تحت فیک آئی ڈیز بنا لیں گے اور سائبر کرائم بل کی حیثیت ایک مقدس مسودے کے سوا کچھ نہیں رہے گی۔

ٹیکنالوجی کے حوالے سے ہم ایک خاص تاثر دنیا میں پیش کر چکے ہیں۔دنیا ایگزیکٹ سکینڈل کبھی نہیں بھول سکتی اِسی طرح یوٹیوب کے ضمن میں ہمارا وکھرا ردعمل بھی دنیا کے سامنے ہے۔اِن تمام حرکات سے آخر دنیا میں اِس کے سوا ہم کیا تاثر قائم کر رہے ہیں کہ ہم دراصل علم و تعلیم کا گلا گھونٹنے کے ماہر ہیں اور اِس پر مستزاد ہے فکری جمود اور ثقافتی گھٹن، گویا پورا معاشرہ حبس بے جا میں بند کر دیا گیا ہو۔

سائبر کرائم بل کے حوالے سے یہ بھی باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ یہ بل نہ تو باقاعدہ طور پر اسمبلی میں پیش کیا گیا ہے اور نہ ہی اِس پر قانونی اور تکنیکی ماہرین کی رائے طلب کی گئی ہے بلکہ بل تیار کرنے والی کمیٹی نے ممبران سے زبردستی دستخط کرواکے مسودہ وزیراعظم کو پیش کر دیا اور وزیراعظم نے بنا کسی استفسار کے بل منظور کرلیا۔
اگر بنیادی طور پر دیکھا جائے تو سائبر کرائمز کی روک تھام کیلئے قوانین کسی سطحی حیثیت پر مبنی نہیں ہوتے۔ایسے قوانین کو آئیڈیل سٹیٹس میں بہت حساسیت سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہ بات نہایت دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہی ہے کہ یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔مطلب ہمیں سائبر کرائمز کو روکنے کی بجائے ایسے قوانین وضع کرنے چاہئیں جو تعلیم اور صحت جیسی بنیادی ضروریات کو تجارت بنانے والوں کے خلاف ہوں۔ہمارے ہاں فی الحال ٹیکنالوجی اُس نہج پر نہیں پہنچی کہ اِس کے ذریعے کوئی غیر معمولی انقلاب لایا جاسکے۔ہمارے ہاں جہاں ایک طرف ابھی لاء اینڈ آرڈر کی سچویشن قابل بیان نہیں تو وہاں دوسری طرف تعلیم اور صحت جیسی بنیادی ضروریات کا شدید فقدان ہے۔اِس وقت ریاست کو شدید خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ایسے حالات میں غیر ضروری شوشے کھڑے کرنا قطعاً دانشمندی نہیں بلکہ ریاست میں مزید اَنارکی کو ہوا دینے کے مترادف ہے۔
ہمارے معاشرے کو اِس وقت برقی مجرموں کی بجائے اُن موالیوں سے خطرہ ہے جنہوں نے اپنے گھر میں سکھ کا سانس لینا حرام کیا ہوا ہے۔بھانت بھانت کی شدت پسند تنظیمیں کبھی مذہب کی آڑ لے کر قتل و غارت کا جواز پیش کر رہی ہیں تو کبھی قبائلی جہالت خونخوار رویہ لے کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اگر حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو اِن تمام جرائم کی علت خود حکومت ہے۔حکومت کی نااہلی اور چند ٹکوں کی خاطر ایمان فروشی ہی اِن تمام خانہ زاد جرائم کی علت اولیٰ ہے۔واضح رہے کہ الہامی ریاست نظامِ خداوندی کی اَمین ہوتی ہے اور خدا کا نظام یہی ہے کہ اُس کی مخلوق میں طبقاتی عصبیت اور معاشی ناہمواری کا خاتمہ کر دیا جائے لیکن اڑسٹھ سال گزرنے کے بعد ملک آج بھی فکری، معاشی اور سیاسی بحران کا شکار ہے اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

پشتون صوفیائے کرام

روزنامہ پاکستان 14اپریل2016

تصوف کوئی مخصوص مسلک یا کوئی مذہبی فریضہ نہیں بلکہ یہ ایک عالمگیر دعوتِ اُنس ہے جس کا مقصد انسانیت کے درمیان باہم نظریاتی نزع کا سدِ باب ہے۔انسان جب سے شعور کا حامل ہوا تب سے مختلف الجہات نظریاتی، اقتصادی اور تہذیبی جدل رونما ہوتی رہی ہے جس کی روک تھام کے لئے انسان نے متنوع سماجی منشور وضع کئے لیکن نتیجہ صفر رہا اور آج تک انسانیت باہم برسرِ پیکار رہے۔

البتہ انسانی معاشروں میں کچھ لوگ ایسے بھی یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے انسانیت کے درمیان پائی جانے والی نظریاتی چپقلش کا قلع قمع کیا۔ایسے عظیم المرتبت لوگ دنیا کی ہر تہذیب اور سماج میں موجود رہے ہیں اور دنیا اَن ارفع لوگوں کو صوفیائے کرام کے نام سے جانتی ہے۔اِن لوگوں نے انسانیت میں مذہبی تفریق کا علی الاعلان بائیکاٹ کر کے دینِ محبت کا پرچار کیا۔

دینِ محبت سے مراد وہ آفاقی دین ہے جس میں کسی بھی انسان سے نظریاتی نفرت یا نسلی امتیاز نہیں برتا جاسکتا گویا اِس سیارۂ زمین پر رہنے والے تمام انسان فطرتاً برابر ہیں اور اسی مساوات کا ادراک دراصل تصوف ہے۔خطہِ اَباسین کے صوفیائے کرام جنہوں نے ہند کی تہذیب میں پیار و محبت کا درس دیا، اِن میں پشتون تمدن کے صوفیائے کرام پشتون خطے میں نظریاتی تشدد کا سدباب اور اخوت و امن کا پیکر بن کر اُبھرے۔ہم اگر پشتو تمدن کی بات کریں تو پشتو تمدن میں عبدالرحمن بابا، عبدالحمید بابا، مرزا علی خان المعروف فقیر اپیی، سعید لالہ المعروف لیوَنے مَلا، پیر روشان انصاری، گلستان بابا، حمزہ شنواری اور حکیم غلام سرور المعروف طاہر کلاچوی انتہائی قابلِ ذکر ہیں۔

یوں تو ہر تمدن کے صوفی کا اپنا ایک مقام ہے لیکن یہاں پر میں پشتون صوفیائے کرام کا ذکر کروں گا جنہوں نے اپنی قوم اور پورے ہند میں فطرتی آزادی کا پرچار کر کے ہر دور کے استعمار کے خلاف اہلِ ہند کو فکری و عملی جدوجہد کی طرف راغب کیا۔رحمان بابا نے جہاں اپنے فکر و فلسفہ کی بدولت پشتون قوم کو ذہنی غلامی سے آزادی اور انسان پرستی کا درس دیا تو وہاں فقیر اپیی اور سعید لالہ نے عملی جدوجہد کے ذریعے اپنی قوم کو یہ نکتہ باور کرایا کہ اپنی تہذیب و تمدن پر اپنا

سب کچھ وار دینا ہی اصل مردانگی ہے ۔اپنی تہذیب پر کسی غیر کا ظلم برداشت نہ کرنا ہی صوفی کا امتیاز رہا ہے ۔تصوف کا مطلب ظالم کے آگے سرنگوں ہونا ہرگز نہیں بلکہ ظالم کے خلاف سینہ سپر ہو کر ظلم کا قلع قمع کرنا ہے کیونکہ درویش اور صوفی نہ صرف محبت کا پرچارک ہوتا ہے بلکہ وہ ایک نڈر اور بے باک شخصیت کا حامل بھی ہوتا ہے ۔اِسی طرح ہر صوفی ظلم اور بربریت کے خلاف جدو جہد کو حمیتِ ارفع سمجھتا ہے ۔جیسا کہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال فرماتے ہیں ۔ع

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

تصوف دراصل ہر قسم کی تہذیبی غلامی کی نفی کرتا ہے چاہے وہ تہذیب تقدیس کے اعلیٰ ترین مقام پر کیوں نہ فائز ہو کیونکہ غلامی ہمیشہ غلامی ہی ہوتی ہے چاہے وہ فکری ہو یا تہذیبی ۔غلامی ایک طوق ہے اور اِس میں انسان کی تمام تر صلاحیتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں ۔غلامی کی بدترین شکل فکری و تہذیبی غلامی ہے ۔اقبال فرماتے ہیں ۔ع

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

پس تصوف ذوقِ یقین ہی کا دوسرا نام ہے اور پشتون صوفیائے کرام کے ہاں دو ہی فلسفے پائے جاتے ہیں ۔ایک ذوقِ یقین اور دوسرا حمیت یعنی اپنے تمدن پر فخر کرنا،اپنے تمدن کا دم بھرنا۔پشتو تمدن میں روحانی اقدار یعنی غیرت، حیاء اور وفا پر جان نچھاور کرنا ہی اصل سمجھا جاتا ہے ۔پشتو تمدن میں پیسہ اور جاہ و حشم کی کوئی وقعت نہیں ۔انسانیت سے محبت اور انسانیت پر مرمٹ جانا ہی پشتو تمدن کا امتیازی وصف ہے ۔رحمان بابا فرماتے ہیں ۔ع

انسانیت خو په دولت نه دے رحمانه
بت کا سرو زرو نه جوړ کے انسان نه دے

جس طرح انسانیت پر مرمٹنا پشتون صوفیائے کرام کا درسِ اوّلیں تھا بعینہٖ انسانیت آزاری سے ممانعت بھی اِنہی صوفیاء کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے کیونکہ صوفیاء کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں اور ان میں کوئی بھی فطرتی امتیاز نہیں پایا جاتا چنانچہ رحمان بابا فرماتے ہیں ۔ع

آدم زاد په معنا واړه یو صورت دی
هر چی بل آزار وی هغه آزار شی

پشتو تمدن میں وفاداری اصل الاصول ہے چاہے وہ عقائد سے ہو یا جملہ موجودات سے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں پشتون قوم کو زیادہ شدت پسند کہا جاتا ہے جبکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اخلاص اُس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ آپ ہر آلائش سے خود کو پاک کر کے ایک طرف کھڑے نہیں ہو جاتے۔ پشتون قوم کی دوستی اور محبت خالص ہوتی ہے اور یہی بنیادی سبب عموماً انتہا پسندانہ معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت یہی ہمارے مذہب کی بھی تاکید ہے کہ اپنے اندر اخلاص پیدا کرو، تقویٰ پیدا کرو تا کہ تم فلاح کو پہنچ سکو۔ رحمان بابا فرماتے ہیں ۔ع

چه تقویٰ او دیانت نه لری رحمانه
دا دے هسے هم نشینوں نشیں مه شه

تصوف سالک کو جہاں انسان پرستی اور سراپا عشق و محبت سکھاتا ہے تو وہاں اُس پر عقل و دانش کی گرہیں بھی کھولتا ہے۔ کشف و وجدان بھی مرحمت کرتا ہے کیونکہ تصوف باطن کی صفائی کا نام ہے۔ یہ بیک وقت انسان کو تمام تر اخلاقی آلائشوں سے منزہ کر کے حمیت، سراپا محبت، انسانی ہمدردی اور خودیابی و خدایابی سے بہرہ مند کرتا ہے۔ حکیم غلام سرور طاہر کلاچوی فرماتے ہیں ۔ع

چی دا عقل او ادراك په دائرے کے راتلے نه شی
ما ته دا سے نظر را که ، ما ته دا سے چشمان را که

تصوف چونکہ ایک روشن رستہ ہے اس لئے یہ انسان کو اِس قدر منور کر دیتا ہے کہ پھر دنیا کی چکا چوند انسان کی نظر کو خیرہ نہیں کر سکتی حتیٰ کہ انسان سائبانِ ذات میں سرمست ہو کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور یہی بے نیازی بالآخر تجزیہ ذات سے ماوراء ہو کر بے خبری پر تمام ہوتی ہے۔رحمان بابا فرماتے ہیں۔ع

رحمان هیچ له خپله زان نا خبر نه یم
چې دا هسے رنگ زبون او محزون چا کړم

پشتو زبان چونکہ فارسی الاصل ہے اس لئے ادبی پشتو میں زیادہ تر تراکیب فارسی سے در آئی ہیں۔اگر ہم پشتو زبان کا بتدریج لسانیاتی تعاقب کریں تو یہ زبان سیدی جلال الدین رومی، عمر خیام، فردوسی، سعدی شیرازی اور عبدالرحمن جامی تک پہنچ جاتی ہے۔حمزہ بابا پشتو زبان پر لچر اعتراضات کا منطقی جواب کچھ یوں دیتے ہیں۔ع

وائی اغیار چی دا دوزخ ژبه دا
زبه جنت ته دا پشتو سره زم

تصوف چونکہ عشق کی اوّل و آخر ہے اِس لئے تصوف میں سالک کا مطمح محبت و عشق ہی ہوتا ہے چنانچہ ایک پشتو غزل میں محبت و عشق کے احوال گلستان بابا بہت خوبصورت پیرائے میں بیان فرماتے ہیں۔یہ غزل ذاتی طور مجھے بے حد پسند ہے۔ع

چا چی سکلےؒ په اخلاص وی جام دا عشق
قرنیگی په هر دام په نام دا عشق

طعامنّاں دا دنیا ورته بس وی
چا چی اُخڑّو یو زل طعام دا عشق

راته اخکاری عاشقی لویه رتبه ده
شو محمود غوندے باچا غلام دا عشق

نصیحت په عاشقانوں اثر نه کَه
راته وایه اے مُلّا کلام دا عشق

بل تعلیم ته حاجت نشته گلستانا
چرته گورا زه ورزه امام دا عشق

☆☆☆☆☆☆☆

جنید جمشید ! واپس آ جاؤ میاں

روزنامہ پاکستان 10 مارچ 2016

مرد کی پرہیزگاری اور کوئلوں کی دلالی میں کوئی فرق نہیں ہوتا مطلب دونوں صورتوں میں ہمیشہ منہ ہی کالا ہوتا ہے۔ ہمارے مرحوم اُستاد کہا کرتے کہ مرد کبھی پرہیزگار نہیں ہوتا سوائے اِس صورت میں کہ وہ صاحبِ فراش ہو جائے یعنی ع

وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار

کل ایک سینئر صحافی دوست نے ایک چھوٹا سا ویڈیو کلپ بھیجا جس میں سابق گائیک اور موجودہ حضرت مولانا جنید جمشید ایک فیشن شو میں ریمپ پر قصیدہ بُردہ شریف پڑھ رہے تھے اور جس کے فوری بعد ماڈلز کیٹ واک کرنے لگیں۔اب اِس میں کیا بُرائی ہے؟۔سوال تو یہ بنتا ہے لیکن یہ سوال بنتا ہی نہیں جب آپ حیاء سے نابلد ہوں۔جو لوگ کہتے ہیں دین اور دنیا میں کوئی فرق نہیں وہ دراصل دین سے واقف ہیں نہ دنیا سے، اور اِس طرح کے بیانئے سنا کر رجعت پسند اور لبرل مولوی دین کو من پسند بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔دنیا میں ہر چیز اپنے مقام پر جچتی ہے۔جب آپ کتوں کے کان بلیوں کو نہیں لگا سکتے تو پھر دین کو دنیا میں کیسے گھسیڑ سکتے ہیں؟۔دنیا ایک مسلسل تجارت ہے جہاں انسان پہلے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے پھر اپنی ضرورت کو بڑھاتے بڑھاتے ہوس کا پجاری بن کے آخری سانس تک اپنی ہوس کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔گویا یہ ننانوے کا چکر ہے جو کبھی سو نہیں ہوتا۔اِس کے برعکس دین ایک بے لوث جذبہ ہے جس میں نہ کوئی لین ہے نہ دین۔جہاں ذات کی نفی اور جذبات کا بھرم رکھا جاتا ہے۔جہاں یقین ہے بنا منطق کے اور تسلیم ہے بغیر دلیل کے۔دنیا اضطراب ہے اور دین تسکین دائم۔دنیا غلاظت کا ڈھیر ہے اور دین کستوری کی مشک۔ سلطان العارفین حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں۔ع

اے دنیا زن حیض پلیتی کتنی مَل مَل دھوون ہُو

دنیا کارن عالم فاضل گوشے بہہ بہہ روون ہُو

دین و دنیا میں تفریق معرفت کا پہلا سبق ہے اور یہ سبق کسی رجعت پسند مولوی یا لیبارٹری میں بیٹھے پروفیسر کے بس کا روگ نہیں ۔ یہ فقر کا راستہ ہے جہاں فناء ہی فناء ہے اور جہاں فناء ہی اصل بقاء ہے ۔پس دین خدا سے شدید محبت بالواسطہ محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کا ظہور قلبِ عارف پر ہی ہوسکتا ہے ۔

حضرت مولانا جنید جمشید! آپ نے ریمپ پر کھڑے ہو کر قصیدہ بردہ ہی پڑھنا تھا تو پھر کوک سٹوڈیو میں روہیل حیات کے ساتھ ریںڈیشن کمپوز کرنے میں کیا برائی تھی؟ ۔گیٹ اَپ چینج کرنے اور گھیرے دار لباس پہننے سے انسان اگر نیک بن جاتا تو سادھو یوں بن بن میں خود کو جوگ نہ لگا تا پھرتا۔ابتداء میں تصویر حرام تھی ، پھر تصویر آہستہ آہستہ حلال ہوگئی اور اب گانا بجانا بھی خراماں خراماں حرمت سے باہر نکل رہا ہے پھر وہ دن بھی دور نہیں جب مولانا موصوف اِسی حلیہ کے ساتھ پھر سے گٹار گلے میں ڈالے کوئی دھماکہ خیز گانا گا رہے ہوں گے ۔

نہ صرف زمین گول ہے بلکہ انسان کی فطرت بھی گول ہے یعنی انسان جن نظریات سے اپنا سفر شروع کرتا ہے پھر آہستہ آہستہ تبدیلی کے ساتھ واپس اُنہی نظریات پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں کہ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے ۔اِس تمام مرحلے میں مجھ سے بہتر کون آگاہ ہوسکتا ہے کہ میں خود ایسی ہی صورتحال سے گزر کر آیا ہوں ۔میری تربیت ایک روایتی دیوبندی مدرسہ میں ہوئی ۔فقہ اور حدیث کے میرے اُستاد مولانا حسین احمد مدنی کے تلمیذِ خاص مرحوم حضرت مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی صاحب تھے ۔جن سے براہ راست میں نے علم دین سیکھا لیکن طبیعت چونکہ تغیر پسند تھی اس لئے نظریات میں جوہری تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں ۔میں اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں یہ پیشں گوئی کر رہا ہوں کہ بہت جلد حضرت جنید جمشید میوزک کی جانب واپس لوٹ آئیں گے ۔

ایک نکتہ آج تک مجھے سمجھ نہ آسکا کہ نیک بننے کیلئے وضع قطع بدلنا کیوں ضروری ہوتا ہے جبکہ دین کا معاملہ تو انسان کی روح سے خدا کے تعلق کا معاملہ ہوتا ہے ۔ اِس میں ظاہری وضع قطع تبدیل کرنا یا کسی مخصوص مذہبی گروہ کے ساتھ منسلک ہونا کیوں ضروری ہوتا ہے؟ ۔ دیندار ہونے کیلئے تبلیغی جماعت ، بریلوی مسلک یا اہل حدیث جماعت کے ساتھ منسلک ہونا کیوں ضروری ہے؟ ۔تحقیق عمیق کے بعد مجھے اِس نکتہ کی تسلی بخش منطق سمجھ نہ آسکی لیکن اتنا تو سمجھ چکا کہ ہر مذہبی گروہ کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں اور ہر فرقہ محض اپنے دلائل کا پجاری ہے ۔ دنیا کے تمام مذاہب ایک دوسرے کی نفی سے اپنا وجود قائم کئے ہوئے ہیں ۔

اگر اہل مذاہب میں یہ وتیرہ نہ رہے تو پوری دنیا کے انسان ایک ہو جائیں اور ہر قسم کا باہمی نظریاتی اختلاف ناپید ہو جائے۔ دنیا میں کوئی بھی کام فی نفسہ حرام نہیں ہوتا، چاہے وہ کسی بھی شعبہ سے متعلق کیوں نہ ہو۔ البتہ اس کا استعمال اسے قبیح اور صحیح بنا دیتا ہے۔ عجیب مضحکہ خیز اختلاف ہے۔

ایک مذہب میں گانا بجانا اگر حرام ہے تو دنیا کے دوسرے مذہب میں اِسے مذہبی عبادت کے طور پر سرانجام دیا جاتا ہے چنانچہ ایسی صورتحال میں انسان کے پاس شعور کے علاوہ کوئی مقام قابل اعتماد نہیں ٹھہرتا۔ میں جذبات کی مخالفت نہیں کر رہا۔ جذبہ ہمیشہ صادق ہوتا ہے لیکن جذبہ کوئی قابل اعتبار چیز نہیں جبکہ شعور شفاف چشمہ ہے جو آپکی روح کو سیراب کرتا ہے۔

اگر آپ کائنات میں غور کریں تو ہر جگہ آپ کو ایک موسیقیت نظر آئے گی۔ رقص کرتے اَشجار کی سرسراہٹ، بل کھاتی ندیوں کی سنسناہٹ اور برستی بارش کی بوندوں کی چھم چھماہٹ دراصل قدرتی موسیقی کی مختلف شکلیں ہیں۔ میرے انتہائی محترم جنید جمشید ایک بہت ہی قابل انسان تھے (سابقہ دور میں)۔ بہت زیرک موسیقار اور گلوکار تھے۔ وائٹل سائنز کی مدھر کمپوزیشنز آج بھی دماغ میں رس گھولتی ہیں۔

شعیب منصور نے جن دو لڑکوں پر محنت کی تھی وہ دونوں واقعی باکمال تھے۔ روہیل حیات کو آج کوک سٹوڈیو میں صوفیانہ رنگ میں باس گٹار بجاتے دیکھتا ہوں تو روح چہک سی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنید جمشید سے بڑھ کر آج روہیل حیات روحانی عبادت کر رہے ہیں۔ وہ عبادت جو پژمردہ روحوں کو پرسرور توانائی بخشتی ہے۔

جنید جمشید! آپ کو نماز روزہ حج زکوٰۃ کی ادائیگی سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن خدارا اپنے اندر چھپے اُس مہان کلا کار کا گلا مت گھونٹیے جو پریشان حال اَرواح کا درد مند ہوا کرتا تھا۔ میں آج بھی گنگناتا رہتا ہوں۔ ع

نہ تُو آئے گی نہ ہی چین آئے گا
میرے دل کی ہری بیلوں کا
پتا پتا سوکھتا جائے گا

جنید جمشید! دنیاومافیہا سے بھاگ کر آپ خدا کو نہیں پاسکتے۔ع

سنسار سے بھاگے پھرتے ہو
بھگوان کو تم کیا پاؤ گے
اِس لوک کو بھی اپنا نہ سکے
اُس لوک میں بھی پچھتاؤ گے

آپ نے جلد بازی کرلی ،نہیں تو بخدا آپ کو خدا کو مل اور تیور سُروں میں بھی مل جاتا۔مولانا طارق جمیل صاحب کے بیانات تو بہت سنے ہوں گے،میری آپ سے درخواست ہے کہ صرف ایک بار حضرت امیر خسرو دہلوی رحمہ اللہ علیہ کی سوانح حیات بھی پڑھ لیں۔آپ بیک وقت قرآن، حدیث،فقہ اور منطق کے ماہر ہونے کے باوجود ایک فقید المثال موسیقار تھے۔آپ محبوب الہیٰ بابا صاحب حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ علیہ کے سامنے بیٹھ کر راگ رنگ فرمایا کرتے۔راگ ایمن سمیت طبلہ،ستار اور موجودہ باس (گٹار) بھی حضرت امیر خسرو کی دَین ہیں۔کاش آپ صرف ایک بار حضرت امیر خسرو دہلوی کے متعلق پڑھ لیتے۔کاش۔

☆☆☆☆☆☆☆

راگ بیلاس خانی توڑی

روزنامہ پاکستان 07اپریل2016

آزادی بلاشبہ ایک مجرد حقیقت ہے اور کائنات میں اِس سے بڑی کوئی نعمت موجود نہیں۔ یہ آزادی مجھے بچپن میں بالکل بھی حاصل نہیں تھی لیکن پھر بھی میں نے اپنی مرضی سے انگریزی تعلیم کی بجائے دینی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ جب پارسائی کا بھوت اُترنا شروع ہوا تو پھر سے چوری چھپے محلے کے اکلوتے "مجلس خانہ" میوزک اکیڈیمی جانے لگا۔ جہاں پر اُستاد غلام رسول خان صاحب جیسے صاحبِ جنوں موسیقار ہر وقت ایک ضعیف الحال فرانسیسی ہارمونیم کے ساتھ بھیرویں کے سُروں سے لپٹے کوندرکی کھاٹ پر براجمان نظر آتے۔

آپ برٹرینڈ رسل کی بات چھوڑیں۔ میں آپ کو اپنا ذاتی تجربہ بتاتا ہوں کہ علم و عقل کی پُر خار وادی میں بھٹکنے والوں کے لئے موسیقی صراطِ مستقیم ہے۔ خدارا میرا یہ جملہ کسی بھی غیر ذہین یا متوسط ذہین کے لئے نہیں اگر آپ دس نمبر کے ذہین نہیں تو پھر آپ چپ کر کے اِس جملے پر سے گزر جائیں۔ اگر بُرا لگے تو میرے حق میں دعا فرما دیں کہ خطا کار ہوں کچھ بھی بول دیتا ہوں۔

حیرت کی کوئی بات نہیں یہ اُکھڑا اُکھڑا سا لہجہ جان بوجھ کر اپنایا۔ ہر وقت سنجیدہ صورت بنا کر سنجیدہ پیرایوں میں بات کرنے سے اُکتا گیا ہوں، لیکن خیر پھر بھی سنجیدہ تو ہونا پڑے گا کیونکہ آگے بات ہی کچھ انتہائی سنجیدہ چلنے والی ہے۔ موسیقی کیا ہے؟۔ قدرت کی صدا اور فطرت کی لے۔ انسانی گلا سات سروں کی ترتیب پر بنا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سات سر انسانی حلق سے بخوبی ادا ہوتے ہیں۔ موسیقی دھیان کا بہترین وسیلہ ہے گویا جب انسان گیان سے تھک جائے تو اُسے دھیان کی طرف راغب کرنے کے لئے موسیقی ایک بہترین ذریعہ ہے۔ کبھی ہوا کی سرسراہٹ کو غور سے سنیں۔ اِسی طرح کبھی بارش کی چھم چھماہٹ پر کان دھریں تو معلوم ہوگا کہ کس طرح کون و مکاں میں مدھر دھنیں تیر رہی ہیں۔ سیدی رومی کی نے نوازی پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا تو آپ نے کیا خوب جواب مرحمت فرمایا۔ ع

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست

از کجا می آید آواز دوست؟

فرماتے ہیں کہ میں تو قدرت کی صناعی پر حیران ہوں کہ یہ خشک پیتل، خشک لکڑی اور خشک چمڑے میں سے آواز کہاں سے نکل رہی ہے۔ستار،طبلہ اور بانسری وغیرہ اِنہی چاراشیاء سے بنتے ہیں۔لبِ لباب یہ کہ آلاتِ موسیقی قدرت کے مظاہر میں سے ہیں اور اِن کا استعمال دراصل قدرت کی عطاء کردہ ذہانت سے لطف اندوز ہونا ہے۔میں اب علم کی حقیقت کا قائل نہیں رہا جب سے علم وخرد کی حقیقت مجھ پر وا ہوئی۔

اقبال پر بہت سے ذہین اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے علم کی بجائے عشق پر زور دیا اور علم کو محض وقت کا ضیاع قرار دیا۔میرے خیال میں اقبال نے پوری دیانتداری سے کام لیا کیونکہ علم کے بعد معرفت شروع ہوتی ہے اور معرفت کا اختتام عشق پر ہوتا ہے تواِس لئے عشق اصل المراحل ٹھہرا۔

میاں تان سین کے پانچ بچے تھے۔تین فرزند اور دو دختران۔تان رس خان، بیلاس خان، اور ہمیر سین خان جبکہ صورت سین اور سرسوتی دیوی جن میں سرسوتی دیوی بعد میں مسلمان ہو کر حسینی کے نام سے مشہور ہوئیں۔یوں تو اولاد سبھی عزیز ہوتی ہے لیکن میاں تان سین کو اپنے منجھلے بیٹے بیلاس خان سے خصوصی التفات تھا گویا پوری اولاد میں سے بیلاس خان کچھ زیادہ ہی لاڈلہ تھا میاں کا۔اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ پیارے لوگوں سے کچھ زیادہ ہی خفگی محسوس ہوتی ہے۔

خیر ایک مبینہ روایت ہے کہ میاں تان سین اپنے آخری ایام میں اپنے لاڈلے بیلاس خان سے ناراض ہو گئے تھے اور راضی ہونے کی ایک انوکھی شرط رکھ دی کہ جب تک بیلاس خان دنیائے موسیقی میں کچھ بالکل نیا شگوفہ نہیں پیدا کر لیتے میرے راضی ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔چنانچہ جب بیلاس خان کو اپنے والد کی اِس شرط کی خبر ہوئی تو اُنہوں نے سارنگی اٹھائی اور کوشش شروع کر دی۔کہتے ہیں کہ یہ وہ وقت تھا جب میاں تان سین کا جسم پوری طرح شل ہو چکا تھا اور وہ چارپائی پر بالکل سیدھے لیٹے ہوئے تھے جبکہ ساتھ میں بیلاس خان اپنی پوری مہارت اور جہد کے ساتھ دنیائے موسیقی میں کچھ نیا رنگ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔بیلاس خان سارنگی کے سروں کو چھیڑتے گئے، ساتھ ساتھ میاں تان سین پر نزع کا عالم طے ہوتا گیال۔ایک قوی امکان تھا کہ وہ بیلاس خان کی سرتوڑ کوشش بغور سن رہے تھے اور پھر وہ لمحہ آیا کہ جس میں بھیرویں کے سروں سے بیلاس خان نے ایک نئی کونپل پیدا کرلی۔بیلاس خان اِس بندش کو پکڑ کر دہراتے رہے کہ دریں اثناء میاں تان سین کے جسم سے روح پرواز کرگئی۔

پریشانی کا عالم بپا ہو گیا اور ایک لامتناہی تذبذب پیدا ہوا کہ کیا بیلاس خان کی کامیابی میاں کے کانوں میں گونج چکی تھی یا نہیں مگر جب میاں کے پپوٹے گیلے نظر آئے تو تشفی ہوئی کہ میاں نہ صرف اپنے لاڈلے کی کوشش بغور سن چکے تھے بلکہ جاتے جاتے بیلاس خان سے راضی بھی ہو چکے تھے۔تب سے آج تک بیلاس خان کی اپنے والد کو منانے کی اس انوکھی کوشش کو راگ بیلاس خانی توڑی کہا جاتا ہے۔ آئیے اِس راگ کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔بیلاس خانی توڑی ایک نہایت مختصر راگ ہے بلکہ توڑی کی اصطلاح ہی مختصر کی جانب اشارہ ہے۔اِس راگ کی خوبی یہ ہے کہ بھیرویں کے سروں سے توڑی کی شکل پیدا کی جاتی ہے۔پنچم بھیرویں کا سموادی سر ہے اور اساوری میں بھی اِس سر پر ٹھہرا جاتا ہے۔یہی دو راگ ہیں جن کی چھایا بیلاس خانی توڑی میں اکثر نظر آنے لگتی ہے اور اِسی لئے بیلاس خانی توڑی میں پنچم کا سر کمی کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔اِس کا وادی سر دھیوت اور سموادی سر گندھار ہے۔

گانے کا وقت دن کا دوسرا پہر ہے۔بیلاس خانی توڑی کے آروہ میں مدھم کے سر سے پنچم یا دھیوت پر نہیں جانا چاہئے بلکہ مدھم سے گندھار یا رکھب پر واپس آ کر اِن سروں سے مدھم کے اگلے سروں پر جاتے ہیں۔اِسی طرح ایک لحاظ سے مدھم کا سر بیلاس خانی توڑی کے آروہ میں ورجت ہے اور اسی طرح اِس کے اَوروہ میں پنچم کے سر سے مدھم یا گندھار پر نہیں آیا جاتا بلکہ اس سر کو یا تو بالکل چھوڑ دیا جاتا ہے یا پنچم سے واپس دھیوت پر جا کر مدھم پر آتے ہیں۔ اِسی طرح اَوروہ میں پنچم ورجت کرنے سے یہ راگ اَساوری اور بھیرویں دونوں سے بچ جاتا ہے۔

اِس راگ میں رکھب اور نکھاد کی سنگت رہتی ہے اور اَوروہ میں پنچم ورجت کرنے سے دھیوت اور مدھم کی سنگت بھی نظر آتی ہے۔بھیرویں سے بچانے کے لئے آروہ میں نکھاد بہت کم لگایا جاتا ہے۔اِس طرح اساوری کی جھلک نظر آنے لگتی ہے جسے اَوروہ میں پنچم ورجت کر کے دور کر دیا جاتا ہے۔توڑی کی شکل دکھانے کے لئے بیلاس خانی میں توڑی کا کومل گندھار سارے گارے، گارے سا کے روپ میں لگایا جاتا ہے۔سمجھدار گانے والے بھیرویں کے کومل گندھار اور توڑی کے کومل گندھار کا فرق اچھی طرح جانتے ہیں۔یہ گندھار بھیرویں کے کومل گندھار سے دھیما ہوتا ہے اور اَتی کومل کہلاتا ہے اور یہی گندھار بیلاس خانی میں توڑی کا اَنگ قائم رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہمیں روشِ دین بدلنا ہو گی

روز نامہ پاکستان 31 مارچ 2016

کچھ کہنے کی مجال ہے نہ طاقتِ آہ و بکا ہے ۔ یہ جو انسانیت سوز حال ارضِ پاک پر پھر سے شروع ہو چکا ہے اس کا سدِ باب کون کرے اور کس طرح کرے؟ ۔ درمیان میں کچھ عرصہ سکون رہا تو ملک میں کاروبارِ زندگی پھر سے شاداب ہو گیا تھا لیکن شاید نامراد و مکروہ ارواح بے چین تھیں کہ آخر اِس قدر امن کیوں قائم ہو چکا ۔ سو اپنے مکروہ اور انسانیت سوز اقدام کے ذریعے حسبِ سابق ایک بار پھر معصوم جانوں کو بے موت مار کر اپنے قبیح مقاصد میں کامیاب ہو گئے ۔

ہمارے بہت سے دیسی لبرل دانشور اِس تمام صورت حال کو براہ راست مذہب سے منسلک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ اُن کا موقف ہے کہ مذہب ہی دہشت گردوں کو ایسے مکروہ اقدامات پر کاربند کئے ہوئے ہے گویا اِن کی اِس درندہ خوئی کا محرک مذہب ہے جبکہ دنیا کے تمام مذاہب کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قریباً تمام مذاہب کی ابتداء ہی ظلم کے خلاف جنگ سے شروع ہوئی ۔ پس مذہب کو انسانیت کُش بنا کر پیش کرنا معلوم انسانی تاریخ کے ساتھ زبردست ناانصافی ہے ۔ انسان فطرتاً قبیح اور صلیح ہوتا ہے ۔ مذہب تو انسان کو اخلاقی آلائش سے منزہ کرتا ہے تاکہ آپ ایک کھرے اور شفاف انسان بن سکیں البتہ مذہب کو کمرشلائز کر کے قبیح طبع اور تجارت پیشہ لوگ اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کیلئے مذہب کا سہارا لیتے ہیں اور پھر اِس کیلئے اُنہیں مذہب کو انتہائی خوفناک صورت میں ہی کیوں نہ پیش کرنا پڑے چنانچہ ایسے بدترین لوگوں کا محاسبہ بہت ضروری ہے ۔

میں اپنے اُن تمام دیسی لبرل دانشور احباب سے عرض کرتا چلوں کہ آپ معروف انسانیت پرست محترمہ مدر ٹریسا کو تو مانتے ہیں کیا وہ ایک کٹر مذہبی عورت نہیں تھی؟ ۔ بالکل تھی اور اُنہوں نے اپنی پوری زندگی زبردست مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ کمال انسانیت پرستی میں گزار دی ۔ آج بھی دنیا اُسے ماں جیسے عظیم المرتبت اعزاز سے یاد کرتی ہے ۔

پس یاد رکھیں کہ عقائد بے ضرر ہوتے ہیں ۔ اصل معاملہ تربیت کا ہوتا ہے کہ آپ اپنی اولاد، اپنے معاشرے اور رعایا کی کس بنیاد پر تربیت کر رہے ہیں اور کر بھی رہے ہیں یا محض اُنہیں خودسر بننے کیلئے آزاد چھوڑ دیا ہے ۔

مَیں نے ایک طویل عرصہ تقابل ادیان پر تحقیق کرنے کے بعد یہ نکتہ دریافت کیا کہ دنیا کے سب سے بہترین انسان

مذاہب کے بانی ہیں۔ جن میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، زرتشت، مہاویر، بدھ، گرونانک، بہاء اللہ وغیرہم بہت معروف ہیں اور دنیا آج بھی اِن ہستیوں کو علم وحکمت اور رحمت ومحبت کا پیکر مانتی ہے۔ اِن تمام ہستیوں کی تعلیمات میں کہیں بھی ظلم وتشدد کی تلقین نہیں کی گئی بلکہ ظلم وتشدد کے خلاف سینہ سپر ہو کر انسانیت کو جبر واستبداد سے نجات دلانے کی تلقین کی گئی ہے۔

ہمارا مذہب کہتا ہے کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے اور یہ بات ہر مسلمان مانتا ہے مگر ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو قرآن کے اِس واضح حکم پر عمل کرتے ہیں؟۔ اصل مسئلہ تعبیر کا ہے کہ آپ مذہب کے احکامات کو کن مآخذات کی بنیاد پر مانتے ہیں۔ ہمارا سب سے بنیادی مسئلہ اِس وقت تعبیرِ دین کا ہے یعنی ہمیں اپنے دین کو بالکل نئے سرے سے سمجھنا ہوگا۔ ہمیں اب امام غزالی کی جامدانہ روش ترک کر کے ابن الرشد اور ابن العربی کی روش اختیار کرنا ہوگی تب کہیں ہم اخلاقی طور پر بہتر ہو سکتے ہیں۔ مجھے ایک مغربی دانشور کی بات یاد آرہی ہے کہ اسلام ایک بہترین مذہب ہے اور مسلمان ایک بدترین قوم ہے۔ درست فرمایا اُنہوں نے کیونکہ اسلام کسی خاص قوم یا خطے کے لوگوں کا کنٹریکٹ نہیں تھا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اب اسے ایک تجارتی کنٹریکٹ بنا دیا گیا ہے۔ بہر حال اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنے آپ کو سدھار لیں۔

اِس وقت ہمیں القاعدہ، داعش اور تحریکِ طالبان کا اسلام نہیں چاہیئے۔ ہمیں ابن الرشد، ابن العربی اور سیدی جلال الدین رومی کا اسلام چاہیئے۔ اگر ہم نے آج بھی دین کی تعبیر نہیں بدلی تو پھر وہ دن دور نہیں جب ہم اپنے کرتوتوں کے سبب پوری دنیا کو اسلام سے متنفر کر دیں گے۔ جس طرح اِس وقت اسلام اور انسانیت کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو چکی ہے تو پھر اِس کو پاٹنا انتہائی مشکل ہو جائے گا۔ یاد رکھیں کہ جب دنیا کے کسی بھی مذہب اور انسانیت میں خاطرخواہ تضاد پیدا ہو جائے تو بہترین اذہان مذہب سے کنارہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اب آہستہ آہستہ ایسا ہو بھی رہا ہے کہ دنیا کے بہترین اذہان مذہب سے کنارہ کر رہے ہیں اور جس کی بنیادی وجوہات مذہب کی جامدانہ اور خودغرضی پر مبنی تعبیرات ہیں جو آج کے بہترین ذہن کیلئے کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں۔

اگر ہم مغرب میں سیکولر موومنٹ کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مذہب کی یہی گھٹن زدہ جامد اور خودغرضی پر مبنی تعبیرات تھیں جن کے سبب آخر کار مذہب کو ریاست سے بالکل الگ کر دیا گیا۔

ہم تو یہی کہتے ہیں کہ اسلام ایک انتہائی پُر امن اور محبت و رحمت کا دین ہے اور اسے ایسے ہی پیش کیا جائے جیسے کہ اسے ابن الرشد کی دانشمندانہ روشنی، ابن العربی کی باکمال معرفت اور سیدی جلال الدین رومی کی لازوال محبت میں پیش کیا گیا ہے۔مَیں کوئی نئی بات نہیں کر رہا مجھ سے پہلے اقبال نے بھی یہی بات کی تھی کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے دین کو دانش اور محبت میں پیش کر کے سیدی جلال الدین رومی کی روش اپنا لیں۔فرماتے ہیں۔ع

وقت است کہ بگشایم میخانہ رومی باز

پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست

ہمارے پاس اِس وقت صرف دو ہی راستے ہیں یا تو ہم اپنی دینی روش کو ابن الرشد کی منطق، ابن العربی کی معرفت اور سیدی جلال الدین رومی کی محبت کے تابع کر لیں یا پھر ہم سرے سے مذہب کو ریاست سے الگ کر لیں۔پس اگر ہم نہیں چاہتے کہ دین ہماری سیاست سے جدا ہو تو پھر ہمیں صوفیانہ روش اپنانا ہو گی۔اب صوفیانہ روش سے مراد بھنگ مافیا یا درباروں پر بیٹھ کر تجارت پیشہ لوگ یا پھر اولیاء کی قبور پر دھندہ کرنے والوں کی روش ہرگز نہیں بلکہ صوفیانہ روش سے مراد ابن العربی کی روش، سیدی جلال الدین رومی کی روش ہے۔جنہوں نے اسلام کی روح کو افزاء کیا اور دنیا میں ثابت کر دیا کہ اسلام سے بہترین روحانی معرفت اور محبت و رحمت کہیں موجود نہیں۔ہمیں اِس وقت ابن العربی کی معروف نظریاتی دانش وحدت الوجود کو نہ صرف سمجھنا ہو گا بلکہ فوری طور پر اپنے اعمال کا حصہ بنانا ہو گا جس میں کہا گیا ہے کہ انسان خدا کا مظہر ہے اور انسانیت کی اہانت ذاتِ خداوندی کی تنکیر ہے۔اِنہی نکات کو ابن العربی نے اپنی کتب فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔آپ اپنے ایک معروف بیت میں فرماتے ہیں۔ع

الرب عبد والعبد رب

یا لیت شعری من المکلف

ہمیں اعتقاداتِ صوفیاء کو اپنانا ہو گا جنہوں نے اسلام کے ذریعے نظریاتی تضادات کا خاتمہ کر کے انسانیت میں محبت و رحمت کو فروغ دیا۔پس اگر ہم اپنے دین کی حفاظت کیلئے دردمند ہیں تو ہمیں اپنی دینی روش تبدیل کرنا ہو گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

قرار دادِ لاہور

روز نامہ پاکستان 24 مارچ 2016

" آج کے اجلاس میں یہ نصب العین بدلنے کے لئے نوابزادہ لیاقت علی خان نے قرارداد پیش کی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا نصب العین اب قرار دادِ لاہور یعنی " پاکستان " ہو۔ مسلم لیگ کا نصب العین جغرافیائی لحاظ سے ایک منطقے میں مناسب مکانی تغیرات اور تبدیلیوں کے ساتھ ایسی آزاد اور کامل خود مختار ریاستیں ان کا آزاد وطن ہوں گی۔ یہ ریاستیں کلی طور پر آزاد اور خود مختار ہوں گی۔ اقلیتوں کے مذہبی، اقتصادی، تمدنی اور انتظامی حقوق کی حفاظت کے لئے اُن کے مشورے سے آئین میں واضح طور پر تحفظات ہوں گے۔ اُن علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اُن کے تمدنی، مذہبی اور اقتصادی حقوق کی حفاظت کے لئے آئین میں اُسی قسم کے واضح تحفظات ہوں گے۔"

نوابزادہ لیاقت علی خان نے قرارداد پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کا حکم رکھتا ہے۔ اب ہم لاہور کی قرارداد کو اپنا مطمح نظر قرار دے رہے ہیں اور اِسی قرارداد کو " پاکستان " کا نام دیا جاتا ہے۔ " ہم ہندوستان کو تقسیم نہیں کرنا چاہتے نہ ہی ہمارا مقصد کسی سے لڑائی ہے، ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے قومی وطن میں ہماری آزاد ریاست ہو اور اُس ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق محفوظ ہوں گے"۔ (روز نامہ انقلاب 17 مارچ 1941ء) بالکل ایسی آزاد ریاستوں کا تصور اِس سے قبل محمد اقبال بھی الہ آباد میں پیش کر چکے تھے جسے خطبہ الہ آباد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اگر اِس کو ہم انتہائی سلیس پیرائے میں بیان کریں تو اِس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہند کے مسلم اکثریتی خطے میں آزادانہ طور پر جغرافیائی منصوبہ بندی کی جائے گو کہ بعد میں اِسے نظریاتی تحفظ کیوں نہ حاصل ہو جائے۔ قائداعظم محمد علی جناح کا مطمح نظر بھی یہی تھا جسے قیامِ پاکستان کے بعد جعلی تھنک ٹینک نے ہائی جیک کر کے پاکستان کی نظریاتی اَساس ہی بدل کر رکھ دی۔ قرار دادِ لاہور یعنی قرار دادِ پاکستان دراصل ہند میں ایسی آزاد ریاستوں کے قیام کا پیش خیمہ تھی جس میں مسلم اکثریتی علاقوں کو ہر طرح کی مذہبی و تمدنی آزادی حاصل ہو اور بعینہ یہی آزادی اقلیت کو بھی حاصل ہو جیسا کہ درج بالا خطبہ میں واضح ہو چکا۔

اگر ہم قراردادِ لاہور کو مزید واضح کرنا چاہیں تو اس سے مراد وہ آزاد سیکولر سٹیٹس ہیں جن میں سے بعد میں ایس ہٹا کر سٹیٹ بنا دیا گیا۔ مطلق آزاد جامع ریاستیں ہیں جن میں ایڈمنسٹریٹیو ہولڈ مسلم اکثریت کے پاس ہو جبکہ اقلیت بھی محفوظ ہو اور ایسا یقیناً سیکولر منشور کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ جن ریاستوں میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے تو اُن میں سیکولر منشور کے ہی تحت اُنہیں مکمل مذہبی اور تمدنی آزادی حاصل ہوگی۔ بالکل یہی صورت حال آج ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان کے مسلمان آج بھی سیکولر منشور کی حفاظت کے لئے جدو جہد کر رہے ہیں اور اِس ضمن میں دیو بند کے علمائے کرام پیش پیش ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی سے لے کر مولانا ارشد مدنی تک تمام جید علمائے کرام ہندوستان میں سیکولر منشور کی زبردست حمایت اور اِس کے نفاذ کے لئے کڑی جدو جہد کر رہے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ ایک آزاد ریاست میں ہر انسان کو اپنے مذہبی نظریات کے تحفظ کے ساتھ زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

اگر ہم سیکولر منشور کو سائیڈ پر رکھ کر ہی سوچیں تو یہ منطق سمجھ میں آجاتی ہے کہ ایک آزاد ریاست میں ہر شہری کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیئے اگر بحیثیتِ پاکستانی مسلمان ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی و تمدنی تحفظ کے لئے آواز بلند کریں تو یاد رکھیں کہ ہمیں بحیثیتِ پاکستانی مسلمان پاکستان میں بھی اقلیتوں کو مذہبی اُمور کی انجام دہی مکمل آزادی کے ساتھ دینا پڑے گی۔ پس اگر ہم اس نکتے سے متفق ہیں تو ہم نے غیر شعوری پر سیکولر منشور کی حمایت کر دی۔

اگر ہم آل انڈیا مسلم لیگ کا دقیق منطقی تجزیہ کریں تو ہند میں اِس جماعت کے بانی اسماعیلی امام سر سلطان محمد آغا خان سوم ہیں جو ایک زیرک سیاستدان اور مایہ ناز مسلم سکالر تھے۔ ہند میں اسماعیلی نظریات کے حاملین کے نظریاتی و تمدنی تحفظ کے لئے دولتِ فاطمین کی طرز پر ایک آزاد ریاست قائم کرنا چاہتے تھے کہ جس میں فاطمی تمدن کا احیاءِ عمل میں لایا جائے لیکن یہ جماعت قائد اعظم محمد علی جناح کی شمولیت کے بعد سیکولر منشور پر رواں ہوگئی جبکہ اِس سے قبل محمد علی جناح اپنے سیاسی سفر کا آغاز کانگریس سے کر چکے تھے اور یہی کیفیت لگ بھگ محمد اقبال کی بھی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ میں بھی وطن پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن یہ جماعت ہند میں کانگریس کی نسبت انتہائی غیر فعال تھی۔ اِسی لئے اس جماعت کو محمد علی جناح جیسے عظیم مدبر کی اَشد ضرورت تھی۔ ہند میں آل انڈیا مسلم لیگ کی فعالی سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے تمام تر مراحل میں محمد علی جناح کو ایک انتہائی ذمہ دار قائد کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔

قراردادِ لاہور یعنی قراردادِ پاکستان کسی مخصوص نظریاتی خطے کے قیام کا لائحہ عمل نہیں تھی بلکہ یہ اُن چند آزاد اور خود مختار ریاستوں کی آئینی بنیاد تھی جن کا قیام مسلم اکثریتی علاقوں میں عمل میں لایا جاتا مگر بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اِس قرارداد کو ایک مخصوص نظریاتی اسٹیٹ میں تبدیل کر کے قراردادِ لاہور کا مقصد ہی ختم کر دیا گیا۔یقین کیجئے جو حشر ہم نے قراردادِ لاہور کے ساتھ کیا بالکل وہی حشر آج ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

ہماری انتہائی بدقسمتی یہ تھی کہ قیامِ پاکستان کے فوری بعد قائداعظم محمد علی جناح ہم سے رخصت ہو گئے پھر سب جہاں تھا وہیں دھرے کا دھرا رہ گیا بلکہ پاکستان کی نظریاتی اَساس سے لے کر اِس کی تمدنی و اقتصادی بنیاد کو بھی مضمحل کر دیا گیا جس کے سنگین نتائج ہم آج بھگت رہے ہیں۔

قریباً اَڑسٹھ سال گزر جانے کے بعد آج بھی ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں ہمیں قائد چھوڑ کر گئے تھے بلکہ اُس سے بھی بدترین مقام پر۔قیامِ پاکستان کے فوری بعد فوجی آمروں کی پے در پے شورش نے اِس ریاست کو ایک غیر منطقی اور مبہم ڈگر پر روانہ کر کے بے ایمانی اور جبر و استبداد کی تمام حدیں پھلانگ دیں۔میں یہاں پر مشرقی پاکستان کے ساتھ روا رکھی گئی فوجی بربریت کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا کہ اِس سے مضمون کا رخ ہی بدل جائے گا ورنہ ہمارے فوجی آمروں نے جماعتِ اسلامی کے جنگجو گروپ البدر اور الشمس کے ساتھ مل کر جو بنگالیوں کا انتہائی بے دردی سے قتل عام کیا اُس کا ادنیٰ کا تذکرہ کرنے کے بعد پاکستان میں کوئی بھی رحمدل اور سلیم الفطرت انسان رہنا گوارا نہیں کرے گا۔

بدمعاشی،جھوٹ،منافقت اور لُوٹ مار ہم میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ریاست کا بانی جن لوگوں کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا شومئی قسمت کہ آج وہ ریاست کے اربابِ حل و عقد بنے بیٹھے ہیں اور نہ صرف ریاست کی نظریاتی اساس کو ہائی جیک کیئے ہوئے ہیں بلکہ عوام کو بھی دو قومی نظریہ کی مبہم بنیاد پر قیام پاکستان سے لے کر اب تک مسلسل بیوقوف بناتے آ رہے ہیں۔یہ وہی لوگ ہیں جو کل قیامِ پاکستان کی شد و مد سے مخالفت کر رہے تھے۔یہ تنقید نہیں بخدا درد ہے جو اپنی دھرتی کے لئے سینے میں اُبل کر الفاظ کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہم گم گشتہ قوم

روزنامہ پاکستان 17 مارچ2016

انسان اُس وقت تباہ ہو جاتا ہے جب وہ اپنے اصل سے ٹوٹ کر نقل کی طرف بھاگنے لگ پڑے۔اصل سے مراد انسان کا تہذیبی تعلق اور نقل سے مراد انسانی کا نظریاتی تعلق ہے۔ورتمان (موجود) میں جینا کوئی برائی نہیں لیکن اِس کیلئے اپنی تہذیب سے بیگانہ ہو جانا تنزلی کو دعوت دینا ہے۔دنیا میں ہر قوم علم و اخلاق کی بنیاد پر ترقی کی منازل طے کرتی ہے اور علم سے مراد اپنی تہذیب پر قیام کرتے ہوئے زمانِ جاریہ میں نت نئے تجربات کرنا جبکہ اخلاقیات سے مراد رویہ کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا۔

اِن بنیادی اقدار سے بے اعتناعی انسان کو ایسا بنا دیتی ہے جیسے کہ آج ہم بن چکے۔پاکستان جو ہندوستانی تہذیب ہی کا ایک مختصر سا حصہ ہے۔ہمارا پیارا ملک ہے۔امرتسر اور لاہور میں دیوار ڈال لینے سے آپ تہذیب کے بخرے نہیں کر سکتے۔اگر کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے جیسے آج ہم ہو چکے۔کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ ہندوستان میں بیٹھا عالم جب کہتا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہے تو پاکستان میں بیٹھا عالم کہتا ہے کہ نہیں صاحب یہ جھوٹ ہے ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے کیونکہ مسلمان ایک نظریے کا نام ہے اور پاکستان ایک خالص نظریاتی ریاست ہے۔

یہی پاکستانی عالم کچھ دیر بعد جب شیعہ،سنی بریلوی اور اہل حدیث کے باہمی اختلافات پر سیخ پا ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ پاکستان کسی شیعہ یا سنی کا نہیں ہم سب کا ہے یہاں پر کوئی نظریاتی اختلاف نہیں،ہم پاکستانی قوم ہیں۔اب اِس گفتار کے غازی سے کوئی یہ کہہ دے کہ جب نظریے کی کوئی وقعت ہی نہیں تو پھر پاکستان کا وجود کس بنیاد پر قائم کیا؟۔شیعہ اور سنی میں محض کوئی فروعی اختلاف نہیں۔میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ شیعہ کے ہاں دین کے مآخذ سرے سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔کوئی بھی سنی اسلام سے شاہکارِ رسول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مبرا نہیں کر سکتا لیکن اہل تشیع کے ہاں خلفائے راشدین کا کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا۔اہلِ تشیع کے ہاں امامت اہلِ سنت کی طرح کوئی علمی منصب نہیں بلکہ بنیادی مآخذِ دین ہے،تو جناب یہ کوئی کم اختلاف ہے؟۔

میں اگر نظریہ کی بنیاد پر اوطان کی تقسیم کا قائل ہوتا تو پاکستان میں شیعہ اور سنی مملکت کی تجویز ضرو پیش کرتا۔

بچپن سے لیکر آج تک مسلسل تحقیق کے بعد کوئی بھی ایسا ٹھوس تحریری ثبوت نہ مل سکا کہ قائد نے یہ ملک کسی نظریہ کے تحت بنایا تھا اگر آج بھی ہم نے اپنے بچوں کو جھوٹ پڑھایا تو یقین جانئے آنے والے کل میں بھی ہم اسی طرح معاشرتی وفکری طور پر دنیا کے سامنے مغلوب رہیں گے۔ایک معروف نیم مذہبی دانشور جو سابق بیوروکریٹ بھی ہیں ایک چینل پر آکر فرماتے ہیں کہ قائد کو سیکولر کہنا جائز نہیں کیونکہ ٹائی تو میں بھی لگاتا ہوں۔ پینٹ تو میں بھی پہنتا ہوں اگر مجھے کوئی سیکولر کہے تو میں گالی سمجھوں گا۔

اگر قائد اسلام کی سربلندی کے لئے ایک الگ ریاست بنانا چاہ رہے تھے تو کیا شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی اور متکلم اسلام ابوالکلام آزاد اسلام سے بیگانہ ہو گئے تھے؟۔پس علمائے ہند کی دینی حیثیت کچھ نہ تھی جو ہندوستان میں اسلام کے نظریاتی محافظ بن کر کھڑے تھے؟۔ویسے تو ہمارے ہاں مولوی کا کوئی قبلہ نہیں ہوتا۔جہاں جاہ وحشم دِکھے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔مفتی محمود مرحوم نے شورش کاشمیری کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "شکر ہے ہم پاکستان بننے کے گناہ میں شامل نہیں تھے"۔بعد میں کیا ہوا، وہی مفتی محمود سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے اور اُن کی نسل آج پاکستان کی نظریاتی اَساس کو ٹھیکہ پر لے چکی ہے۔پھر کہتے ہیں اَجی پاکستان نے اتنے سالوں میں ترقی کیوں نہیں کی۔

جب تک پاکستان کی مبادیات درست نہیں ہوں گی، ترقی محض ایک خواب ہی رہے گی۔تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر قوم کا خمیر تہذیب سے اُٹھتا ہے چنانچہ بغیر تہذیب کے قوم چوپایوں کا ریوڑ بن جاتی ہے۔ہم دنیا میں واحد قوم ہیں جس کا خمیر اسٹیبلشمنٹ سے اُٹھتا ہے۔اسٹیبلشمنٹ کی اقوام راسخہ اب اپنے اختتام کی جانب رواں دواں ہیں پس جلد ہی خمیرِ پاکستان کسی نئی قوم کا اعلان کرے گا پھر جس نے اگلی چند دہائیاں اپنے پیشروؤں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔ہم عرب ہیں نہ ایرانی اور خبردار جو ہندوستانی کہا نہیں تو را کے ایجنٹ تصور کئے جاؤ گے اور اگر اِس پر اصرار کیا تو غائب بھی ہو سکتے ہو۔

ہماری تہذیبی اقدار سنسکرتی ہیں نہ عربی اور نہ ہی ایرانی البتہ اِن تینوں کا مربہ کہہ سکتے ہیں۔گویا ہم نظریاتی طور پر عرب کے ذہنی غلام ہیں تو کچھ تعداد میں ایران کے فکری مقلد اور نچلا طبقہ تو سنسکرتی تہذیب کا سماجی غلام۔ہماری جو ایلیٹ کلاس ہے وہ تو فکری اور سماجی دونوں لحاظ سے انگریزی تہذیب کی پالنہار ہے۔اِس کے علاوہ جو مڈل کلاسئے ہیں وہ عرب اور ایرانی تہذیب وتمدن کے غلام اور نہ صرف غلام ہیں بلکہ اُنہیں غلامی پر فخر بھی حاصل ہے۔

رہ گیا پسا ہوا طبقہ چونکہ اِن میں زیادہ تر ہندو سے مسلمان ہوئے لوگ ہیں تو اُن کی خصلت سے آج تک سنسکرتی تمدن کی لاشعوری تابعداری نہیں گئی۔ پس ہمارے پاس خالص اپنی شناخت کوئی نہیں ہے۔ ہمیں دنیا میں اپنا آپ منوانے کیلئے یا تو ٹائی سوٹ لگا کر انگریز کا دم بھرنا پڑتا ہے یا پھر گھیرے دار لباس پہن کر عربوں کی غلامی کرنا پڑتی ہے تب کہیں جا کے ہمیں دنیا پہچانتی ہے۔

ہم اپنی تہذیب سے کٹ گئے تو ہمارے پاس قومیت کی علت ہی ناپید ہوگئی۔ جب قومیت کی علت ہی ناپید ہوگئی تو پھر ہم ایک ریوڑ بن گئے جس کو مطلق العنان لوٹتا رہا ہے، کبھی دفاع کا اعلان کر کے تو کبھی مذہب کے نعرے لگا کر اور کبھی قومیت کے جھنڈے تلے جمع کر کے کیونکہ ہماری کوئی تہذیب نہیں۔

اِس لئے ہماری تہذیب اسٹیبلشمنٹ ہے پس ہماری تہذیب یعنی اسٹیبلشمنٹ پہلے اقوام بناتی ہے پھر اُنہیں را کا ایجنٹ قرار دیکر نیست و نابود کر دیتی ہے۔ عرب اور ایرانی اقوام کو کبھی دنیا آنکھیں نہیں دِکھا سکتی کیونکہ وہ اپنے خمیر پر کھڑے ہیں اپنی تہذیب پر قائم ہیں اور ہم اپنی تہذیب یعنی اسٹیبلشمنٹ پر جو کہ ماہر ہے نہ صرف اقوام بنانے میں بلکہ اُنہیں گم گشتہ کرنے میں بھی دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

☆☆☆☆☆☆☆

تحفظِ نسواں کا صحیح مفہوم

روزنامہ پاکستان 03 مارچ 2016

عورت محبت و خدمت کی عملی شکل ہے۔عورت کا جسمانی و روحانی استحصال دراصل نسل انسانی کی بقاء کے لئے سم قاتل ہے اور عورت کے استحصال کا سب سے مثبت درجہ یہ ہے کہ آپ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری بیاہ کر لے آئیں۔اب آپ اعتراض کریں گے کہ مذہب تو اِس چیز کی اجازت دیتا ہے تو آپ کون ہوتے ہیں پابندی لگانے والے؟۔دراصل بات یہ ہے کہ مذہب انسان کے انفرادی وجود کو مخاطب کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے" قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی "یعنی کامیاب ہوگیا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا۔مذہب جیسے ہی تزکیہ نفس سے آگے بڑھتا ہے تو شعور اور کیوم کا نشتر لیکر کھڑا ہو جاتا ہے۔بات ذرا تلخ ہو جائے گی نہیں تو ابو بکر رازی نے کہا تھا کہ عقل کے ہوتے ہوئے وحی کی افادیت فہم سے بالاتر ہے۔اقبال نے رازی کے پیچ و تاب کا اعتراف کرتے ہوئے بہر حال جواب تو دیدیا۔ع

اِک دانش نورانی اِک دانشِ برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

دنیا کا کوئی بھی مذہب عورت کے تحفظ کی مخالفت نہیں کرتا بالخصوص اسلام نے تو عورت کو بدوؤں کے ظلم وستم سے نجات دلائی جو عورت کے معاملے میں وحشی صفت واقع ہوئے تھے۔پیغمبر اسلام حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عورت کو محبت و تقدس کی روشنی سے منور کر دیا۔روایات کے معاملے میں خاصا تساہل برتتا ہوں لیکن آپ کا یہ معروف ارشاد کہ" اے مسلمانو! عورت کے معاملے میں ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا" سے کون مسلمان واقف نہیں لیکن اِس کے باوجود بھی رجعت پسند مولوی اسلام کی خود ساختہ تعبیر پیش کر کے نت نئی نظریاتی جنگ چھیڑ دیتا ہے۔دنیا کا ہر مذہب بالعموم اور اسلام بالخصوص اِس بات پر زور دیتا ہے کہ ایک انسان اپنے نفس میں موجود آلائش کو دور کرے لیکن آج کا مولوی اسلام کو اپنی من پسند تعبیرات میں لپیٹ کر پیش کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جدید ذہن مذہب سے بیزار ہو رہا ہے۔ پاکستان ایک اسلامی جمہوری ریاست ہے، مطلب یہاں ہر شہری کو قرآن وسنت سے غیر متصادم قانون سازی کا مکمل حق حاصل ہے اِس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ اصل میں معاملہ اُس وقت خراب ہو جاتا ہے جب اسلام اور جمہوریت کو آپس میں متصادم قرار دیا جاتا ہے تو تب انسان اسلام کا رہتا ہے نہ ہی جمہوریت کا۔

دوٹوک بات یہ ہے کہ مذہب اور جمہوریت دو الگ الگ معاملات ہیں اور دونوں میں جوہری اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسلام میں قانون سازی کا مطلق حق خدا کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں جبکہ جمہوریت کا سادہ مطلب یہ ہے کہ ہر شہری کو بلاامتیاز قانون سازی کا حق دے دیا جائے چاہے وہ قانون نصوص یا ڈیوائن کے خلاف کیوں نہ ہولیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں مذہب اور جمہوریت آئین میں ایک مربہ کی شکل لئے ہوئے ہے اور یہی بنیادی وجہ ہے جو لبرل اور مولوی کو باہم نظریاتی جدل پر کاربند کئے ہوئے ہے۔

اب ملک کی نظریاتی مبادیات کو کون اَتاترک متناسب کرسکتا ہے؟ ۔نہیں معلوم، لیکن اتنا تو واضح ہے کہ اِس ملک کو معرض وجود میں لانے والی شخصیت کسی بھی لحاظ سے مذہبی ذہن کی حامل نہیں تھی۔ قائد کو کیا معلوم تھا کہ اُس کی آزاد فکری ریاست اصغرسودائی کے نعرے "پاکستان کا مطلب کیالاالہ اللہ" کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔

جس ریاست کے پہلے نامزد وزیرِ قانون اور وزیرِتعلیم ایک ہندو پنڈت جوگندر ناتھ منڈل اور وزیر خارجہ احمدی (قادیانی) مبلغ چوہدری ظفراللہ خان تھے نہ معلوم وہ کب رجعت پسند مولوی کے ہتھے چڑھ گئی۔ تحفظ نسواں کی ضرورت اُن بدترین معاشروں میں پیش آتی ہے جہاں کے مرد شدید جنسی گھٹن میں مبتلا اور اخلاقیات سے عاری ہوں۔ ہمارے معاشرے میں نقاب اور عبایا میں لپٹی ہوئی دوشیزہ یا اُدھیڑعمر مائی جب گھر سے قدم باہر رکھتی ہے تو ہم مردوں کے نظریں بصورتِ تیر اُن کے خدو خال کو چیر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی عصمت دار دوشیزہ معاش کی مجبوری سر پہ اُٹھائے جب آفس جاتی ہے تو باس اُس کی عصمت کی قیمت چند اعلیٰ مراعات کے عوض خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور مزاحمت کی صورت میں اُس کو ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ایسی بھیانک صورتحال میں تحفظ نسواں بل تو درکنار تحفظ نسواں آئین مرتب کرنا چاہیئے جس میں یہ قانون درج ہو کہ جو بھی مرد بلا ضرورت کسی اجنبی عورت کو تاکنا شروع کردے تو اُسے فوری طور پر حوالات میں بند کر دیا جائے۔

ہمارے ہاں ایک بنیادی مسئلہ ارینج میرج کا ہے جس میں دو انسانوں کی بجائے دو خاندانوں کے درمیان شادی ہوتی ہے ۔ایسی صورت میں مرد کا ایک اجنبی عورت کے ساتھ شفقت سے پیش آنا محض ایک چانس ہی بن جاتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں نکاح کے بعد عموماً عورت قید اور مرد آزاد ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ مرد بزعم خود اپنی عورت پر ہر طرح کی برتری کا خواہاں رہتا ہے ۔اِس کے برعکس ہمارے معاشرے میں عموماً عورت کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا چنانچہ اکثر عورتیں اِس اذیت ناک صورتحال کو نصیب کا کھیل سمجھ کر وقت کو دھکا لینے لگ جاتی ہیں کیونکہ ہمارے ہاں مرد کے مقابلے میں عورت کی دلیل اُس کی گستاخی اور کمینگی پر محمول کی جاتی ہے ۔پس عورت اپنے ہونٹ سی کر تادمِ زیست مرد کا بہیمانہ تشدد برداشت کرتی رہتی ہے ۔شادی محض جسمانی ضرورت کی تکمیل یا افزائش نسل کا ذریعہ نہیں بلکہ شادی دراصل دو انسانوں کی روح کے مضبوط تعلق اور عبودیت کی سب سے بہترین شکل ہے اور عبادت تبھی ممکن ہو سکتی ہے جب روح کا روح سے اتصال ہو جائے ۔ایسا اتصال بے لوث اور مبنی بر اخلاص ہوتا ہے اور اِس میں کسی قسم کی لالچ وغیرہ کا امکان باقی نہیں رہتا۔البتہ شادی کے بعد عورت کی بنیادی ذمہ داریوں میں اپنے خاوند کی خدمت، اُمور خانہ داری اور اولاد کی تربیت اوّلین درجہ رکھتی ہیں ۔اگر اِن تین ذمہ داریوں میں کوئی خلل نہ آئے تو عورت کسی بھی سماجی اُمور کی انجام دہی یا معاشی ذمہ داری اُٹھا سکتی ہے ۔پس مہذب معاشروں میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔

مغرب میں لاتعداد ایسی پڑھی لکھی عورتیں موجود ہیں جو صرف اپنے گھر اور بچوں کی تربیت کیلئے اپنے آپ کو وقف کر چکی ہیں ۔میں ذاتی طور پر اِس کا مشاہدہ کر چکا ہوں ۔لیکن جنہیں معاشی مسائل کا سامنا ہوتا ہے تو وہ ضروریات زندگی کی تکمیل کیلئے احسن طریق اور کما حقہ خود داری سے ملازمت بھی کرتی ہیں ۔ہمارے ہاں مذہبی سکالر مذہبی مشقات پر تو دن رات توجہ دلاتے رہتے ہیں اور جہنم کے عذاب سے بچنے کیلئے وظائف و اوراد بتاتے رہتے ہیں لیکن معاشرے کو بدترین اخلاقی رویوں سے جہنم بنانے والے مرد حضرات کی اصلاح کی کوشش بالکل نہیں کرتے کیونکہ ہماری ترجیحات دنیا سے ماوراء ہیں ۔ہمیں موجودہ زندگی سے بے خبر اُس زندگی کو بہتر بنانا ہے جس کے لئے پہلے مرنا ضروری ہے ۔سدگرو اُوشو فرماتے ہیں کہ ”سوال یہ نہیں کہ آپ موت کے بعد کی زندگی کیلئے کیا کچھ کر رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ آپ موت سے پہلے کی زندگی کو واقعی زندہ ہو کر جی رہے ہیں“ ۔

☆☆☆☆☆☆☆

ایمان ،الحاد اورتصوف

روزنامہ پاکستان 25- 18فروری 2016

اکتوبر 2013انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملائشیاء میں ایک علمی سیمینار کے دوران سوال کیا گیا کہ ایمان اورالحاد میں کیافرق ہے اورکیااِس دورمیں ایمان کوعقلانے کی گنجائش موجود ہے؟ ۔جب میری باری آئی تو میں نے عرض کیا" جو لوگ سوچتے ہیں وہ مانتے نہیں اور جو مانتے ہیں وہ سوچتے نہیں" ۔ جی ہاں ۔اصل میں بات یہ ہے کہ ایمان ،مذہب اوردین سے متعلق تمام معاملات کا تعلق علم وعقل سے نہیں جذبات سے ہے ۔

جدید ذہن امام غزالی کی مخالفت کرتا ہے کیونکہ آپ نے دین میں سوچنے سمجھنے کو گمراہی قرار دیا ہے جبکہ آپ نے صرف عقل کے خلاف بات نہیں کی بلکہ عقل کے حق میں بہت سی روایات بھی احیاء العلوم میں بیان کی ہیں ۔امام غزالی ایک منطق شناس اورحق رسیدہ عالم تھے ۔وہ دین میں غوروفکر کے ہر پہلوکوبخوبی جانتے تھے تبھی تو آپ نے تہافتہ الفلاسفہ تحریر کر کے فلاسفہ کی بوقلمونیوں کو آشکار کرنے کے بعد دین میں غوروفکر کی تمام راہیں قریباً مسدود کر دیں ۔

دین کے معاملے میں غوروفکر انسان کو گمراہ کر دیتا ہے اور یہی دراصل ہمارے علماء کاروایتی نقطہِ نظر ہے ۔مولوی کے نزدیک دین روایت کا نام ہے تو فلاسفر اِسے علم کہتا ہے جبکہ صوفی کے نزدیک دین عشق ہے ۔اَدیانِ عالم،عالمگیر تصوف،فلسفہ اورعلمِ نفسیات کا طالبعلم ہونے کے ناطے مجھے یکے بعد دیگرے اِن تین روایتی مکاتب پر بات کرنی ہے ۔جہاں تک امام غزالی کی بات ہے تو آپ بھی زمانہِ شباب میں ذہین فلسفی رہے ہیں ۔آپ نے علوم متداولہ کے علاوہ مابعدالطبیعیات پر زبردست مہارت حاصل کی ۔آپ نے فلاسفہ یونان کے نظریات کو بھی بہت گہرائی سے پڑھا اورسمجھا چنانچہ اُس دور کے عظیم مسلم فلاسفہ ابن الرشداورابن سینا کے نظریات سے بھی بھرپوراستفادہ کیا اور پھر ابن سینا اورابن الرشد کے نظریات پر زبردست تنقید بھی کی ۔

امام غزالی ابتدائی عمر میں منطق کے دلدادہ تھے پھر دین کی طرف دھیان ہوا تو اسلام کے حق میں زبردست منطق پیش کی ۔عقائد سے لیکر معاملات تک کو منطق کی روشنی سے منور کر دیا ۔یہی وجہ ہے کہ آپ تاریخ میں حجتہ الاسلام کے لقب سے جانے جاتے ہیں ۔

آخری عمر میں آپ تصوف کی جانب مائل ہو گئے تھے اور اِسی مکتب کی پیروی میں آپ کا انتقال ہوا۔امام غزالی کا تذکرہ کرنے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ آپ نے عقائد و معاملات کو عقلانے کے بعد دین میں غور وفکر کی راہیں مسدود کر کے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جو بھی ذہین دین میں غور وفکر کی راہ اپنائے گا بالآخر وہ گمراہ ہو جائے گا۔پس اِسی گمراہی کو اِلحاد کہا جاتا ہے۔یہی وہ اصل الحاد ہے جس کا شکار اکثر ذہین علماء ہوتے رہے ہیں۔اب یہاں پر ایک انتہائی دقیق نکتہ یہ بھی ہے کہ غور وفکر کوئی قبیح فعل نہیں ہے۔انسان اب تک غور وفکر ہی کے بوتے پر یہاں تک پہنچا۔چلیں اِس کو ذرا سلیس پیرائے میں بیان کرتا ہوں۔دیکھیں مذہب ہو یا دین اِس کا تعلق صرف جذبات سے ہوتا ہے اور جذبہ کی صفت یہ ہے کہ وہ عقل سے عاری ہوتا ہے مطلب جس میں فکر شامل ہو جائے وہ جذبہ نہیں رہتا۔

ہمارے ہاں اکثر بولا جاتا ہے، دل اور دماغ گویا دل کی بات دراصل جذبات کی بات ہوتی ہے اور دماغ کی بات سوچ اور فکر کی یعنی وہ کام جو بنا غور وفکر کے کیا جائے وہ جذبہ ہوتا ہے اور جس کا تجزیہ کر لیا جائے وہ فکر سے متعلق ہوتا ہے۔پس دین ایسے سلوک کا نام ہے جو خالص جذبات سے متعلق ہو۔دین میں اِس روش کے قائل صرف صوفیاء ہی ہیں۔مسئلہ اُس وقت بگڑتا ہے جب مذہبی عقائد اور معاملات کو عقلانے کی کوشش کی جائے۔حقیقت یہ ہے کہ ایسا بالکل ہو ہی نہیں سکتا سوائے ملمع سازی کے۔مثال کے طور پر آپ نے تسلیم کر لیا کہ ایک درخت ہے جو خود بخود ہے۔ یہاں تک تو کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی اِس سے آگے جب آپ یہ کہتے ہیں کہ اُس درخت کی فلاں فلاں شاخ کے اَسباب یہ وہ ہیں۔یہاں سے پھر دجل شروع ہو جاتا ہے کیونکہ جب آپ پہلا نکتہ بغیر سبب کے تسلیم کر چکے ہیں تو پھر آگے کے نکات میں عقل استعمال کرنے کا کیا فائدہ؟لیکن اِس کے برعکس عقلیت کی ایک فطری کمزوری یہ بھی ہے کہ یہ بغیر اعتقاد کے کلام کا سہارا ہی نہیں لے سکتا۔

معاملہ یوں ہوا کہ آپ نے ایک جھوٹ گھڑ کر سچ کی دعوت شروع کر دی اور پھر جھوٹ کی شدید مخالفت۔ایک ذہین عالم جب مذہبی عقائد کو منطق کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کرتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ اُس کے عقائد محض اُس کے یقین کی بنیاد پر کھڑے ہیں اور اُس کا یہ یقین عام اصطلاح میں "ایمان" کہلاتا ہے۔اگر وہ سچ کی تلاش میں عقائد سے لاتعلق ہو کر آگے نکل جائے تو اِسے اصطلاح میں "الحاد" کہا جاتا ہے۔پس یہی بنیادی فرق ہے ایمان اور الحاد میں۔ہر ذہین عالم دین اگر وہ کسی ذاتی مفاد کے زیرِ اثر نہ ہو تو زندگی میں ایک بار الحاد کی جانب ضرور جاتا ہے۔

ایک نا قابل تردید سچ تو یہ ہے کہ جس شخص نے الحاد کا درد نہ سہا ہو وہ ایمان کی لذت سے محروم ہی رہتا ہے۔صوفی سوداگر نے سچ ہی کہا ہے۔ع

کافر نہ شدی لذتِ ایماں کہ شناسی

مولوی کہتا ہے کہ دین روایت ہے۔مولوی سے مراد اہل سنت الجماعت کے علماء ہیں۔ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک بن انس اور بالخصوص امام احمد بن حنبل روایت کے قائل تھے۔امام ابوحنیفہ کا زیادہ تر دھیان تو روایت کی بجائے قیاس کی جانب تھا لیکن باقی تینوں امام روایت پر کاربند رہے بالخصوص امام احمد بن حنبل کا روایات کے حق میں معتزلہ کے سامنے ڈٹ جانا ہی اُن کے روایات پر اعتماد کی قوی دلیل ہے۔قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس یہ وہ چار ماٰخذ ہیں جن سے اہل سنت والجماعت کے نزدیک دین پھوٹتا ہے۔یہاں پر روایت کے ساتھ ساتھ کسی زمانے میں درایت بھی پائی جاتی تھی لیکن امام غزالی کے بعد یہ روش ناپید ہوگئی۔پھر بعد میں جتنے بھی ذہین علماءِ دین میں عقل کی طرفداری کرتے تو وہ اجماع سے اپنا علمی تعلق توڑ بیٹھتے اور عوام میں غیر مقبول ٹھہرتے۔

ابن حزم اندلسی اور امام ابن تیمیہ اِس کی واضح مثال ہیں۔دوسرے نمبر پر وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین کو عقل کے تابع کر دیا۔اُن میں معروف لوگ تو معتزلین ہیں لیکن اِس منہج میں مسلم فلاسفہ ابن سینا، ابن رشد، اسحاق کندی، ابوبکر رازی اور قاضی معریٰ وغیرہم کے علاوہ ایک بڑی تعداد شامل ہے جنہوں نے قرآن کے بعد محض عقل کو ترجیح دی بلکہ بعض فلاسفہ تو وحی کے مقابلے میں عقل کو ترجیح دیتے رہے جیسا کہ قاضی معریٰ اور ابوبکر رازی۔

عرب اہلِ یونان کے برعکس اتنے عقل پرست نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ جلد ہی یہ منطقی روش ناپید ہوگئی اور بہت جلد معتزلہ کے بہت سے ذہین علماء واپس روایت کی جانب لوٹ آئے جن میں معروف شخصیت امام الکلام ابوالحسن الاشعری ہیں جنہوں نے چالیس سال تک معتزلہ کے عقائد کا دفاع کیا بعد میں اپنی روش متعارف کرا لی جس میں روایت و درایت کا خوبصورت اِمتزاج موجود ہے۔اہل سنت کے بطن سے کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو قرآن کو عقلی معانی دے کر روایات سے دور ہو گئے۔یہ لوگ خالص قرآنی کہلاتے۔

اِن میں معتزلہ کے علماء واصل ابن عطاء،جہم بن صفوان ،علامہ زمخشری اور جاحظ معروف ہیں ۔یہ لوگ جعلی مجموعہِ احادیث کے سبب روایات کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے ۔اِن لوگوں نے حضرت عمرؓ کے مشہورِ زمانہ قول کا بھرپور نعرہ لگایا کہ"حسبنا کتاب اللہ "یعنی ہمارے لئے خدا کی کتاب ہی کافی ہے۔

اہل القرآن کے برعکس ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہوگیا جنہوں نے قرآن کو روایات کے تابع کر دیا یہ لوگ خود کو اہل الحدیث،سلفیہ اور اصلی اہلِ سنت کہتے ۔اِن کے نزدیک محدثین ایران جنہوں نے صحاحِ ستہ مرتب کی معتبر ٹھہرے ۔یہ لوگ قرآن اور حدیث سے آگے جانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے ۔اِن کے نزدیک دین کا مآخذ قرآن اور حدیث ہے لیکن اِن کے علماء قرآن کو محض روایات سے متشرح کرتے ہیں اور منطق وقیاس سے یکسر گریز کرتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے علاوہ ایک دوسرا بڑا مکتب اہل تشیع کا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو سلسلہِ خلافت کے قائل نہیں ۔یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آپ کا دینی جانشین،وصی اور حقیقی امام تسلیم کرتے ہیں۔ اِن کے نزدیک امام کا وہ مفہوم نہیں جو اہل سنت کے ہاں پایا جاتا ہے ۔یہاں امام سے مراد ماہرِ فن نہیں بلکہ وصیِ رسول ہے ۔چنانچہ اِن کے نزدیک دین کے منابع قرآن،روایاتِ معصومین،عقل اور اجماع ہے۔

یہ سنن نبوی دراصل معصومین کی جاری کردہ روایات سے اَخذ کرتے ہیں ۔اہل سنت کے برعکس اہل تشیع میں عقل کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے ۔اثناءعشریہ کے برعکس اسماعیلیہ اور نزاریہ جو پانچ اَئمہ پر قیام کرتے ہیں، کے نزدیک روایت کی جگہ عقل اور بیعت پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اب اسماعیلیہ اور نزاریہ کے نزدیک روایت قریباًناپید ہو چکی ہے ۔دین کے اِس قدر مختلف النظر مکاتب بیان کرنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ دین میں جب غوروفکر سرانجام پاتا ہے تو پھر فرقے جنم لیتے ہیں۔

ہم اِسے اصطلاحاً مکاتب کہہ رہے ہیں لیکن دراصل یہ تفرقہ ہی کی علمی شکل ہے ۔اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی بھی دینی مکتب کسی دوسرے مکتب پر تکفیر یا اِرتداد کے فتوے نہ لگاتا۔ یہاں پر ایک علمی اعتراض پر بات ہو جائے کہ اکثر ذہین علماءدین میں علمی اختلاف کو احسن قرار دیتے ہیں حتیٰ کہ اِس ضمن میں ایک روایت بھی گھڑلی گئی کہ اُمت میں اختلاف رحمت ہے حالانکہ کوئی بھی سلیم الفطرت یہ بات تسلیم نہیں کرسکتا کہ اختلاف باہم رحمت بن سکتا ہے ۔اختلاف تو زنگ ہے جو دلوں کو میلا کر کے کدورت پیدا کرتا ہے چنانچہ اِس کو رحمت کہنا تفرقہ بازی اور مفاد پرستی کی اخیر ہے۔

نظریہ کوئی اِس قدر غیر اہم بھی نہیں کہ اِسے آپ عملی زندگی میں غیر مؤثر قرار دیں لیکن نظریہ انسانی ذات سے بڑھ کر نہیں ۔ جب ہم نظریاتی اجتماع کو قوم بنالیتے ہیں تو پھر نظریاتی اختلاف کو رحمت نہ معلوم کس بنیاد کہہ دیتے ہیں؟ ۔

دوسرا علمی اعتراض یہ ہے کہ دین کے اُصول میں کوئی اختلاف نہیں ۔ یہ اختلاف تو فروعی ہے حالانکہ آپ درج بالا معروضات کو غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر مکتب میں دین کے مآخذ تک مختلف نظر آئیں گے گویا نظریہ دین کے مآخذ تک تبدیل کر دیتا ہے تو اِس قدر جوہری اختلاف کو فروعی اختلاف کہنا قرینہِ جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ ۔

تصوف ایک روش کا نام ہے ۔ یہ کوئی مکتب یا فرقہ نہیں بلکہ یہ ایک طرح سے عالمگیر جذباتی تحریک ہے ۔صوفیاء محبت اور عشق ہی کو دین سمجھتے ہیں یعنی اِن کے نزدیک دین دراصل محبت و عشق کا دوسرا نام ہے ۔ یہاں روایت، عقل اور اجماع وہ حیثیت نہیں رکھتے جو دیگر مکاتب میں رکھتے ہیں ۔صوفیاء کے نزدیک دین دراصل سات جذباتی مقامات کا نام ہے ۔اُنس، محبت، عقیدت، ایمان، عبادت، عشق اور جنون یا فنائیت ۔تصوف میں محبتِ دوست ہی دراصل دین حق ہے ۔سیدی جلال الدین رومی فرماتے ہیں ۔ع

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

صوفیاء کے نزدیک دین محبتِ خدا سے شروع ہو کر عقیدتِ انسان پر تمام ہو جاتا ہے ۔عارفین کہتے ہیں خدا کو انسان کی ضرورت نہیں لیکن انسان کو انسان کی ضرورت بہر صورت ہے ۔پس انسان سے محبت دراصل خدا سے محبت ہے ۔ تصوف لغوی اعتبار سے بھی رویہ کی صفائی کا نام ہے اور محبت تو رویہ کی شفافیت کی انتہا ہوتی ہے ۔صوفیاء نے دین کو علم سے منقطع کر کے عشق کے تابع کر دیا ۔صوفیاء کے نزدیک دین علم نہیں عشق ہے ۔سلطان العارفین حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں ۔ع

جے کر دین علم وچ ہوندا
تاں سر نیزے کیوں چڑھدے ہُو

صوفیاءنے دین کوعشق کے تابع کرکے انسانیت میں لسانی ،نظریاتی اورثقافتی تفریق کو ناپید کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی کسی اہلِ مذہب کوبھی گمراہ نہیں سمجھتا۔تصوف میں محبت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے نہ کہ نظریات کو۔صوفیاء کے نزدیک حضرت موسیٰ ، حضرت مسیح ، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ،شری کرشن ،شری رام، سدھارتھ گوتم بدھ ، زرتشت ، مہاویر، گرونانک اور بہاءاللہ خدا کے برگزیدہ بندے اور مصلح اعظم تھے۔تصوف ایک عالمگیر جذباتی روش ہے جو دنیاکے تمام مذاہب میں یکساں پائی جاتی ہے۔ہم اگراپنے علاقائی مذہب کی بات کریں تو وہاں پربھی ہمیں ایک عالمگیر جذباتی ربط ملے گا۔اسلامی حمد، ہندوآرتی ،سِکھ آرتی ، یہودی سالم، پارسی یاسنا ،بدھسٹ وندنا ،مسیحی مناجات اِس اَمر پر دال ہیں کہ تمام مذاہب میں تصوف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اسلامی حمد

الحمدللہ رب العالمین ،الرحمن الرحیم

ہندوآرتی

اوم جے جگدیش ہرے ،سوامی جے جگدیش ہرے
بھگت جنوں کے سنکھٹ ،چھن میں دور کرے

سِکھ آرتی

دھناسری محل ہے پہلا
آرتی ، ہک اُومکا رسد گرو پراساد

مسیحی مناجات

لّلو یاہ ،یاوسوتریا کائے یادوکیسا کائے یادُونامس
تُوتھیوس یمون اوتی ایثنائی کائے دکائیاا ے

پارسی یاسنا

ستوتو گاروواہمنگ اہورائی مزدائی
اشائچاواہشتائی دادم مہیچاشماہیچہ اچہ اوادیمی وہو

بدھسٹ وندنا

ناموتاسا بھگوتاوَارھتاوَ

سماسم بدھاسا

ناموتاسا بھگوتاوَارھتاوَ

یہودی سالم

ہلّلو اث، یہواہ کل گوٸس شبھوئے ہوے کل ہوامس کہ جبار

علینو ے ہصر اوَ وآمث یہواہ لاوَس ہلّلو یاہ

درج بالا مناجات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مذہب میں اُصول صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا سے محبت کے ساتھ التجا کرنا کیونکہ محبت ایمان کا میوہ ہے۔ اِسی لئے کسی بھی صاحبِ ایمان کے دل میں نفرت یا کدورت نہیں پنپ سکتی۔تصوف میں نظریہ کی بجائے انسانی ذات کو مرکزِ ہدایت سمجھا جاتا ہے اور انسانی ذات پر ہی ہر طرح کا نظریہ قربان کر دیا جاتا ہے۔تصوف میں علم و دلیل کیلئے نہیں حُسن و اَدا کیلئے لڑا جاتا ہے۔معروف صوفی بزرگ سعید سرمد سرمست فرماتے ہیں۔ع

سرمد ایں کوزہ عجب شکستے کر دی
ایماں بہ فدائے چشمِ مستے کر دی
عمرے کہ بہ آیات و احادیث گزشت
رفتی و نثار بت پرستے کر دی

تصوف مذاہب سے ماوراء ہوتا ہے لیکن کوئی بھی مذہب تصوف سے ماوراء نہیں ہوسکتا کیونکہ محبت ہر مذہب کی بنیاد ہے اور بغیر محبت کے مذہب کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔اِس لئے تصوف ابتدائے آفرینش ہی سے انسانی معاشروں میں مقبول رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

علم اور تعلیم میں بنیادی فرق

روزنامہ پاکستان 11- 04فروی 2016

علم دراصل انسان کے انفرادی اعمال کے نتائج کو کہتے ہیں جبکہ تعلیم کسی دوسرے انسان کے مشاہدات وتجربات کے بیان کا نام ہے چنانچہ انسان جب کوئی عمل سرانجام دیتا ہے تو اِس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکلتا ہے قطع نظر اِس سے کہ وہ مثبت ہو یا منفی بہرحال نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔ اِسی نتیجے کا نام علم ہے اور اگر ہم اپنے اِن نتائج کو یکجا کر کے الفاظ میں بیان کر دیں تو وہ دوسرے انسانوں کے لئے تعلیم کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں پس علم اور تعلیم میں یہی بنیادی فرق ہے۔
تعلیم دراصل معلومات کے ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جو انسان کے انفرادی تجربات سے منزہ ہو۔ اگر انسان خود عمل کر کے نتائج حاصل کر لے تو وہ عالم کہلاتا ہے۔ معلومات کے اجتماع کے حامل کو عالم نہیں کہا جاسکتا پس خالص علم عامہ کے لئے ضروری نہیں جس قدر کہ تعلیم ضروری ہے کیونکہ ہر انسان کو ہر قسم کے تجربات کی بھٹی سے نہیں گزارا جا سکتا اِس لئے اِسے دوسروں کے تجربات کا خلاصہ دے دیا جاتا ہے تا کہ وہ اپنے رویے کو مزین کر لے۔
علم کی حقیقت وغایت کی تلاش میں سرگرداں انسان شعور کی روشنی سے بہرہ مند ہونے کے بعد سے سوچنے اور سمجھنے کا اہل ہو چکا تھا چنانچہ سب سے پہلے انسان نے مظاہرِ فطرت پر غور کیا اور پھر بہت سی خود ساختہ تعبیرات متعین کیں جن کو شعور کی بہتری کے ساتھ ساتھ مزید مترشح و منطقی کرتا چلا گیا پس علم کی ابتدا مظاہرِ فطرت پر غور کرنے سے ہوئی۔
ابتداء میں انسان نے مظاہرِ فطرت کے متعلق عجیب وغریب اور موجودہ شعور کے مطابق تخریب الحواس آراء قائم کر لی تھیں جنہیں موجودہ شعور ایک ایک کر کے نہ صرف رد کر چکا ہے بلکہ اسکی جگہ عملی تجربات کی بنیاد پر تازہ ترین سائنسی و تکنیکی علوم بھی حاصل کر چکا ہے۔
علم کی حقیقت فی نفسہٖ نہیں بلکہ اضافی ہے جیسا کہ ماہرِ طبیعیات آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت میں واضح کر دیا تھا کہ کائنات کی ہر چیز اضافی ہے۔ نظریہ اضافیت سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی چیز یا سوچ دراصل مطلق نہیں ہوتی بلکہ وہ اردگرد کے ماحول کے سبب وقوع پذیر ہوتی ہے گویا جیسا ماحول ویسی سوچ یا اشیاء، چنانچہ جب تک اِس سوچ یا شے کو مطلوبہ ماحول میسر رہے گا وہ سوچ یا شے اپنا وجود برقرار رکھے گی۔

جیسے ہی وہ ماحول خراب ہوا تو وہ سوچ یا شے بکھر کر کسی نئی شکل میں وقوع پذیر ہو جائے گی۔طبیعیات میں اِسے سروائیول آف دی فٹسٹ کہا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کسی نظریہ یا شے کے متعلق حتمی رائے ایک مستقل جہالت ہے۔انسان کسی نظریے کو وجود و قبولیت تو بخش سکتا ہے لیکن اِس نظریے یا فلسفے کو حتمی و لامحدود نہیں کہہ سکتا کہ شعور جامد نہیں بلکہ جاری و ساری ہے۔

انسان ابتداء سے ہی اپنے مجرب اعمال سے سیکھتا رہا ہے اور سیکھتا رہے گا پس ضروری ہے کہ اب اِس فطرتی مظہر کا اقرار کرلیا جائے کہ کوئی بھی سوچ ،نظریہ، قانون یا اخلاقی قدر دراصل حتمی و لامحدود نہیں ہو سکتی کیونکہ انسان کا شعور حتمی و مطلق نہیں۔مطلق سے مراد انسانی سوچ یا نظریہ کو عالمگیر اطلاقی حیثیت حاصل ہونا ہے چنانچہ دنیا کا کوئی بھی نظریہ یا قانون ایسا نہیں جو انسان کے لئے ہمیشہ قابل عمل رہے کیونکہ انسانی طبیعت میں زبردست نیرنگی اور ماحول میں بے پناہ تغیراتی وسعت ہے جس کے سبب کوئی ایک سوچ یا قدر مطلق نہیں ہو سکتی۔نظریات تغیرات کے مختلف النوع مراحل سے گزر کر انسانی اعمال کا درجہ حاصل کرتے ہیں پھر وہ شعور کی تازگی کے ساتھ ساتھ بوسیدہ ہو کر کسی نئی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔

انسانی رویے اور تاریخ پر تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ انسانی سوچ کبھی جامد نہیں رہی گو کہ انسان اسے حتی الوسع منجمد اور مطلق کرنے کی کوشش ضرور کرتا رہا ہے مگر آج تک اس سر توڑ کاوش میں کامیاب نہ ہو سکا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ انسان کو ایسا محسوس ہوا کہ جو شعور آج اِس کے پاس ہے ویسا شعور آنے والے کل میں انسان کے پاس نہیں رہے گا چنانچہ انسان نظریات و اخلاقی اقدار کو جامد کرتا چلا گیا اور اُن پر تقدیس کی چھاپ لگا دی تا کہ بعد میں آنے والا تازہ ترین شعور کا حامل انسان گزشتہ شعور کے حاملین کی قائم کردہ اخلاقی اقدار و نظریات کے خلاف بغاوت نہ کر سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ بغاوت بھی ہوتی رہی ہے اور تنقید و تنکیر بھی کیونکہ شعور جاری ہے جامد نہیں۔

تعلیم مخصوص ہو سکتی ہے تعلیم و تربیت مخصوص و جامد ہو سکتی ہے لیکن فکر جامد نہیں ہو سکتی کیونکہ فکر بہتے دریا کی مانند ہے اور بہتے دریا کبھی نہیں رکتے۔عام قاعدہ ہے کہ کھڑا پانی جوہڑ بن جاتا ہے پس یہی صورتحال فکر کی بھی ہے۔فکر جامد ہونے سے انسانی روح و جسم پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔تعلیم کی حقیقت و غایت اور تعلیم کا مقصدِ اصلی دراصل تہذیب النفس ہے۔

تعلیم کا مقصد ڈگریاں حاصل کرنا یا اپنی معیشت کے اسباب پیدا کرنا نہیں، ہاں خدمت کا جذبہ رکھ کر تعلیم کے وسیلے سے ملازمت کی صورت میں معاشی فوائد حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ معیشت بھی انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ البتہ تعلیم کا مقصد حصولِ معیشت نہیں بنانا چاہئے نہ ہی اِس مقصد کی تکمیل کو تعلیم کا نام دینا چاہئے۔ سب سے مستند ڈگری تجربہ اور بہترین معیشت ذہنی و جسمانی محنت ہے۔ فی زمانہ تعلیم کو محض بہترین روزگار کا وسیلہ سمجھا جانے لگا جس کی وجہ سے تعلیم کا مقصدِ اصلی ہی فوت ہوگیا ہے۔ دنیا کی ہیئت بدلنے والی کئی ایک اہم شخصیات نے نہ تو کسی تعلیمی ادارے میں باقاعدہ رسمی تعلیم حاصل کی تھی نہ ہی اعلیٰ ڈگری ہولڈرز تھے۔

یہاں پر میں چند ایک اہم شخصیات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جنہوں نے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی لیکن دنیا کے لئے وہ ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دے گئے کہ رہتی دنیا تک اُن کے نام اور کام زندہ و تابندہ رہیں گے۔ معروف تھیوریٹکل فزیسٹ آئن سٹائن کے نام سے کون واقف نہیں وہ منطقی اور طبیعی نظریہ اضافیت تھیوری آف ریلیٹیوٹی کے بانی تھے۔

یہ نظریہ اِس وقت دنیا میں اخلاقیات سے لے کر سماجیات و سیاسیات میں جوہری تبدیلیاں رونما کر چکا ہے۔ مائیکل فراڈے دنیائے سائنس کے بااثر ترین کیمیادان تھے اُنہوں نے برقی مقناطیسیت ایجاد کر کے برقی سائنس کی بنیاد رکھی۔ انسانیت بالخصوص حبشی قوم کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے والے ابراہم لنکن بھی کسی تعلیمی ادارے میں رسمی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ جدید اَمریکہ کے بانی بینجمن فرینکلن بھی ایک غیر تعلیم یافتہ شخص تھے۔ ماہرِ ہندسہ جات شری واستو رامانوجن جنہوں نے حسابیات کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ آج اے ٹی ایم مشین سے کون واقف نہیں، یہ مشین اِنہی کی محنت کا نتیجہ ہے، بھی پڑھے لکھے نہیں تھے۔

معروف ترین ادیب اور رومانوی نثر کے ماہر ولیم شیکسپیئر بھی رسمی تعلیم کے حامل نہیں تھے۔ آج دنیا کی معروف ترین موبائل کمپنی ایپل سے کون واقف نہیں بچے سے لیکر جوان اور بوڑھے تک ایپل کے لیپ ٹاپ اور سمارٹ فونز استعمال کر رہے ہیں ایپل جو کہ موبائل ٹیکنالوجی کی دنیا کا انتہائی مستند اور معتبر ترین نام ہے اِس کے بانی سٹیو جابز بھی مڈل پاس تھے۔ کالج سے نکالے جانے والے بل گیٹس بھی جدید دور کی انتہائی معتبر شخصیت ہیں۔ کمپیوٹر بغیر بل گیٹس کے تذکرہ کے نامکمل ہے۔ مائیکروسافٹ اِس وقت دنیا کی انتہائی قابلِ اعتماد اور مستند ترین سافٹ ویئر کمپنی ہے اور بل گیٹس اِس کے مالک ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ صرف وہ نہیں جن کے پاس بھاری بھرکم ڈگریاں ہیں یا جو بڑے بڑے تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل ہیں۔زندگی سے بڑی کوئی یونیورسٹی نہیں اور تجربے سے بڑی کوئی ڈگری نہیں۔

انسان صرف تجربات سے سیکھتا ہے تخیلات سے نہیں۔کالج یا یونیورسٹی میں آپ کو کسی علم یا فن کے قواعد وضوابط تو پڑھائے جا سکتے ہیں لیکن حقائق نہیں۔حقائق تجربات سے حاصل ہوتے ہیں جبکہ تجربات سے قبل رہنمائی سودمند ثابت ہوسکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ کسی کی رہنمائی آپ کے تجربات کو مثبت بنا دے ہاں بنا بھی سکتی ہے،بعض اوقات لیکن یہ کوئی مستقل قاعدہ نہیں کہ کسی کی علمی یا منطقی رہنمائی تجربات کے نتائج مثبت بنا دے۔

دانش اصلی وہ ہے جو آپ کو غوروفکر اور مشاہدات وتجربات سے حاصل ہوتی ہے۔سوچ اور تجربات ومشاہدات پر پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔دنیا کا کوئی بھی نظریہ،خیال یا عقیدہ مطلق حقیقت نہیں رکھ سکتا کیونکہ حقائق بدلتے رہتے ہیں اِس لئے کہ انسانی طبع یک رنگی اور جمود سے منزہ ہے۔انسان فطرتاً متغیر پسند واقع ہوا ہے۔وہ جلد اُکتا جاتا ہے،رویوں سے اعمال سے،افکار سے اِس لئے ضروری ہے کہ انسان کو فطرتی آزادی کے ساتھ اپنی فکر اور عمل متعین کرنا چاہیئے کہ یہ انسان کا خارجی نہیں بلکہ فطرتی اور جوہری حق ہے۔

فکر ڈرائیو کرتی ہے وجود کو پس وجود تابع ہوتا ہے فکر کا اور اِسی فکر کا خلاصہ دانش کہلاتی ہے۔پس دانش کی مثال سورج کی کرنوں کی مانند ہے جو اَبد تک چمکتی رہے گی۔دانش انسانی رویہ کو مزین کرتی اور انسان کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل بناتی ہے۔اِس معاملے میں صرف انسان کو رہنمائی چاہیئے ہوتی ہے صرف صراطِ دانش کی اور صراطِ دانش انسان کسی تعلیمی ادارے یا تعلیمی ماحول سے نہیں حاصل کرسکتا اِس کیلئے فکری جدوجہد اور رویہ میں جدت اور نیرنگی ضروری ہے۔

اگر فکر رجعت پسندی سے آلودہ ہو جائے اور انسانی رویوں کو عقائد جکڑ لیں تو انسان کے اخلاق متعفن ہو جاتے ہیں اور معاشرہ اخلاقی پستی میں گر جاتا ہے۔دنیا میں صرف وہی اقوام آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے قابل ہوتی ہیں جو علم اور اخلاق کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہوتی ہیں۔

علم سے مراد ڈگریاں لینا یا دیوہیکل تعلیمی ادارے تعمیر کرنا نہیں بلکہ اجتماعی شعور پیدا کرنا حقیقی علم ہے جو کہ ہمارے ہاں بالکل ناپید ہو چکا ہے۔اجتماعی شعور کسی بھی معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔واضح رہے کہ اجتماعی شعور صرف ڈگریاں لینے سے نہیں آجاتا۔

پاکستان میں آجکل قریباً ہر علم وفن کی عبوری ڈگریاں مل رہی ہیں لیکن فی نفسہٖ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں نے ایک تھیوریٹکل فزیسٹ نوجوان سے کہا کہ آپ مجھے آئن سٹائن کی تھیوری اپنے الفاظ میں بالکل سادہ طریقہ سے سمجھا دیں۔ یقین کیجئے میری یہ گزارش سن کر نوجوان پریشان ہوگیا۔

یادرکھیں پڑھنا تعلیم ہے اور سمجھنا علم اور پڑھنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں جب آپ سمجھ ہی نہیں پائے کیونکہ ہمارے پڑھنے کا مقصد ہی دراصل سمجھنا ہوتا ہے اور جب ہم سمجھ سے عاری ہوجائیں تو پڑھنا ہمارا ذریعہ معاش تو بن سکتا ہے لیکن ذریعہِ فلاح نہیں۔ علم اور تعلیم میں ایک جوہری فرق یہ بھی ہے کہ علم انسان کو تہذیب النفس کی راہ پر لگا دیتا ہے جبکہ تعلیم تہذیب النفس سے مشروط نہیں ہوتی۔ علم سے انسان حساس بن جاتا ہے اور یہی حساسیت انسان کے رویہ کو ہر آلائش سے منزہ کردیتی ہے۔

اِس کی مثال کچھ یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک پی ایچ ڈی ڈگری ہولڈر بدتہذیب ہوسکتا ہے وہ اخلاقی قباحت کا شکار ہو سکتا ہے لیکن ایک حساس عالم بدطینت نہیں ہوسکتا اور اِس کی دلیل یہ ہے کہ بدتمیزی دراصل بے حسی سے پیدا ہوتی ہے چنانچہ ہر بے حس انسان بدخو بھی ہوتا ہے۔ علم اور تعلیم میں بنیادی فرق کی وضاحت کے بعد تربیت پر بھی روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ہمارے ہاں ایک اصطلاح عام استعمال ہوتی ہے یعنی تعلیم وتربیت۔ تعلیم وتربیت سے مراد شعوری وغیر شعوری حُسنِ اخلاق ہی ہوتی ہے۔ جب ہم اپنے بچوں کی تربیت کی بات کرتے ہیں تو اِس کا سیدھا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم اپنے بچوں کے اخلاق سنوارلیں نہ کہ اُنہیں ڈگری ہولڈر بنالیں۔ ڈگری لینے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے لیکن یادرہے کہ محض ڈگری لینا مقصود نہیں کیونکہ ڈگری دراصل آپ کے فن کا ثبوت ہوتی ہے کہ آپ فلاں فن کے ماہر یا اُس کے متعلق کس قدر معلومات رکھتے ہیں جبکہ تربیت آپ کے اخلاقی وجود کا تعارف ہے۔

علم تو اخلاقیات ہی کا مطالعہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ اجتماعی شعور نہیں پایا جاتا اِس لئے علم، تعلیم، تربیت اور اخلاقیات کو باہم گڈمڈ کردیا جاتا ہے جس کے باعث اجتماعی شعور انتہائی ناقص بن جاتا ہے۔ کسی چیز کو کما حقہ سمجھنا علم ہے کسی چیز کے متعلق رہنمائی تعلیم ہے کسی چیز کو بتدریج کمال تک پہنچانا تربیت ہے اور رویہ کو ہر منفی سرگرمی سے پاک کرنا دراصل اخلاق ہے۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نصاب ہی انتہائی ناقص اور فرسودہ ہے۔ ہم اپنے بچوں کو اَمن رسیدہ شعور دینے کی بجائے اُنہیں جہالتِ چنگیزی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اُوپر سے فاصلاتی نظامِ تعلیم نے ریاستی نظامِ تعلیم کو کباڑ خانہ بنا کے رکھ دیا۔ سی ٹی، پی ٹی سی اور بی ایڈ جیسی انتہائی فنی مہارت آج دوشیزاؤں کا کھیل بن چکی ہے۔ سیگریٹ پھونکنے والے سے لیکر کبوتر اُڑانے والا آوارہ مزاج بھی آج اُستاد بن چکا ہے۔

بلکہ ہمارے ہاں تو محکمہ تعلیم کو مُرلی محکمہ کی مزاحیہ اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُستاد کسی بھی انسانی معاشرے کا روحانی باپ ہوتا ہے لیکن ایسا کچھ نہیں پایا جاتا مملکتِ خداداد میں۔ یہاں پر ایک سال میں سب سے زیادہ چھٹیاں محکمہ تعلیم والوں کو ہی نصیب ہوتی ہیں جبکہ دیگر انڈسٹریل ڈیپارٹمنٹس برائے نام چھٹیاں کرتے ہیں۔ مطلب سب سے گیا گزرا محکمہ ہمارے ہاں تعلیم ہی ہے۔

دو قومی نظریہ کی حقیقت

روزنامہ پاکستان 21 جنوری 2016

شیخ سعدی نے کہا تھا۔ع

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یعنی جتنی بھی بلند و بالا عمارت کھڑی کرنی ہو اُس کی بنیادی اینٹ درست رکھنی چاہیئے گر پہلی اینٹ ٹیڑھی ہوگئی تو پوری دیوار ٹیڑھی رہے گی۔دو قومی نظریہ کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اہلِ سناتن دھرم (ہنود) اور اہلِ سلام دو الگ الگ قومیں ہیں۔اِس لئے مسلمانوں کو سناتن دھرمیوں سے الگ اپنی ایک ریاست قائم کرنی چاہیئے جس میں خالص اسلامی قوانین کا نفاذ کیا جاسکے۔

اوّل تو یہ کہ نظریات سے اقوام نہیں بنتیں۔دوسری بات یہ کہ اگر یہی اُصول ہو تو پھر اُس وقت ہندوستان میں مختلف نظریات کے حامل افراد موجود تھے۔اہلِ اسلام، اہلِ سناتن دھرم، بدھ متی، جینی، سِکھ، زرتشتی، عیسائی وغیرہ وغیرہ تو گویا ہفت قومی نظریات کی بنیاد پر اُصولاً پورے ہندوستان کو برابر تقسیم کرنا چاہیئے تھا۔دو قومی نظریہ کی اختراع کو عموماً دو شخصیات سے منسوب کیا جاتا ہے۔ایک سر سید احمد خان جبکہ دوسری شخصیت سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔

راقم کے نزدیک قوی روایت یہی ہے کہ دو قومی نظریہ کے حقیقی بانی دراصل سید ابوالاعلیٰ مودودی ہی تھے کیونکہ سر سید احمد خان کا طبعی رجحان زیادہ تر اہلِ سلام کی تعلیم و تعلم اور اخلاقی بہتری کی طرف تھا جبکہ ہندوستان میں مذہبی و سیاسی لحاظ سے اپنی ایک الگ وضع رکھنے والی شخصیت سید ابوالاعلیٰ مودودی ہی تھے جن کی طبیعت براہِ راست اسلامی سیاست کی جانب مائل تھی اور آپ اسلامی قوانین کے نفاذ کیلئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے چھ سات سال قبل 1941ء میں آپ نے اپنی ایک الگ اسلامی سیاسی تنظیم جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی۔

یہ ایک بنیاد پرست اسلامی سیاسی جماعت تھی جس میں اُس وقت زیادہ تر تعداد نوجوانوں کی تھی۔جن میں میاں طفیل محمد، مولانا امین احسن اصلاحی، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا وحید الدین خان اور جاوید احمد غامدی کے نام قابل ذکر ہیں۔

دوقومی نظریہ جس کسی نے بھی پیش کیا بہرحال ہندوستان کے فاضل اہلِ اسلام کی اکثریت اِس کو اسلام کے منافی سمجھتی رہی کیونکہ دوقومی نظریہ کی بنیاد نہ تو قرآن میں کہیں پائی جاتی ہے اور نہ ہی کہیں مجموعہ احادیث میں۔آج تک پاکستانی قوم کو دوقومی نظریہ کی اساس کے متعلق نہیں بتایا گیا۔عوام تو درکنار غضب یہاں تک کہ دوقومی نظریہ سے خود بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح بھی لاعلم تھے۔

چنانچہ 14 نومبر 1946ء کو آپ ایک پریس کانفرنس میں فرماتے ہیں "یقین کیجئے جب میں پاکستان کا مطالبہ کرتا ہوں تو میں مسلمانوں کی جنگ نہیں لڑ رہا ہوتا"۔دوقومی نظریہ کے خلاف اِس سے مستند قول کسی کا بھی نہیں ہوسکتا۔ بالفرض اگر دوقومی نظریہ کی اہمیت واقعتاً موجود تھی تو پھر ہندوستان میں رہنے والا ایک مسلمان بھی اِس کی مخالفت نہ کرتا کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا کیونکہ اَمارتِ اسلامیہ کے نفاذ کی ذمہ داری کسی مخصوص گروہ پر نہیں بلکہ تمام اہلِ اسلام پر عائد ہوتی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سا اسلام تھا جو آزادمنش مسلمانوں کا ایک گروہ ہندوستان کے دوٹکڑے کرکے نافذ کرنا چاہتا تھا؟۔دوقومی نظریہ کا خیال ہندوستان کے معروف عالم دین اور مجتہد فی المذہب مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد و دیگر علمائے ہند کو کیوں نہیں آیا؟۔اگر قیامِ پاکستان کی بنیاد اسلام ہی تھی تو پھر اسلام کے اتنے بلند پایہ علمائے دین آخری دم تک کیوں بٹوارے کی مخالفت کرتے رہے؟۔قیامِ پاکستان کی مخالفت میں علمائے دیوبند کا نظری اختلاف تو یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ ایک اخباری انٹرویو میں معروف دیوبندی عالم مفتی محمود مرحوم والد گرامی مولانا فضل الرحمان نے کہا تھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے"۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد یہی مولوی عسکری قوتوں کے آلہ کار بن کے ریاست پر آج تک حکمرانی کر رہے ہیں۔دوقومی نظریہ کا مقصد اگر ہندو و مسلم دو الگ الگ قومیں تھیں تو پھر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ 1971ء میں پاکستان سے الگ ہونے والے بنگالی مسلمانوں کا تعلق کس قوم سے تھا؟۔

کیا وہ بھی سناتن دھرمی تھے؟۔اگر نہیں تو پھر کیا نظریہ پاکستان کی اساس باقی رہتی ہے یا نہیں؟۔سقوطِ ڈھاکہ کے بعد دو قومی نظریہ کی اساس باقی رہی؟۔اگر رہی تو کس بنیاد پر؟نہیں تو پھر پاکستان آج کس بنیاد پر کھڑا ہے؟۔

ہر سوال کا جواب سوال میں ہی موجود ہے صرف سمجھنے کی زحمت لابدی ہے۔دو قومی نظریہ کی حقیقت اِس کے پس منظر اور پیش منظر کے متعلق مبنی برحق معلومات آج تک چھپائی جاتی رہیں۔دو قومی نظریہ کی بنیاد عموماً اہلِ سناتن دھرم کے نسلی تعصب اور اہلِ اسلام سے اُن کے مذہبی بغض کے طور پر سامنے لائی جاتی رہی حالانکہ یہ دلیل صریح ملمع سازی ہے۔اگر ایسی ہی کوئی سنگین صورت حال تھی تو پھر ہندوستان کے مدبر علماء اِس بنیادی اور نہایت اہم شورش سے کیوں غافل ہو گئے تھے؟۔کیا ہندوستان کے حالات اُن کے سامنے نہیں تھے؟۔کیا اُنہیں اُمتِ مسلمہ کی بہتری کی فکر نہیں تھی؟۔اِن تمام سوالات کا جواب اگر نفی میں دیا جائے تو پھر ہندوستان میں کچھ نہیں بچتا کیونکہ بٹوارے کی مخالفت کرنے والے بنیاد پرست اور اپنے وقت کے جید علماء تھے۔

عجیب مخمصہ ہے کہ ہر معاملے میں مولوی مستند قرار دیا جاتا ہے لیکن جب دو قومی نظریہ کی بات آتی ہے تو پھر کہا جاتا ہے کہ وہ تمام مولوی جو پاکستان کے حق میں نہیں تھے وہ مستند نہیں ہیں گویا وہ کانگریسی تھے۔پتہ نہیں پھر مستند کون ہوتا ہے؟۔شاید اکابرین دیوبند کے نافرمان مفتی محمود،مولانا سمیع الحق اور مولانا فضل الرحمن ہی مستند ہیں۔شاید۔

ریاست اپنے شہریوں کی ہمیشہ شعوری آبیاری کرتی ہے تا کہ وہ اپنے ملک کا شعوری دفاع کر سکیں،اپنی ریاست کی بنیاد پر فخر کر سکیں لیکن یہاں تو منافقت کے درس دیئے جاتے ہیں۔مصلحت کے نام پر مولوی ملک کو دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہا ہے ساتھ اِس منطق کا ورد کرتے ہوئے کہ پاکستان تو اسلام کے نام پر بنا ہے۔قیامِ پاکستان کی مخالفت مقصود نہیں قیامِ پاکستان کا حقیقی رخ سامنے لانا مقصود ہے جو غبارِ مارشل لاء اور مُلّا لاء میں کہیں گم ہو کے رہ گیا۔آج ہم فطرتی طور پر انگریز نواز بن چکے ہیں۔چلیں ہم نہ بھی سہی تو ہمارے حکمران تو طاغوتی قوتوں کے تلوے چاٹ ہی رہے ہیں نا،پس ہمارا اپنا کوئی وجود ہی نہیں نہ کوئی خودی۔

☆☆☆☆☆☆☆

اقوام کے اجزائے ترکیبی

روزنامہ پاکستان 14 جنوری 2016

انسانی ذات مادہ اور ذہن کا مرکب ہے۔مادی زندگی کی بقاء کیلئے ہمیں مادی وسائل جبکہ ذہنی وجود کی بقاء کیلئے ہمیں مابعدالطبیعیاتی وسائل درکار ہوتے ہیں۔روٹی اور پانی جہاں انسان کے مادی وجود کی بقاء کے ضامن ہوتے ہیں تو وہاں عقائد اور مذاہب انسان کے ذہنی یا روحانی وجود کو قائم رکھتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ انسانی معاشرت جغرافیہ سے وقوع پذیر ہوتی ہے یا پھر عقیدہ یا نظریہ سے؟۔

برصغیر میں قیامِ پاکستان سے قبل اِس اہم مسئلہ پر سیاسی نوعیت کی کافی بحث ہو چکی لیکن یہاں پر میرا مقصد اِس سوال کا خالص منطقی جواب ڈھونڈنے کی کوشش ہے۔اگر نظریہ پاکستان سے مراد اہلِ اسلام کے اسلامی تشخص کی بقاء ہے تو پھر ہند میں بسنے والا ایک بھی مسلمان پاکستان بننے کے بعد انڈیا میں رہنے کا اُصولی طور پر حقدار نہیں ٹھہرتا کیونکہ پاکستان کا وجود ہی دراصل نظریاتی اور اہلِ اسلام کے اسلامی تشخص کی حفاظت ہے۔خیر اِس بحث کو یہیں پر چھوڑ کر ہم آگے بڑھتے ہیں۔

مارکس کا کہنا ہے کہ مادہ اصل ہے اور ذہن اُس کی پریکٹیکل فارم۔جب مادہ محفوظ نہیں رہے گا تو اذہان کی وجودیت فناء سے دوچار ہو جائے گی۔اِس لئے انسانی کاوش کی توجہ مادہ پر ہونی چاہیئے نہ کہ اذہان پر۔آپ کا کہنا ہے کہ ذہین لوگ عوام کے اذہان مروجہ عقائد کے ذریعے ماؤف کر کے اُن کا جسمانی اور معاشی استحصال کرتے ہیں اور خود ہر طرح کی سہولت سے لطف اندوز ہوتے ہیں جبکہ جفاکش کو جہانِ آئندہ کی لامحدود آسائشوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔

بلاشبہ کارل مارکس ایک عظیم انسان تھے۔وہ صرف فلاسفر نہیں بلکہ اپنے سینے میں ایک غریب پرور دل بھی رکھتے تھے۔وہ غریب سے یکسر مذہب چھیننے کے قائل نہیں تھے بلکہ اُنہوں نے تو مذہب کو بے روح دنیا کی روح کہا تھا۔

اقبال نے آپ کے متعلق اتنا تو کہا ہے۔ع

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب

نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

جہانِ اسباب میں نظریات یا عقائد سے پیٹ نہیں بھرتا۔نظریہ اور عقیدہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم مگر نظریات یا عقائد کی بنیاد پر قانون سازی عالمگیر انسانی معاشرت کیلئے ایک انتہائی خطرناک فعل ہے کیونکہ جب عقائد کی بنیاد پر قانون سازی کی جائے گی تو عقائد مخالف افراد کیلئے اُس معاشرہ میں مکمل آزادی کے ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ایک ہی نظریات کے حامل افراد کو ایک نظریاتی گروہ تو کہا جاسکتا ہے لیکن ایک مربوط قوم نہیں کیونکہ نظریات انسان کو متحرک کرتے ہیں چنانچہ تحریک کا انجام حصولِ اقتدار یا بغاوت کی راہ ہموار کرتا ہے۔پس اقتدار تک پہنچ جانے کے بعد بھی وہ نظریاتی گروہ ایک گروہ ہی رہتا ہے،قوم نہیں بن جاتا۔

قوم کا تعلق نہ تو عقائد سے ہوتا ہے اور نہ ہی وطن سے چنانچہ نظریہ یا مٹی سے اقوام نہیں بنتیں بلکہ خون یعنی نسل سے اقوام بنتی ہیں پس ہاشمی اور اُموی ایک ہی قوم سے ہیں یعنی عرب۔ اِسی طرح علامہ اقبال سری نگر کے سپرو براہمن تھے چنانچہ وہ مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنی قوم پر فخر کرتے رہے۔اَب اقبال کو پاکستانی کہیں یا ہندوستانی لیکن وہ قوم کے لحاظ سے بہر کیف کشمیری شیواتی پنڈت یعنی سپرو ہی رہیں گے۔

اِس سے آگے کا نکتہ یہ ہے کہ ہر قوم کا تعلق ایک مخصوص تہذیب سے ہوتا ہے اور ہر تہذیب مٹی سے بنتی ہے لیکن اِس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ قوم بھی مٹی یعنی وطن سے بنتی ہے چنانچہ چوہان، اَروڑہ، چٹھہ، راؤ، اگروال، سپرو، لوہانا وغیرہ خالص ہندوستانی قومیں ہیں۔ اِن سب کا تعلق براہ راست ہندو تہذیب و تمدن سے ہے پس چوہان اور ہاشمی مل کر اپنی ایک الگ ریاست تو بنا سکتے ہیں مگر ایک قوم نہیں بن سکتے کیونکہ ہاشمی عرب ہیں اور چوہان خالص ہندوستانی راجپوت۔ مختلف اقوام کی بنیاد پر ایک ریاست تو بن سکتی ہے مگر ایک قوم نہیں کیونکہ قوم خون سے کھڑی ہوتی ہے۔نظریہ یا قانون سے نہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک آزاد ریاست میں نظریات یا عقائد کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔وہاں صرف اور صرف ایک شہری کے حقوق کے تحفظ کی اہمیت لابدی ہوتی ہے۔

نظریات کا کیا ہے۔انسان اکثر جوانی میں آزاد خیال ہوتا ہے جبکہ بڑھاپے میں وہی آزاد خیال خدا خوفی میں مبتلا ہو کر جانماز پر بیٹھ جاتا ہے۔نظریہ اور عقیدہ کبھی جامد نہیں ہوتا۔بے شک اِسے جس قدر گرفت میں رکھا جائے کبھی نہ کبھی انسان یک رنگی سے اُکتا ہی جاتا ہے۔عین جوانی میں ”خدا کہاں ہے؟“ جیسے لادینیت پر مبنی ناول لکھنے والے دانشور بڑھاپے میں ”درود شریف کے فضائل“ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔

اِس میں قطعاً کوئی قباحت ہے نہ ہی یہ اَمر مرجع استہزاء ہے لیکن بات دراصل یہ ہے کہ نظریہ اصل نہیں ہوتا۔ البتہ مسلّمہ حقائق اصل الاصول ہوتے ہیں۔ مسلّمہ حقائق سے مراد مذہبی حقائق ہیں۔

انسان کے خون میں جو تہذیب مرقع ہو جاتی ہے مرتے دم تک انسان اُسی تہذیب کا پرتو رہتا ہے چاہے وہ عرب سے ہندی یا سنسکرتی سے مدنی بن جائے۔ اپنے اَذہان پر غیر تہا زیب لاد لینے سے آپ اپنے اصل سے کسی طور منقطع نہیں ہو سکتے۔ پس آپ کنہیّا لعل سے غلام محمد تو بن سکتے ہیں لیکن خون میں رچی مُرلی منوہر کی عقیدت بہر حال قائم رہے گی۔

پس اِسی بنیادی حقیقت کے ادراک کے بعد مغربی دانشوروں نے ریاست کو مذاہب کے چنگل سے آزاد کر دیا کیونکہ مذہبی ریاستیں ایک مخصوص شخص یا نظریات کے گرد گھومتی ہیں جبکہ عوامی ریاستیں خالص عوامی رائے پر منحصر ہوتی ہیں جن میں انسانی جان، مال اور عزت تمام تر نظریات سے بالاتر ہوتی ہے چنانچہ یہی اصل مفہوم ہے سیکولرازم کا جسے رجعت پسند مافیا نے لادینیت سے معروف کر دیا۔

یہ ایک اَٹل حقیقت ہے کہ نظریات تحاریک وقوع پذیر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام اور بدھ مت دو مختلف تحریکیں ہیں۔ اسلام ایک خالص عربی تحریک ہے اور بدھ مت ایک خالص ہندو اصلاحی تحریک۔ اسلامی تحریک عرب قوم میں نمودار ہوئی تو بدھ مت ہندوؤں میں۔ دونوں تحاریک آج تک موجود ہیں لیکن کوئی بھی بدھ متی اسلام قبول کرنے کے بعد عربی بن جائے گا نہ ہی کوئی قریشی بدھ مت اختیار کرنے کے بعد ہندو۔ درآمد شدہ نظریات جس قدر بھی حقائق پر مبنی کیوں نہ ہوں آپ کو اپنی تہذیب سے بیگانہ نہیں کر سکتے۔ شعوری یا لاشعوری طور پر انسان اپنی ہی تہذیب وتمدن کا پالنہار ہوتا ہے اور یہی عین فطرت بھی ہے چاہے اِسے منطق کی کسی بھی کسوٹی پر کیوں نہ پرکھ لیا جائے۔

نظریہ، وطن اور قوم تین مختلف چیزیں ہیں جن میں زبردست بُعد پایا جاتا ہے۔ نظریات کی بنیاد پر وطن بنتا ہے نہ ہی قوم۔ نظریات کی بنیاد پر جو کچھ بنتا ہے اُسے تحاریک کہتے ہیں جیسے اسلام، بدھ مت، بہائی مت، مارکسزم وغیرہ وغیرہ۔

رہا وطن کا معاملہ تو انسان کسی بھی ریاست میں رہ کر اُس کے آئین کی اطاعت کا عہد کرنے کے بعد اُس سے بغاوت نہیں کر سکتا چاہے وہ پاکستان ہو یا ہندوستان کیونکہ یہ ایک سیاست کا مسلّمہ اُصول ہے۔

نظریات یا مذاہب کی بنیاد پر بننے والی ریاستیں دنیا دیکھ چکی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے یعنی اخلاقی، سماجی اور معاشی لحاظ سے غیر متوازن، ظلم واستبداد اور منافقت پر مبنی ہوتی ہیں۔

اگر ریاست کو نظریہ یا مذہب کا پابند کر دیا جائے تو وہ ریاست مخالف عقائد کے حامل شہریوں کیلئے جہنم سے کم نہیں ہوتی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک مذہبی ریاست اپنی مخالف مذہبی ریاست کی ہر لحاظ سے شدید مخالف ہوتی ہے جو کہ عالمگیر اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔

لیکن اِس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ خیر و شر کا جو مشترکہ ورثہ ہے اُس سے یکسر اعراض برت لیا جائے جیسا کہ اِس وقت امریکہ یا دیگر چند سیکولر ریاستیں خیر و شر کے پیمانے پارلیمنٹ میں بیٹھ کر خود بنا رہے ہیں یعنی جو اُنہیں صحیح لگتا ہے وہی دنیا پر بھی مسلط کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ محض کرنسی نوٹ پر We Believe in God لکھ لینے سے انسان خیر پر کاربند نہیں ہو سکتا اِس کیلئے باقاعدہ مسلّمہ حقائق کو قانون کی شکل دینا ناگزیر ہے ورنہ ظلم و بربریت کا سدِ باب کرنے کیلئے انسان کے پاس موجود عقلیتِ محض (Absolute Rationality) کافی نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

معرفتِ تہذیب و تمدن

روزنامہ پاکستان 07 جنوری 2016- 31 دسمبر 2015

عربی زبان میں ثلاثی مجرد کے باب ذَھَبَ (چلا گیا) سے مذہب بروزن مفعل یعنی وہ راستہ جس کی جانب چلا جائے، بنتا ہے۔ اصطلاحی معنیٰ میں مذہب درحقیقت مخصوص عقائد کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ پس اِسی سے مشتق اصطلاح تہذیب بنتی ہے جس کے معنیٰ رہنے کی جگہ۔ اگر ہم اِس کے جغرافیائی معنیٰ لیں تو ایسی جگہ کا رخ کرنا جہاں پانی موجود ہو چنانچہ تہذیب کی مبادیاتی تفہیم بھی یہی ہے۔

اگر ہم ابتدائی زمانے کے انسان کی بات کریں تو وہ ہمیشہ جہد للبقاء (Survival) کی جنگ لڑتا رہا۔ وہ ہمیشہ ایسے مقامات کی تلاش میں رہتا جہاں پانی کی فراوانی ہوتی تاکہ وہ اُسی پانی کے آس پاس پڑاؤ ڈال لے اور یہ اِس لئے کہ پانی انسانی وجود کی بقاء میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ جب کسی دریا یا جھیل کے کنارے انسانوں کا اجتماع پناہ گزین ہو جاتا تو وہ جگہ تہذیب کا مظہر بن جاتی۔ بعد میں جب انسان کا جغرافیائی شعور سے واسطہ پڑا تو تہذیب کے معنی مزید نکھرتے گئے۔ یعنی بعد میں انسانی بود و باش بھی تہذیب ہی کے دائرے میں شمار ہونے لگی جبکہ اجتماعی رہن سہن کو تمدن کی اصطلاح سے معروف کر دیا گیا۔ پس انسانی اجتماع کی خصلت اور رہن سہن کے لئے تہذیب و تمدن کی اصطلاح مخصوص ہوگئی۔

بہت بعد میں جب انسان مزید انڈسٹریل ترقی کرتا گیا تو پھر یہ اصطلاح عبرانی زبان سے نکل کر لاطینی زبان کے لفظ کلچر میں سمو گئی۔ لیکن یہاں پر ایک بات ملحوظ رہے کہ اصطلاح تہذیب و تمدن ہو یا کلچر اِس میں جغرافیائی عناصر کا اثر بہرحال موجود رہتا ہے جیسا کہ مشرقِ وسطیٰ میں کثرت سے لق و دق صحراء اور دشت موجود ہیں اِس لئے وہاں کے لوگوں کے مزاج میں سختی، تیوارانہ چہرے، دیو ہیکل قد، لباس ڈھیلے ڈھالے اور حُلیے (Get-up) غیر مصفّا (Stubble) ہوتے ہیں۔ بدوی تہذیب (Saracen Civilization) میں علم و دانش کی بجائے رومانیت اور تعیش مزاجی زیادہ پائی جاتی ہے۔

شہنشاہِ تشبیہات اِمرؤ القیس، زہیر اور لبید جیسے رومانیت پسند شاعر اِسی بدوی تہذیب کے روشن مظاہر ہیں۔

بدوی تہذیب کو اخلاقیات اور دانش کی روشنی سے منور کرنے کے لئے تحریکِ محمدیہ معروف بہ اسلام نے بہت اہم کردار ادا کیا۔قرآن نے بدوقوم کی بتدریج اخلاقی وفکری آبیاری کی چنانچہ ارشاد ہے" هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ "۔یعنی وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں سے ایک رسول بھیجا جو اُنہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کو پاک کرتا ہے اور اُنہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

گویا بدوی تہذیب میں زبردست اخلاقی وفکری رفعت صرف اسلام ہی کی بدولت ممکن ہوئی لیکن وہ جو چند ایک بنیادی جغرافیائی خصائل بدوؤں میں ابتداء ہی سے موجود تھے وہ بعینہٖ آج بھی موجود ہیں۔معروف عرب مورخ ابن خلدون "المقدمہ ابن خلدون" میں لکھتے ہیں کہ بدوؤں کے جہل کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے جب ایران فتح کیا تو سلاطین کے محلات میں گھس کر اعلیٰ ترین ضیافتوں کا اہتمام کرتے ہوئے کافور کی ٹکیاں نمک سمجھ کر شوربہ میں ڈال دیں اور چپاتیوں کو چیتھڑے سمجھ کر پیروں تلے روند دیا۔قرآن نے ہر لحاظ سے اس قوم کی آبیاری کی اور عرب کے ہاں یہ عادت بھی موجود رہی ہے کہ جب بھی ملتِ ابراہیم کے اخلاقیات پستی کا شکار ہو جاتے تو نبی مبعوث کر دیا جاتا چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر یہ سلسلہ معد بن عدنان کی نسل سے محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام ہوا۔

دنیا میں بہت کم تہازیب آمیزیشات سے محفوظ رہیں چنانچہ اِنہی میں سے ایک ایران کی تہذیب ہے۔یونان کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ منطقی رویہ ایرانی تہذیب میں ہی پایا جاتا ہے۔قبل از اسلام ایران میں بہت سے زیرک دانشور اور منطقی وفکری تحاریک موجود رہی ہیں چنانچہ تحریک مزدکیت بھی ایران ہی کی وہ لازوال اشتراکی دانش ہے جس نے نہ صرف بدو قوم بلکہ براعظم یورپ کی مختلف اسرائیلی ومسیحی تہازیب پر بھی زبردست اثرات مرتب کئے۔قرآن میں جب يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ کے احکامات صادر ہوئے تو عدوانِ اسلام چیخ اُٹھے کہ یہ تو خالص مزدکیت ہے اور جو سلمان فارسی نے ہم پر مسلط کروادی۔ڈاکٹر محمد اقبال اِس کا تذکرہ "جاوید نامہ" میں بہت منطقی انداز سے کرتے ہیں۔ع

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

مزدک ایران کا ایک انتہائی زیرک دانشور تھا جس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں انسانی مساوات کی بات کی۔اُس وقت ایرانی شہنشاہ صباد نے مزدک کے عقائد قبول کر کے پورے خطے میں مزدکیت کا نفاذ کر دیا تھا۔ایرانی تہذیب کے مابعد الجغر افیائی خدو خال نہایت خود دارانہ اور جنگجویانہ تھے۔ یہاں کے لوگ بدوؤں کے برعکس تعیش کی بجائے جفاکشی کو ترجیح دیتے اور رومانیت کی بجائے وطن پرستی پر مر مٹتے گویا حب الوطنی اِن کے خمیر میں شامل تھی۔ ساتویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں زرتشت اور حکیم مانی ایرانی تہذیب کے عدیم المثال دانشور و مصلح گزرے ہیں۔زرتشت کی ژند اوستا اور حکیم مانی کی شاہ پورنامہ (مذہبی کتب) ایک طویل عرصے تک ایرانی تہذیب وتمدن کے حل وعقد اور عوام پر اپنے گوناگوں اثرات مرتب کرتی رہیں تاوقتیکہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جنگِ قادسیہ نے ایرانی تہذیب وتمدن کو منہدم کر کے نیم بدوی تہذیب کی داغ بیل ڈال دی۔

بدوی اور ایرانی تہذیب کے علاوہ تیسری سب سے اہم اور برصغیر کی مبادیاتی (Essential) تہذیب سنسکرتی تہذیب ہے جس کا اثر آج بھی پاک و ہند کے تمدن پر صاف نظر آرہا ہے گو کہ اُموی جنگجو محمد بن قاسم کی دیبل (سندھ) پر لشکر کشی کے بعد بدوی تہذیب نے برصغیر کو دو بڑے نظریاتی مکاتب ہندو مسلم میں منقسم کر دیا۔

سنسکرتی تہذیب دراصل شری رام اور مرلی منوہر (کرشن) کی نصیحت آموز اور کارزارِ حیات سے ملفوظ تہذیب ہے۔یہ تہذیب جہاں رام کی محبت و وفاداری سے گندھی ہوئی نظر آتی ہے تو وہاں پانڈو خاندان کے جنگجو بہادر اور کرشن جی کے ہونہار شِشش اَرجن کی فقید المثل جنگی حکمتِ عملی کا نمایاں شاہکار ہے۔سنسکرتی تہذیب میں فکری وطبقاتی درجہ بندی تو بہر حال موجود رہی ہے جس نے اِس تہذیب کو ایک کراہت آمیز سماجی سطح پر قائم کئے رکھا لیکن اِس تہذیب کا نعرہِ آشتی اور خوئے اَمن اِسے دنیا کی تمام تہازیب سے ممتاز کر گیا۔زیادہ تر صلح جو اور وطن پرست خصلت کے حامل سنسکرتی بھگوت گیتا کی روحانی دانش سے سرشار دھرتی ماتہ کے کیول سپتر نہیں بلکہ رکھوالے بھی ہیں۔کرم یوگ (اُمورِ فرائض کی تکمیل کا زمانہ) بھکتی یوگ (اِرادتِ مسلسل کا زمانہ) اور نشکم کرما (جزا کی خواہش کے بغیر نیکی کرنا) کی مبنی بر حکمت تعلیمات نے اہلِ سنسکرت کو دیگر تہازیب کے حاملین سے ممیز کر دیا۔

گنگا جمنی تہذیب میں دانش یونانی حکمت سے بھی قبل موجود رہی ہے۔گویا اہلِ سنسکرت کو دنیائے معلوم کی تہازیب میں سب سے اوّلین مہذب ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور جس سے آج بھی بہت سے محقق ناشناس ہیں۔

جس وقت بدو پانی کے لئے میلوں دور جا کر اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے اُس وقت خشکی کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا (ہندوستان) سرسبز و شاداب باغات اور ثمر رسیدہ اَناج سے لہلہا رہا تھا۔ جہاں دریاؤں کا باپ اباسین اور گنگا جمنا اپنے ایامِ عروج پر تھے ۔ یہاں کے لوگ نہایت پُرامن اور راست باز تھے ۔ فکری آزادی اِس تہذیب کا ایک نمایاں عنصر رہی ہے چنانچہ جس زمانے میں وردھمان مہاویرا اور گوتم بدھ لوگوں کو آتم وشواس اور دھرم گیان کی شکشہ دے رہے تھے تو وہاں خالص مادیت اور الحاد پر مبنی مکتبِ فکر "چارواک" لوگوں کو سمجھا رہے تھے کہ ہر قسم کا دھرم گیان ڈھونگ اور تمام دھرم گرو پاکھنڈی ہیں جبکہ لوگ نہ صرف چارواکیوں کی بات سن رہے تھے بلکہ اپنی پوری آزادی کے ساتھ اِس فکر کو پریکٹس بھی کر رہے تھے ۔ پس دنیا کے کسی بھی تمدن میں اِس قسم کی فکری آزادی کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ۔

یہ قانونِ فطرت ہے کہ جہاں بھوک اور افلاس نہیں ہوتی وہاں سکون و آشتی قائم رہتی ہے اور جہاں مفلسی اور مسکنت نے ڈیرے ڈال رکھے ہوتے ہیں وہاں کے لوگ حرب الصفات اور انارکسٹ ہوتے ہیں چنانچہ مٹیالی رنگت کے چکنے شفاف چہرے سفید اور رنگین لباس کے رسیا اہلِ سنسکرت اپنی تہذیب پر ہمیشہ فخر کرتے رہے ہیں ۔

لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اِسی شاداب تہذیب کے اپنے فرمانرواؤں کی غیر ضروری غفلت اور کمزور سیاسی حکمتِ عملی کے سبب اِس خطے میں کچھ ایسے افراد بھی گھس آئے جو کہنے کو تو برصغیر میں کاروبار کرنے آئے تھے لیکن "آگ لینے آئی اور چولہے کی سائین بن بیٹھی" کے مصداق اِس شاداب خطے یعنی سونے کی چڑیا پر چڑھ دوڑے ۔

یہ لوگ شعور اور اخلاقیات کے علمبردار بن کر آئے اور تہذیب و تمدن کے نئے ریکارڈ قائم کر کے نکل گئے ۔ اہلِ ہند انہیں فرنگی، انگریز اور گوروں کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ یہ لوگ صرف ٹائی اور کوٹ سوٹ پہن کر نہیں آئے بلکہ اپنے ساتھ اپنی مکمل تہذیب بھی لے کر آئے جبکہ دوسری جانب اِن کی حکمت و اخلاقی بصیرت اہلِ ہند کے ذہین سپوتوں کو بھی متاثر کر گئی ۔ چنانچہ پروفیسر تھامس آرنلڈ جیسے ذہین مستشرق کی شعوری آبیاری نے اہلِ ہند کے زرخیز اذہان کو جلا بخش دی ۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور سید سلیمان ندوی جیسے علمائے کرام اور ذکی دانشور پروفیسر تھامسن آرنلڈ کی ہی فکری کاوش کا نتیجہ ہیں ۔ برصغیر کے وسیع الفکر لوگوں نے انگریز دانشوروں سے بہت کچھ سیکھا اور پھر بہت دیر تک اپنی سوسائٹی کو شعور و دانش کی طرف راغب کرتے رہے ۔ معلمِ ہند سر سید احمد خان ہی کے خصوصی اصرار پر پروفیسر آرنلڈ نے مایہ ناز کتاب "The Preaching of Islam" رقم کی ۔

فطرتِ غیر متبدلہ ہے کہ کوئی چیز یا رویہ نہ تو کماحقہ مثبت ہوتا ہے نہ ہی منفی چنانچہ انسانی رویے بھی اثبات ونفی کے مرکبات سے بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ انگریز کے برصغیر میں آنے سے یہاں پر ایک نئی مگر انتہائی قلیل سطح پر ایک باشعور اور خوشنما تہذیب تو وقوع پذیر ہوگئی لیکن ایک انتہائی خسارہ یہ بھی ہوا کہ گورے اِس خود دار قوم کو ذہنی اور تہذیبی غلامی میں مبتلا کر گئے۔

یہ وہ دور تھا جب سنسکرتی، بدوی اور ایرانی تہذیب کو سختی سے دبا کر ایک نئی تہذیب "اینگلو انڈین کلچر" مسلط کیا جا رہا تھا لیکن بات وہی ہے کہ کوئی بھی عمل یا سوچ فی نفسہٖ قبیح نہیں ہوتی چنانچہ بدوی تہذیب کے اثر نے جہاں برصغیر کو شیخ احمد سرہندی جیسا جید عالم دیا تو ایرانی تہذیب کے اثر نے امیر خسرو دہلوی جیسا ہرفن مولا عالم دین و دنیا عطاء کیا۔ بعینہٖ اینگلو انڈین کلچر نے اِس خطے کو قائداعظم محمد علی جناح جیسا زیرک سیاستدان اور علامہ محمد اقبال جیسا ہمہ جہت دانشور دیا۔ بلاشبہ تہذیبی تصادم سے نئے اذہان اُبھرتے ہیں اور فکر کے زاویے بدلتے ہیں۔ پس تہذیبی تصادم ہر نئی سوچ اور عمل کا ضامن ہوتا ہے۔

پاکستان کے تہذیبی خدو خال بیان کرنے سے پہلے اہم تھا کہ مملکت میں موجود چار مذکورہ تہذیبوں کا اجمالاً مگر جامعیت کے ساتھ ذکر کیا جاتا۔ پاکستان جغرافیائی اعتبار سے برصغیر کا ایک چھوٹا سا حصہ اور مابعد الجغرافیائی لحاظ سے تہذیبِ سنسکرت کا ایک مفقود الاصل نمونہ ہے۔ اِس وقت یہ چاروں تہذیبیں بدوی، ایرانی، سنسکرت اور اینگلو انڈین کلچر کا آمیزہ ہے چنانچہ بدوی اور ایرانی تہذیب سے ہم نظریاتی طور پر، سنسکرتی تہذیب سے ہم سماجی اور اینگلو انڈین تہذیب سے ہم شعوری طور پر وابستہ ہیں۔ تہذیبی لحاظ سے اگر ہم اہلِ ریاست کی نظریاتی درجہ بندی کریں تو اہل سنت والجماعت اور جماعتِ سلفیہ کو ہم براہِ راست بدوی تہذیب کے زیرِ اثر کہہ سکتے ہیں۔ اِسی طرح مسلکِ اہلِ تشیع کو ہم ایرانی تہذیب سے بالواسطہ اور بدوی تہذیب سے بلاواسطہ متاثر کہہ سکتے ہیں۔ اِسی طرح جدید تعلیم یافتہ طبقے کو ہم اینگلو انڈین کلچر سے متاثر کہہ سکتے ہیں۔

تہذیبی خدوخال میں نظریاتی درجہ بندی کا مقصد صرف یہ تھا کہ تہذیب بغیر مذہب کے اپنا وجودِ اصلی کھو دیتی ہے۔ اِس لئے کسی بھی طرح سے تہذیب اور مذہب کو الگ الگ پیرائے میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ثقافت (کلچر) اور مذہب میں فکری تفریق ضرور پائی جاتی ہے جسے آجکل سیکولرازم کہا جاتا ہے۔

یہ ایک جدید انتظامی اصطلاح ہے جو برطانیہ کے ایک آزاد منش دانشور جارج جیکب ہولیوک نے وضع کی اور جس کا مفہوم یہ ہے کہ نظریہ یا فکر اور قانون دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔پس ایک مخصوص نظریہ یا فکر کو زبردستی پورے معاشرے پر مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں پورے معاشرے کو ایک مخصوص قانونی دائرہ کا پابند ضرور کیا جاسکتا ہے ۔تہذیبی تصادم کے مذکورہ فوائد بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ اِس کے ممکنہ خسارے پر بھی نظر ڈال لی جائے تاکہ تحریر فکری توازن نہ کھودے ۔

تہذیبی تصادم کا سب سے تباہ کن خسارہ یہ ہے کہ اِس سے آپ اپنی اصل شناخت سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں حتیٰ کہ آپ کی اپنی تہذیبی شناخت بھی مفقود ہو جاتی ہے ۔پس اِسی بنیادی سبب کے باعث نظریاتی علماء نت نئی تہازیب کو اپنے اندر سمو لینے کی شدومد سے مخالفت کرتے ہیں پھر چاہے وہ اجنبی تہذیب کسی بھی مروجہ تہذیب پر اثر انداز ہونے لگے ۔تہذیبی تصادم سے اقوام بنتی ہیں جو کہ اپنے اصل سے تو بیگانہ ہو جاتی ہیں لیکن بہر حال وہ ایک نئی تہذیب ضرور رونما کر دیتی ہیں ۔ جیسے ہندوستان میں جب دو قومی نظریہ کی بنیاد پر مباحثے شروع ہوئے تو کانگریسی علماء مولانا حسین احمد مدنی وحفظ الرحمن سیوہاروی کا موقف تھا کہ قومیں اَوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نظریات سے جبکہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا کہنا تھا کہ قومیں نظریات سے بنتی ہیں ۔ع

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اِس بحث کو کسی دوسرے کالم کیلئے چھوڑ دیتے ہیں کہ قومیں نظریات سے بنتی ہیں یا اوطان سے لیکن ایک بات تو مسلّم ہے کہ تہذیبی تصادم اقوام کی سماجی وفکری ہیئت ضرور بدل دیتے ہیں کیونکہ نظریات جلد ہی عقائد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو بعد میں خون کی طرح رگوں میں شامل ہو کر تمدن کی اصل بگاڑ لیتے ہیں جیسا کہ پاکستان اِس وقت مختلف تہازیب کا ملغوبہ بن چکا ہے ۔یعنی نہ تو ہم خالص عرب ہیں نہ ہی خالص ایرانی اور ہندو یا سنسکرتی کہنا تو اب ہمارے لئے مذہبی اور قومی جرم بن چکا ہے ۔

جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اصطلاح ہندو کا مطلب ہر گز ہندو مذہب کا حامل نہیں بلکہ ہندوستان کا باشندہ ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل ہندوستانی علماء کو عرب میں ہندی ہی کہا جاتا رہا ہے۔

بدقسمتی سے ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کی اپنی کوئی شناخت نہیں۔جو کچھ ہے وہ اِمپورٹڈ ہے یعنی ہم اپنے ناتواں شعور پر دوسری تہازیب کی اقدار بخوشی وبخوبی لاد چکے ہیں اور ابھی تک اِس کا ادراک بھی نہیں رکھتے بلکہ اِسی رو میں بہتے چلے جارہے ہیں۔

دوسری اقوام کی شناخت کو کاربن کاپی کر کے اپنے اُوپر مسلط کرنے والی اقوام کبھی ترقی کی منازل نہیں طے کر سکتیں اور ایسا تب ہی ہوتا ہے جب اقوام میں اجتماعی شعور ناپید ہو جائے۔جو شخص اپنی شخصیت کا تعارف نہیں رکھتا وہ بھلا دنیا کے سامنے اپنی تہذیب و اقدار کا کیا تعارف کر سکتا ہے؟۔المختصر ہم مفقود الاصل قوم ہیں جسے اپنا تعارف ہی یاد نہیں رہا اگر کچھ یاد ہے تو بس باہمی منافرت اور نظریاتی جنگ و جدل۔

☆☆☆☆☆☆☆

مذہب اور ریاست

روزنامہ پاکستان 24دسمبر2015

مذہب دراصل انسان کو جذبات یا عقائد کی بنیاد پر دو طرح کے قوانین فراہم کرتا ہے۔ایک روحانی اور دوسرے معاملاتی، جنہیں عام اصطلاح میں حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی کہا جاتا ہے۔روحانی قوانین تو بہرحال غیر متبدل ہوتے ہیں جبکہ قوانین معاملات میں تبدیلی لابدی ہے۔کسی بھی مذہب کے متعین کردہ جذبات یعنی عقائد اور روحانی قوانین متغیر نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ دراصل مذہب کے مبادیات میں شمار ہوتے ہیں جن کو تبدیل کرنے سے مذہب کے مروجہ خدوخال متاثر ہو جاتے ہیں۔
اِس لئے اِن کو چھیڑنے سے قوی امکان ہے کہ جذباتی جدل واقع ہو جائے جو کسی بھی خونریز معرکے کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔تواریخِ بشر ایسے متعدد واقعات سے بھری پڑی ہے۔سو ہم متعین جذبات یعنی عقائد یا روحانی مشقات پر بحث کرنے سے گریز کر کے قوانین معاملات پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔
عقائد اور روحانی مشقّات دراصل ہر انسان کا خالص انفرادی معاملہ ہے جیسا کہ ہم عرض کر چکے کہ انسانی شعور جستجو کی بنیاد پر خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔وقت شعور کی ہی بدولت تبدیل ہوتا ہے چنانچہ جب ہم کہتے ہیں کہ پرانا زمانہ تو اِس سے ہرگز ہماری یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ زمانہ جس میں سورج مغرب سے طلوع ہوتا تھا بلکہ ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ وقت جس میں انسانی شعور ابتدائی منازل طے کر رہا تھا۔وقت کا بدلنا دراصل ایک منطقی محاورہ ہے دراصل شعور کی تبدیلی کو ظاہر کرنے کے لئے۔انسانی شعور خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے اور نا معلوم یہ سلسلہ کہاں جا کے رُکے گا۔شعور کو ثبات نہیں۔اِس کی تفسیر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی زبانی سنئے۔ع

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یہ تغیر دراصل شعور کا تغیر ہے۔انسانی فکر کی بہتری کی روداد ہے جو ہمیشہ جاری و ساری رہے گی۔قوانین معاملات دراصل تبدیلی کے مختلف مراحل سے گزر رہے ہیں۔حیوان کی سرشت سے اُٹھنے والا انسان آج اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہے اور یہ سلسلہ یہاں پر بھی نہیں رُکے گا۔آگے جائے گا اور جاتا ہی رہے گا کہ یہی قدرت کا اٹل فیصلہ ہے اور جس کا انسان کماحقہ ادراک بھی کر چکا ہے۔عقائد اور روحانی مشقات کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے اور قوانین معاملات کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی سے، چنانچہ انسانوں کے چھوٹے سے گروہ کو معاشرہ اور اِسی کو مزید وسیع کر لیں تو ریاست کہلاتی ہے۔یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ قوانین معاملات کا تعلق براہِ راست ریاست سے ہوتا ہے۔

دراصل ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔مذہب کے حامل ریاست کے شہری ہوتے ہیں۔ریاست کو مذہب کا پابند نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ریاست میں ہر عقائد کے حامل بطورِ شہری زندگی گزارنے کے اہل ہوتے ہیں۔دنیا میں ابھی تک کسی ایسی ریاست کا وجود واقع نہیں ہوسکا جس میں سو فیصد ایک ہی جذبات یا عقائد کے حامل شہری ہوں۔ایک فیصد کیوں نہ سہی بہرحال مختلف عقائد کے حامل افراد ضرور موجود ہوتے ہیں۔

قرآن میں اسلام کے بالکل ابتدائی ادوار میں متعدد مقامات پر عقائد و نظریات کو انفرادیت تک محدود رکھنے کے احکامات ملتے ہیں۔چنانچہ ارشاد ہے"لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ"۔یعنی آپ کے لئے آپ کا دین اور میرے لئے میرا دین۔اسلام کے ابتدائی ادوار میں عقائد کی تبدیلی پر ریاست نے کوئی قوانین یا حدود جاری نہیں کئے چنانچہ ارشاد ہے"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا"۔یعنی وہ لوگ جو ایمان لے آئے پھر کفر اختیار کر لیا پھر ایمان لے آئے اور پھر کفر پر ڈٹ کر آگے بڑھ گئے تو ایسے لوگوں کی اللہ تعالیٰ نہ تو مغفرت کرے گا، نہ ہی راہِ راست دکھائے گا۔مذکورہ بالا آیت میں دو بنیادی نکات قابلِ غور ہیں۔

پہلا نکتہ یہ کہ وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیتے ہیں اُن کے لئے اللہ نے کوئی مخصوص سزا مقرر نہیں کی جبکہ دوسرا یہ کہ وہ لوگ جو کفر پر ڈٹ گئے ایسے لوگوں کا معاملہ براہِ راست اللہ کے ساتھ مخصوص ہوگیا۔پس واضح ہوگیا کہ مذہبی عقائد کا تعلق انسان اور خدا کے درمیان طے شدہ ہے۔چنانچہ اب اِسے اپنی طرف سے کسی قانون کی شکل دے کر نہ تو فردِ واحد کو اِس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی قانون وضع کر کے انسان کو اِس کا پابند

کرے، نہ کسی گروہ اور نہ ہی کسی ریاست کو اس اَمر کی اجازت دی جاسکتی ہے۔قرآن کی یہ آیت انسانیت کے درمیان ایک فیصلہ کُن مطلق حکم کی حیثیت رکھتی ہے اور جس میں کسی قسم کی طبع زاد تاویل کی ضرورت نہیں اور نہ ہی سیاق وسباق کی بنیاد پر من پسند حواشی کی محتاج۔

پس ریاست کو عقائد کی گرفت سے آزاد کر کے قوانین معاملات کو خالص انسانی بصیرت پر چھوڑ دیا جائے۔انسانی بصیرت جن عقائد ونظریات کی حامل ہوگی اُسی کا عکس قوانین معاملات میں ظاہر ہو جائے گا۔اِسی نظم کو جدید اصطلاح میں جمہوریت کہا جاتا ہے جس میں انسان کو اپنی ذاتی بصیرت کی بنیاد پر قوانین معاملات وضع کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور جس کی طرف قرآن میں بھی واضح اشارہ موجود ہے۔" وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ "۔یعنی اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔ہر انسان کو اِس بات کا مکمل اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی شخصی بصیرت کی بنیاد پر رائے پیش کرے جو بصیرت اکثریت پر مشتمل ہوگی وہی قوانین معاملات وضع کرنے کی مجاز، جبکہ اقلیت کو اِس بات کا مکمل اختیار ہوگا کہ وہ اپنی نادر بصیرت پیش کرتی رہے اُس وقت تک کہ یہ اقلیت اکثریت میں بدل جائے۔اس سے بہترین متوازن اور جامع نظم اجتماعی کوئی نہیں۔

پس یہی نظمِ اجتماعی آج کے انسانی شعور کے عین مطابق ہے۔فی زمانہ صرف وہی اخلاقی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی اقدار مروج وتابندہ رہ سکتی ہیں جو افکارِ تازہ سے ہم آہنگ ہوں گی کیونکہ اقدار اور فکر کی ہم آہنگی انسانی جذبات میں بہترین توازن پیدا کر دیتی ہے جس سے معاشرے میں ہر قسم کی اخلاقی افراط وتفریط کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہم اہلِ صفا مردودِ حرم

روزنامہ پاکستان 03دسمبر2015

کبھی کبھی قدرت ایسی مافوق الفہم ہستیاں زمین پر نمودار کر دیتی ہے کہ انسان ایسی شخصیات کے متعلق سوچ کر بھی لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ایسی شخصیات دماغ کے راستے سے گزر کر دل میں پیوست ہو جاتی ہیں اور پھر شعور اپنی ہر قسم کی اذیت کا مداوا اُن شخصیات کے افکار و نظریات سے کرتا رہتا ہے۔میرا اشارہ نابغہ روز گار محترمی فیض احمد فیض مرحوم کی طرف ہے۔ساری زندگی آپ نے مصائب و آلام میں گزار دی۔اشتراکی جنون آپ کو تادمِ زیست ناکوں چنے چبواتا رہا اور ایک پل بھی چین سے نہ بیٹھے۔میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ بہت زیادہ پڑھ لکھ جاتے ہیں وہ ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ذہین کبھی مسرور نہیں رہتا۔

مجھے شیو کمار بٹالوی کا وہ جملہ یاد آرہا ہے جو اُس نے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔کہتے ہیں "ذہین تو مرتا رہے گا، پل پل اور یہ ایک طرح سے Slow Suicide ہے"۔ایسا اِس لئے کہ ذہانت انسان کو انتہائی حساس بنا دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ذہین معاشرے میں فکری، معاشی اور معاشرتی افراط و تفریط پر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔مطلب وہ کڑھتا ہی رہتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ طاقت نہ ہو تو ذہانت سے بڑا وبال اور کوئی نہیں۔اقبال نے سچ ہی کہا تھا۔ع

رِشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصاء نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

میں نے تو صرف ذہانت کی بات کی جبکہ حکیم الامت تو طاقت کے بغیر کلیمی کو کارِ عبث فرما گئے۔بات تو بالکل سچ ہے بلکہ ایک اٹل حقیقت ہے لیکن بہت کم ایسا نادر اتفاق ہوتا ہے کہ ذہین مقتدر بھی ہو۔فیض صاحب کو بھی اپنی کمال فطانت اور پُر آلام بے بسی کا گہرا احساس تھا۔سچ تو یہ ہے کہ اشتراکیت بھی دراصل ایک معاشرتی حساسیت کا نام ہے۔خیر نظریہ تو کوئی بھی قبیح نہیں ہوتا لیکن اشتراکیت ایک حساس نظریے کا نام ہے۔

غربت کوئی الہیاتی منصوبہ نہیں بلکہ یہ ہماری ہی سماجی افراط وتفریط کا نام ہے ۔جو لوگ اِسے الہیاتی منصوبہ بندی بنانے پر تُلے ہوئے ہیں وہی درحقیقت غربت کے اصل ناصب ہیں ۔ چنانچہ غریب کو غریب خدا نے نہیں بلکہ انسانی معاشروں میں وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم نے کیا ہے ۔ یہاں پر ایک اور عمومی استدلال کا ذکر کرتا چلوں ۔
کہا جاتا ہے کہ اگر معاشرے میں غریب نہیں رہیں گے تو تعمیراتی کام وغیرہ کرنے کے لئے کارندے وغیرہ کہاں سے لائیں گے ۔ اِس لئے غریب کا معاشرے میں موجود رہنا بہت ضروری ہے ۔پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی کام کرنے کے لئے غریب ہونا کیوں ضروری ہے؟ ۔دوسری بات یہ کہ کسی کا مکان بنانے والے کا غریب ہونا کیوں شرط ہو؟ ۔دراصل ہمارا رویہ فکری نہیں بلکہ جمودی ہے ۔ہم نے کبھی خود سے غور وفکر کی مشقت نہیں کی ۔ بات کہاں سے کہاں نکل جاتی ہے ۔ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اشتراکیت ایک حساس ذہن کا نعرہ ہے اور فیض صاحب آخری سانس تک یہ نعرہ بلند کرتے رہے ۔انسان کی کمال ڈھٹائی پر بہت دکھ ہوتا ہے ۔ہم آج سب کو بھول گئے ۔اُن لوگوں کو بھی جنہوں نے ہمارے حقوق کے لئے اپنی ذات کو مصائب ومشکلات کے لئے پیش کیا۔مجھے سبط حسن یاد آ گئے ۔حبیب جالب بھی دل پر لکھے ہوئے ہیں ۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کے ساتھ مل کر فیض صاحب نے کہا تھا۔ع

ہم دیکھیں گے ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوح ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہل حکم کے سر اُوپر

جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب اَرض خدا کے کعبے سے
سب بت اُٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اُچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے

سبطِ حسن، حبیب جالب، فیض صاحب سب گزر گئے اور ہم بھی گزر رہے ہیں لیکن نہ اُنہوں نے دیکھا اور نہ ہی ہمارے دیکھنے کے کوئی امکانات موجود ہیں کیونکہ ابھی ظلم وستم کے کوہِ گراں روئی کی طرح اُڑتے نظر آرہے ہیں نہ ہی اہلِ حکم کے سروں پر بجلی کڑ کڑ کرتی نظر آرہی ہے۔ جمہوری اذہان کے ہاتھوں بننے والی ریاست میں کبھی جمہوریت نہ پنپ سکی۔ ریاست کے متعلق سوچنے اور بنانے والے جس قدر ذہین اور زیرک تھے بدقسمتی سے اُن کے بعد ریاست کو ویسی ایماندار اور فرض شناس لیڈرشپ نہ مل سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ فیض صاحب جیسی زیرک اور قوم پرست شخصیات نے حالتِ تنویم میں پڑی اِس قوم کو ہر لحاظ سے بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ بے سود۔ ع

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے اُن کو
ہمتِ کفر ملے جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغ جفاء ہیں اُن کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

مَیں نہیں سمجھتا کہ فیض صاحب جیسا بیدار مغز شخص پھر اِس قوم کو نصیب ہوگا۔

درحقیقت ہم نے قدر نہ کی، نہ بانیٔ پاکستان کی اور نہ ہی اپنے ہمدرد اور غمخوار رہنماؤں کی۔ اِس لئے کہ ہم ایک خوابیدہ قوم ہیں جس پر جہالت و رجعت پسندی کی نیند طاری ہو چکی ہے۔ اِسی نیند سے بیدار کرنے کے لئے فیض صاحب جیسی شخصیات نے اپنے قلم کے ذریعے بھرپور جدوجہد کی لیکن افسوس کہ ہم بیدار نہ ہوسکے۔ سچ ہی تو کہا تھا اقبال نے۔ ع

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

انسان جس قدر بھی کوشش کرلے آخر کار وہ فناء ہی ہو جاتا ہے۔ بس اللہ کا نام ہی رہتا ہے اور سدا رہے گا۔ فیض صاحب جیسے سماج دوست رہنما کے بارہا جگانے پر بھی کوئی مردِ قلندر اَنا الحق کا نعرہ نہ لگا سکا کیونکہ ہوسِ جاہ سے فرصت نہیں اور احساسِ اُنس نہیں تو اَنا الحق کا نعرہ کیسے لگے بلکہ اَنا الحق کا سرے سے ادراک ہی نہیں۔ ع

بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو ناظر بھی ہے منظر بھی
اُٹھے گا اَنا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

کیا عجیب بات ہے کہ فیض صاحب کی مذکورہ نظم کو سننے اور پڑھنے کی حد تک تو پوری قوم دلچسپی رکھتی ہے لیکن نہ کبھی کسی نے فیض صاحب کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی عمل کی توفیق ملی کسی کو۔ بات یہ ہے کہ ابھی ہم لمبی تان کے سو رہے ہیں اور نہیں معلوم کب بیداری نصیب ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆

شہید اسرار اللہ گنڈہ پور کی یاد میں

روزنامہ پاکستان 26 نومبر 2015

انسان ایک جذباتی وجود ہے اور ہمیشہ جذبات ہی انسان کے شعور پر حاوی رہتے ہیں گویا یہ درست ہے کہ عقل جذبات کی غلامی کرتی ہے۔ بلاشبہ مذہب ایک بہترین اور متوازن ضابطہِ حیات فراہم کرتا ہے جس میں ہر قسم کی افراط وتفریط کی ممانعت کے احکام صادر کیئے جاتے ہیں لیکن انسان پھر بھی حکمِ عدولی پر کاربند رہتا ہے۔ عاقبت اندیشی اور حصولِ جنت کی جہد بلاشک وشبہ کارِخیر ہے مگر یہ اُس وقت کیونکر کارِخیر ہوسکتا ہے جب یہ کام کسی انسان سے اُس کے جینے کا حق چھین کر انجام دیا جائے۔

دہشت گردی اور انتہاء پسندی کے عفریت نے یوں تو پورے ملک کو اپنی لپیٹ لے رکھا ہے لیکن بعض اوقات ایسے مذموم اقدام کسی ایسے اندوہ ناک اور تخریب الحواس حادثات کا سبب بن جاتے ہیں جو انسان کو تادمِ حیات خون کے آنسو رلاتے رہتے ہیں۔ میرے نہایت شفیق دوست اور معتبر طبیعت سردار اسرار اللہ خان گنڈہ پور کے دلکش اور حسین و جمیل خدوخال بخدا آج بھی دل پر نقش ہیں۔ میں آج بھی تصور میں یہ بات تسلیم کرنے سے گریزاں ہوں کہ شہید دوست اِس وقت ہمارے درمیان موجود نہیں۔

اُن دنوں مَیں ملائشیاء میں تھا۔ معمول کے مطابق اپنی ڈیوٹی کر کے فلیٹ پہنچا تو ابھی تک خود کو فارمل ڈریس سے بھی آزاد نہیں کر پایا کہ ذہن میں خیال آیا کہ گھر فون کر کے خیر و عافیت کیوں نہ دریافت کرلوں۔ چنانچہ بذریعہ کال گھر پہ بات ہوئی تو دوسری ساعت ایک انتہائی اندوہ ناک خبر سن کر گویا میرے تو پاؤں سے کسی نے زمین کھینچ لی۔ میرے سیاہ بخت کانوں میں یہ خبر آئی کہ سردار اسرار اللہ خان ایک خودکش حملے میں اپنے چند اہم ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر میں یکا یک سکتے میں پڑ گیا۔ میرے منہ سے آواز نہ نکلنے پائے اور اِسی حالت میں فون بند کر دیا۔

کافی دیر تک میں دم بخود رہا۔ جب حواس قدرے ٹھکانے لگے تو فوری بی بی سی کی ویب سائٹ پر تفصیلات چیک کرنے کی غرض سے لیپ ٹاپ آن کیا تو سکرین پر الفاظ میری آنکھوں سے دوڑنے لگے۔ الفاظ پڑھنے میں مجھے شدید دِقت ہو رہی تھی اور ذہن پڑھا ہوا سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔

بی بی سی کی ویب سائٹ پر اسرار اللہ شہید کا ضوفشاں چہرہ دیکھ کر آپ کے ساتھ گزارے گئے تمام لمحات زخم بن کر روح کو اذیت ناک کرب سے دو چار کرتے گئے۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالا۔ مجھے بالکل بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ سردار اسرار اللہ یوں بھری جوانی میں اچانک رخصت ہو سکتے ہیں۔لیکن یہ ایسی حقیقت ہے جس کو ذہن آج بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ بقرِ عید کے پہلے دن عصر کے وقت سردار اسرار اللہ اپنی رہائش گاہ میں آنے والے مہمانوں سے معانقہ میں مصروف تھے کہ بھرے مجمع میں ایک ناعاقبت اندیش خودکش بمبار آپ کے حجرے میں گھسا اور آپ سے ہم آغوش ہو کر خود کو بارود سمیت اُڑا دیا۔ یوں وہ بدبخت خود سمیت ہمارے بے آب وگیاہ علاقے کی روشن اُمید بھی لے اُڑا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے اور یہ ہمارا قرآن اور خدا کی شریعت کہہ رہی ہے۔ نہ معلوم یہ کون لوگ ہیں جو ظلم و استبداد کی اِس بھیانک روش کو سلامتی کے دین سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ وقت بہت خوبصورت اور پُرسکون ہوا کرتا جب آپ کے ساتھ صحافتی معاملات کے بارے گفت وشنید جاری رہتی۔

اُن دنوں میں صوبہ سرحد کے انتہائی معروف انگریزی اخبار دی فرنٹیئر پوسٹ کے ساتھ منسلک تھا اور اکثر و بیشتر آپ سے ملاقاتیں جاری رہتیں۔ تین بار آپ صوبائی قانون ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ نہایت دھیمے مزاج کے مگر حسِ مزاح کمال کی رکھتے تھے۔ نہ صرف خوش شکل بلکہ خوش گفتار، ملنسار، بذلہ سنج اور مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ ایک دھیمی اور دل آویز مسکراہٹ ہر وقت آپ کے ضوفشاں چہرے پر دمکتی رہتی۔ پاکستان میں کردار کی سیاست قریباً ناپید ہوتی جا رہی ہے لیکن آپ کو دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے انفرادی مفادات پر اُصولوں کو ترجیح دینے والے آج بھی زندہ ہیں۔ سیاسیات میں ماسٹر کرنے کے بعد آپ سیاست کے مبادیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ کے منہ سے کبھی بعید از اخلاقیات بات سننے کو نہیں ملی۔ نظریاتی سیاست آپ کا وصف تھی۔

میرا ایمان ہے کہ ایسی عدیم المثال شخصیات بہت کم پیدا ہوتی ہیں جن کے پاس اقتدار کے ہوتے ہوئے بھی اُن کے اخلاقیات اور اُصول مجروح نہیں ہوتے۔ افسوس کہ ہمارے ہاں اجتماعی شعور کا فقدان ہے۔ ہم سیاسی شعور رکھتے ہیں نہ ہی عالمی جمہوری اقدار کا فہم۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے ہمدرد اور زیرک ایک ایک کر کے گنوا بیٹھے اور اِس سے بھی شرمناک بات یہ ہے کہ ہم اپنے محسنین کا بدلہ لینے میں بُری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ دو سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے

مگر آج تک شہید اسرار اللہ کے قاتلوں کا پتہ نہ چل سکا۔ اہم بات تو یہ ہے کہ اِس وقت صوبہ خیبر پختونخواء میں پاکستان تحریکِ انصاف کی حکومت ہے اور شہید اسرار اللہ اِسی حکومت کا مضبوط ستون سمجھے جاتے رہے ہیں۔ ایسی حکومت پر حروفِ افسوس کے سوا اور کیا لکھا جا سکتا ہے کہ جو ابھی تک اپنے وزیر قانون کے قاتلوں کا سراغ تک نہ لگا سکی۔ بہت ہی اچھا کیا جو آپ کے بڑے برادر سردار اکرام اللہ گنڈہ پور نے وزیر اعلیٰ پرویز خٹک کو خط لکھ کر مشترکہ تحقیقاتی ٹیم تحلیل کرنے کی گذارش کر دی۔ اکرام اللہ کے اعتراضات بجا تھے کہ ٹیم نے ابھی تک ہمارے بیانات قلمبند نہیں کئے چنانچہ تحقیقاتی ٹیم جانبداری اور تعصب کا شکار ہو چکی ہے اِس لئے اب اِس کا کوئی فائدہ نہیں رہا۔ اِس ضمن میں اکرام اللہ خان کو انفرادی طور پر مشورہ دوں گا کہ ایسی حکومت جو آپ کے چھوٹے بھائی اور اپنے وزیر قانون کے قاتلوں کا سراغ لگانے میں ناکام ہو چکی ہے ایسی حکومت کا حصہ بننے سے بہتر ہے کہ آپ مستعفی ہو جائیں اور ویسے بھی اب شہید اسرار اللہ کی ناگہاں شہادت کے بعد آپ کے خاندان میں سیاست مکروہ ہوگئی ہے۔ شہید اسرار اللہ کے قاتل یقیناً آج بھی اپنی مسند پر براجمان ہوں گے مگر کون جانے کہ وہ کس لبادے میں خود کو اوڑھے ہوئے ہیں۔ انصاف وہاں طلب کیا جاتا ہے جہاں منصف مدعی نہ ہو۔ یہاں تو منصف ہی مدعی ہے۔ ع

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

نوابزادہ لیاقت علی خان، حیات شیر پاؤ، حق نواز گنڈہ پور، بینظیر بھٹو، بشیر احمد بلور، اسرار اللہ گنڈہ پور وغیرہم یہ تمام سیاسی لیڈر جمہوری اَذہان کے حامل نڈر لوگ تھے جنھوں نے اِس ملک میں جمہوریت کی خاطر اپنی جانیں تک گنوا دیں۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اِن تمام سیاسی شہداء میں سے کسی ایک کا بھی قاتل پکڑا گیا؟۔ یقیناً جواب نفی میں ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو مجھے تو اپنے نہایت شفیق دوست شہید اسرار اللہ کی کمی آج بھی افسردہ کئے ہوئے ہے اور بخدا یہ خلاء کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ ع

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

☆☆☆☆☆☆☆

جمالیاتِ خسرو

روزنامہ پاکستان 19 نومبر 2015

علم سکڑتا جا رہا ہے اور تعلیم بڑھتی جا رہی ہے۔ انسانی جمالیات پر تکنیک نے قبضہ کر کے انسان کو ایک میکانکی آلے میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب دساتیرِ گل و بلبل کی جگہ فیس بک اور ٹویٹر نے لے لی ہے۔ رہی سہی کسر گوگل نے پوری کر دی۔ ہوسِ فوقیت نے انسانی فطرت سے تہذیب و جمالیات کو نکال باہر کر دیا۔ سٹیٹس سمبلز کی جانب بھاگنے والا انسان اب تسکینِ حسِ جمالیات کو وقت کا ضیاع اور خرافات سے تشبیہ دینے لگا گویا ذائقے بدل گئے۔ روحانی ملیریا نے آج کے انسان کے سینے پر نہ صرف ہوس کی صفراء پیدا کر دی بلکہ اُس کے اعصاب کو کور ذوقی کی اینٹھن سے بھی بھر دیا۔

آج کا اُصول ہے آگے بڑھو چاہے کسی کو کچلنا کیوں نہ پڑے بلکہ کچلتے جاؤ اور آگے بڑھتے جاؤ۔ گویا منزل کا تعین ہی نہ رہا سوائے آگے بڑھنے کے۔ ہمارے اساتذہ کہا کرتے کہ علم سفر ہے اور محبت منزل پس علم کی انتہاء محبت ہے کیونکہ انسان عقلِ کل نہیں ہو سکتا اِس لئے اُسے عقائد کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ لیکن آج کے اُصول یہ نہیں۔ آج صرف ایک ہی اُصول ہے کہ بس آگے بڑھتے جاؤ اور اخلاقیات و تہذیب کی ساری حدیں پھلانگ دو۔ پھر آخر میں بے سکونی کی موت مر کر پسماندگان کو اِسی دھکم پیل میں چھوڑ جاؤ۔

جمالیات کی بات ہو اور ملک الشعراء کا ذکر نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ فی زمانہ اَدب کے معیارات بدل گئے۔ منثور کلام نے نظم کا لطف ہی بیگانہ کر دیا۔ ایک دور ہوتا تھا جب غیر مبذون کلام کے حامل معروف شعراء کو بھی بھرے مجمعوں میں خفت اُٹھانی پڑتی جبکہ آج تو ہر تیسرا پریشان حال شاعر بنا ہوا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری دراصل جذبات و احساسات کی بہترین ترجمانی کرتی ہے لیکن یہ بالکل ضروری نہیں کہ ہر اُداس طبع شاعر ہو۔ سوشل میڈیا پر آزادیِ ہنر کی غیر ضروری سہولیات نے اُردو نظم کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا۔

خیر بات تو حضرت ابوالحسن یمین الدین المعروف امیر خسرو دہلوی کی ہو رہی تھی۔ والد امیر سیف الدین ایک تُرک سردار تھے۔ منگولوں کے حملوں کے وقت ہندوستان آئے اور پٹیالی (آگرہ) میں سکونت اختیار کر لی۔ حضرت امیر خسرو 1253ء میں یہیں پیدا ہوئے اور یہیں (1325ء) میں دارِ فانی سے کوچ کی۔

آپ کی والدہ ہندوستانی تھیں ۔ کچھ عرصے بعد آپ کا خاندان دہلی منتقل ہوگیا۔حضرت امیر خسرو نے سلطنت دہلی (خاندان غلامان،خلجی،تغلق) کے آٹھ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور برصغیر میں اسلامی سلطنت کے ابتدائی ادوار کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں سرگرم حصہ لیا۔عربی فارسی اور سنسکرت پر غیر معمولی دسترس رکھنے والے صوفی شاعر جمالیات کے بحرِ بیکراں تھے ۔ یہ وہی خسرو ہے جس کو غالب نے اپنا اُستاد تسلیم کیا۔محبوب الٰہی بابا صاحب حضرت نظام الدین اولیاء کے لاڈلے مرید علوم دینیہ ومتداولہ کے ماہر سمجھے جاتے تھے لیکن آپ نے جو فارسی ادب تخلیق کیا اُس کی مثال رہتی دنیا تک مفقود ہوگئی ۔حضرت امیر خسرو دہلوی کی شاعری فارسی میں ہو یا سنسکرت میں جمالیات سے لبریز اور روحانی آسودگی سے مالا مال ہوتی ہے ۔میں سمجھتا ہوں کہ حضرت خسرو ہی اُردو زبان کے پہلے شاعر تھے ۔آپ نے فارسی اور برج بھاشا کی جو حسین اور دلکش آمیزش تخلیق کی ،برصغیر کے کسی بھی شاعر کے حصے میں یہ عدیم المثال ہنر نہ آسکا۔ع

ز حالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لی ہو کاہے لگائے چھتیاں

طوطیِ ہند کا لقب پانے والے حضرت امیر خسرو دہلوی محبوب الٰہی کے بہت چہیتے مرید تھے ۔حضرت محبوب الٰہی اکثر و بیشتر اپنے سر پر کلاہ ترچھی رکھا کرتے ۔ چنانچہ ایک دن امیر خسرو دہلوی کی ذوق بیں نگاہ پڑی تو فرطِ جذبات سے بے ساختہ پکار اُٹھے ۔ع

ہر قوم راست راہِ دین و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

حضرت محبوب الٰہی وجدِ التفات میں آ کر فرماتے ہیں ۔خسرو آگے بھی تو بول چنانچہ خسرو فرماتے ہیں ۔ع

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بکس نگاہے

حضرت امیر خسرو دہلوی صرف قرآن، حدیث فقہ و منطق کے ماہر نہیں تھے بلکہ اَدب اور موسیقی پر بھی زبردست عبور حاصل تھا۔موسیقی کی سُدھ قدرتی طور پر آپ کو عطاء ہوئی تھی۔آپ جیسا زیرک موسیقار برصغیر میں پھر نہ پیدا ہوسکا۔آلاتِ موسیقی میں ستار اور طبلہ آپ ہی کی ایجادات ہیں جبکہ گائیکی میں خیال اور ترانہ بھی آپ ہی نے وضع کئے۔

ترانہ جو آج بھی کلاسکی موسیقی کیلئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے تقریباً ہر بڑے موسیقار نے اِس میں طبع آزمائی کی چاہے وہ انڈیا کے پنڈت روی شنکر ہوں، اُستاد امیر خان، منشی رضی الدین، اُستاد بہاءالدین خان یا پھر اُستاد الاساتذہ نصرت فتح علی خان مرحوم ہوں، سب نے کسی نہ کسی راگ میں ترانے کی مشق ضرور کی ہے۔آپ کی وضع کردہ راگوں میں راگ زیلف اور راگ ہمیر کے ترانے انسان کو بے ساختہ روحانی آسودگی سے بہرہ مند کر دیتے ہیں۔علاوہ ازیں راگ فرغانہ، صنم خیال، موافق اور راگ مجیر کی بندش آج بھی زیرک قوال کے ہاں سببِ تبرک و راحت ہے۔
راگ مجیر کی بندش۔ع

حضرت نظام الدین اولیاء پیر مشائخ نور
آن پڑے دربار تہارے خسرو پر کرپا کرو

حضرت خسرو کے فن کی اَوج محض تار و چوب تک محدود نہیں تھی بلکہ آپ کی روح معرفتِ حق سے گزر کر حقیقتِ محمدیہ میں ادغام کر چکی تھی اور جس کا ادراک صرف صاحبِ حال قلندر یا ولیِ سرمست ہی کر سکتا ہے۔فرماتے ہیں۔ع

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

صنفِ نازک کے خط و خال کی منظر کشی پر حضرت خسرو کو کمال ملکہ حاصل تھا چنانچہ آپ کا سارا رومانوی کلام مستور کماں دار کے کومل اور نرمل حُسن و شباب سے پُر جمالیات و روحانی تسکین کا مرقع ہے۔میری بے حد پسندیدہ حضرت خسرو کی یہ غزل فارسی رومانوی اَدب و تہذیب کا فقید المثل شاہکار ہے۔ع

گفتم کہ روشن از قمر ، گفتا کہ رخسار منست
گفتم کہ شیریں از شکر ، گفتا کہ گفتار منست

میں نے کہا کہ چاند سے زیادہ کچھ روشن ہے؟ کہا کہ میرے رخسار۔
میں نے کہا کہ شکر سے زیادہ میٹھا کچھ ہے؟ کہا کہ میری گفتار۔

گفتم طریق عاشقاں ، گفتا وفاداری بود
گفتم مکن جور و جفاء ، گفتا کہ ایں کار منست

میں نے کہا کہ عاشقوں کا طریق کیا ہے؟ کہا کہ محبوب سے وفاداری۔
میں نے کہا کہ جور و جفاء نہ کیجئے۔ کہا کہ یہ تو میرا کام ہے۔

گفتم کہ مرگِ ناگہاں ، گفتا کہ درد ہجرِ من
گفتم علاجِ زندگی ، گفتا کہ دیدار منست

میں نے کہا مرگِ ناگہاں کیا ہے؟ کہا کہ میرے ہجر کا درد۔
میں نے کہا کہ زندگی کا علاج کیا ہے؟ کہا کہ میرا دیدار۔

گفتم بہاری یا خزاں ، گفتا کہ رشکِ حُسنِ من
گفتم خجالتِ کبک را ، گفتا رفتارِ منست

میں نے کہا کہ تُو بہار ہے یا خزاں؟ ۔کہا کہ وہ میرے حُسن پر رشک کناں ہیں ۔
میں نے کہا کہ چکور کی شرمندگی کیا ہے؟ ۔کہا میری رفتار۔

گفتم کہ حوری یا پری ، گفتا کہ من شاہ بُتاں
گفتم کہ خسرو ناتواں ، گفتا پرستار منست

میں نے کہا کہ یہ حور اور پری کیا ہے؟ ۔کہا کہ میں حسیناؤں کی بادشاہ ہوں ۔
میں نے کہا کہ خسرو تو ناتواں ہے ۔کہا کہ میرا پرستار تو ہے ۔

خودی

روزنامہ پاکستان 12 نومبر 2015

انسان ایک باشعور حیوان ہے اگر ہم انسان اور حیوان میں بنیادی فرق ملحوظ رکھیں تو یہ امتیاز صرف شعور کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے گویا انسان کو حیوان سے جو چیز ممیز کرتی ہے وہ شعور ہے۔شعور ایک اِکائی ہے جو انسان کو خیر اور شر کے مبادیات سے آگاہ کرتی ہے۔شعور انسان کو خیر کی برکت اور شر کے خسارے سے متنبہ کرتا ہے۔شعور کا یہ انتباہ انسانی خصلت کو تہذیب کی اَوج پر لے جاتا ہے چنانچہ انسانی رویہ کو تمام آلائشوں سے منزہ کرنے والا ہی شعور ہی ہے۔

شعور دراصل غور و فکر کا خلاصہ ہے جس کی بنیاد پر انسان تزکیہ نفس کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔اگر ہم علم کی بات کریں تو علم کی غرض و غایت بھی یہی تزکیہ نفس ہے کہ اِس کے بغیر علم کا کوئی فائدہ نہیں رہ جاتا۔علم انسان کو شعور سے بہرہ مند کرتا ہے اور شعور انسانی رویہ میں تزئین پیدا کرتا ہے گویا اِس لحاظ سے علم انسان کے لئے زیور ثابت ہوا۔

علم شعور پیدا کرتا ہے اور شعور انسان کو خود آگہی کی لازوال دولت عطا کرتا ہے۔خود آگہی دراصل خدا آگہی ہے جیسا کہ صوفیاء سے روایت ہے"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے اپنے خدا کو پہچان لیا۔خود آگہی کے بعد انسان جس مقام پر پہنچتا ہے وہ دراصل ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی روحانی اصطلاح "خودی" کہلاتی ہے۔خودی دراصل معرفتِ خدا ہے جو انسانی روح کو روحِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لیتی ہے۔یہ ہم آہنگی انسان کو رضائے خداوندی میں حصہ دار بنا دیتی ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا۔ع

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

رضائے الٰہی میں منشائے انسان کی قدرت کو شامل کرنا دراصل اِس اَمر کا بین ثبوت ہے کہ انسان شعور کی بدولت اپنی روح سے ہر قسم کی آلائش دور کر چکا گویا فلاح پا چکا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔"قَدۡ أَفۡلَحَ مَن تَزَكَّىٰ"۔یعنی کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو آلودگی سے پاک کر لیا۔

نفس کی آلودگی سے پاکیزگی یہ ہے کہ انسان منفی جذبات پر قابو پالے یعنی غصہ،نفرت، کینہ،کدورت، قطع تعلقی، گزند جان ومال اور آبرو وغیرہ سے مکمل طور پر کنارہ کرلے۔جب انسان اِس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ روحِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے اورانسان حق کا استعارہ بن جاتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جسے خودی کہا گیا۔یہ خودی دراصل تہذیب النفس کی معراج کا نام ہے جہاں پر انسان مردِمومن سے ملقب ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں پر انسان کامل ہوجاتا ہے۔تکمیل ذات دراصل تزکیہ نفس کی بدولت انجام پاتی ہے اورتزکیہ نفس شعور سے پیدا ہوتا ہے پس شعور کی بنیاد علم ہے ۔افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس ریاست کے بانی شعوروآگہی کی معراج پر موجود تھے اُسی ریاست کا نوجوان طبقہ جوکسی بھی ریاست کا روشن مستقبل ہوتا ہے شعوروآگہی سے نابلد ہے۔زرپرستی اور ہوسِ جاہ وحشم نے ہمارے ہاں علمی رویہ پنپنے ہی نہیں دیا۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا شمار اپنے زمانے کے انتہائی ذہین ترین مفکرین میں ہوتا تھا۔آپ وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے امام غزالی کی منطقی مخاصمت کے بعد باقاعدہ طور پر عقلی روش کا ڈٹ کر دفاع کیا۔آپ نے عقلِ محض کی قباحت کو واضح کرکے عقل کو وجدان کی روشنی سے منور کیا۔آپ نے جہاں ملحدانہ فکر کا محاسبہ کیا تو وہاں عقیدہ کو شعور کی روشنی سے ضوفشاں کیا۔آپ نے اُمتِ مسلمہ کے اذہان کو رجعت پسندی کے بوسیدہ تصورات سے نکال کر دانش نورانی کی روشنی سے منور کیا۔آپ نے نہ صرف مطلق دانش کی اذیت ناک آزادی کے بنیادی اسباب کو تفصیل سے بیان کیا بلکہ اپنے خطبات میں دانش نورانی کی افادیت پر بھی سیر حاصل بحث کی۔فرماتے ہیں۔ع

اِک دانش نورانی اِک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

آپ نے اُمت کو غور وفکر کی ترغیب کے ساتھ ساتھ نفس کی تہذیب کا وہ درس دیا جو رہتی دنیا تک اُمت مسلمہ کے اذہان کو روشن کرتا رہے گا۔آپ نے فکری اور سماجی خودداری کا نیا راستہ متعین کیا جسے آپ ”خودی“ کی اصطلاح سے تعبیر کرتے رہے۔

خودی عام طور پر فارسی زبان میں تکبر کے معانی میں استعمال ہوتا رہا لیکن پہلی مرتبہ آپ نے اِس اصطلاح کی ایک مخصوص علمی تعبیر بیان کی جو بیداری شعور کی ایک فقید المثال تحریک بن کر معروف ہوئی۔ افسوس اِس اَمر کا ہے کہ دیگر اقوام نے ڈاکٹر محمد اقبال کے تصورِ خودی کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنا کر سماجی و اقتصادی ترقی کی راہیں ہموار کر لیں لیکن ہم وہ بدنصیب قوم ہیں جو آج تک کماحقہ افکارِ اقبال سے استفادہ نہ کر سکے۔ ہم نے قائد اعظم محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت سے کچھ سیکھا نہ فکرِ اقبال سے اپنے اذہان کو روشن کیا۔

دراصل ہمارے ہاں غوروفکر کی وہ روش ہی نہ پیدا ہو سکی جو کسی بھی قوم کی علمی و اخلاقی اوج کی ضامن ہوتی ہے۔ رجعت پسندی اور ثقافتی گھٹن نے ہمارے اذہان کو مضمحل کر دیا۔ ہم غوروفکر کی مشقت کی بجائے جہالت کی سہل پسندی میں جتھ گئے یہی وجہ ہے کہ آج ہم علمی، اخلاقی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے محض خواب دیکھ رہے ہیں۔

تعلیمی اداروں کی بھرمار بھی ہمارے رویہ میں تہذیب نہ لا سکی۔ الیکٹرانک میڈیا کا تقابلی اژدہام بھی ہمارے اخلاق نہ سنوار سکا کیونکہ ہماری ترجیحات ابھی تک شعور نہیں طلبِ جاہ ہے۔ ہماری نئی نسل بھی تعلیم اِس لئے حاصل کرتی ہے تاکہ وہ اختیارات تک رسائی حاصل کر لے۔

ہم علم کے مقصد سے واقف ہیں نہ ہی تعلیم کی افادیت سے۔ ہمارے ہاں سب سے قابلِ رحم طبقہ اُستاد اور دانشور رہے۔ چونکہ ہمیں علم سے شغف نہیں اِس لئے اُستاد کی قدر و منزلت کا بھی احساس نہیں۔ بھاری بھرکم سوشل سٹیٹس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہم ہر اخلاقی و تہذیبی حد پھلانگنے کے درپے رہتے ہیں پھر چاہے ہمیں اِس کے لئے ضمیر کیوں نہ بیچنا پڑے۔ ع

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

ہم اپنے فکری رہنما کی تمام نصیحتیں بھول چکے ہیں۔ نصیحت تو درکنار ہم خود اپنے علمی و فکری رہنما ہی بھول چکے کیونکہ ہم ضمیر فروش قوم ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کے بعد آج تک پھر پاکستان کو کوئی مخلص اور ذہین لیڈر نہ مل سکا اور جو کوئی اتفاق سے مخلص مل بھی گیا تو وہ رجعت پسندی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ جب تک ہمارا ضمیر، ہماری خودی بیدار نہیں ہوگی تب تک ہم ایک زندہ قوم نہیں بن سکتے۔ رجعت پسند معاشروں میں دو چیزیں عام ہوتی ہیں۔ ایک علم و اخلاق کا قحط دوسرا ضمیر فروشی کا، چنانچہ اِس ضمیر فروشی میں صرف اشرافیہ نہیں بلکہ اہلِ جُبّہ و دستار بھی شامل ہیں۔ ع

باقی نہ رہی وہ تری آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

☆☆☆☆☆☆☆

شعور برائے جمہوریت

روزنامہ پاکستان 15 نومبر 2015

ہمارے ایک متشرع بزرگ دوست فرماتے ہیں کہ یہ کیسی جمہوریت ہے کہ مفتی اعظم اور ایک خوانچہ فروش کی رائے برابر ہوتی ہے۔حضرت جی کا سوال تو معقول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سوال آخر پیدا ہی کیوں ہوا؟۔اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی جمہوریت سے قبل بہت سے اُصول ایسے ہیں جن کے متعلق ہم سرے سے جانتے ہی نہیں یعنی جمہوریت کے بھی بہت سے بنیادی تقاضے ہوتے ہیں جن کی تکمیل کے بعد کہیں جا کے جمہوریت معاشرے میں پنپ سکتی ہے۔

جس ملک میں تعلیم جیسی بنیادی ضرورت پر سو روپے میں سے صرف دو روپے خرچ کئے جاتے ہوں اُس ملک میں جمہوریت کا صرف خواب ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ہر قوم کی ترقی کے مبادیات میں سے علم و اخلاق بنیادی درجہ رکھتے ہیں۔علم و اخلاق کے بغیر کوئی بھی قوم کسی بھی لحاظ سے ترقی نہیں کر سکتی چاہے وہ اِس کے علاوہ جونسا بھی اُصول اپنا لے۔جن معاشروں میں علمی،معاشی اور سماجی طبقاتی نظام رائج ہو وہاں ملوکیت تو پنپ سکتی ہے جمہوریت نہیں کیونکہ جمہوریت کی بنیاد دانش عامہ پر قائم ہوتی ہے۔جب تک ریاست کا ہر شہری باشعور اور متفکرانہ رویہ کا حامل نہیں ہو جاتا تب تک جمہوریت کا صرف نام ہی لیا جا سکتا ہے۔

جمہوریت ایک خالص عوامی نظمِ اجتماعی ہے جس میں ہر شہری کو بلا تفریق و امتیاز رائے دہی کا حق حاصل ہوتا ہے۔جب ریاست کا ہر شہری باشعور اور صاحبِ دانش ہو جائے تو پھر یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی کہ ایک مفتی اور خوانچہ فروش کی رائے میں کیا فرق رونما ہو رہا ہے۔اوّل تو ہمارے ہاں اجتماعی طور پر غور و فکر کا وتیرہ ہی نہیں پایا جاتا اگر کہیں سے کوئی فکر و دانش کی آواز بلند ہو تو رجعت پسند شجرِ ممنوعہ قرار دے کر اُس پر قدغن لگا دیتے ہیں۔مسئلہ صرف یہ نہیں کہ ہمارے پاس نظمِ اجتماعی کا شعور نہیں بلکہ ہمارے ہاں تو سماجیات کے تمام علوم کا قحط ہے۔ہم جانتے ہی نہیں کہ معاشرہ ہوتا کیا ہے،ریاست کے مبادیات کیا ہوتے ہیں،سیاست کی جمہوری بنیاد کیا ہے۔ہمارے ہاں کردار کشی اور اشراف پرستی کا نام سیاست ہے۔

اصل میں اخلاقیات کی بنیاد شعور ہے۔جب تک انسان باشعور نہیں ہو جاتا وہ صاحب اخلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ علم انسان کو تہذیب النفس کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔جہالت ایک متعدی بیماری ہے جو سب سے پہلے انسانی رویہ میں بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ایک شخص کا مضمحل رویہ پورے معاشرے کی تخریب کا سبب بن سکتا ہے اور جہاں پورے کا پورا معاشرہ ہی تخریب الخصلت ہو وہاں تو لب کشائی کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔اہلِ دانش ہمیشہ تنقید برائے اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں لیکن ہمارے ہاں تنقید دراصل کردارکشی کا نام ہے اور اِس کے لئے وہ محاذ استعمال ہو رہا ہے جو انبیاء کا پیشہ رہا ہے۔صحافت ایک مقدس اور حساس فریضہ ہے۔ایک صحافی کو متوازن مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ باشعور اور باکردار بھی ہونا چاہئے تا کہ وہ معاشرے کی بہتر اسلوب سے اصلاح کر سکے اِس پیشے کا تقاضا منکسر المزاجی اور فکری توازن ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی اہتمام موجود نہیں۔

ہمارے ہاں نہ تو مکمل اور ذمہ دارانہ صحافتی تربیت کا اہتمام ہے نہ ہی مشقاتِ تہذیب النفس کا۔ہمارے ہاں خود احتسابی کا کوئی رواج نہیں پایا جاتا۔ملائشیاء اور سنگار پور میں قیام کے دوران میں نے وہاں کے لوگوں میں خود احتسابی اور تہذیب النفس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی دیکھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں آج علم واخلاق کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی یافتہ اور باکمال تسلیم کی جاتی ہیں۔

تمام برائیوں کی جڑ جہالت ہے۔جب تک ہم جہالت کا قلع قمع نہیں کر لیتے تب تک کسی بھی شعبہ میں ترقی کا کوئی امکان موجود نہیں۔پس یاد رہے کہ محض ڈگریاں لینے کا نام تعلیم نہیں۔تعلیم دراصل تہذیب النفس کا نام ہے۔اگر تعلیم آپ کے رویہ میں بہتری نہ لا سکی تو آپ کے کالج یا یونیورسٹی پڑھنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔چنانچہ تعلیم کی غرض وغایت تہذیب النفس ہی ہے۔جہالت سے نفرت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جاہل کا رویہ آلودہ ہوتا ہے جبکہ تعلیم رویہ میں ہر قسم کی آلائش کو دور کر دیتی ہے اور شعور انسان کے اعمال کو روشن کر دیتا ہے۔

ہمیں اساتذہ تاکید کیا کرتے کہ جب بھی تنقید کرنی ہو تو ہمیشہ نظریات پر تنقید کریں۔شخصیت پر تنقید سے یکسر گریز کریں کیونکہ شخصیت حاملِ حواس ہوتی ہے جبکہ نظریات حسیات سے منزہ ہوتے ہیں۔شخصیت پر تنقید معاشرہ میں سماجی تخریب اور باہمی چپقلش کا سبب بنتی ہے کیونکہ اکثر و بیشتر شخصیات سے انسانی جذبات متعلق ہوتے ہیں۔چنانچہ شخصیت پر تنقید سے انسانی جذبات مجروح ہوتے ہیں اور اِسی طرح منتقمانہ فضاء قائم ہو جاتی ہے۔

نہ صرف اتنا بلکہ یہ سلسلہ سماجی بگاڑ پر جا کر رکتا ہے اِس لئے شخصیت پر تنقید سے یکسر گریز کیا جائے ۔پس غیر احتسابی کی بجائے خود احتسابی کی راہ اپنانی چاہیئے ۔

ضرورت نہیں نام لینے کی لیکن ملکی صحافت و سیاست میں آج کل جن اخلاق سوز سرگرمیوں کی ہلچل مچی ہوئی ہے کسی بھی مہذب قوم سے ایسے قبیح الخلق سرگرمیوں کی اُمید نہیں کی جا سکتی ۔ایک طویل عرصہ ہوگیا علم نفسیات پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے ۔میں نے آج تک اِس طرح کی اخلاق سوز فضاء کہیں نہیں دیکھی جس قدر آج کل ہمارے ہاں چل رہی ہے ۔ بالفرض اگر میں ایک سیاسی رہنما ہوں تو سماجی و اخلاقی اُصول کے مطابق میری سیاست کو میری گھر کی دہلیز پار کرنے کی اجازت نہیں چنانچہ میرے گھر میں کیا ہو رہا ہے یا میرے بیڈ روم میں کیا ہونے والا ہے اس کا میری سیاسی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہ ہے وہ اُصول جس کی پاسداری باشعور قومیں کر رہی ہیں لیکن یہاں تو صحافی، سیاستدان، وکیل سب سیدھا گھر میں گھس آتے ہیں ۔

اِس سے قبیح الخلق رویہ اور کیا ہوسکتا ہے بھلا؟ ۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ ہوسِ زر اور مکروہ شہرت نے ہمارے حواس کو تہذیب سے بیگانہ کر دیا۔ ہم اپنے چینلز کی ریٹنگز اور ویورشپ بڑھانے کی خاطر ایسی قبیح سنسنی پھیلاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔اس سارے معاملے میں ذرا بھی فکر نہیں رہتی کہ ہماری اِن قبیح سرگرمیوں کے نتائج کن صورتوں میں سامنے آئیں گے اور معاشرے میں کس قسم کی اخلاقی فضاء پروان چڑھے گی ۔پس اِس طرف ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا کیونکہ ہم اجتماعی طور غور و فکر کی عادت نہیں رکھتے ۔

☆☆☆☆☆☆☆

علم الکائنات

Published on: www.murshidfoundation.org: 18.09.2020

اگر آپ کو سیارہِ زمین سے بے دخل کر دیا جائے تو آپ کو بالکل سیدھ میں اُوپر قریباً سو کلو میٹر جانا پڑے گا۔ پھر آپ اِس گول مٹول سیارے کی سلطنت سے باہر نکل جائیں گے لیکن اِس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آپ پھر سیارہ زہرہ یا مریخ تک پہنچ جائیں گے۔ نہیں بالکل بھی نہیں کیونکہ آپ نے مریخ تک پہنچنے کیلئے قریباً آٹھ کروڑ کلو میٹر خلاء میں سفر کرنا ہو گا جبکہ زہرہ تک پہنچنے کیلئے کم و بیش ایک ارب دو کروڑ تیس لاکھ کلو میٹر سفر کرنا ہو گا۔

یہ مضمون پڑھنے اور سمجھنے کیلئے بہت ضروری ہے کہ آپ اپنے عقائد کو چند منٹ کیلئے گوشہِ نسیان میں رکھ دیں لیکن اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر اِس سے آگے پڑھنا آپ کے عقائد کیلئے مضر ہو سکتا ہے۔ سائنس نہیں مانتی کہ اِس کائنات یا انسان کو بنانے والی کوئی فی نفسہٖ حکیم یا مدبر ذات موجود ہے۔ سائنس کی بنیاد ہے تجربہ اور تجربہ کے وسائلِ رئیسہ انسان کی پانچ حسیات ہیں چنانچہ جب تک کچھ بھی اِن پانچ حسیات کے دائرے میں نہیں آجاتا تب تک سائنس اُس کو تسلیم نہیں کرتی پس یہ سائنس کی جوہری مجبوری ہے۔

سائنس کی واحد میزبان عقل ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ عقل خود بھی محلِ نظر ہے البتہ تجربہ پر کوئی کلام نہیں کیونکہ تجربے سے بڑھ کر کچھ بھی اس کائنات میں تسلیم و رضا کا حقدار نہیں ٹھہرتا۔ اب عقل اور تجربہ دونوں کسی بھی خدا یا خالق کے ادراک سے یکسر عاری ہیں چنانچہ سوائے تسلیمِ مطلق کے کوئی رستہ نہیں ہے۔ اب یہ بھی کیونکر ضروری ہے کہ اِس کائنات کا کوئی خالق ہو؟۔ یہ سوال تبھی اُٹھ سکتا ہے جب آپ مطلق تسلیم سے فرار حاصل کر چکے ہوں اور اگر آپ مطلق تسلیم و رضا کے پیکر ہیں تو یہ سوال آپ کیلئے اچھی خاصی مصیبت پیدا کر سکتا ہے۔

سائنس مانتی ہے کہ اِس کائنات کی ابتداء ایک زوردار دھماکے سے ہوئی جسے کاسمولوجی کی زبان میں بِگ بینگ اور اُردو میں اِنفجارِ عظیم کہا جاتا ہے۔ جس طرح خدا پرستوں سے ذہین پوچھتے رہے ہیں کہ خدا کا خالق کون ہے ٹھیک اُسی طرح علمائے سائنس سے بھی ہم جیسے گھمبیر طبع پوچھنے کی جسارت کرتے رہتے ہیں کہ بِگ بینگ سے قبل وہ مادہ کیسے وقوع پذیر ہوا جس کے سبب یہ زوردار دھماکہ ہوا؟۔

سورج ایک دیوہیکل ستارہ ہے جس کے گرد کوئی آٹھ سیارے گردش کر رہے ہیں۔ اِنہی گھومنے والے سیاروں میں سے ہمارا بھی ایک چھوٹا سا گول مٹول سیارہ ہے جس کو ہم زمین کہتے ہیں۔ سورج کی کل عمر قریباً ساڑھے چار ارب سال ہے جبکہ ہماری زمین کی بھی لگ بھگ یہی عمر ہے۔ ہم انسانوں کی عمر بہت کم ہے، مطلب ہمارے آباؤ و اجداد تو کم و بیش ڈھائی لاکھ سال قبل اِس زمین پر اپنے قدم جما چکے تھے مگر ہم جیسے جدید انسانوں کو جسے بائیولوجیکل سائنس میں ہوموسیپین کہا جاتا ہے ابھی کوئی ساٹھ ہزار سال ہی ہوئے ہیں۔

سائنس کہتی ہے کہ یہ کائنات اربوں کہکشاؤں سے بھری پڑی ہے۔ اِنہی اربوں کہکشاؤں میں سے ایک کہکشاں ہماری ہے جسے ہم مِلکی وے گیلیکسی کہتے ہیں۔ علم الکائنات ابتداء ہی سے دو مصیبتوں کی زد میں رہا ایک تخلیق دوسری ارتقاء۔ ارتقاء کی سوجھ بوجھ تو آتی رہی ہے۔ اہم مسئلہ تخلیق ہے چنانچہ انسان نے دیکھا کہ کچھ بھی اُس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ ہم انسان اُس شئے کو وجود نہیں دے دیتے بعینہٖ یہ کائنات بھی ایک وجود دینے والے کی مرہون ہے۔ یہ ایک عقلی لازمہ ہے۔ سوال تو یہ بھی قدرے معقول ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شئے کسی بنانے والے ہی کی مرہون ہو؟۔ عقل والوں کے بھی بڑے عجیب وغریب روگ ہوتے ہیں۔ یہ تو بھلا ہو دیوانگی کا کہ زندگی کو کسی حد تک متوازن کر دیا ورنہ اِس عالمگیر کنفیوژن نے تو انسان کو اَدھ مُوا کر دیا تھا۔

ہماری زمین سورج کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر ہمارا سورج ہماری گیلیکسی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پھر ہماری گیلیکسی خلاء میں پھیلی دیگر اربوں گیلیکسیز کے مقابلے میں بالکل بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اب اِس وسیع وعریض اور لامحدود کائنات میں انسان کیا حیثیت رکھتا ہے؟۔ اِس کا جواب سوچنے والوں کے ذمہ ٹھہرا۔ سائنس خدا کی منکر ہے اور یہ سائنس کی بڑی تکلیف دہ مجبوری ہے جبکہ انسانی عقل بھی اب خدا کے وجود کے حق میں دیئے گئے دلائل سے بیزار ہو چکی ہے یہی وجہ ہے کہ قریباً آدھی دنیا کسی نہ کسی شکل میں تصورِ خدا سے لاتعلق ہو چکی۔ یہ بڑے ہی سوچنے سمجھنے کے مسائل ہیں اِن پر واویلا کرنے کی بجائے ہمیں اِن کا انتہائی موزوں حل ڈھونڈنا ہوگا اگر تو ہم اِس اہل بن جائیں ورنہ مار دھاڑ تو ہماری تربیت کا جزلاینفک بن چکا ہے۔

ارتقاء برحق ہے لیکن ارتقاء کیلئے بھی تو ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ ارتقاء سے قبل بھی موجود ہوتا کہ اُس میں ارتقاء کا عمل شروع ہوسکے۔ اَب اگر کچھ پہلے سے موجود ہی نہیں تو اُس میں ارتقاء کا عمل کیسے رونما ہوسکتا ہے؟۔

یہ ہے وہ اہم سوال جو سائنس کی ہر تھیوری کو محض ایک افسانہ بنا دیتا ہے۔ بگ بینگ فی الحال ایک تخمیہ ہے اِس لئے سائنس کے چکر میں ایمان جیسی نادر دولت سے ہاتھ دھو بیٹھنا بھی دانشمندی نہیں۔

خیر یہ تو سائنس کی وہ حتمی مجبوری ہیں جہاں پر سائنس کو بھی سرنڈر کرنا پڑتا ہے۔ تخلیق معقول ہے مگر تخلیق کے اثبات سے قبل ایک انتہائی معقول سوال یہ بھی ہے کہ بالکل اِسی اُصولِ تخلیق سے خود خالق کیسے فرار حاصل کرسکتا ہے لیکن اگر خالق اُصولِ تخلیق سے چپ کر کے فرار حاصل کرسکتا ہے تو پھر جو کچھ موجود ہے اِس کو مطلق حق کیوں نہ تسلیم کرلیا جائے۔ مگر یہ معاملہ اتنا آسان نہیں کہ کائنات کو مطلق حق مان کر مسئلہ حل ہو جاتا ہے پس تخلیق اور خالق کا تصور انسان کی مشترکہ عقلی میراث ہے اِس سے اِس طرح بیک جنبشِ قلم جان نہیں چھڑائی جاسکتی۔

اَب یہ رہیں مذاہب کی مجبوریاں۔ کیوں نہ دنیائے علم وحکمت کے عظیم المرتبت عالم سقراط کا قول مستعار لے لیا جائے کہ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا جبکہ یہ تجاہلِ عارفانہ نہ صرف علمائے حکمت کے ہاں رائج رہا بلکہ اب تو علمائے سائنس نے بھی اس اَمر کا اقرار کرہی لیا ہے کہ ہم اس کائنات کے متعلق فی الواقع کوئی حتمی علم نہیں رکھتے۔

☆☆☆☆☆☆☆

دادرا کی تھاپ

Published on: www.murshidfoundation.org: 12.08.2020

بچپن میں سب سے زیادہ ڈانٹ دادی مرحومہ سے جس سبب پڑی وہ دراصل میرا موسیقی کا غیر معمولی شوق تھا اور جس سے میں آج بھی مفر حاصل نہ کرسکا۔ آبائی گاؤں تحصیل کلاچی میں گھر اور مدرسہ کے بیچ ایک قدیم طرز کی غیر رسمی میوزک اکیڈیمی واقع ہوا کرتی جس میں رات کے اوقات میں آس پاس کے دیہاتوں سے مختلف گویے آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور یہی وہ وقت ہوتا جب بنگالی ٹوپی اور ایک بالشت داڑھی کو وسیع و عریض ٹارا ویرا کی چادر سے ڈھانک کر اکیڈیمی میں گھس جاتا۔

بس پھر کیا ہوتا اُستاد عاشق حسین کلوروی کی راگنیاں اور میرا شدید اِنہماکِ سماعت اور پھر تب ہوش ٹھکانے لگتا جب کوئی بڑا بزرگ مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس چونک نما اکیڈیمی تک آ پہنچتا۔ بعد میں جب ذرا آزادی نصیب ہوئی تو کلاسیکل موسیقی کے مختلف کہنہ مشق اَساتذہ سے نہ صرف علمِ موسیقی کے درس لئے بلکہ عملی طور پر بھی تان پورہ، ہارمونیم اور طبلہ کی مکمل ٹریننگ حاصل کی۔ اب تو خیر علمِ موسیقی پر میرے قریباً ساٹھ مقالات اشاعت کیلئے تیار ہیں۔ اُستاد چاند خان کی انتہائی نادر نگارش میں کہیں پڑھا تھا کہ سُر ماں اور تال باپ ہے چنانچہ سُر شناسی سے قبل تال کی سوجھ بوجھ بہت ضروری ہے ورنہ نرا سُر شناس ہونا کافی نہیں۔

سُر دراصل ہوا کی گانٹھ ہوتی ہے جس میں بیک وقت آواز اور خاموشی کا ایسا لطیف سنگم قائم کیا جاتا ہے کہ آواز نشاط انگیز ہو جائے جبکہ تال سے مراد سے خالص ریاضی کے اُصولوں پر مبنی وہ رفتار ہے جس میں تمام ضربوں کے بیچ یکساں وقفہ پایا جاتا ہو جیسا کہ تال دادرا میں کل چھ ماترے یعنی ضربیں ہیں اور ہر تین ضربوں کے بعد ایک انتہائی معمولی وقفہ ہے۔ ضربوں کے بول ہیں۔ دھادِھن نا، دھاتِن نا۔ یہ کُل چھ ضربیں ہیں۔

اِن میں تیسرے بول میں نا کی جگہ تھاپ ماری جاتی ہے۔ بعض اوقات تیسرے بول سے تہائی یا ترکٹ بھی لی جاتی ہے جس سے دادرا کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ تال دادرا میں مجھے پاکستانی اور ہندوستانی موسیقی کے دو گیت بے حد پسند ہیں۔

ایک گیت رونا لیلیٰ نے پاکستانی فلم ہم دونوں کیلئے گایا تھا جس کے بول ہیں " اُن کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا" جبکہ دوسرا گیت لتا منگیشکر نے فلم انارکلی کیلئے گایا تھا جس کے بول ہیں " یہ زندگی اُسی کی ہے جو کسی کا ہو گیا" اِن دونوں گیتوں میں تال دادرا کا خوب استعمال کیا گیا ہے۔

دادرا کے حوالے سے یہاں پر میں یہ واضح کر دوں کہ دادرا کے نام سے ایک صنفِ گائیکی بھی کبھی رائج رہی ہے یہ گائیکی کی ایک ہلکی پھلکی قسم ہے۔جس کا زیادہ تر زور مینڈھ اور مُرکیوں پر ہوتا ہے۔ یہ صنف کسی مخصوص راگ کی پابند نہیں ہوتی۔عموماً اِس میں عشقیہ ارادے کہے جاتے ہیں۔بیگم اختر فیض آبادی دادرا گانے میں یدطولیٰ رکھتی تھیں۔آپ کا مشہور دادرا جو راگ بھیروی میں ہے اور جس کے بول ہیں " ہمری اٹریا پہ آؤ سانوریا دیکھا دیکھی بلم ہوئی جائے" آج بھی موسیقی کے شائقین کیلئے ایک عجیب مسحورکن اثر رکھتا ہے۔

دادرا کے متعلق ایک عجیب وغریب حقیقت یہ بھی ہے کہ ہمارا دل دادرا تال کے اُصولوں پر دھڑکتا ہے۔ہمارا دل ایک منٹ میں ستر بار دھڑکتا ہے اور اِسے ہم میوزک کی زبان میں ستر بی پی ایم کہتے ہیں یعنی ستر ضربیں ایک منٹ میں اور یہ لے موسیقی کی قدیم صنف دھرپد کیلئے انتہائی موزوں ہے۔آج کل کے حساب سے دادرا ایک سوبیس بی پی ایم کی رفتار سے بجے تو بھلا محسوس ہوتا ہے جبکہ یہی لے دھرپد میں ستر اور ساٹھ بی پی ایم تک پیچھے چلی جاتی ہے۔

اگر انسانی دل کی دھڑکن کو ایک اچھے ساؤنڈ سسٹم میں ٹرانسفر کر کے اِس کے ساتھ رات کے وقت راگ درباری کی سنگت کی جائے تو پورا انسانی جسم بلڈ پریشر، شوگر، اینگزائٹی، ڈپریشن اور ہر قسم کی مایوسی سے چھٹکارا پا سکتا ہے اور یہ کوئی مِتھ یا اُسطورہ نہیں بلکہ یہ ایک طبی اور سائنسی حقیقت ہے۔گویا دادرا کی تھاپ سے انسان مختلف قسم کی جسمانی اور ذہنی بیماریوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

اِس کائنات میں اِس قدر خالص قدرتی علاج شاید ہی کوئی اور ہو جس قدر شفاف اسلوبِ علاج موسیقی ہے۔ پوری کائنات ردھم میں ہے۔آسٹروفزکس کے ماہرین نے مِلکی وے گیلیکسی سے آنے والی جو عجیب وغریب قسم کی آوازیں سنی ہیں وہ بھی ردھم میں ہیں پس مریخ سے جو آوازیں ریکارڈ کی گئی ہے اور جو نیٹ پر بھی موجود ہیں اُن میں بھی ایک عجیب قسم کا ردھم پایا جاتا ہے۔آواز کی متضاد خاموشی نہیں بلکہ ضرب ہے۔ یہی ضربیں جب یکساں وقفہ کے ساتھ ایک سائیکل میں لگنے لگیں تو ردھم بن جاتا ہے پس یہی ضربیں اپنی مخالف سمت میں آواز کی صورت اختیار کر کے سُر بن جاتی ہیں۔

سُر ضرب نہیں بلکہ ہوا میں گرہ لگانا ہے جبکہ اِس کے برعکس تال یا ردھم ضرب ہے جو کسی بھی دوسری شے پر لگائی جاتی ہے تاکہ ہوا یعنی سُر ردھم کا سہارا لیکر قائم رہے پس سُر دراصل آکسیجن اور ہائیڈروجن کی انتہائی لطیف شکل ہے۔

کوئی بھی ضرب جب مسلسل ریاضی کی اطاعت کرتی ہے تو تال بن جاتی ہے۔تال دادرا میں فلم قدرت کا ایک اور انتہائی مقبول گیت مجھے یاد آگیا جسے گایا کشور کمار نے ہے اور اِس کی موسیقی معروف موسیقار آر ڈی برمن نے ترتیب دی۔ بول اِس گیت کے ہیں" ہمیں تم سے پیار کتنا یہ ہم نہیں جانتے مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا"۔ اِس گیت میں بھی راگ بھیرویں کے سُروں کے ساتھ تال دادرا کو خوب نبھایا گیا ہے۔خوبرو راجیش کھنہ اور چنچل چتون ہیما مالنی کے چھوٹے چھوٹے مرقص قدموں نے تال دادرا کی تھاپ کی کما حقہ عکس بندی کی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

غلام محمد قاصر کی یاد میں

Published on: www.murshidfoundation.org: 08.07.2020

ڈیرہ اسماعیل خان علمی و ادبی لحاظ سے بہت خاص مقام رکھتا ہے بالخصوص اِس کے نواحی علاقے جنہیں انتظامی طور پر تحاصیل کا درجہ حاصل ہے۔کلاچی اور پہاڑ پور۔ پہاڑ پور ہی کی زرخیز دھرتی کے ایک سپوت جناب غلام محمد قاصر مرحوم جنہیں ایک طویل عرصہ تک احمد ندیم قاسمی،منیر نیازی اور احمد فراز جیسے کہنہ مشق شعراء کی مصاحبت حاصل رہی آج بھی ہمارے اذہان کو اپنے سحر انگیز الفاظ کی خوشبو سے معطر کئے ہوئے ہیں ۔اُردو ادب کے اِس درخشاں ستارے کا جنم 4 ستمبر 1944ء کو تحصیل پہاڑ پور ہی میں ہوا۔آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں پہاڑ پور میں حاصل کی جبکہ اعلیٰ تعلیم کیلئے پشاور یونیورسٹی کا رخ کیا۔

پیشہ کے لحاظ سے آپ ایک پرائمری سکول ٹیچر تھے اور ایک طویل عرصہ تک پہاڑ پور ہی کے ایک سرکاری سکول میں بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے رہے ۔غلام محمد قاصر اُردو شاعری کے وہ درخشاں ستارے ہیں جن کی ندرتِ فکر اور جدتِ تخیل سے آپ کے ہمعصر شعراء بھی متاثر نظر آتے ہیں ۔اُردو شاعری میں غلام محمد قاصر مرحوم ایک بالکل منفرد اور جدید لب و لہجے کے شاعر مانے جاتے ہیں ۔ چنانچہ عوامی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پورے ملک میں شاید ہی کوئی ایسا مشاعرہ ہو جس میں آپ کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو۔ یوں آپ مسلسل مختلف مشاعروں میں شرکت کرنے لگے اور متعدد مشاعروں میں منیر نیازی اور احمد ندیم قاسمی جیسے سکہ بند شعراء کلماتِ تحسین سے آپ کی زبردست حوصلہ افزائی کرتے رہتے ۔روایت ہے کہ جب ایک مشاعرے میں آپ نے اپنی غزل کا یہ بند سامعین کی نظر کیا۔ع

تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ مے خانے کا پتہ
ہم نے ہر اُس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

تو منیر نیازی آپ سے کہنے لگے کہ قاصر مجھ سے میرا سارا کلام لے لو لیکن مجھے اپنا بس یہ ایک شعر دیدو۔

غلام محمد قاصر انتہائی نامساعد حالات میں پلے بڑھے۔ڈیرہ اسماعیل خان اُن دنوں صوبہ سرحد کا ضلع ہونے کے سبب ہر لحاظ سے انتہائی پسماندگی کا شکار تھا۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کے نواحی علاقے آج بھی تعلیم وصحت اور دیگر بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔مگر ایسے ہی نامساعد حالات میں غلام محمد قاصر نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کرتے ہوئے جلد ہی پورے ملک میں اپنی ادبی مہارت کا لوہا منوالیا۔آپ کے کئی اشعار آج اُردو ادب اور عوامی حلقوں میں زبان زدِ عام ہوچکے ہیں جیسے کہ۔ع

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

سب سے پہلے آپ کو احمد ندیم قاسمی نے 1977ء میں اپنے ادبی جریدے فنون کے وسیلے سے ادبی حلقوں میں متعارف کرایا۔پھر اُسی سال آپ کے شعری مجموعہ "تسلسل" نے پورے ملک کے ادبی حلقوں میں کھلبلی مچادی کیونکہ آپ نے اُس وقت غزل کو بالکل ایک نئی جدت اور عوامی لہجے کے ساتھ پیش کیا اور یہی فنی ندرت تادمِ مرگ آپ ہی کا طرہِ امتیاز رہی۔اِسی طرح پھر دوسرے شعری مجموعہ "آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے" جو 1988ء میں شائع ہوا اور تیسرے شعری مجموعہ "دریائے گماں" جو آپ کی وفات سے دو سال قبل 1997ء میں شائع ہوا، نے ادبی اور عوامی حلقوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

سال 2006ء میں آپ کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے حکومت پاکستان نے آپ کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔آپ ایک زیرک ڈرامہ نویس بھی تھے چنانچہ 1993ء میں آپ کو بہترین ڈرامہ نویس کی حیثیت سے بولان ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔آپ ہی تحریر کردہ ڈرامہ سیریل تلاش اور بچوں کا انتہائی پسندیدہ پلے بھوت بنگلہ اپنے وقت میں بے حد مقبول ہوئے۔علاوہ ازیں آپ کو عکس خوشبو ایوارڈ، گولڈن جوبلی ایوارڈ، بہترین نغمہ نگار پی ٹی وی پشاور ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔غلام محمد قاصر ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ درویش صفت انسان بھی تھے۔خاموش طبع ہونے کے ساتھ ساتھ چہرے پر ایک زبردست فکری کیفیت ہر وقت طاری رہتی۔

وہ تین نامور شعراء جو بذاتِ خود آپ کی ادبی شخصیت سے زبردست متاثر تھے خلوت وجلوت میں آپ کی تعریف کرتے رہتے ۔احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی اور احمد فراز ۔احمد فراز خود بھی ایک جدید لہجے کے شاعر تھے اور جنہیں اپنے وقت میں زبردست عوامی مقبولیت بھی حاصل ہوئی بالخصوص نوجوان طبقہ میں مگر قاصر کو جن فکری خصوصیات نے دیگر ہمعصر شعراء سے ممیز کیا اُن میں درد کی زبردست تجزیب ہے ۔کائنات کا وہ اَزلی اور لامتبدل کرب ہے جس کے کماحقہ احساس تک ہر ایک شاعر کی رسائی ممکن نہیں ہوتی ۔آجکل تو خیر شعر وشاعری میں وہ فکری دقت اور فنی مہارت تو رہی نہیں لیکن اُس زمانے میں اعلیٰ شاعری کی خصوصیات ہی یہی ہوتی تھیں کہ اشعار میں کس قدر فکری گہرائی پائی جاتی ہے جبکہ اِسی فکری گہرائی سے قاصر کا پورا کلام مملو ہے فرماتے ہیں ۔ع

شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھِس گئے آخر کنکر جو نوکیلے تھے

قاصر کی شاعری میں آلام ومصائب کی تجزیب کا وہ نمایاں عنصر موجود رہا جو بلاشبہ میر کے بعد ہمیں دیگر شعراء میں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے ۔انتہائی پسماندہ اور نامساعد حالات میں پروان چڑھنے والے ایک فقیر منش شاعر نے جو اُردو شاعری کو ایک جدید اسلوب سے ہمکنار کیا، لاریب اِس اسلوب کی خوشبو رہتی دنیا تک قائم ودائم رہے گی۔

یوں تو قاصر کا سارا کلام عدیم النظیر ہے مگر مجھے ذاتی طور قاصر کی جو غزل پسند ہے اُس کو یہاں میں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا ۔ع

بَن میں ویراں تھی نظر شہر میں دل روتا ہے
زندگی سے یہ مرا دوسرا سمجھوتہ ہے

لہلہاتے ہوتے خوابوں سے مری آنکھوں تک
رتجگے کاشت نہ کر لے تو وہ کب سوتا ہے

جس کو اِس فصل میں ہونا ہے برابر کا شریک
میرے احساس میں تنہائیاں کیوں بوتا ہے

نام لکھ لکھ کے ترا پھول بنانے والا
آج پھر شبنمیں آنکھوں سے ورق دھوتا ہے

تیرے بخشے ہوئے اِک غم کا کرشمہ ہے کہ اب
جو بھی غم ہو مِرے معیار سے کم ہوتا ہے

سو گئے شہرِ محبت کے سبھی داغ و چراغ
ایک سایہ پسِ دیوار ابھی روتا ہے

یہ بھی اِک رنگ ہے شاید مِری محرومی کا
کوئی ہنس دے تو محبت کا گماں ہوتا ہے

تین ماہ مسلسل جگر کے سرطان میں مبتلا ہونے کے بعد دنیائے اُردو ادب کا یہ چمکتا ستارہ 20 فروری 1999ء کو اِس دارِفانی سے کوچ کر گیا۔ آپ کی رحلت کے بعد اُردو شاعری میں اپنی نوعیت کا جو خلاء پیدا ہوا اُس کو کبھی بھی کوئی شاعر پورا نہیں کرسکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

جماعتِ اسلامی اور قیامِ پاکستان

Published on: www.murshidfoundation.org: 10.06.2020

جھوٹ، منافقت اور خوف یہ تین بنیادی نفسیاتی دباؤ ہیں جن کی زد میں اِس وقت پوری قوم آچکی ہے اور یہ تینوں نفسیاتی عوامل ہی اِس وقت ریاست کی عوام کے اوصافِ جاریہ ہیں ۔ریاست کا کوئی بھی اِدارہ اِس وقت اِن نفسیاتی عوامل سے منزہ نہیں ۔انفرادی نوعیت کے معاملات ہوں یا اجتماعی، جھوٹ منافقت اور خوف ہمیں ہر کہیں گھیرے ہوئے ہیں اور اب تو اِس سے فرار حاصل کرنے کی بجائے ہم اِسے عقلانے اور اِس پر مستزاد یہ کہ اِسے خیر بنانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑتے۔

سراج الحق کا قول مبارک آجکل کچھ زیادہ ہی گردش کر رہا ہے کہ اگر آج قائد اعظم اور علامہ اقبال زندہ ہوتے تو جماعت اسلامی میں ہوتے۔واہ سبحان اللہ کیا کمال ڈھٹائی ہے بلکہ عربی کی ایک اصطلاح ہے لیس بشئی جس کے معنی ہیں حیاء سے جان بوجھ کر دور ہو جانا، کہہ دینا زیادہ موزوں ہے۔ مجھے جھوٹ لکھنا نہیں آسکا۔منافقت میری رگوں میں نہ دوڑ سکی یہی وجہ ہے کہ مجھے ایک طویل عرصہ تک مذہبی اور سماجی دباؤ کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

صحافت تو میں نے ایامِ شباب میں ہی ترک کر دی تھی اِس لئے کہ مجھ سے ضمیر فروشی اور چاپلوسی نہیں ہوتی تھی۔میں تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہان کا تہہ دل سے احترام کرتا ہوں اور مجھے انفرادی طور پر کسی سے رتی برابر اختلاف نہیں مگر میں جھوٹ اور منافقت برداشت کرنے کا عادی نہیں رہا یہی وجہ ہے کہ میرا تمام تر علمی و تحقیقی اور ادبی کام تنقید سے مملو ہے۔جب تک آپ معاشرے میں بوسیدہ اقدار پر تنقید کر کے نئے راستے متعین نہیں کریں گے تب تک معاشرے سے اخلاقی و علمی دیوالیہ پن دور نہیں ہوگا جیسا کہ اقبال فرماتے ہیں ۔ع

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

سپین کے معروف فلاسفر جارج سانتایانہ نے کہا تھا کہ" جو لوگ تاریخ سے نہیں سیکھتے وہ تاریخ دہراتے رہتے ہیں۔" جماعت اسلامی کے بہت سارے معتبر اراکین میرے بہت اچھے دوست ہیں مگر میں سچ بات کہنے اور لکھنے میں کوئی لحاظ نہیں کرتا۔ سراج الحق کا یہ قول کہ آج اگر قائد اعظم اور علامہ اقبال زندہ ہوتے تو جماعت اسلامی میں ہوتے جماعتیوں کی زبان پر عام ہو چکا۔ مجھے اِس ضمن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی یا آج کے اُمرائے جماعت کے متعلق کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں پر سید ابوالاعلیٰ مودودی کے چند نادر اقوال درج کرتا ہوں تا کہ قیام پاکستان اور بانی پاکستان کے متعلق سید ابوالاعلیٰ مودودی اور آپ کی جماعت کا موقف واضح ہو جائے۔

ہم اِس تحریک کو آج بھی صحیح نہیں سمجھتے جس کے نتیجے میں پاکستان بنا ہے اور پاکستان کا اجتماعی نظام جن اُصولوں پر قائم ہو رہا ہے اُن اُصولوں کو ہم اسلامی نقطہ نظر سے کسی قدر و قیمت کا مستحق نہیں سمجھتے۔ (ہفت روزہ کوثر 16 نومبر 1949)۔ پاکستان کا قیام اور اِس کی پیدائش درندے کے برابر ہے۔ (مولانا مودودی، ترجمان القرآن، جلد 31 صفحہ 59، اشاعت 1948)۔ محمد علی جناح کا مقام مسند پیشوائی نہیں بلکہ بحیثیت غدار عدالت کا کٹہرا ہے۔ (مولانا مودودی، ترجمان القرآن، جلد 31، ص 63 اشاعت 1948)۔ تقسیم ہند کے تین اداکار تھے اور محمد علی جناح کی اداکاری سب سے زیادہ ناکام رہی۔ (مولانا مودودی، ترجمان القرآن، جلد 31، ص 77 اشاعت 1948)۔ مسلم لیگ کو ووٹ دینا حرام ہے۔ (مولانا مودودی، ترجمان القرآن جلد 28 ص 125 اشاعت پٹھان کوٹ)۔ محمد علی جناح جنت الحمقاء (احمقوں کی جنت) کا بانی اور رجل فاجر (گنہگار انسان) ہے۔ (مولانا مودودی، ترجمان القران ص 153 فروری 1946)۔ پاکستان جنت الحمقاء (احمقوں کی جنت) اور مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہے۔ (ترجمان القرآن ص 154 اشاعت 1946)۔ پاکستان لاکھوں کروڑوں ڈاکوؤں، لٹیروں، قاتلوں، زانیوں اور سخت کمینہ صفت ظالموں سے بھرا ہوا ہے۔ (ترجمان القران جلد 31 ص 59)۔ مہاجر وہ بھگوڑے اور بزدل ہیں جنہوں نے قومیت کی جنگ لڑی اور جب سزا بھگتنے کی باری آئی تو راہِ فرار اختیار کر لی۔ (بیان مولانا مودودی نوائے وقت 29 اگست 1948)۔ مسلم لیگ کی نامراد تحریک کا مقصد ناپاکستان کا قیام ہے۔ (ترجمان القرآن اپریل 1946)۔

مذکورہ تمام تر اقوالِ صریحہ قطعیہ کے بعد بھی اگر کوئی جماعت اسلامی کا امیر یہ کہے کہ ہم قائد اعظم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں تو اُس سے بڑا کذاب اور مفتری بھلا کون ہوسکتا ہے؟۔امیر جماعت سراج الحق نے کہا کہ ہم بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے فرمان کو پورا کرنے کی جدو جہد کر رہے ہیں۔ پاکستان اسلامی جمہوری ملک ہے جس کے فکری رہنما علامہ اقبال اور سید ابوالاعلی مودودی تھے۔(20اپریل2014)۔

مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔سید ابوالاعلیٰ مودودی پاکستان کے فکری رہنما تھے اِس کی وضاحت سید ابوالاعلیٰ مودودی ازخود اپنے درج بالا اقوال میں دے چکے ہیں۔مجھے قوی یقین ہے کہ جماعت اسلامی کے موجودہ اُمراء نہ تو تحریک پاکستان سے واقفیت رکھتے ہیں نہ ہی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت سے گویا یہ وہ لوگ ہیں جو نظریاتی طور پر نہیں بلکہ حادثاتی طور پر جماعت اسلامی میں موجود ہیں۔کوئی بھی دیانتدار جماعتی نہ تو اپنے بانی جماعت کے نظریات کا منکر ہوسکتا ہے نہ ہی قیام پاکستان کی حمایت کرسکتا ہے مگر اقتدار کی خاطر یہ حادثاتی جماعتی اپنی ہی جماعت کی تاریخ مسخ کرنے کے درپے ہیں۔جماعت اسلامی کے اُمراء میں ذراسی بھی نظریاتی حمیّت ہوتی تو یہ لوگ پاکستان میں سیاست کا نام تک نہ لیتے۔فارسی کا ایک مصرع ہے۔ع

بے حیاء باش ہر چہ خواہد کرد

قیام پاکستان کی مخالفت کرنے والی مذہبی جماعتوں میں مجھے سب سے دیانت دار جماعت الاحرار لگی جن کے اُمراء اور کارکن قیام پاکستان کے بعد سیاست سے بالکل دور ہوگئے یہ کہہ کر کہ ہم نظریاتی طور پر پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے اِس لئے اصولاً پاکستان کے سیاسی اُمور میں مداخلت کو بھی روا نہیں سمجھتے۔آج تک یہ لوگ اپنے اُس اُصول پر قائم ہیں مگر جمعیت علمائے ہند کی روحانی اولاد اور جماعت اسلامی نے ایسا بدترین یوٹرن لیا کہ جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔اِس کی تفصیل کسی اور کالم میں کروں گا۔سردست جماعت اسلامی اور قیام پاکستان کا تقابلی جائزہ کرنا مقصود تھا تاکہ اسلامی نظام کی شیدا ہماری نئی نسل جماعتوں کے مذہبی وسیاسی فریب سے آگاہ ہوسکے۔

☆☆☆☆☆☆☆

عشق اور اِشراق

Published on: www.murshidfoundation.org: 13.05.2020

انسانی شعور اور جذبات میں کشمکش کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے انسان کو دو پاٹوں میں تقسیم کئے ہوئے ہے۔ فلاسفر، سائنسدان اور ماہرین طبیعیات ہمیشہ جذبات کے پیچھے لٹھ لیکر پڑے رہے مگر پھر بھی جذبہ ہے جو ماند نہیں پڑ رہا۔ حکیم بوعلی سینا جیسا زیرک فزیشن بھی یہی کہہ رہا ہے کہ عشق محض اختلالِ مغز ہے۔ فلسفی اِسے ویلے لوگوں کا کام کہتے ہیں جبکہ سیدی رومی تو اِسے دوائے دوام فرما گئے۔ ع

شاد باد اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تُو افلاطون و جالینوس ما

انسان شعور اور حکمت کی روشنی سے تو منور ہے ہی اِس میں کوئی شبہ نہیں مگر یہ نور بغیر تاریکی کے کیا معنی رکھتا ہے؟۔ اگر عشق سیاہِ درک ہے اور تعقل و شعور نور تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنا سیاہی کے نور کا ادراک کیسے ہوا؟۔ یہی کشمکش دراصل تصوف میں عِشق اور اِشراق کی اصطلاحات سے تعبیر کی جاتی ہے۔ فلسفی، سائنسدان، ماہرِ نفسیات و طبیعیات اِشراق کی طرف لپکتے ہیں جبکہ اصحابِ فقر و وجدان اور دردمند عشق کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ شعور کی دو دھاری تلوار جب صاحبِ اشراق کا جگر چھلنی کرتی ہے تو وہ بےساختہ پکار اُٹھتا ہے۔ ع

عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

عاشق کو اِس سے کوئی غرض ہی نہیں رہتی کہ فلسفہِ زندگی کے مبادیات کیا ہیں۔صحیح کیا ہے اور غلط سے اجتناب کیونکر ضروری ہے۔وہ تو بس اتنا جانتا ہے کہ وہ عاشق ہے اور بس۔یہ عقل وشعور کے مسائل وہ اصحابِ اشراق کیلئے چھوڑے رکھتا ہے جیسے کہ ع

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

اِشراق زندگی کی راہ تو متعین کر دیتا ہے پھر وہ چاہے اِسے ہر دور اور زمانے میں نت نئے حیل ومعانی سے کیوں نہ گھڑتا رہے مگر وہ یہ کام پوری تندہی اور ذمہ داری سے کر لیتا ہے۔پھر اِسے نظامِ حیات کا نام دے کر ہر خاص وعام کو اِس کا مقلد ٹھہراتا ہے۔بہت عام معانی میں اِلقاء و الہام اور بہت ہی خاص معانی میں وحی اور علمِ لدّنی دراصل اِشراق ہی کی مختلف دقیق صورتیں ہیں۔کہیں یہ دِقّت مخصوص ہے تاکہ اِشراق کی بنیاد پر انتشارِ تعقد اور فتنِ تسلّم نہ پیدا ہو اور کہیں یہ بہت عام تاثر لئے ہوئے ہے تاکہ کچھ دیوانے اپنا بھرم قائم رکھ سکیں۔اشراق کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اِسی کے بطن میں عشق چھپا پڑا ہے مگر عموماً لوگ سفر مکمل نہیں کر پاتے یا پھر درمیان میں کسی پگڈنڈی پر نکل پڑتے ہیں ورنہ بالآخر اشراق بھی عشق ہی کی زین پر سوار ہو جاتا ہے۔ع

ایں کارِ حکیمی نیست دامانِ کلیمی گیر
صد بندہِ ساحل مست یک بندہِ دریا مست

زندگی کی گہما گہمی اور مصنوعی چہل پہل کو اِشراق اچھا خاصا دلچسپ بنا دیتا ہے گویا کچھ بھی کرنے کا جواز تو ہے ہی اِشراق کے پاس حتیٰ کہ عشق کو بھی اشراق تختہِ مشق بنا دیتا ہے۔پھر آخر میں خود بھی ٹھیک وہیں کھڑا ہو جاتا ہے جہاں پر عشق کو دیکھ کر یہ سیخ پا ہوا تھا۔

شبلی جانتا تھا کہ منصور کا اَناالحق قطعی غیر منطقی نہیں تھا گو کہ بظاہر غیر تشریعی تھا مگر وہ کیا کرتے وہ تو اشراق کے سرخیل تھے اور جو زیرک اشراق کے دام میں آجاتے ہیں اُن کا اَنا اور بقاء دونوں سے بڑا ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ تعظیم اور ناموس کی لذتِ ناپائیدار اُنہیں جلوہِ دیوانگی سے وقتی طور پر نابلد کر دیتی ہے اور کبھی یہ لذت ضد اور خود غرضی تک بھی پہنچ جاتی ہے مگر اصحابِ عشق و اشراق بخوبی جانتے ہیں کہ یہ محض طلوع ہوتے سورج کی کرنیں ہیں جو دن ڈھلتے ہی ماند پڑ جائیں گی۔ اشراق اَنا سے منزہ ہو تو یہ ایک عالمگیر رحمت ہے لیکن اگر اِس میں اَنا اور خود غرضی شامل ہو جائے تو یہ زمانے کی پسلیاں چیر کے رکھ دیتا ہے پھر اِس کا مداوا فوری طور پر ممکن بھی نہیں ہوتا۔ ع

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گزر اِس عہد میں ممکن نہیں ہے چوبِ کلیم

عشق وفا کا طالب ہے۔ وفا حریت کی اور حریت کچھ معانی نہیں رکھتی جب تک کہ آپ کے پاس تسہل و طاقت کے وسائل نہ ہوں اور تسہل و طاقت کے وسائل بغیر جہدِ مسلسل و تعقل و تدبر کے ممکن ہی نہیں۔ یوں کہانی کافی دور سے ہوتی ہوئی اشراق پر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ عشق کی بجائے اشراق کی جانب کھنچتا چلا جا رہا ہے۔ عشق کی سب سے بنیادی صفت یہ ہے کہ اِس میں اخلاص کا آخری مقام پایا جاتا ہے اور عاشق اِس اخلاص کی بنیاد پر پوری دنیا کا مقابلہ کرنے کیلئے کھڑا ہو جاتا ہے پھر عین اِسی مقام پر اِشراق توازن کا کام دیتا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ عشق کب کا کائنات اور مابعدالکائنات کا دو ٹوک فیصلہ کر کے رکھ دیتا۔ ع

عقل آمد دین و دنیا شد خراب
عشق آمد در دو عالم کامیاب

اس کائنات میں متعدد بار عشق نے اپنے گہرے اور فوری اثرات دکھائے مگر انسانی شعور پھر سے اِس انتہائی انتشار کو متناسب سطح پر لاتا رہا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے گو کہ اِس کی منطق اور افادیت کچھ بھی نہیں ہے مگر پھر بھی اصحابِ اشراق اس مبہم اور تکرار گزیدہ سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں تا کہ نئے لوگوں کو بھی لطف و کرب سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے جبکہ عشق اِس سب کا قائل نہیں ۔ عشق فیصلہ کن ہے پھر چاہے اُس فیصلے کا نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ نکل آئے ۔ ع

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اشراق کے حق میں جہاں دیو قامت ناطق کھڑے ہیں تو وہاں عشق کے حق میں سرمست دیوانے کھڑے ہیں پس دونوں برحق و برمقام ہیں مگر بات یہ ہے کہ ۔ ع

مِری دیوانگی پہ ہوش والے بحث فرمائیں
مگر پہلے اُنہیں دیوانہ بننے کی ضرورت ہے

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت بیدم شاہ وارثی

Published on: www.murshidfoundation.org: 16.04.2020

انسان شعور حاصل کرنے کے بعد اُسی کے چیز کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے جس کے تعاقب میں اپنے معاشرے کو پاتا ہے مگر کچھ نابغہِ روز گار ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں اِس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ لوگ کس طرف جارہے ہیں اور میں کس طرف جارہا ہوں بلکہ وہ اپنی دُھن میں مست روزی روٹی اور حصولِ دنیا سے اُوپر اُٹھ جاتے ہیں۔

جی ہاں ایسے بھی دیوانے ہوتے ہیں جنہیں اِس کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ شام کو روٹی ملے گی یا نہیں۔ چراغ میں تیل ہے یا نہیں۔ شادی بھی کرنی ہے یا نہیں۔ گھر بھی بسانا ہے یا نہیں۔ والدین کی توقعات پر بھی پورا اُترنا ہے یا نہیں۔ دراصل ایسے لوگ غیر معمولی صلاحیت کے لوگ ہوتے ہیں جنہیں غمِ روز گار و غمِ اہل وعیال نہیں ستا پاتا۔ وہ بس اپنی دنیا میں مست قلندر رہتے ہیں۔ اپنی دنیا جہاں وفورِ جذبات کا بے ہنگم دریا ہے اور اُن کے والہانہ غوطے۔ ایسے لوگ دراصل دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جینے کا صرف ایک وہی ڈھنگ نہیں جو آپ لوگ اپنائے ہوئے ہو پس اِس طرح بھی جیا جاتا ہے جس طرح ہم جی رہے ہیں۔

حضرت غلام حسین المعروف سید بیدم شاہ وارثی وحدت الوجود کے حامل صوفی مجذوب تھے۔ آپ 1882ء میں حضرت سید انور شاہ صاحب کے گھر اَٹاوہ میں جلوہ گر ہوئے۔ حضرت قبلہ سید وارث علی شاہ صاحب کی ارادت میں آئے تو اُنہوں نے آپ کا نام بیدم شاہ وارثی رکھ دیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اٹاوہ ہی میں حاصل کی۔ بچپن میں دوسرے معروف شعراء کی غزلیں سن سن کر گنگنایا کرتے۔ شاعری کی کشش آگرہ لے آئی اور یہیں پر ایک اُستاد شاعر نثار اکبر آبادی کے ہاں زانوئے تلمذ طے کرنے لگے۔ بیدم شاہ وارثی اپنے زمانے کے انتہائی معروف صوفی شاعر تھے۔ اساتذہ شعراء آپ کو سراج الشعراء کے لقب سے ملقب کرتے رہے ہیں۔ ایک طویل عرصہ تک متحدہ ہندوستان میں آپ کے بند، ٹھمریاں، دادرے اور بھجن زبانِ زدِ عام اور بالخصوص زبانِ زدِ صوفی قوال رہے جیسے کہ۔ ع

گنج شکر کے لعل نظام الدین
چشت نگر میں باگ رچایو

بیدم شاہ وارثی پختہ وجودی صوفی تھے ۔عالمگیر اورنگزیب کے دور سے لیکر بیسویں صدی تک اہلِ ظواہر کی جانب سے وجودی صوفی زبردست تنقید کا سامنا کرتے رہے ۔بیسویں صدی وجودی صوفی شعراء کی صدی کہلاتی ہے ۔ اِس صدی کے اوائل میں حضرت خواجہ غلام فرید کوٹ مٹھن والے، میاں محمد بخش سائیں کھڑی شریف والے، حضرت پیر سید مہر علی شاہ گیلانی گولڑوی، بیدم شاہ وارثی اور پھر بعد میں ذہین شاہ تاجی اور سید نصیر الدین گولڑوی کے نام بہت معروف ہوئے ۔تصوف کے خالص وجودی رنگ کو سمجھنا ایک عام ذہنی سطح کے انسان کیلئے انتہائی مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ تصوف کا وجودی رنگ ہر زمانے میں سماجی و مذہبی عتاب کا شکار رہا۔ بیدم شاہ وارثی ایسے ہی تصوف کے وجودی رنگ میں رنگے ہوئے تھے ایک جگہ فرماتے ہیں ۔ع

کعبے کا شوق ہے نہ صنم خانہ چاہیئے
جانانہ چاہیئے درِ جانانہ چاہیئے

ساغر کی آرزو ہے نہ پیمانہ چاہیئے
بس اِک نگاہِ مرشدِ میخانہ چاہیئے

وحدت الوجود دراصل مخ المذاہب ہے گویا دنیا کے ہر مذہب کا اصل الاصول اِسی نقطہ پر آ کر معلق ہو جاتا ہے علاوہ ازیں معانی وتماثیل ہیں ۔اسلام ہر مسلمان کو خدا اور اُس کے برگزیدہ رسول ﷺ سے غیر مشروط محبت کی تلقین کرتا ہے پس یہ غیر مشروط محبت جب اپنے جوبن پر آتی ہے تو وجودیت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے ۔ بیدم فرماتے ہیں ۔ع

برہمن مجھ کو بنانا نہ مسلماں کرنا
میرے ساقی مجھے مستِ مئے عرفاں کرنا

شیخ کو کعبہ مبارک ہو برہمن کو کنشت
ہم کو سجدہ طرفِ کوچہِ جاناں کرنا

عشق خود ایک مستقل مذہب ہے اور یہی مذہب صوفیاء اور عشاق کے ہاں وسیلہِ نجات ہے۔ اِس کی مثال کچھ اِس طرح ہے کہ جیسے بہت ساری ندیاں بہت سے نالے اور اَن گنت دریا ایک سمندر میں آ کر اپنی انفرادی حیثیت کھو دیتے ہیں بعینہٖ صوفی ماسوا خدا یعنی غیر اللہ سے کٹ کر اُسی ذاتِ لم یزل میں مستغرق ہو جاتا ہے کہ جب تک ندی اپنی الگ حیثیت برقرار رکھتی ہے وہ ندی ہی کہلاتی ہے پھر جب وہ کسی جھیل یا دریا سے مل جاتی ہے تو وہ ندی نہیں رہتی بلکہ جھیل یا دریا کہلاتی ہے۔ کچھ یہی حال صوفی اور خدا کا ہے۔ بیدم فرماتے ہیں۔ع

کہیں ہے عبد کی دھن اور کہیں شورِ انا الحق ہے
کہیں اخفائے مستی ہے کہیں اظہارِ مستی ہے

بنایا رشکِ مہر و مہ تری ذرہ نوازی نے
نہیں تو کیا ہے بیدم اور کیا بیدم کی ہستی ہے

یوں تو بیدم شاہ کا تمام کلام ہی عشق و سرور اور جذب و مستی سے گُندھا ہوا ہے مگر ذیل میں بیدم شاہ کا ایسا صوفیانہ شاہکار پیش کر رہا ہوں جو بلاشبہ صوفی شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ع

اگر کعبہ کا رخ بھی جانب مے خانہ ہو جائے
تو پھر سجدہ مری ہر لغزشِ مستانہ ہو جائے

وہی دل ہے جو حسن و عشق کا کاشانہ ہو جائے
وہ سر ہے جو کسی کی تیغ کا نذرانہ ہو جائے

یہ اچھی پردہ داری ہے یہ اچھی رازداری ہے
کہ جو آئے تمہاری بزم میں دیوانہ ہو جائے

مرا سر کٹ کے مقتل میں گرے قاتل کے قدموں پر
دمِ آخر اَدا یوں سجدہِ شکرانہ ہو جائے

تری سرکار میں لایا ہوں ڈالی حسرتِ دل کی
عجب کیا ہے مرا منظور یہ نذرانہ ہو جائے

شبِ فرقت کا جب کچھ طول کم ہونا نہیں ممکن
تو میری زندگی کا مختصر افسانہ ہو جائے

وہ سجدے جن سے برسوں ہم نے کعبہ کو سجایا ہے
جو بت خانے کو مل جائیں تو پھر بت خانہ ہو جائے

کسی کی زلف بکھرے اور بکھر کر دوش پر آئے
دل صد چاک اُلجھے اور اُلجھ کر شانہ ہو جائے

یہاں ہونا نہ ہونا ہے نہ ہونا عین ہونا ہے
جسے ہونا ہو کچھ خاکِ درِ جانانہ ہو جائے

سحر تک سب کا ہے انجام جل کر خاک ہو جانا
بنے محفل میں کوئی شمع یا پروانہ ہو جائے

وہ مے دیدے جو پہلے شبلی و منصور کو دی تھی
تو بیدم بھی نثارِ مرشدِ مے خانہ ہو جائے

☆☆☆☆☆☆☆

ہالووین اور شیشپی

Published on: www.murshidfoundation.org: 10.03.2020

مذہبی معاملات میں غیر ضروری رجعت پسندی اور کٹر پن نے آج ہمیں اِس خطے کی قدیم ثقافت سے بھی محروم کر دیا اور کسی بھی قوم یا معاشرے کیلئے اِس سے بڑھ کر خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اساسی تہذیب سے ہی بیگانہ ہو جائے۔ جانے انجانے میں ہم اُس جانب چل پڑے جہاں ہم اپنی انفرادی شناخت ہی کھو بیٹھے۔

ہمارے وقت میں تو خیر ہماری اصل ثقافت آخری سانسیں لے رہی تھی البتہ ہم سے کچھ عرصہ قبل یہ کٹھا میٹھا تہوار اپنی اصل حالت میں موجود تھا۔آج لوگ ہالووین کے نام سے تو خوب واقف ہیں مگر پندرہ شعبان کی رات ہونے والے اپنے ثقافتی تہوار شیشپی سے شاید ہی آج کوئی واقف ہو۔

بزرگ بتاتے ہیں کہ اس رات ہر محلے اور گلی کوچوں میں دس دس لوگوں کے جمگھٹے چپکے سے لوگوں کے گھروں میں دیوار پھلانگ کر گھس جاتے اور جو کچھ بھی کھانے کا آسانی سے ہاتھ لگ جاتا فوراًاٹھا کر بھاگ پڑتے۔بعد میں مالکِ مکان پیچھے آوازیں لگاتا کہ لڑکو برتن نہ توڑ دینا باقی جو کچھ برتن میں ہے آپس میں بانٹ کے کھالو۔آج کوئی تصور بھی کر سکتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں کبھی اِس ڈھنگ کے تہوار بھی ہوا کرتے مگر آج سے کوئی چالیس پچاس سال قبل ہر سال کی پندرھویں شعبان کو رات کے وقت گلی محلوں میں یہ تہوار پورے جوش و خروش سے منایا جاتا اور اِسے عموماً بڑی عورتیں شیشپی کے نام سے یاد کرتیں۔اب تو صورتحال یہ ہے کہ۔ع

گُل گئے گلشن گئے خالی دھتورے رہ گئے

کرماں والے ٹُر گئے تے لنگڑے لولے رہ گئے

ہالووین مغرب میں منایا جانے والا ایک ثقافتی تہوار ہے جس میں گلی کوچوں، بازاروں، سیر گاہوں اور دیگر مقامات پر جا بجا ڈراؤنے چہروں اور خوفناک لبادوں میں ملبوس چھوٹے بڑے بھوت اور چڑیلیں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔اکثر گھروں کے باہر بڑے بڑے کدو پیٹھے نظر آتے ہیں جن پر ہیبت ناک شکلیں تراشی گئی ہوتی ہیں اور اُن کے اندر موم بتیاں جل رہی ہوتی ہیں۔

کئی گھروں کے باہر ڈراونے ڈھانچے کھڑے دکھائی دیتے ہیں اور اُن کے قریب سے گزریں تو وہ ایک خوف ناک قہقہہ لگا کر دل دہلا دیتے ہیں۔ کاروباری مراکز میں بھی یہ مناظر اکتوبر شروع ہوتے ہی نظر آنے لگتے ہیں۔ اکتیس اکتوبر کو جب تاریکی پھیلنے لگتی ہے اور سائے گہرے ہونا شروع ہو جاتے ہیں تو ڈراؤنے کاسٹیوم میں ملبوس بچوں اور بڑوں کی ٹولیاں گھر گھر جا کر دستک دیتی ہیں اور Trick-or-treat کی صدائیں بلند کرتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یا تو ہمیں مٹھائی دو یا پھر ہماری طرف سے کسی چالاکی کیلئے تیار ہو جاؤ۔ گھر کے مکین اُنہیں ٹافیاں اور میٹھی گولیاں دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اَمریکا میں ہالووین کی ابتداءسن 1921ء میں شمالی ریاست منیسوٹا سے ہوئی اور اِسی سال پہلی بار شہر کی سطح پر یہ تہوار منایا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ دو ہزار سال پرانا یہ تہوار اَمریکا کے دوسرے قصبوں اور شہروں تک پھیل گیا اور یوں اِس نے مغرب میں قومی سطح کے بڑے تہوار اور ایک بہت بڑی کاروباری سرگرمی کی شکل اختیار کر لی۔

تاریخ دانوں کا کہنا ہے ہالووین کا سراغ قبل از مسیح دور میں برطانیہ کے علاقے آئرلینڈ اور شمالی فرانس میں ملتا ہے جہاں سیلٹک قبائل ہر سال اکتیس اکتوبر کو یہ تہوار مناتے تھے۔ اُن کے رواج کے مطابق نئے سال کا آغاز یکم نومبر سے ہوتا تھا۔ موسمی حالات کے باعث اُن علاقوں میں فصلوں کی کٹائی اکتوبر کے آخر میں ختم ہو جاتی تھی اور نومبر سے سرد اور تاریک دنوں کا آغاز ہو جاتا تھا۔ سردیوں کو قبائل موت کے ایام سے بھی منسوب کرتے تھے کیونکہ اکثر اموات اِسی موسم میں ہوتی تھیں۔

قبائل کا عقیدہ تھا کہ نئے سال کے شروع ہونے سے پہلے کی رات یعنی اکتیس کتوبر کی رات کو زندہ انسانوں اور مرنے والوں کی روحوں کے درمیان موجود سرحد نرم ہو جاتی ہے اور روحیں دنیا میں آ کر انسانوں، مال مویشیوں اور فصلوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ روحوں کو خوش کرنے کے لیے سیلٹک قبائل اکتیس اکتوبر کی رات آگ کے بڑے بڑے الاؤ روشن کرتے تھے۔ اَناج بانٹتے اور مویشیوں کی قربانی دیتے تھے۔ اِس موقع پر وہ جانوروں کی کھالیں پہنتے اور اپنے سروں کو جانوروں کے سینگوں سے سجاتے تھے۔ جب آٹھویں صدی میں اِن علاقوں میں مسیحیت کا غلبہ ہوا تو اِس قدیم تہوار کو ختم کرنے کیلئے پوپ بونی فیس چہارم نے یکم نومبر کو تمام برگزیدہ شخصیات کا دن قرار دے دیا۔ یہ دن اُس دور میں آل ہالوز ایوز کہلاتا تھا جو بعد ازاں بگڑ کر ہالووین بن گیا۔

کلیسا کی کوششوں کے باوجود ہالووین کی اہمیت کم نہ ہو سکی اور لوگ یہ تہوار اپنے اپنے انداز میں مناتے رہے۔

اَمریکا دریافت ہونے کے بعد بڑی تعداد میں یورپی باشندے یہاں آ کر آباد ہوئے تو وہ اپنے ساتھ اپنی ثقافت اور رسم و رواج اور تہوار بھی لے کر آئے۔ کہا جاتا ہے کہ شروع میں ہالووین میری لینڈ اور جنوبی آبادیوں میں یورپی تارکین وطن مقامی طور پر چھوٹے پیمانے پر منایا کرتے تھے۔ اُنیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر یورپ سے لوگ اَمریکا آ کر آباد ہوئے جن میں ایک بڑی تعداد آئرش باشندوں کی بھی تھی۔ اِن کی آمد سے اس تہوار کو بڑا فروغ اور شہرت ملی اور اِس میں کئی نئی چیزیں بھی شامل ہوئیں جن میں Trick-or-treat خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور جو آج اِس تہوار کا سب سے اہم جزو ہے۔

اُنیسویں صدی کے آخر تک اَمریکا میں ہالووین پارٹیاں عام ہونے لگیں جن میں بچے اور بڑے شریک ہوتے تھے۔ اِن پارٹیوں میں کھیل کود اور کھانے پینے کے ساتھ ساتھ ڈراؤنے کاسٹیوم پہنے جاتے تھے۔ اُس دور کے اخباروں میں اس طرح کے اشتہار شائع ہوتے تھے جن میں ایسے بہروپ دھارنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی جنہیں دیکھ کر لوگ دہل جائیں۔ سن 1950ء کے لگ بھگ ہالووین کی حیثیت مذہبی تہوار کی بجائے ایک ثقافتی تہوار کی بن گئی جس میں دنیا کے دوسرے حصوں سے آنے والے تارکینِ وطن بھی اپنے اپنے انداز میں حصہ لینے لگے۔

رفتہ رفتہ کاروباری شعبے بھی ہالووین سے اپنا حصہ وصول کرنے لگے اور نت نئے کاسٹیوم اور دوسری چیزیں مارکیٹ میں لا کر اِن کی سائنسی بنیادوں پر مارکیٹنگ شروع کر دی یہاں تک کہ اب ہالووین اربوں ڈالر کے کاروبار کا ایک بہت بڑا ثقافتی تہوار بن چکا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویز

Published on: www.murshidfoundation.org: 11.02.2020

اگر ہم احسان فراموش قوم نہ ہوتے تو اپنے محسنین کو کبھی نہ بھولتے لیکن خیر احسان کی بات رہنے دیجئے پہلے اِس بات پر تحفظات موجود ہیں کہ ابھی تک کیا ہم ایک قوم کی شکل بھی اختیار کر چکے ہیں یا ہنوز دلی دور است؟۔

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم فقید المثل ادیب، باکمال مفسرِ قرآن اور زیرک مفکرِ پاکستان 9 جولائی 1903ء میں ہند کے ضلع گورداسپور کے شہر بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت بٹالہ اَکھنڈ پنجاب کا ایک معروف شہر تھا جو علم و ادب کے حوالے سے پورے ہند میں مشہور تھا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم روایتی طریق سے حاصل کی۔ بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کیا آپ 1955ء میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہو کر قرآن کے ہو گئے۔ قرآن پر آپ کا تدبر دنیا بھر میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی مایہ ناز تفسیر مفہوم القرآن باشعور دیندار طبقہ میں ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے مگر اِس سب سے بہت اہم بات یہ ہے کہ آپ تحریکِ پاکستان کے وہ اَنمٹ کردار ہیں جنہیں بلاشک وشبہ قائداعظم محمد علی جناح اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے بعد مفکرِ پاکستان اور بانی پاکستان کا مرتبہ حاصل ہے لیکن صد افسوس کہ۔ ع

منزل اُنہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

علامہ مرحوم قائداعظم محمد علی جناح کے دینی مشیر اور نہایت قابل احترام رفیق تھے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح پروٹوکول کے بہت سخت ہوا کرتے لیکن علامہ مرحوم کو اِس بات کی قطعی اجازت تھی کہ آپ سے کسی بھی وقت بنا اپوائنمنٹ کے ملاقات کر سکتے تھے۔ اقبال نے جب ہند میں بیداری اُمت کی فکری تحریک شروع کی تو آپ نے اِس فکری تحریک کا جانشین علامہ مرحوم کو بنایا۔ سید نذیر نیازی کی ذمہ داری میں چھپنے والے بیدار مغز رسالہ طلوعِ اسلام کی مکمل اِدارت تادمِ حیات آپ کے پاس ہی رہی۔

بلا شبہ آپ اقبال کے بعد ہند میں اور بالخصوص پاکستان میں فکرِ اقبال کے حقیقی جانشین تھے لیکن اِس میں کوئی شبہ نہیں جو متعصبانہ رویہ ہند میں کانگریسی مُلّا نے اقبال کے ساتھ روا رکھا بالکل وہی رویہ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی مُلّا نے علامہ مرحوم کے ساتھ روا رکھا۔

قرآن جہاں پیغمبر اسلام کو "لَسۡتَ عَلَيۡهِم بِمُصَيۡطِرٍ" کے تحت تنبیہ کرتا ہے کہ اے پیغمبر آپ کفار پر داروغہ نہیں مقرر کیئے گئے تو وہاں اُنہی پیغمبر اسلام کے اُمتی اور دین کے بزعمِ خود حتمی پالنہار اسلام کے جید اور مخلص علماء کو یکے بعد دیگرے کافر بناتے گئے۔علامہ مرحوم اپنے خطبات میں اکثر فرمایا کرتے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے کبھی تھیوکریٹک یا سیکولر سٹیٹ کی بات نہیں کی۔گویا قائد براہِ راست انسانوں کی حکومت اور مُلّا کے اقتدار سے زبردست نالاں تھے۔وہ چاہتے تھے کہ ہم ایک الگ سٹیٹ قائم کریں جس میں ہم خالص قرآنی اُصولوں پر ایک منصفانہ معاشی نظام قائم کرلیں جس میں ہر قسم کی طبقاتی تفریق ناپید ہو جائے۔چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد فروری 1948ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے قائد نے اہلِ امریکہ کے نام ایک براڈکاسٹنگ پیغام کے ذریعے فرمایا کہ "پاکستان میں کسی قسم کی تھیوکریسی کارفرما نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں دے دی جاتی ہے اور جس میں وہ بزعم خویش خدائی مشن کو پورا کرتے ہیں"۔

پاکستان ایک شاندار ریاست کا پیش خیمہ تھی جو قائداعظم محمد علی جناح کی بصیرتِ خیر میں پنہاں تھی لیکن افسوس کہ وہ لوگ جو کل قیامِ پاکستان کی شدومد سے مخالفت کرتے رہے آج اُسی پاکستان میں اصحابِ حل وعقد بنے بیٹھے ہیں۔آپ اپنی آخری عمر تک قیامِ پاکستان کی مخالفت کرنے والے مُلّا انسٹی ٹیوشن پر تنقید کرتے رہے اور اُنہیں یاد دلاتے رہے کہ آپ وہی لوگ ہیں جنہوں نے بانی پاکستان اور آپ کے رفقائے عظام کے راستے میں روڑے اٹکائے اور تحریکِ پاکستان کو ایک گمراہ کاوش گردان کر ہند کے مذہب پرست طبقہ کو بانی پاکستان سے بدظن کیا لیکن بات یہ ہے کہ۔ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

آپ اکثر فرمایا کرتے کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے مجھے قرآن میں موجود اساسی اُصولوں کو قوانین کی شکل

یں مرتب کرنے کی تاکید تھی اور نظریہ پاکستان کی مخالفت کرنے والے ہند کے مُلّا کو منہ توڑ علمی جواب دینے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اسلامی معاشیات کو اپنی کتاب نظامِ ربوبیت میں کھل کر بیان کیا اور مملکتِ خداداد کا اسلامی معاشی نظام مرتب کیا لیکن افسوس کہ آج تک آپ کے علمی و تحقیقی کام پر توجہ نہیں دی گئی۔ عوام کی طرف سے تو خیر آپ ابتداء ہی سے مبغوض ٹھہرے تھے پاکستان کی گورنمنٹ نے بھی آپ کے علمی و تحقیقی کام پر کوئی توجہ نہیں دی حالانکہ آپ صحیح معنوں میں قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ محمد اقبال کے فکری جانشین تھے۔ آج پورے عالم اسلام میں کسی بھی مذہبی گروہ یا عالم دین کے پاس اسلام کا مدون معاشی نظام موجود نہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے اِس پر کبھی توجہ دی جبکہ اِس کے برعکس علامہ مرحوم اپنی پوری زندگی اسلام کے معاشی نظام کو قرآن سے متشرح کر کے بیان کرتے رہے اور بار بار یاد دلاتے رہے کہ پاکستان دراصل قرآنی اُصولوں کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔

پس حقیقتاً تحریک پاکستان کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہی کچھ سامنے آتا ہے کیونکہ اگر پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ بنانا مقصود ہوتا تو اس کیلئے ایک الگ ریاست کا مطالبہ بالکل بے معنیٰ تھا کہ اَکھنڈ ہندوستان تو پہلے ہی سے ایک سیکولر ریاست کی شکل اختیار کر چکا تھا چنانچہ اِس مقصد کیلئے ایک الگ حصے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اِس کے برعکس پاکستان تھیوکریٹک سٹیٹ قائم کرنے کیلئے بھی نہیں بنایا گیا کہ بانی پاکستان مُلّا انسٹی ٹیوشن کے سخت خلاف تھے۔ تھیوکریٹک سٹیٹ ملوکیت کی بدترین شکل ہوتی ہے جس میں معاشی اقتدار اشرافیہ کے پاس اور مذہبی اقتدار مُلّا کے پاس ہوتا ہے اور یہ دونوں ادارے مل کر بڑی مہارت سے عوام کا خون چوستے ہیں اور عوام کو ایک مستقل ذہنی و فکری غلامی کا طوق پہنا دیتے ہیں۔ اِسی کے متعلق اقبال فرماتے ہیں۔ ع

باقی نہ رہی وہ تیری آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

دکھ کی بات یہ ہے کہ آج تک پاکستان کی کوئی مستند تاریخ نہیں لکھی جا سکی جس میں وہ تمام تر حقائق درج کئے گئے ہوں جن کی طرف علامہ مرحوم پوری زندگی توجہ دلاتے رہے۔

ملک میں مُلّا انسٹی ٹیوشن کا اِس قدر فکری غلبہ ہے کہ آج کی پود علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کا نام لینا بھی باعثِ قباحت سمجھتی ہے بلکہ سرے سے آپ کے نام سے ہی واقف نہیں ہے۔ آپ کے افکار ونظریات سے آگہی تو درکنار اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی آپ کے متعلق نہیں جانتے۔

آپ بلاشبہ ایک جلیل القدر شخصیت کے حامل انسان تھے۔ طلوعِ اسلام کے محاذ سے آپ نے اپنی پوری زندگی قائد اعظم محمد علی جناح اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے اُصولوں کی نگہداشت میں گزار دی۔ آپ ابتداء ہی سے اسلام میں ملوکیت اور مذہبیت در آنے کی سازش کو بے نقاب کرتے رہے۔ آپ نے اپنی مایہ ناز کتاب "شاہکارِ رسالت" میں عام منطق اور تاریخی حقائق سے ثابت کیا کہ اسلام کی صحیح انتظامی تعبیر حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں وقوع پذیر ہوئی اور آپ نے تاریخِ دنیا میں پہلی مرتبہ وہ عظیم ترین عادلانہ حکومت قائم کی جس کی مثال دنیا میں کبھی بھی پیش نہیں کی جا سکتی اور حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم اُسی عدلِ فاروقی کو قرآنی اُصولوں کی بنیاد پر پاکستان میں قائم کرنا چاہتے تھے جو بدقسمتی سے مُلّا انسٹی ٹیوشن کے عوام پر غلبہ کے سبب قائم نہ ہو سکی اور اِسی کا افسوس آپ تادمِ زیست کرتے رہے۔

افسوس کہ اگر ہم احسان فراموش قوم نہ ہوتے تو قائد اعظم محمد علی جناح، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کے افکار ونظریات کو سمجھ کر اس مضمحل پاکستان کو جناح کا پاکستان بنا لیتے لیکن یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ پاکستان میں مقتدرہ کے سیاسی عمل دخل اور مُلّا انسٹی ٹیوشن کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

آپ علالت ونحافت کے باوجود بھی آخری عمر تک گلبرگ لاہور میں اپنی رہائش گاہ پر باقاعدگی سے درسِ قرآن دیتے رہے اور یہ سلسلہ جاری تھا کہ آپ 24 فروری 1985ء کو واصل بحق ہو گئے۔ خدا آپ کی روح کو مقامِ اَرفع عطاء فرمائے اور ہم سب کو آپ کے قرآنی علم کا فہم عطاء فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆☆☆

فلسفہِ آزادی

Published on: www.murshidfoundation.org: 13.01.2020

لکھنا تو میں کچھ اور چاہ رہا تھا لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی جانب سے متعدد بار یہ گذارش کی گئی کہ فلسفہِ آزادی پر بالکل سادہ سا تبصرہ کریں ۔آزادی کی شروعات دراصل انسان کی انفرادیت سے ہوتی ہے ۔ ایک ایسا انسان جو معاشی، اخلاقی اور سماجی طور پر خود مختار ہو، علم البشریات کی رُو سے آزاد کہلائے گا مگر میں چاہتا ہوں کہ آزادی جیسی انتہائی بنیادی ضرورتِ انسانی کو ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکے اِس لئے اِس کی کچھ تفصیل بیان کر رہا ہوں ۔

آزادی کو سمجھنے کیلئے ہر شخص کے پاس تین انتہائی بنیادی نوعیت کی سہولیات کا ہونا بہرصورت ضروری ہے ورنہ آزادی اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی یعنی معاشی، اخلاقی اور سماجی سہولیات ۔معاشی سہولت یہ ہے کہ ریاست کا کوئی بھی شہری پیٹ بھرنے اور ایک نارمل سطح پر زندگی گزارنے کیلئے کسی بھی قسم کی دقت کا سامنا نہ کر رہا ہو پس ایسے شخص کو اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کیلئے کسی بھی دوسرے انسان کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے ۔

اخلاقی سہولت دراصل فکری سہولت ہے یعنی دنیا کی کوئی بھی ریاست، مقتدرہ یا فردِ واحد کسی بھی اِنسان کو اس اَمر کا پابند نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی فکری نہج کو صرف اِس بل بوتے پر بدل ڈالے کہ اُسے کھانے پینے اور رہنے کی سہولیات دی جا رہی ہیں ۔ یہ ایک جدید سیاسی نظم ہے جسے آجکل سیکولرازم یا اُردو میں خیارِ فکر سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ اِس انتہائی بنیادی سہولت کو آپ دائرہِ آزادی سے باہر نہیں نکال سکتے ۔تیسری سہولت کا تعلق براہ راست ریاست سے ہے یعنی ہر شخص جیسے سوچتا ہے اُسے ویسا عمل کرنے کی بھی سہولت آسانی کے ساتھ میسر ہو، تا کہ اُس کی جوہری قابلیت نکھر کر سامنے آسکے ۔دنیا کا کوئی بھی آئین یا قانون فی نفسہٖ اتنا طاقتور نہیں ہوسکتا کہ وہ انسان سے اُس کی یہ انتہائی بنیادی سہولیات چھین لے ۔

یہ انتہائی بنیادی سہولیات انسان پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لیکر آتا ہے اور اِس میں کسی کی انفرادی یا اجتماعی شراکت نہیں ہوتی یعنی کوئی بھی شخص کسی بھی دوسرے انسان کے ذہن میں مستقل طور پر اپنے خیالات نہیں ڈال سکتا اور نہ ہی اُسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ بھی ویسا ہی سوچے جیسے مطالبہ کرنے والا سوچتا ہے ۔

اِسی طرح کسی شخص کو معاشی سہولیات فراہم کر کے آپ اُس سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ وہ اب آپ کی غلامی پر آمادہ ہو جائے۔کسی بھی انسان کو آپ اُس کے نظریات کے پر چار سے روک نہیں سکتے کیونکہ یہ دادا گیری کے سوا کچھ نہیں کہ آپ کو جو کچھ پسند ہو اُسے قانون بنا کر لوگوں پر تھوپ دیں اور لوگ جیسا سوچیں اُسے جرم قرار دے دیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل یہاں کا باشندہ اِن تینوں مذکورہ سہولیات سے محروم تھا۔انگریز سرکار نے برِصغیر کے باسیوں کو آزادی کے شعور سے بھی محروم کر دیا تھا کہ لوگ یہ سوچ تک نہ رکھیں کہ کوئی باہر سے آ کر انہی لوگوں کی زمین اور وسائل پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا ہے۔ 15اگست 1947ء سے قبل ہندوستان کے باسی اتنا تو سمجھ گئے تھے کہ انگریز نے ہمیں اپنا غلام بنا لیا ہے اور اِس سے ہمیں کسی نہ کسی صورت اب آزادی چاہئے پھر چاہے اِس کے حصول کا طریقہ کار گاندھی وادی ہو یا سبھاش وادی،کسی بھی طور انگریز سے نجات حاصل کرنی ہے۔ یہاں تک تو معاملہ بالکل سادہ اور قابل فہم تھا۔مسئلہ پیچیدہ اُس وقت ہوا جب خطہِ ہندوستان کو انگریز سے نجات کے ساتھ ساتھ تقسیم بھی ہونا پڑا۔

1947ء سے قبل تو آزادی کا مفہوم بہت سادہ اور دوٹوک تھا کہ کسی طریقے سے انگریز کو اپنے ملک سے بھگانا ہے مگر انگریز کے جانے اور ہندوستان کو دولخت ہونے کے ساتھ ہی پوری ہندوستانی قوم سے آزادی کا وہ بالکل سادہ مفہوم ہی کھو گیا۔بہت ہی جلدی میں ہندوستان کو ایک بالکل نووارد انگریز آفیسر ریڈکلف سے آڑا تر چھا کٹوا کر ایک عام آدمی کیلئے مسائل کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔ایک عام آدمی جس بیچارے کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آخر ہمارے ملک کے ساتھ ہو کیا رہا ہے اور ہم اب کریں گے کیا چنانچہ اِس زبردست شورش کے بعد لاکھوں لوگ دنوں اور ہفتوں میں در بدر ہو گئے اور ہزاروں بے موت مارے گئے۔

مطلب ایک عام آدمی کو تو آزادی چاہئے تھی مگر حصے میں آئیں لامتناہی اذیتیں اور درد اور اُنہی اذیتوں کا سلسلہ ابھی بھی جاری و ساری ہے۔ چند ذہین لوگوں کے فکری انتشار کا خمیازہ نسلیں بھگتی ہیں اور صدیوں بھگتی رہتی ہیں۔مقتدر تو صرف مقتدر ہوتا ہے۔اقتدار کا کوئی مذہب نہیں ہوتا تبھی مقتدر ہمیشہ کسی نہ کسی فکر کے چبوترے پر چڑھ کر اپنا آپ بچا لیتا ہے۔شامت تو ایک لاچار اور بے بس کی آتی ہے جس کے پاس ایک طرف مفکرین کے رنگا رنگ لارے ہوتے ہیں تو دوسری طرف اپنے لئے آزادی کی حتمی خواہش جو اُسے بہت جلد پورا ہوتے دکھائی دیتی ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔

کچھ ذہین سمجھتے ہیں کہ اُن کی فکر میں کبھی جھول نہیں ہوسکتا۔اُن کے کئے گئے فیصلے کبھی المناک نتائج برآمد نہیں کر سکتے مگر ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ کوئی بھی انسانی فیصلہ حتمی طور پر درست اور مثبت نتائج پر مبنی ہو۔ 15 اگست 1947ء کو ہندوستان پہلے تین ٹکڑے پھر 26 مارچ 1971ء کو چار ٹکڑے ہوگیا۔اب تین ٹکڑوں کے علاوہ بیچ میں جو حال وادیِ کشمیر کا ہوا اُس کا تذکرہ تو احساسِ اذیت کے سوا کسی صورت ممکن نہیں۔حقیقی معنوں میں کون آزاد ہوا اِس کا فیصلہ آج تینوں ملکوں کی عوام نہایت آسانی کے ساتھ کرسکتی ہے البتہ اِس دھکم پیل میں جو زبردست غلامی و بے بسی وادیِ کشمیر کے حصے میں آئی اُس کی تلافی تو درکنار خود اُس کا اپنا وجود ہی مخدوش ہوگیا۔فکر کو مفاد کی کھونٹی سے اُتار کر اور نفرت کو دلوں کے علاقے سے بھگا کر جب انسان غور کرتا ہے تو معلوم پڑتا ہے کہ حقیقی آزادی کا چراغ بوسیدہ باتی اور خشک باٹلی کے ساتھ آج بھی گُل ہوا پڑا ہے۔

ایک عام آدمی جن پریشانیوں اور اذیتوں کا سامنا قیامِ پاکستان سے قبل کر رہا تھا آج تہتر سال گزرنے کے بعد بھی اُسی لاچاری کا شکار ہے ہاں اِسی اثناء میں چند ایک خاندان یا افراد ضرور سیراب ہوئے ہیں مگر عوام کی اکثریت آج بھی ٹھیک اُسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے جن میں کل مقید تھی۔مسئلہ انگریز یا ہندو کا نہیں ہے مسئلہ طاقتور اور کمزور کا ہے۔یہ جنگ کل بھی طاقتور اور کمزور کے بیچ تھی اور آج بھی ٹھیک اُسی طرح جاری و ساری ہے۔

جو کمزور تھے اُنہوں نے ذہانت حاصل کی اور وہ بھی اپنی مہارت کے سبب مقتدر حلقوں میں شامل ہو گئے سو اصل پراسیس پر غور کریں۔زمین پر لکیریں کھینچ لینے سے اور پھر سرحدوں پر باڑ لگانے سے نہ تو آزادی ملتی ہے اور نہ ہی طاقت۔طاقت ایکتا میں اور آزادی معاشی، اخلاقی اور سماجی یکساں سہولیات کی فراہمی میں مضمر ہے۔اگر ہمیں آج صحیح معنوں میں آزادی کا حصول ممکن بنانا ہے تو ہمیں ایک عام آدمی کو طاقتور بنانا ہوگا ورنہ اپنا چولہا الگ کر لینے سے قطعاً آزادی نہیں ملتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

مقدمہ دین و فہیم

Published on: www.murshidfoundation.org: 17.12. 2019

آزاد خیال مجھ سے اکثر و بیشتر پوچھتے رہتے ہیں کہ اگر دین خدا کی جانب سے جاری کردہ ہے تو پھر اِس میں آزادانہ تحقیق کی اجازت کیوں نہیں ہے؟۔ دین کو سمجھنے سے قبل ایک مختصر اور فیصلہ کن منطقی مقدمہ سمجھنا انتہائی ضروری ہے تاکہ حقیقت فی نفسہٖ واضح ہو جائے۔طبیعیات سے دور جب کلام مابعدالطبیعیات کے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو ایسے میں دو ہی منطقی مقامات سامنے آتے ہیں۔

ایک تسلیم دوسرا تنکیر۔ بالکل سادہ مطلب یہ ہے کہ یا تو آپ ہر قسم کے تصورات وعقائد کا انکار کر لیتے ہیں یا پھر اپنے پسندیدہ یا معاشرے میں پہلے سے جاری و ساری تصورات وعقائد کو من وعن قبول کر لیتے ہیں گویا اب مخاصمت صرف تسلیم وتنکیر کے بیچ واقع ہے۔مَیں ہر بار یہی عرض کرتا رہتا ہوں کہ دین، مذہب یا دھرم کا تعلق خالصتاً انسانی جذبات سے ہے۔اب معاملہ اگر یہاں سے تھوڑا سا بھی آگے یا پیچھا ہوا تو زبردست قسم کا انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔

قریباً پندرہ سال مسلسل مَیں علم الکلام پر غور کرتا رہا لیکن تصورات وعقائد کا عقدہ نہ تو کلام وا کر سکا اور نہ ہی مطلق منطق جسے ہم جدید اصطلاح میں ماڈرن فلاسفی کہتے ہیں چنانچہ جب آپ طے ہی کر لیتے ہیں کہ دو جمع دو چار ہی ہوں گے تو پھر اِس اَمر کی گنجائش کیسے رہ جاتی ہے کہ دو جمع دو پانچ بھی ہو سکتے ہیں؟۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں صاحب دو جمع دو چار ہی ہوتے ہیں پانچ تو کسی صورت بھی نہیں۔پس یہی تصورِ مسلّمہ یا عقیدہ ہے۔دین اور مذہب کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔کلام یا منطق کی ایک بنیادی خاصیت یہ ہے کہ یہ محض اعتقاد ہی کی شرح کرتی ہے چنانچہ پہلے تحقیق کریں بعد میں اعتقاد اپنائیں یا پہلے اعتقاد بعد میں کلام یعنی آپ پہلے سے کچھ بھی طے نہ کریں پھر تحقیق کریں منطق میں اسے استقراء (Inductive Reasoning) کہتے ہیں جبکہ اِس کے برعکس جب اُصول پہلے سے طے کر لئے جائیں تو اِسے استخراجی (Deductive Reasoning) طریق استدلال کہا جاتا ہے۔اب یہاں پر معاملہ خاصا دلچسپ ہو گیا ہے۔ بالکل سادہ سے جملوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

جب آپ کچھ بھی طے کرتے ہیں تو اِس کی صرف دو ہی اقسام ہیں یا تو آپ کے طے کردہ مسائل مشاہدہ و تجربہ پر مبنی ہوں یا پھر تسلیمِ محض پر۔ اگر تو مسائل مشاہدہ و تجربہ پر مبنی ہیں پھر تو کلام کی گنجائش بہر صورت موجود ہے تاکہ مشاہدات و تجربات کو مزید وسعت دی جاسکے جیسا کہ سائنس کا وتیرہ رہا ہے جبکہ اِس کے برعکس اگر آپ کے مسائل خالصتاً تسلیمِ محض پر مبنی ہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تسلیم کے بعد کلام کی گنجائش کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ پس جب آپ بات مان لیتے ہیں تو اِس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ نے بحث کو ترک کر دیا۔ بالکل یہی انتہائی بنیادی اور بالکل آسان فہم نکتہ ہمارے صوفیاء علماء کو سمجھاتے رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی کوئی ایک عالم اِس انتہائی اہم اور بنیادی مسئلہ پر غور کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

گزشتہ بقرعید پر ایک سینئر پروفیسر صاحب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ سرقربانی کی منطق کیا ہے؟۔ مَیں نے بحث سے کنارہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ حضرت ابراہیم کی سنت ہے اس لئے ہمارے دین میں جاری ہوگئی۔ پھر سوال کیا کہ حضرت ابراہیم نے تو اپنے بیٹے کو ذبح کیا تھا تو کیا گائے یا بکرا ذبح کرنے سے حضرت ابراہیم کی سنت پوری ہو جائے گی؟۔ میں نے بحث کو یکسر سمیٹنے کی غرض سے عرض کی کہ جناب آپ اِس طرح کریں اِس بار اپنا بیٹا ہی ذبح کر لیں پھر کماحقہ سنتِ ابراہیم پوری ہو جائے گی۔

یہ واقعہ عرض کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ مذہب یا دین کے معاملے میں منطق کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ احکامات کی اہمیت کے پیشِ نظر صرف تسلیم و رضا پر ہی زور دیا جاتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ صفر پر کھڑے ہو کر ایک سے نو تک کی منادی شروع کر دیں۔ کلام کریں۔ دلیل دیں۔ بحث کریں لیکن بالکل خالی ہو کر۔ بالکل کورا ہو کر۔ پھر دیکھیں جو بھی سچ ہو گا ٹپک کر سامنے آجائے گا۔ نہیں ہو گا کچھ سچ تو بھی اتنی سمجھ تو آ ہی جائے گی کہ جھوٹ کیا ہے۔

سقراط نے کہا تھا کہ میں اتنا تو جان گیا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ زہر پینے سے قبل ایک شاگرد نے سقراط کے چہرے پر بھرپور طمانیت دیکھ کر سوال کیا کہ اُستاد مرنے کا وقت ہے اور آپ اِس قدر مطمئن؟۔ جاتے جاتے اِس اطمینان کا سبب تو بتا دیں؟۔ سقراط نے مسکرا کر کہا کہ دیکھو بچو! موت دو ہی کام کرے گی۔ اگر تو یہ مجھے بالکل ہی فناء کر دیتی ہے پھر تو کہانی ہی ختم یعنی جو کچھ میرے پاس ہے یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اِس لئے اگر ایسا ہوا تو پھر فکر کی کیا بات جب میں ہی نہیں رہوں گا لیکن اگر موت مجھے باقی رکھتی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ میں نے کھویا کیا؟ یعنی دوسری صورت میں تو مَیں

مرا ہی نہیں یعنی جو کچھ میرے پاس تھا وہی مرنے کے بعد بھی میرے پاس ہی رہا۔ دنیا کا کوئی بھی شخص اُس وقت تک صحیح معنوں میں دیندار نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے دین کو منطق سے الگ نہیں کرلیتا۔

ایسا نہیں ہے کہ مطلق دانش کو سلامت رکھے اور دیندار بھی ہو۔ البتہ نفاق کی ہر صورت ممکن ہے یعنی آپ کی منطق اُصول سے تو احتراز کرے جبکہ فروع پر کلام کا انبار لگا دے۔ فی زمانہ عجیب فیشن چل پڑا ہے کہ ہر معاملے کو دانش کی کھونٹی پر ٹانک دو پس یہی وجہ ہے کہ اب لوگ دین و دنیا سے خالص نہیں رہے۔ دانش ہر معاملے میں قطعاً کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ انسانی زندگی کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جہاں والہانہ سپردگی، وارفتگی، جذب و مستی اور فقر و استغناء کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ شاید اِنہی انسانی معاملات میں عقل کی تہی دامنی کو حضرت علامہ اقبال نے اپنے ایک بند میں یوں بیان کیا تھا۔ ع

ایں کارِ حکیمی نیست دامانِ کلیمی گیر
صد بندہ ساحل مست یک بندہ دریا مست

دین کیلئے فہم کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک سرمست دل اور ایک بے باک جگر کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ لڑنے جھگڑنے اور بحث و تکرار کی کیا منطق ہے جب آپ بات خالصتاً دین کی کر رہے ہوں؟۔ رسالتمآب ﷺ نے بہ نفسِ نفیس اپنے ہی لوگوں سے ستائیس کے قریب جنگیں لڑیں۔ کسی کو مارنے کی منطق تو عقل قیامت تک نہیں دے سکتی جب تک کہ آپ کا سینہ وارفتگی سے نہ پُر ہو۔ جہاں ایک طرف معاملہ یہ ہے کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے تو وہاں غزوات میں ہزاروں انسان مارے جاتے ہیں جبکہ منطق یہ کہتی ہے کہ وہ لوگ وہ بات نہیں مان رہے تھے جو ہم مان رہے تھے لیکن پھر منطق تو یہ بھی کہتی ہے کہ میں آپ کی بات چاہے پھر وہ آپ کے مطابق جتنی بھی مقدس و اہمیت کی حامل کیوں نہ ہو، کیوں مانوں؟۔ نہیں مانتا اِس لئے آؤ لڑیں پھر جو جیتا وہی سلطان۔ گویا اعتقاد کے بغیر ایک لامتناہی جدل ہے جس کا کوئی اَنت نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

مقتدرہ کی بساط میں لپٹی ملکی سیاست

Published on: www.murshidfoundation.org: 14.11. 2019

ہٹلر نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ "جھوٹ کو اتنا دہراؤ کہ وہ سچ لگنے لگے" حالانکہ دنیا کا کوئی بھی جھوٹ کبھی سچ نہیں ہو سکتا البتہ وہ سچ دکھائی ضرور پڑ سکتا ہے۔ دنیا اب بخوبی جان چکی ہے کہ نظمِ اجتماعی کی صرف ایک ہی صورت قابل عمل ہے اور وہ ہے جمہوریت۔ علاوہ ازیں یا تو وہی قدیم ملوکیت یا پھر جدید فوجی آمریت لیکن اِس انتہائی اہم نکتہ کو سمجھنا ایک ایسی قوم کیلئے جسے سالوں سے نہ صرف اجتماعی طور پر بیوقوف بلکہ گمراہ کر دیا گیا ہو قریباً ناممکن ہے۔

جھوٹ، منافقت، نفرت اور مار دیں گے کے انجانے خوف نے اِس جدید شناخت کی حامل پاکستانی قوم کو تہتر سالوں سے جاں بلب کر رکھا ہے۔ چند طاقتور لوگ جو بڑی دیانتداری اور شطارت سے اقتدار اپنے سے بعد والوں کو منتقل کرتے چلے آرہے ہیں عوام کے کھلم کھلا مجرم ہیں جن کا مواخذہ تو شاید ایک عام آدمی کبھی نہ کر سکے مگر کبھی اجتماعی شعور کی طاقت اُبھری تو ان کا انجام قابل دیدنی ہوگا۔ تن تنہا جس شخص نے ہندوستان کی دھرتی پر ایک عام آدمی کیلئے جس جنتِ ارضی کا خواب دیکھا تھا اُس خواب کو چکنا چُور کرنے میں ہماری مقتدرہ نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑا۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ بانی پاکستان محمد علی جناح اور آپ کی دیانتدار ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کے بعد اِس ریاست نے کوئی ایسا سیاسی امام دیکھا جس کی آبیاری ہماری مقتدرہ نے نہ کی ہو؟۔ یقیناً نہیں بتا سکتا کیونکہ ہمارے پاس جن ہونہار سیاسی زعماء کی لسٹ موجود ہے وہ سبھی اِسی ہٹلری بارہ دری کے دربان رہے ہیں پھر وہ چاہے جاگیردار ذوالفقار علی بھٹو صاحب ہوں، مہاجر ساہوکار میاں محمد شریف کی اولاد یا پھر ریاستِ پاکستان کو کافرستان کی مذہبی اصطلاح سے تعبیر کرنے والے جمیعتی یا جماعتی مولوی حضرات ہوں۔ بھلا وہ کون ہے جس کے کندھے پر مہرِ مقتدرہ نہیں لگی۔

گزشتہ جنرل الیکشن کے حتمی نتائج سے بیس منٹ قبل تک بھی ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اقتدار کی زمام اناڑیوں کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے لیکن پھر ہوا وہی جس کا کسی کو وہم و گمان تک نہ تھا۔ اب ایک عام آدمی جسے مزدوری کر کے کوئی پانچ چھ بچے بھی پالنے ہیں وہ بیچارہ کیا رائے دے کہ آخر اِس ریاست کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے اور قرضے چڑھتے جا رہے ہیں۔ نہ کوئی روزگار ہے اور نہ کوئی خاطر خواہ ریاستی خبر گیری۔

البتہ چند لوگ اتنے خوشحال ہیں کہ اُن کیلئے یہ ریاست شداد کی جنتِ اِرم سے کم نہیں ۔ یہ لوگ جس وقت چاہیں دنیا کے کسی بھی ملک میں سکون سے رہ سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو یہاں پر رہ کر دادا گیری کلچر کا مزہ لے سکتے ہیں ۔احباب کہتے ہیں کہ آپ نے تو ملکی سیاست پر لکھنا ہی چھوڑ دیا جبکہ میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ ملک میں سیاست نام کا کچھ ہو تو بندہ کچھ لکھے ۔ملک میں اِس وقت کوئی بھی نامور سیاسی پارٹی موجود نہیں رہی جس کی سیاسی سرگرمیوں پر کچھ تبصرہ کیا جا سکے ۔ رہے سہے بس ایک مولانا فضل الرحمن کبھی کبھار کوئی شغل میلہ لگا لیتے ہیں علاوہ ازیں تو سرے سے کوئی سیاسی سرگرمی نظر ہی نہیں آرہی ۔

وزیراعظم عمران خان نے پچھلے دنوں واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ دیکھیں عوام اِدھر اُدھر نہ دیکھے، میرے علاوہ کوئی آپشن نہیں ،گویا خان صاحب دوسرے الفاظ میں یہ کہہ رہے تھے کہ میں جیسا بھی ہوں بہر صورت مجھ پر گزارا کرو کیونکہ اِس وقت مقتدرہ کے پاس میرے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہے ۔اب خان صاحب یہ راز نہ بھی کہتے تو ملک کا بچہ بچہ یہ حقیقت جان چکا ہے کہ خان کی آمد مرحبا کیسے بنی ۔جھوٹ اور منافقت کے تو خیر ہم دیر سے رسیا ہیں مگر اب ریاست میں جدید ٹیکنالوجی کی گھر گھر دستیابی کے سبب شعور کافی حد تک روشن ہو چکا ہے ۔شاید اب حقیقی آزادی کے دن قریب ہیں لیکن اِس کیلئے بھی اب کئی نیک دل سرِ دار چڑھیں گے ۔کئی بے موت مار دیئے جائیں گے اور کئی در بدر کر دیئے جائیں گے ۔شاید اِس المناک صورتحال کے بعد ہی کچھ سویرا ہو ۔

حقیقی سیاست تو کبھی پنپ ہی نہ سکی یہاں اور اب تو نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ سرے سے سیاست کا شعور ہی ناپید کر دیا گیا۔ چنانچہ اب لوگ کہتے ہیں کہ بھاڑ میں جائے سیاست ۔اب کچھ نیا ہونا چاہئے شاید نیا سے مراد وہ پرانی حکمتِ عملی ہے کہ مقتدرہ خود سامنے آ کر زمامِ اقتدار سنبھال لے علاوہ ازیں تو کوئی خاص آپشن نظر نہیں آرہا ۔

ایک عام بیانیہ ہے کہ لولی لنگڑی جمہوریت آمریت سے بہتر ہے جبکہ سوال یہ ہے کہ کیا جمہوریت کو لولا لنگڑا کرنا ضروری ہے؟ ۔کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جمہوریت کو ایک بالکل آزاد فضاء میں پوری آزادی کے ساتھ سانس لینے دی جائے پھر چاہے وہ ٹھوکریں کیوں نہ کھاتی رہے؟ ۔آزادانہ ماحول کی فراہمی ایک نہ ایک دن اِس لولی لنگڑی جمہوریت کو صحت مند ضرور کر دے گی مگر مسئلہ یہ ہے کہ اتنی آزادی دی کیوں جائے جمہوریت کو حالانکہ اس کو لولا لنگڑا کر کے اچھا خاصا وقت گزر رہا ہے؟ ۔

ایک عام آدمی کو ملکی سیاست کا براہ راست شعور دلانے کی بجائے اسے کشمیر، فلسطین اور انڈیا کے درونِ خانہ پالیسیوں پر تبصرہ کا اہل بنا دیا گیا ہے تا کہ گھر میں شروع گھپلوں کی جانب کسی کا دھیان نہ جا سکے۔ اب طاقتور اتنا احمق تو ہوتا نہیں ہے کہ وہ آوازِ خلق نقارہِ خدا کا رخ اپنی جانب موڑ دے فلہٰذا وہ پھر عام آدمی کو اِدھر اُدھر کے شغل میلوں میں مصروف رکھتا ہے تا کہ گھر کے بھید گھر والوں پر عیاں نہ ہوں۔

ہمارے ہاں ایک روایت ہے کہ نو بیاہتا بہو کو ہمسایوں کا کل کٹا چٹھا بتا دو تا کہ وہ جب لڑائی کے موڈ میں آئے تو اپنے گھر میں اپنی ساس اور نندوں سے لڑنے کی بجائے ہمسایوں کے ساتھ لگی رہی۔ ظلم کہاں کہاں نہیں ہو رہا دنیا میں۔ کشمیر میں ہندوستان کی دادا گیری سے پوری دنیا واقف ہے مگر کسی بھی ملک یا خصوصاً یورپین یونین جو خود کو انسانیت کا غیر مشروط علمبردار کہتی ہے ابھی تک کشمیریوں کے حق میں کوئی قدم اٹھایا حتیٰ کہ ہم نے خود کیا عملی اقدامات اُٹھائے؟۔ کوئی نہیں بس جابر اپنا جبر چھپانے کی خاطر دوسروں کے ظلم وستم کا پرچار کرنے لگتا ہے تا کہ اُس کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کشمیریوں سے کہیں بدتر حالات اِس وقت ایک عام آدمی کے ہمارے اپنے ملک میں ہیں۔ لوگ غربت کی لکیر سے بھی نیچے چلے گئے ہیں مگر کوئی پرسان حال نہیں۔ سیاست اور عوامی نمائندے تو اب بس کٹھ پتلیاں بن چکے ہیں اور جن کی ڈور مقتدرہ کے پاس ہے چنانچہ جب وہ چاہتے ہیں تو اپنی مرضی کا ہلا وا دے دیتے ہیں۔ اِس کے برعکس جو دیوانے آزادی چاہتے ہیں اُنہیں زندگی کے بوجھ سے ہی آزاد کر دیا جاتا ہے۔ فیض صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ع

ہے اہلِ دل کیلئے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

☆☆☆☆☆☆☆

گم گشتہ تہذیب

Published on: www.murshidfoundation.org: 18.10. 2019

سمیری، عکادی، بابلی اور فنیقی تہازیبِ عتیق کے بعد دنیا کا سب سے مستند اور قدیم تمدن ہندی تمدن ہے، علمائے عمرانیات و تہازیب اِس کا اندازہ قریباً چھ ہزار سال قدیم تک لگاتے ہیں۔ تہازیبِ عتیق کے علاوہ یہی وہ خطہ ہے جہاں یونان سے بھی دو ہزار سال قبل یہاں کے عظیم المرتبت دانشور و روحانی پیشوا شری کرشن اپنے ہونہار شاگرد ارجن کو دانشِ حیات سمجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہم ریاستِ پاکستان کے باسی بھی اِسی تہذیب ہی کے پروردہ ہیں بالکل جیسے متحدہ امارات اور مملکتِ سعودیہ ایک ہی تہذیب کے حامل ہیں۔ ہمارے جتنے بھی ذہین لوگ تھے وہ اِسی ہندی تہذیب کے پروردہ تھے مگر حیرت کا عالم یہ ہے کہ کسی ایک ذہین نے بھی ہمیں مبادیاتِ تمدن سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اِن کی کوئی سیاسی مجبوریاں رہی ہوں گی ورنہ یہ بنیادی ذمہ داری تو یہاں کے ہر ذہین شخص پر عائد ہوتی ہے۔ تہازیب بود و باش اور فکری اُپج سے نمو پاتی ہیں بشرطیکہ وہ اُدھار یا باسی نہ ہوں۔

رسالتمآب حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کی معاشی، اخلاقی اور سیاسی ہیئت کو چند ہی سالوں میں یکسر بدل دیا مگر عرب اپنے تمدنی خصائل سے باز نہ آسکے چنانچہ عرب عرب تھے اور عرب ہی رہے۔ اسلام کی عالمگیریت پر کوئی کلام نہیں مگر آج بھی کوئی عجمی تمدنی لحاظ سے کسی بھی عرب کے ہم پلہ نہیں ہوسکتا گو کہ اِس ضمن میں کئی نیک دل عجمی حکمائے اسلام نے عرب تمدن کا خوب پرچار کیا۔

اخلاقی طور پر ہر انسان پوری طرح آزاد ہے کہ وہ جس شخصیت پر چاہے ایمان لائے یا جس کی چاہے تکذیب کرے مگر کوئی بھی انسان اپنے وجود اور عقل میں رچے بسے تمدن کو باہر نہیں نکال سکتا کیونکہ تمدن ہزاروں سالوں کی مسلسل مشقت کے بعد کہیں کوئی ایک صورت اختیار کرتا ہے۔ آپ چاہیں تو دنیا کا کوئی بھی تمدن اپنے اُوپر لاد لیں مگر وہ تمدن جو آپ نے اپنے اوپر لاد لیا وہ ہمیشہ آپ کیلئے اُدھار اور باسی ہی رہے گا۔

مثال کے طور پر ہندوستان میں جب انگریز آیا تو اِس کی سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ اپنا تمدن بھی یہاں کے

باسیوں پر چسپاں کر دے چنانچہ انگریز اپنی اِس کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا مگر نتیجتاً یہ کوشش نامراد ہی رہی۔ برصغیر میں انگریز کے آنے کے بعد کچھ ذہین لوگوں نے اپنی زندگی کو انگریزی طرزِ حیات پر ڈال لیا اور پھر اپنی پوری زندگی انگریزی تمدن کو اوڑھے رکھا۔ اِسی طرح انگریز سے قبل کچھ اہلِ ہند نے عربی اور فارسی تمدن بھی خوب اَوڑھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد دیگر بنیادی مشکلات کے ساتھ ایک بڑی مشکل یہ بھی یہاں کے باسیوں کیلئے پیدا ہوگئی کہ اب ہندوستان سے الگ ہو کر ہم نے کونسا تمدن اپنانا ہے۔

کچھ ذہین لوگ کہتے تھے کہ بانی پاکستان اور اُن کے دیگر رفقاء کی تقلید کرتے ہوئے انگریزی تمدن کو اپنایا جائے جبکہ اِس کے برعکس معدودے چند علمائے اسلام کا یہ خیال تھا کہ یہاں عرب یا اسلامی تمدن رائج کیا جائے جس کیلئے ہم ہندوستان سے الگ ہوئے ہیں چنانچہ مسئلہ کافی پیچیدہ ہوتا گیا اور معاملہ جب اسلامی تمدن کے نفاذ پر آن پہنچا تو ریاستِ پاکستان کے باسیوں کے بیچ تضلیل و تکفیر کے دروازے کھل گئے اور پھر ریاست کی مقننہ کو باَامرِ مجبوری اس مسئلہ کو دبانا پڑا تا کہ نوزائیدہ ریاست میں افراتفری اور انتشار پیدا نہ ہو۔ پس نفاذِ تمدن یا طرزِ حیاتِ اسلامی کا یہ انتہائی بنیادی مسئلہ آج بھی جسٹس منیر کمیشن کے نام سے بوسیدہ اوراق کے ڈھیر میں محبوس پڑا ہے۔ دس سال قبل مجھ سے کسی نے پوچھا تھا کہ ہماری اصل تہذیب کیا ہے؟، ہماری یعنی ہم پاکستانیوں کی گو کہ ہمارا طرزِ حیات ایلیٹ کلاس میں زیادہ تر انگریزی مڈل اور لوئر مڈل کلاس میں زیادہ تر عربی اور فارسی ہے۔ تب میں نے ایک گہری سانس لیکر خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن آج شاید خاموش رہنا ممکن نہیں۔

ہماری تہذیب وہی ہے جو حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبال لاہوری کی تہذیب تھی۔ ہماری تہذیب وہی ہے جو گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور کی تہذیب تھی۔ جو امام الانقلاب مولانا عبید اللہ سندھی کی تہذیب تھی۔ جو فرزندِ اسلام حضرت علامہ عنایت اللہ خان مشرقی کی تہذیب تھی۔ جو بابائے عوام خان عبد الغفار خان کی تہذیب تھی۔ جو امامِ سیاست مولانا ابو الکلام آزاد کی تہذیب تھی۔ جو دلیر اور نڈر نوجوان بھگت سنگھ کی تہذیب تھی۔ جو انگریز کو ناکوں چنوں چبوانے والے شیر دل کمانڈر نیتا جی سبھاش چندر بوس کی تہذیب تھی۔ جو پسے ہوئے طبقہ کے پیشوا بابا صاحب ڈاکٹر امبیدکر کی تہذیب تھی۔ مطلق العنانین اسکندر مرزا، ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف نے جس تہذیب کی بنیاد ڈالی اُس تہذیب کا یہاں کی عوام سے کوئی تعلق نہیں۔

ہماری تہذیب کی امین وہ ضعیف العمر دردمند مدبر فاطمہ جناح تھیں جو گلی گلی کوچے کوچے خود جا کر لوگوں کو یہ سمجھا رہی تھی کہ ہم لوگ ہندوستان سے کیوں الگ ہوئے۔ انگریز سرکار کے نمک خواروں نے جس بے دردی سے اِس نحیف اور نوزائیدہ ریاست کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا پس اِس کے نتیجہ میں ایک نئی خوشبودار تہذیب کا نمو پانا تو درکنار خود یہاں کے باسیوں سے اُن کا ہزاروں سالوں پر محیط تمدن سے رشتہ ہی ٹوٹ گیا۔

آسودگی اور نت نئے آسائشوں کے خواب آنکھوں میں سجائے جس خستہ حالی اور بے کسی کے عالم میں ہم اِس نوزائیدہ ریاست کی جانب اپنا گھربار چھوڑ کر آئے تھے، آج تہتر سال گزرنے کے بعد بھی اُسی کسمپرسی اور بے کسی کے حال میں جی رہے ہیں، نہ معلوم اِس سوہنی دھرتی پر کب آسودگی وسکون کی برکھا برسے گی۔ ہمیں اِس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہمسایہ مما لک ہماری ریاستی پالیسیوں پر کیا رائے رکھتے ہیں یا وہاں اندرونِ خانہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمارا مسئلہ تو بھوک ہے۔ جہالت ہے۔ بے یقینی و بے ایمانی ہے۔ بے روزگاری ہے۔ پژمردگی ہے۔ کیا اِس کے بارے بھی ریاست کبھی غور کرے گی یا صرف چند لوگوں کے شغل میلہ کیلئے یہ ٹکڑا الگ کر لیا گیا تھا؟۔

☆☆☆☆☆☆☆

تربیتِ اطفال

Published on: www.murshidfoundation.org: 16.09 2019

باپ بننے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ اب آپ ایک مکمل زندگی کے مؤجب بن چکے ہیں چنانچہ وہ زندگی اب اگلے اکیس سال تک صرف اور صرف آپ ہی کے رحم و کرم پر رہے گی۔ انسانی نفسیات کے ماہرِ اعظم سگمنڈ فرائیڈ نے کہا ہے کہ کسی بھی بچے کی جسمانی و ذہنی ساخت، معاشی و اخلاقی تربیت کے بلاشرکتِ غیرے ذمہ دار اُس کے والدین ہوتے ہیں پس والدین جس طرح چاہتے ہیں اپنے بچے کو ٹھیک ویسا ہی تراش لیتے ہیں۔ فرائیڈ تو یہاں تک کہہ گئے کہ ہر بگڑا ہوا بچہ دراصل کسی بگڑے ہوئے باپ کی نشانی ہے۔ اِس لئے بچہ پیدا کرنے سے قبل والدین کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہئے ورنہ انسانی معاشروں میں حقیقی سدھار ناممکن ہے۔

مجھ سے اکثر والدین پوچھتے ہیں کہ ہمارے بچے بگڑ گئے ہیں۔ ہماری بات نہیں مانتے اور بات بات پر ضد پر اُتر آتے ہیں، اِس کی آخر کیا وجوہات ہیں؟، جبکہ میں بار بار ایک ہی جواب دیتا ہوں کہ بچوں کو اپنی ملکیت نہ سمجھو اس میں کوئی شک نہیں کہ بچے آپ ہی کے توسط سے اِس دنیا میں آتے ہیں لیکن یہ بھی ایک طبی حقیقت ہے کہ ہر بچہ اپنی ماں اور باپ کی جینیٹک میوٹیشن کے سبب وقوع پذیر ہوتا ہے چنانچہ باپ جس ڈھنگ میں بچے کو ڈالنا چاہتا ہے ضروری نہیں کہ بچے کی جینیٹک میوٹیشن بھی اُسی ڈھنگ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔ اِس لئے ہر ماں باپ کو بچوں کا کھوجی ہونا چاہئے۔ وہ ہر لحاظ سے بچوں کا گہرا مشاہدہ کرتے رہیں کہ اُن کا فطرتی میلان کس جانب ہے پس اگر وہ یہ نفسیاتی راز معلوم کر لیں تو پھر بچوں کی اُس ڈھنگ کو اختیار کرنے میں ہر ممکن مدد کریں۔

ماں باپ کو بچوں کا سپورٹر ہونا چاہئے نہ کہ مالک یا باس۔ یاد رکھیں کہ ہر بچہ ایک مکمل آزاد انسانی وجود ہے۔ ماں باپ صرف وجہ بنتے ہیں اِس انسانی وجود کے وقوع کا، مالک نہیں ہوتے۔ بچوں کی تربیت کرتے وقت اُنہیں اپنے فطرتی بہاؤ میں بہنے کا پورا پورا موقع دیں بلکہ اِس معاملے میں بچوں کے مددگار بنیں تاکہ کوئی بچہ فطرتی صلاحیت کو بروئے کار لانے میں کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہ کرے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے مَیں متعدد مضامین مختلف اخبارات اور جریدوں میں لکھ چکا ہوں۔

یہاں پر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اکیس سال کی عمر تک بچوں کو کسی بھی قسم کا مذہبی لٹریچر پڑھانے کی بجائے عالمگیر اخلاقی اُصولوں کی تربیت دی جائے۔عالمگیر اخلاقی اُصولوں کے متعلق جاننے کیلئے روزنامہ پاکستان میں شائع شدہ میرے مضمون تہذیب النفس کا مطالعہ کریں۔

یہ شعور اور شخصی آزادی کا زمانہ ہے اور دنیا ایک روحانی دیہات بن چکی ہے جہاں پر ہم سب انسان ایک دوسرے سے ایسے کنیکٹ ہو گئے ہیں۔اب معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی افریقہ میں بیٹھا ہے یا ہمارے بالکل ساتھ چنانچہ ایسے میں عالمگیر اخلاقی اُصولوں کی تربیت بچے کی ذہنی ساخت میں ایک روشن اور رواداری پر مبنی کردار ادا کرے گی۔بچوں کو غصہ کرنا اور ڈانٹنا انتہائی احمقانہ حرکت ہے۔والدین کو چاہیئے کہ اپنی محرومیوں کو اپنے بچوں پر اثر انداز نہ ہونے دیں اور بچوں کے سامنے ہمیشہ اپنے آپ کو پُر اعتماد اور ایک مضبوط اعصاب کے حامل انسان کی حیثیت سے پیش کریں۔بچوں کو قصے کہانیاں سنانے کی بجائے اُنہیں زندگی کے تلخ حقائق سمجھانے کی کوشش کریں تا کہ وہ اپنے اندر شاندار دلیری اور حالات سے مقابلہ کرنے کا زبردست حوصلہ پیدا کر سکیں۔پس جس قدر ممکن ہو سکے بچوں سے مکالمہ کی فضاء کو قائم رکھیں۔

بچوں کے ہر سوال کا جواب انتہائی اعتماد اور پُرسکون ہو کر دیں۔اگر کسی سوال کا جواب والدین کو خود معلوم نہ ہو تو بجائے جھوٹ بولنے کے بچوں سے صاف گوئی سے پیش آئیں۔بچوں کو سوچنے کا پورا پورا موقع دیں۔اُنہیں خود سے خدا، انسان اور اِس کائنات پر براہ راست غور کرنے کی تاکید کرتے رہا کریں چنانچہ اِس صورت میں وہ ایک مضبوط ذہن اور شاندار اعتقاد کے حامل بن جائیں گے۔زندگی کس قدر مشکل ہے اور اِس دنیا میں انسان کیلئے سروائیو کرنا کس قدر مشکل اَمر ہے، بار بار بچوں کو سمجھائیں۔اُنہیں باور کرائیں کہ ہم صرف آپ کو سپورٹ کریں گے، آگے آپ کی محنت اور لگن ہی آپ کو ایک کامیاب انسان بنا سکتی ہے۔

جس طرح بچوں کی معصوم سوچ پر قدغن لگانا اخلاقی جرم ہے بالکل اِسی طرح بچوں کے جذبات پر پابندی لگانا بھی ایک زبردست اخلاقی جرم ہے۔بچوں کو اُن کے اپنے فطری میلان میں بہنے دیں۔اُنہیں نت نئے تجربات کرنے دیں تا کہ وہ ہر دن ہر لمحہ ذہنی اور اخلاقی طور پختہ ہوتے جائیں۔چودہ سال کے بعد بچوں کو اُن کے جذباتی اُتار چڑھاؤ کے بارے بتانا ہر والدین کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

مخالف جنس کی جانب فطرتی میلان اکثر بچوں کو ذہنی طور پر بیمار بنا دیتا ہے پس بہت ضروری ہے کہ بچوں کو چودہ سال کی عمر کے بعد مخالف جنس کے متعلق تفصیل سے بتا دیا جائے کہ عورت اور مرد کا ساتھ انسانی زندگی کا جز لاینفک ہے اور اِس کے بغیر چارہ نہیں۔ ہر والدین کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو چودہ سال کے بعد جذباتی اور جنسی بہاؤ کے متعلق تفصیل سے آگاہ کریں اور اُنہیں سمجھائیں کہ وہ اپنے جذبات اور جنسی ہیجان کو کس طرح کنٹرول یا اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر تکمیل کر سکتے ہیں۔

جدید موبائل ٹیکنالوجی نے آج انسانی معاشروں میں اخلاقی سونامی بپا کر رکھی ہے چنانچہ ایسے میں بچوں کو ضروری اور مناسب جذباتی یا جنسی تربیت نہ ملنے کے سبب بچے ذہنی اور اخلاقی طور شدید ترین پستی کا شکار ہو جاتے ہیں پس بہت ضروری ہے کہ ایسی صورتحال میں بچوں کو صحت مند جذباتی اور جنسی اشغال کے متعلق وقت پر آگاہ کر دیا جائے۔

ایک مکمل اور ہر لحاظ سے منظم انسان بنانے کی خاطر والدین کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ چودہ سال کے بعد اپنے بچوں کو فائن آرٹ کے کسی نہ کسی ایک شعبہ سے ضرور متعلق کر لیں۔ اِس سے بچوں کی نہ صرف ذہنی صحت برقرار رہے گی بلکہ آگے چل کر جب بچہ کسی سبب ڈپریشن یا اینگزائٹی کا شکار ہو گا تو وہ فائن آرٹ کی مدد سے کتھارسس کرنے کا اہل ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اکثر والدین کو یہ تاکید کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو پرائمری کلاسز سے پیانو یا میوزک کی تعلیم دینا شروع کر دیں تاکہ بچے کا ذہن کسی بھی قسم کے دباؤ کے وقت سٹریس کو دور کرنے کا آرٹ جانتا ہو۔

ایک انتہائی اہم نکتہ جو ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بچوں پر کسی بھی قسم کا ذہنی، جذباتی اور جنسی دباؤ آگے چل کر بچے کی شخصیت کو مکمل طور پر تباہ کر سکتا ہے۔ اِس لئے والدین کو چاہیئے کہ بچوں کی جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ اُن کی ذہنی، جذباتی اور جنسی صحت کا بھی خاص خیال رکھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

والدین اور اولاد

Published on: www.murshidfoundation.org: 12.08.2019

ماں اور باپ دنیا کے واحد اور اِکلوتے رشتے ہیں جن کی وساطت سے ایک انسان اِس دنیا میں نمودار ہوتا ہے گو کہ انسان اپنی مرضی سے تو نہیں آتا اِس دنیا میں لیکن پھر بھی وہ دو لوگ جو انسان کو اِس دنیا میں لے آتے ہیں وہ ماں اور باپ ہی ہوتے ہیں۔ ماں اور باپ کے حقوق سے دنیا کی اَن گنت مذہبی اور اخلاقی کتب بھری پڑی ہیں۔ مجھے اِس مضمون میں ماں یا باپ کے حقوق بارے بات نہیں کرنی بلکہ ماں اور باپ ہونا کیا ہوتا ہے اِس کو واضح کرنا ہے۔

باشعور ہونے کے بعد زندگی جس طریق سے انسان کو لامتناہی اذیتوں سے دو چار کرتی ہے میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی انسان اگر دنیا میں آنے یا نہ آنے کا اختیار رکھتا تو اِس دنیا میں آنے سے قبل ہزار بار سوچتا لیکن چونکہ ہم دو لوگوں کی وساطت سے اپنی مرضی کے بغیر اِس دنیا میں بھیج دیئے جاتے ہیں اِس لئے بہرصورت جینا ہی پڑتا ہے۔

دنیا کا کوئی بھی انسان دراصل آدھا عورت اور آدھا مرد ہے یعنی آدھا وہ ماں کی جانب سے اور آدھا وہ باپ کی جانب سے ہے گویا انسان پہلے ایک آدھی عورت اور آدھا مرد ہے بعد میں اِس کی اپنی شخصیت واقع ہوتی ہے بلکہ اکثر و بیشتر تو واقع ہی نہیں ہوتی کیونکہ اپنی ذات کے بارے میں آگہی انسان کو اَن دو رشتوں سے توڑ دیتی ہے جن کو ہم ماں اور باپ کی صورت میں پہچانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی اولاد فرمانبردار نہیں ہو پاتی چنانچہ اِس کو فرمانبردار بنانے کیلئے مذہبی لٹریچر اور زبردست اخلاقیات کا سہارا لیا جاتا ہے تاکہ انسان اُن دو لوگوں کی تعظیم کر سکے جنہیں اِس نے ماں اور باپ کی حیثیت سے اِس دنیا میں جانا۔

دنیا کی کوئی بھی ماں اور باپ یہ نہیں چاہتے کہ اُن کی اولاد اُن سے کبھی دور جائے یا اُن کی فرمانبرداری میں کوئی کسر چھوڑے لیکن چونکہ انسان ایک کامل آزاد شخصیت بن جاتا ہے اِس لئے اُس کا اپنے والدین کے لئے خالص ہو جانا نفسیاتی طور پر خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پھر انسان سمجھ نہیں پاتا کہ وہ اپنے لئے جئے یا اُن دو لوگوں کے لئے جن کو وہ ماں اور باپ کہتا یا معاشرے کے ادراک کے سبب سمجھنے لگتا ہے۔ اب دو ہی ممکنہ صورتیں سامنے آجاتی ہیں، پہلی صورت تو یہ ہے کہ انسان ماں اور باپ میں منقسم ہو کر جب تک زندہ ہے اُن کی کماحقہ فرمانبرداری میں جتھ جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اپنے والدین اور اُن تمام رشتوں سے جو اِس کو اپنے والدین کی وساطت سے میسر آئے ٹوٹ جائے ۔ درحقیقت ماں اور باپ سے ٹوٹنا اتنا آسان نہیں ہے بہ نسبت اُن رشتوں کے جو ماں اور باپ کی وساطت سے میسر آتے ہیں یعنی بہن بھائی چنانچہ انسان کے پاس اِس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بچتا ہی نہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کی کماحقہ فرمانبرداری میں ہی اپنی پوری عمر گزار دے ۔

اِس کے برعکس اتفاق سے اگر بچہ سادھو، سنت یا فقیر بن گیا تو پھر اُس کے پاس اِس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ سب سے پہلے اپنی ماں اور باپ سے قطع تعلق کر کے اپنا روحانی سفر جاری رکھے لیکن یہ خاصا مشکل کام ہے اور چونکہ یہ بغاوت اور مسلسل مزاحمت پر مبنی ہے اِس لئے اِس کو اختیار کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی شخصیت کا شعور دبا دیتے ہیں تاکہ ماں اور باپ جیسے انتہائی قریبی بلکہ جوہری رشتے سے تعلق قطع نہ کرنا پڑے ۔ باپ جہاں بچوں کا معاشی اور سماجی سہارا ہوتا ہے تو وہاں ماں جذباتی اور اخلاقی سہارا بن جاتی ہے چنانچہ کوئی بھی بچہ اپنی اصل میں کچھ نہیں ہوتا سوائے ایک مرد اور عورت کے ۔

اگر بچوں کو حقیقی باپ اور حقیقی ماں مل جائے تو وہ بچہ اِس دنیا میں آنے کی حقیقی مراد پا لیتا ہے ۔اب یہ ذمہ داری ماں اور باپ کی بنتی ہے کہ وہ محض چسکے کیلئے افزائش نسل میں نہ پڑیں بلکہ صحیح معنوں میں ایک باپ اور ماں ہونے کا حق ادا کریں ۔معروف ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائیڈ نے کہا تھا کہ" ہر انسان کی آسودگی اور بدحالی کے بلاشرکتِ غیرے ذمہ دار صرف اُس کے ماں باپ ہی ہوتے ہیں" ۔ماں اور باپ کوئی اتھارٹی نہیں ہیں کہ بچے اُن کی تابعداری کرتے پھریں بلکہ ماں اور باپ ایک انتہائی اہم اور انتہائی حساس ذمہ داری کا نام ہے ۔اگر کوئی اِس انتہائی اہم ذمہ داری کو خوبصورت طریقے سے نہیں نبھا سکتا تو کوئی اُفتاد نہیں آن پڑی کہ وہ بہر صورت باپ یا ماں بنے ۔بچوں کی صورت میں اگر کسی کو ماتحت فورس چاہیئے تو اُسے کوئی سیکیورٹی ادارہ جائن کر لینا چاہیئے پس شادی کر کے بچے پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔خلیل جبران اپنی معروف کتاب The Prophet میں لکھتے ہیں کہ" اِس میں کوئی شک نہیں کہ بچے دو لوگوں یعنی والدین کی وساطت سے دنیا میں آتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ بچے اُنہی دو لوگوں کے خیالات وطبیعت کے مطابق ہوں ۔وہ اپنے ماں باپ سے ذہنی و جبلی لحاظ سے بالکل مختلف بھی ہو سکتے ہیں، تو ایسے میں ماں باپ بجائے سختی یا جبر کرنے کے اُن کی طبیعت کے ساتھ تیرنے کی کوشش کریں" ۔

اولاد کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہوتی جب تک کہ وہ باشعور نہیں ہو جاتی لیکن مسئلہ شعور حاصل کر لینے کے بعد بھی حل نہیں ہوتا کیونکہ دنیا کے کوئی بھی والدین اتنی آسانی سے اپنی اولاد کو شخصی آزادی فراہم نہیں کرتے پھر وہ چاہے خود آخری درجے میں آزاد خیال اور باشعور کیوں نہ ہوں وہ اپنی اولاد کو ہمیشہ اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں ۔ یہ بہت ہی تکلیف دہ صورتحال ہوتی ہے جب بچہ باشعور ہو کر اپنے جذبات کا رخ کسی اور انسان کی جانب موڑتا ہے تو سب سے پہلی جذباتی ضرب اُس کی ماں کو لگتی ہے ۔ باپ پھر بھی شعور کے بل بوتے پر استقامت سے کام لے لیتا ہے مگر ماں کیلئے یہ صورتحال برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا کہ اُس کی کوکھ سے نکلا وجود کسی اور جانب ڈھلک جائے ۔

یہی وجہ ہے کہ سدگرواُشو شادی کو ایک غیر فطرتی عمل قرار دیتے ہیں کہ اِس میں شخصی آزادی اور انسان کی انفرادیت کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے چنانچہ انسان پہلے اپنے والدین اور پھر بعد کے زمانے میں اپنی اولاد کے رحم و کرم پر رہ جاتا ہے اور ایسی صورتحال میں انسان اپنی ذات سے ناآشنا اور بے خبر رہ کر اِس دنیا سے چلا جاتا ہے جبکہ اِس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ فطرت کی یہی بے ترتیبی اور اضطراب ہی انسان کی حتمی نجات کا سبب بن جائے ۔

مجرد رہنے سے والدین اور اولاد کا اذیت ناک سلسلہ روکا جا سکتا ہے لیکن چونکہ شادی انسانی معاشروں کا ایک زبردست سماجی شعار ہے اِس لئے اِس سے اتنی آسانی کے ساتھ دور رہنا ہر ایک کیلئے ممکن نہیں سو ایسی صورت میں پھر اعلیٰ ترین حکمت عملی اپنا کر مذکورہ بالا اذیت کو کم ضرور کیا جا سکتا ہے ۔

☆☆☆☆☆☆☆

جدلیات

Published on: www.murshidfoundation.org: 13.07. 2019

ایک طویل عرصہ سے فلسفہ کے طلبہ کا مسلسل اصرار جاری تھا کہ جدلیات کے اُصول و مبادی پر کچھ کلام کیا جائے لیکن آنتوں کی بیماری IBD اور اعصابی مرض Tinnitus کے سبب جدلیاتی منطق جیسے انتہائی خشک مضمون پر لکھنا اتنا آسان نہیں تھا اِس لئے ایک طویل انتظار کے بعد اب طبع جدلیات پر کچھ لکھنے کے قابل ہوئی۔

میرے خیال میں جدلیاتی منطق کبھی اِس قدر دقیق اور کنفیوز ڈ نہ رہتی اگر جرمن کے معروف جدلیاتی فلسفی فریڈرک ہیگل اِس کو تختۂ مشق نہ بناتے۔ جدلیات کی بنیاد قدیم یونان کے معروف فلسفی ہرقلاطیس جسے انگریزی زبان میں ہیرا کلائٹس کہا جاتا ہے نے رکھی۔ سب سے پہلے ہرقلاطیس نے مکالمہ کا ایسا اسلوب تخلیق کیا جس میں کلام کی بنیاد کو متضاد ادراکی مکالمہ کے سپرد کیا گیا۔ جدلیات کی منطق اِس قدر مشکل اور دقیق ہے کہ پاکستان میں اِس پر ابھی تک باقاعدہ تحقیقی کام نہ ہوسکا۔ ہرقلاطیس کو سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ ہیگل کو سمجھنا مشکل ہے کیونکہ ہیگل ہرقلاطیس کے اُن تمام بنیادی اُصول و مبادی کو چیلنج کرتا ہے جسے کم از کم ہیگل سے قبل تک جدلیاتی منطق کی مسلمات کا درجہ حاصل تھا۔

ہرقلاطیس کہتا ہے کہ عدم فی نفسہ کامل عدم ہے اور عدم سے وجود کا استخراج ممکن ہی نہیں۔ اِسی طرح وجود مثبوت ہے اور وجود کبھی فناء سے دوچار نہیں ہوسکتا یعنی ہرقلاطیس کے مطابق عدم اور وجود دونوں مجرد ہیں اور اِن دونوں کا باہم متضاد ہونا ہی اِن دونوں کی بقاء کا اصلی ضامن ہے۔ ہرقلاطیس کے مطابق جب تک عدم اور وجود کے درمیان یہ کشمکش جاری رہے گی یہ دونوں اِسی طرح قائم رہیں گے۔ ہرقلاطیس یہ ماننے کو تیار نہیں کہ روشنی اور اندھیرے کے بیچ بھی کچھ ہوسکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روشنی اندھیرے کی غیر موجودگی اور اندھیرا روشنی کی غیر موجودگی کا نام ہے۔

ہرقلاطیس کی منطق کو سمجھنے کیلئے اُس کی انتہائی جوہری دریافت پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ ہرقلاطیس کے مطابق کائنات کے ذرے ذرے میں ایک مسلسل تبدیلی کا عمل جاری ہے۔ ہرقلاطیس اپنے طلبہ کو سمجھانے کیلئے اکثر یہ جملہ کہہ دیتا ہے کہ آپ ایک دریا میں دو بار قدم نہیں رکھ سکتے یعنی دوسری بار قدم رکھنے سے دریا کی لہریں اپنی پہلی والی ہیئت میں نہیں رہیں گی۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی سوچ کو ایک عالمگیر کائناتی تبدیلی سے روشناس کرانے والے ہرقلاطیس ہی تھے۔ہمارے ہاں علم وتحقیق چونکہ عنقارہی ہے اِس لئے فلاسفہ وحکماء کے علمی کام پرابتداء ہی سے ہماری توجہ نہیں رہی چنانچہ ہمارے لئے تورسل جیسے جدید فلسفی کو سمجھنا بھی آسان نہیں چہ جائیکہ ہرقلاطیس اور ہیگل کی جدلیات پر بحث کی سوجھ بوجھ کا تذکرہ ہو۔ہرقلاطیس کی منطق انسان اور اِس کائنات کو سمجھنے کیلئے ہمیں دو مابعدالطبعی آلات فراہم کرتی ہے۔

ایک یہ کہ اِس کائنات کی ہر چیز اپنے متضاد کے سبب قائم ہے۔دوسرا یہ کہ یہ کائنات ہر لمحہ میں ایک زبردست اور جاری تغیر کے عمل سے گزر رہی ہے چنانچہ یہ تغیر اِس قدر برق رفتاری سے جاری ہے کہ آپ ایک سانس دوبار ایک وقت میں نہیں لے سکتے۔اب اگر ہیگل کی بات کی جائے تو اُس نے ہرقلاطیس کے اِس اصول کو کہ روشنی مجرد ہے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ہیگل کہتا ہے کہ روشنی تو ہے ہی اندھیرے کے سبب گویا ہیگل ہرقلاطیس کی اِس منطق پر کہ وجود دراصل ایک مجرد شے ہے کاری ضرب لگاتا ہے۔

ہیگل کہتا ہے کہ روشنی اندھیرے ہی کی ایک دوسری شکل ہے اور نہ صرف روشنی اور اندھیرا ہے بلکہ اِن دونوں کے بیچ بھی کچھ ہے۔البتہ مطلق تغیر کے معاملے میں ہیگل ہرقلاطیس کی تقلید کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ہیگل کہتا ہے کہ انسانی ذہن اتنا طاقتور ہے کہ وہ اپنے تصورات میں تغیر کے سبب عالم مادہ میں بھی تغیر پیدا کر دیتا ہے۔یہاں پر ہیگل افلاطون اور اسپنوزا کی تقلید میں نکل پڑا۔ہیگل پر نقد خود ایک کارِ نارسا ہے کیونکہ ہیگل ہرقلاطیس اور سقراط کی طرح سیدھی بات نہیں کرتا بلکہ بات کو گھما پھرا کر پیش کرنا ہیگل کی ایک لاشعوری خصلت ہے۔

ہیگل کہتا ہے کہ جو تصورات انسانی ذہن میں تغیر پیدا کرتے ہیں اُنہی کے سبب یہ کائنات بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے جبکہ مارکس کی جدلیات اِس کے بالکل برعکس ہے۔مارکس کہتا ہے کہ جرمن فلسفہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے اور ہمارا زمین سے آسمان کی طرف جاتا ہے۔ہیگل کی یہ منطق کہ تغیر کی ابتداء انسانی ذہن سے ہوتی ہے اب درست نہیں رہی۔ہم بارہا یہ مشاہدہ وتجربہ کر چکے ہیں کہ عالم مادہ میں تغیر کے سبب ہی انسانی ذہن میں ایک جوہری تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔شاید یہی انتہائی اہم نکتہ ہمیں مارکس بھی سمجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

مارکس کا یہ کہنا کہ اخلاقی اقدار اور تربیتِ ذات سے قبل انتہائی ضروری ہے کہ انسانی طبع میں ایک جوہری انقلاب پیدا کیا جائے اور یہ جوہری انقلاب مارکس کے مطابق مساوی معاشی استحکام سے ہی پیدا ہوگا۔

مارکس کی تمام تر جدلیاتی مادیت اسی ایک اصول کے گرد گھومتی ہے۔میں ذاتی طور پر ہرقلاطیس اور ہیگل کی جدلیات کی صحت پر تو معترض نہیں ہوں لیکن میری فکر مارکس کی مادی جدلیات کو زیادہ اہمیت دیتی ہے کیونکہ انسان کی طبیعت میں زبردست تغیر ہی دراصل انسانی ذہن میں انقلاب برپا کرسکتا ہے۔ہیگل کے پاس ایک انتہائی اہم سہولت یہ بھی تھی کہ ہیگل کے دور میں انسانی تاریخ اپنا ایک مکمل وجود رکھتی تھی جبکہ ہرقلاطیس کے دور میں انسانی تاریخ اپنے بالکل ابتدائی فکری دور سے گزر رہی تھی۔ اِس لئے ہیگل کیلئے انسان، تاریخِ انسان اور اِس کائنات پر غور کرنا ہرقلاطیس کے مقابلے میں زیادہ آسان تھا۔

ہیگل کا یہ کہنا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے ابن خلدون کے قول کے بعد سب سے ٹھوس اور مضبوط نظریہ تھا۔دو اشیاء آپس میں ٹکراتی ہیں تو ایک نئی چیز کا وقوع ہوتا ہے یہ نظریہ شاید ہرقلاطیس کی فکری اُپج سے تو لڑھک گیا لیکن ہیگل نے خوب کَس کے پکڑ کر اِسے جدلیاتی منطق میں ایک انتہائی اہم اُصول کے طور متعارف کرا دیا۔

ہیگل کی جدلیات کو سمجھنے کیلئے یہاں پر میں اپنے سلسلۂ چشتیہ کے صوفی سرمست بیدم شاہ وارثی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں جس کا پہلا مصرع تو فلسفۂ جدلیات کی عکاسی کرتا ہے جبکہ دوسرا مصرع فلسفہ وحکمت کے دائرے سے آگے کے مقام کو بیان کر رہا ہے۔فرماتے ہیں۔ع

یہاں ہونا نہ ہونا ہے نہ ہونا عین ہونا ہے
جسے ہونا ہو کچھ خاکِ درِ جانانہ ہو جائے

☆☆☆☆☆☆☆

پیسے کی حقیقت

Published on: www.murshidfoundation.org: 19.06.2019

اِس مختصر سے مضمون میں معیشت کے مبہم اور انتہائی پیچیدہ اسرار و رموز بیان کرنا گو کہ ممکن نہیں لیکن پھر بھی میری تمنا ہے کہ کسی بھی طور سے معیشت کے حوالے سے دنیا میں جو ایک عالمگیر منظم فراڈ شروع ہے اِس کو کسی حد تک ایک عام آدمی کیلئے سمجھنا ممکن بنا دوں۔

بہت پہلے یعنی کوئی تین ہزار سال قبل جب مجھے تازہ گوشت چاہئے ہوتا تھا کھانے کیلئے تو میں درانتی اُٹھا کر سیدھا قریب ہی موجود سبزیوں کی کیاری میں چند سبزیاں کاٹ کر اُس شکاری کو دے دیتا جو تازہ بٹیر شکار کر کے میرے پاس تازہ ترکاری لینے آتا تھا۔ یوں مجھے روزانہ ترکاری کھانے سے نجات مل جاتی اور شکاری کو بدلے میں تازہ کدو اور کریلے مل جاتے۔ پس اشیائے خورد و نوش کی یہ سب ابتدائی معاشی لین دین تھی۔ مسئلہ خراب اُس وقت ہوا جب شکاری بٹیر لا کر گھر میں رکھ دیتا اور بدلے میں اُسے تازہ سبزیاں نہ ملتیں کیونکہ کسان روزانہ بٹیرے کھانے کے عادی نہیں تھے چنانچہ شکاری کے بٹیرے گَل سڑ جاتے اور کسان کی سبزیاں باسی ہو جاتیں۔ بڑی ہی عجیب و غریب صورتحال پیدا ہو گئی کیونکہ لوگوں کی محنت ضائع ہونے لگی اور لوگ شدید قسم کی پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔

چنانچہ دوسرا مرحلہ یہ طے پایا کہ اب ہم اشیاء کے بدلے اشیاء نہیں دیں گے بلکہ دونوں اشیاء سے ماوراء کچھ ایسا بطورِ قدر طے کر لیں گے جس کی بنیاد پر اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی لین دین ہو سکے۔ پس وہ قدر اُس وقت ایک دھات جسے ہم "سونا" کہتے ہیں کی حیثیت سے طے پائی۔ سونے کی خاصیت یہ تھی کہ یہ ترکاری اور شکار شدہ بٹیروں کی طرح باسی اور متعفن نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ اپنی اصلیت میں یہ شہابیہ تھا اِس لئے یہ ہر قسم کی بوسیدگی اور زنگ و کیمیکل آلودگی سے محفوظ رہتا۔

پس اب یہ طے پایا کہ ضروریاتِ زندگی کا خریدار صرف وہی ہو گا جو محنت کر کے یہ سونا حاصل کرے گا اور پھر اُسی سونے کے عوض یہ اپنی ضرورت کی تمام اشیاء خرید سکے گا۔ یہ دوسرا دور دراصل سونے کی کرنسی کا دور کہلاتا ہے جو قریباً گزشتہ پچیس سو سال رائج ہے۔

اب وہ باسی پن اور بوسیدگی والا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن سونے کی لین دین کے ساتھ ایک انتہائی گھمبیر مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ سونے کو سنبھالنا مشکل ہو گیا گویا مسئلہ جوں کا توں رہا۔

اب جن کے پاس بھاری مقدار میں سونا ہوا کرتا یعنی اپنی ضرورت کی تمام اشیاء پوری ہو جانے کے بعد بھی بچ جانے والا سونا تو اُس سونے کو سنبھالنے اور اُس کے عوض دور دراز علاقوں میں کاروبار کی غرض سے نقل و حرکت کرنے میں وہ لوگ شدید قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنے لگے۔ مطلب اب کون منوں سونا لاد کر سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کرے چنانچہ یہ دوسرا اسلوب بھی کارآمد نہ ہوسکا۔ بس یہی پریشانی جاری وساری تھی کہ چنگیز خان کے بیٹے قبلائی خان جسے دی گریٹ خان بھی کہا جاتا ہے نے سُناروں کو بلا کر کہا کہ میں نے سنا ہے کہ لوگ اپنی ضرورت سے زائد سونا تمہارے پاس رکھنے آتے ہیں اور تم اُن کو ایک رسید دے دیتے ہو کہ اتنی مقدار میں تمہارا سونا ہمارے پاس بطور امانت موجود ہے۔ بتائیے یہ رسید کا کیا چکر ہے؟، مجھے سمجھاؤ تا کہ اِس سلسلے کو سرکاری سطح پر نافذ کیا جائے۔ سناروں کی تو ہوائی اڑ گئیں کیونکہ اُن کی چاندی کچھ اِس طرح سے لگی ہوئی تھی کہ وہ لوگوں سے اُن کا سونا لیکر اُن کو ایک سادہ سا رسید تھما دیتے۔ لوگ چلتے بنتے تو یہ سنار اُسی سونا پر کاروبار شروع کر دیتے اور پھر دوسروں کے سونا پر کئے گئے کاروبار میں منافع کما کر اصل سونا مطالبہ کرنے پر اپنے گاہک کو واپس کر دیتے۔

چنانچہ قبلائی خان نے بارہ سو عیسوی میں سناروں کی اِسی ترکیب کو بروئے کار لاتے ہوئے دنیا میں پہلی بار چاؤ کے نام سے پیپر کرنسی کی بنیاد رکھ دی۔ اب ہوتا یہ تھا کہ لوگ حکومت کے پاس اپنا سونا رکھ لیتے اور حکومت اُنہیں ایک رسید تھما دیتی کہ ہمارے پاس آپ کا اتنی مقدار میں سونا پڑا ہے۔ آپ کو جب بھی ضرورت پڑے گی حکومت اُسی وقت دینے کیلئے تیار ہو گی۔ کاغذ کی رسید کا نہ تو کوئی وزن تھا نہ ہی اُس کی نقل و حرکت کا کوئی مسئلہ چنانچہ لوگ دھڑا دھڑ اپنا سونا حکومت کے پاس جمع کراتے گئے اور رسیدیں لیتے گئے۔

اب شغل یہ چلا کہ رسیدیں جسے جدید اصطلاح I owe you یعنی میں آپ کا مقروض ہوں پوری دنیا میں پھیل گئیں۔ جس طرح سونے کے وقت سناروں کی چاندی لگ گئی تھی بالکل ایسے ہی اب اِن رسیدوں کے آنے کے سبب چند شاطر دماغ لوگوں نے سوچا کہ کیوں نہ اب کوئی ایسی جگہ بنالی جائے جہاں اِن رسیدوں کے انبار کو یکجا کر کے محفوظ کرلیا جائے پس یہ انبار لگانے کا مقام بینک کے نام سے دنیا میں معروف ہوا۔

چنانچہ یہ عالمگیر فراڈ جسے آج ہم بینک کہتے ہیں اِٹلی کے شہر فلورنس سے شروع ہوااور یہ کوئی سترھویں صدی عیسوی کا اخیر زمانہ تھا۔ بینک جو بنیادی طور پر ایک عالمگیر منظم فراڈ ہے ایک ایسا ادارہ ہے جس کے پاس لوگوں کی رسیدوں جسے آج ہم کرنسی نوٹ کہتے ہیں کے انبار لگے ہوئے ہیں چنانچہ بینک کرتا یہ ہے کہ وہ اپنے پلے سے کچھ بھی خرچ نہیں کرتا وہ آپ کے رسیدوں کو سنبھال کر رکھتا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر آپ اُنہیں وہاں سے نکال کر اپنی ضرورت پوری کر سکیں۔ اِس عالمگیر فراڈ کو سمجھنے کیلئے ایک مثال کا سہارا لیتا ہوں تاکہ مبہم نکات اچھی طرح واضح ہو جائیں۔

مجھے اپنا کچن چلانے کیلئے فی الحال پانچ کلو چینی، پانچ کلو گندم اور پانچ کلو دودھ چاہئے۔ ریاست مجھ سے کہتی ہے کہ آپ محنت کریں ہم آپ کو یہ ضروریات بہم پہنچا دیں گے چنانچہ جب میں کام سے فارغ ہو جاتا ہوں تو ریاست مجھے اشیائے خورد ونوش فراہم کرنے کی بجائے چند رسیدیں (کرنسی نوٹ) تھما دیتی ہے کہ آپ جا کر بازار سے اپنی ضرورت کی اشیاء خرید لیں۔ بالکل یہی پالیسی ریاست ہر شہری کے معاملے میں اپناتی ہے اور اپنے سرکاری بینک سے کہتی ہے کہ آپ رسیدیں چھاپیں چنانچہ بینک اپنی ساری توانائی رسیدیں چھاپنے پر صرف کر دیتا ہے اور کیوں نہ کرے کہ اِس کا تو کام ہی یہی ہے۔ یہاں پر ریاست کا اپنی ہی عوام کے ساتھ ایک منظم اور خفیہ فراڈ یہ چلتا رہتا ہے کہ وہ اشیائے خورد ونوش جو ایک شہری کی اصلی ضروریات ہیں پر توجہ دینے کے اُن رسیدوں کی قدر پر سارا زور لگا دیتی ہے جو اِس نے اپنی عوام کو کام کے بدلے میں دینی ہیں۔

صحیح تماشا اُس وقت شروع ہوتا ہے جب رسیدوں کے انبار لگ جاتے ہیں اور بازار سے چینی گندم اور دودھ غائب ہو جاتے ہیں۔ پیداوار اور اجناس کی مصنوعی قلت پیدا کر کے ریاست ایک کلو چینی پہلے ایک سرخ رنگ کی رسید (سو روپے) کے عوض دیا کرتی تو اب وہی ایک کلو دو سرخ رنگ کی رسیدوں میں دینے لگتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اِس مبہم اور انتہائی پیچیدگی فراڈ کو سمجھنے کیلئے بہت ضروری ہے کہ آپ مضمون کے درج بالا پانچ سطور کو پھر سے پڑھ کر یہاں تک آجائیں تاکہ سمجھنے میں کو کنفیوژن باقی نہ رہے۔

پس ایک کلو چینی ایک ماہ قبل جو ایک سرخ رسید یعنی سو روپے کی ملا کرتی اب وہ دو سرخ رسیدوں یعنی دو سو پر مل رہی ہے، کیوں؟ کیونکہ بینک کو وہ تمام رسیدیں واپس چاہئیں جو اُس نے ریاست کے ذریعے عوام کو فراہم کی تھیں، اِس لئے کہ بینک اُن رسیدوں کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اگر عوام کو ایک کلو چینی ایک کانسی رنگ کی رسید یعنی پچاس روپے میں ملنے لگ گئی تو وہ بقیا ایک کانسی اور ایک سرخ رنگ کی رسید اپنے پاس محفوظ کر لے گا جس سے بینک کا یہ مکروہ کاروبار رک جائے گا پس بہت ضروری ہے کہ یہ رسیدیں فوری طور پر عوام سے واپس لیکر بینک کے پیٹ میں ڈال دی جائیں تا کہ بینک وینٹی لیٹر پر جانے سے بچ جائے۔ حالانکہ ریاست کے پاس اتنی مقدار میں چینی ہے کہ اگر وہ چاہے تو صرف تین سبزی مائل رسیدوں یعنی تیس روپے میں بھی ایک کلو اپنے شہری کو فراہم کرسکتی ہے لیکن اگر اتنی مقدار میں پیداوار نہیں بھی ہے تو ریاست کیلئے اتنی مقدار میں جنس کی پیداوار کوئی مشکل کام نہیں لیکن چونکہ ریاست کو رسیدوں کے ذریعے بینک کو چلانا ہوتا ہے اس لئے وہ اجناس کی قیمت بڑھا کر رسیدوں کا Mass Inflation یعنی مجموعی اخراج پیدا کر دیتی ہے۔

عوام کو اُن خالی رسیدوں سے کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ عوام کو صرف اشیائے ضروریہ درکار ہوتی ہیں جن کی خرید و فروخت کیلئے اِن رسیدوں کی پالیسی استعمال کی جاتی ہے ورنہ ریاست کسی بھی شہری کی محنت کے عوض اُس کی مقروض ہے یعنی وہ اِس کی ضروریات پوری کرے، ہاں اِن ڈائریکٹ ریاست یہ کام کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست اپنی دیانت ثابت کرنے کی غرض سے رسیدوں پر یہ اہم عبادت لکھ دیتی ہے کہ "حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا"۔

آپ یہ جان کر یقیناً حیران رہ جائیں گے کہ بینک ایک خالی عمارت ہے۔ اِس کے پاس اپنی کوئی لیبر یا سرمایہ نہیں ہوتا چنانچہ یہ چلتا ہے لوگوں کی اُن رسیدوں پر جو وہ بینک میں ڈیپازٹ کرا آتے ہیں۔

اب بینک کرتا یہ ہے کہ آپ کو اُن رسیدوں کے عوض جو آپ بینک میں ڈیپازٹ کرا آئے اتنی مقدار میں مختص ہندسے یعنی ڈیجیٹ دے دیتا ہے یعنی اگر آپ نے بینک میں گہرے نیلے رنگ کی ایک سو رسیدیں جو ایک لاکھ بنتا ہے ڈیپازٹ کرا لی ہیں تو بدلے میں بینک آپ کو 1,00000 کے ڈیجیٹ دے دیتا ہے جسے آپ بینک کی ویب سائٹ یا ایپلیکیشن پر دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں۔ یقین کیجئے یہ محض ہندسے ہی ہیں کیونکہ بینک آپ کے ایک لاکھ میں سے نوے ہزار اُٹھا کر فوری طور پر کاروبار میں لگا دیتا ہے اور آپ کیلئے صرف دس ہزار رکھ دیتا ہے تا کہ فوری ضرورت کے وقت بینک آپ کو اپنی رقم واپس کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ چوبیس گھنٹوں میں پچاس ہزار سے زائد کا کیش نہیں نکال سکتے جبکہ اپنی ہی رقم نکالنے پر بینک آپ سے ٹیکس لیتا ہے، صرف اِس لئے کہ آپ نے بینک کے کاروبار میں خلل پیدا کیا یعنی اگر آپ نے صبح بینک میں پانچ

لاکھ روپے ڈیپازٹ کرائے اور شام چار بجے واپس پانچ لاکھ نکلوانے آگئے تو بینک آپ سے پچیس سو روپے ٹیکس لے گا کیونکہ آپ نے بینک کے کاروبار میں خلل پیدا کر دیا۔ جیسے ہی آپ نے رقم ڈیپازٹ کی تھی بینک نے اُسی وقت آپ کو اتنی مقدار کے ہندسہ دے کر وہ رقم کاروبار میں کھپا دی تھی چنانچہ بینک کو وہ آپ کی کھپائی گئی آپ کو واپس کرنا پڑ گئی تو اِس لئے بینک آپ سے اپنے منافع کے حساب سے پچیس سو لے لیتا ہے۔ پس ہر لحاظ سے بینک فائدے میں رہتا ہے۔ بالفرض ایک صبح تمام لوگ بینک کے سامنے قطار لگا کر کھڑے ہو جائیں اور بینک سے مطالبہ کریں کہ اُنہیں اُن کی تمام رسیدیں واپس چاہئیں تو یقین کریں بینک کے پاس سوائے بینک لاک کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوگا کیونکہ بینک کے پاس رسیدیں پڑی ہی نہیں ہوتیں وہ تو بینک کاروبار میں کھپا چکا ہوتا ہے۔ یا پھر ایسا ہو جائے کہ ایک صبح لوگ اُٹھ کر رسیدوں سے منکر ہو جائیں اور ریاست سے مطالبہ کرنے بیٹھ جائیں کہ ہمیں رسیدیں نہیں اشیائے ضروریہ چاہئیں تو ٹھیک اُسی دن بلکہ اُسی وقت تمام بینک دیوالیہ ہو جائیں گے کیونکہ ویلیو رسیدوں یعنی کرنسی کی نہیں وسائل کی ہوتی ہے چنانچہ جب لوگ رسیدوں کی بجائے براہ راست وسائل کا مطالبہ کرنے لگ جائیں گے تو بینک کیلئے وہ تمام رسیدیں محض کاغذ کے بے فائدہ ٹکڑے بن جائیں گے۔

یقین کریں پیسے یعنی کرنسی نوٹس کی کوئی حقیقت یا قدر نہیں ہے۔ دنیا میں قدر کی چیز صرف انسانی سوچ اور محنت ہے۔ یہی سوچ انسان کو سمارٹ بناتی ہے اور یہی سمارٹ انسان اپنی ہی جنس کے غیر سمارٹ انسانوں کو لوٹنے لگتے ہیں۔ فلاحی ریاستیں انسانی سوچ اور محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اُن کیلئے انسان کا وقت ہی دراصل حقیقی قدر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں وسائل اور ہر طرح کی آسودگی آخری درجے میں موجود ہے جبکہ ہم کند ذہن اور کام چور ہیں۔ ہمیں بہت جلدی بغیر کسی مشقت کے ڈھیر سارا پیسہ چاہیے حالانکہ جس ملک میں جتنی زیادہ مقدار میں کرنسی موجود ہوگی وہاں کے وسائل اُسی قدر ناپید ہوتے جائیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اسباقِ جنسیات

Published on: www.murshidfoundation.org: 15.05.2019

میرے روحانی گرو بھگوان شری رجنیش جنہیں دنیا اُوشو کے نام سے جانتی ہے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ" جنسی عمل زندگی کی ڈرائیونگ فورس ہے چنانچہ اِس کے بغیر زندگی غیر متحرک بالکل بے رونق اور مردہ ہوجاتی ہے"۔ ہمیں بچپن سے یہ سکھا دیا جاتا ہے کہ مخالف جنس یعنی عورت کے قریب جانا جائز نہیں اور نہ ہی اُس کے ساتھ کسی بھی قسم کا ربط رکھنا درست عمل ہے جبکہ کوئی بھی بچہ چودہ سال کے بعد اِس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ جنسی عمل سرانجام دے سکے البتہ اِس ضمن میں اخلاقی اقدار کی پابندی لابدی ہے۔

کسی زمانے میں دنیا میں بال و یاہ یعنی بچپن میں شادی کا رواج عام ہوا کرتا۔ تب انسان ذہنی اور جسمانی طور پر اِس قدر کمزور اور لاچار بھی نہیں تھا لیکن آج تو ہمارے ہاں اِس کو قانونی طور پر بھی درست نہیں سمجھا جاتا۔ جنسی عمل جسے انگریزی زبان میں ہم سیکس کہتے ہیں وہ عمل ہے جس کے سبب انسان کو وجود ملا چنانچہ اِس کے متعلق بنیادی آگہی حاصل کرنا دنیا کے تمام علوم وفنون سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں زبردست ثقافتی گھٹن اور غیر ضروری مذہبی رکاوٹیں موجود ہیں اِس لئے ہمارے نوجوان اِس انتہائی حساس اور اہم موضوع کے متعلق اَن گنت غلط فہمیوں کا شکار ہو کر اپنی جنسی قوت کو تباہ کر لیتے ہیں۔

ایک بچہ تعلیم سے فراغت حاصل کرتے کرتے قریباً بائیس سال کا ہو جاتا ہے جبکہ اِس کی جنسی ضرورت چودہ سال کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ بچوں کی شادی بائیس سال کی عمر میں کرادی جائے لیکن ہمارے ہاں عموماً ایسا ہوتا نہیں کیونکہ معاملہ صرف ڈگری لینے تک نہیں رہتا بلکہ ایک شاندار جاب کے چکر میں مزید چار پانچ سال بھی نکل جاتے ہیں اور اب تو دس دس سال بھی جاب کے چکر میں نکل جاتے ہیں تو ایسے میں ایک نوجوان ایک انتہائی خالص فطرتی ضرورت کو دبا کر رہے گا تو اُس کا جسم اور ذہن دونوں زبردست پراگندگی کا تو لازماً شکار ہو جائیں گے۔

ایک طبی تحقیق کے مطابق دنیا کا کوئی بھی بچہ چودہ سال کی عمر کے بعد سے بائیس سال تک پہنچتے پہنچتے کم سے کم چار سو بار خود لذتی یا جنسی عمل سے گزر جاتا ہے جبکہ یہ تحقیق دس سال پرانی ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ بلوغت کے بعد کوئی بھی انسان اِس فطرتی بہاؤ پر روک نہیں لگا سکتا۔ بے شک ہم اخلاقیات کے اعلیٰ ترین اسباق بچوں کے اذہان میں بٹھا دیں لیکن کوئی بھی بچہ اپنے اندر ہونے والی ہارمونل تبدیلی کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ تبدیلی چودہ سال کے بعد شروع ہو جاتی ہے۔

چودہ سال سے بائیس سال تک یہ تبدیلی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ اِس کے بعد اِس تبدیلی میں آہستہ آہستہ اُتار پیدا ہونے لگتا ہے اور اگلے سات سال یعنی تیس سال تک پہنچتے پہنچتے یہ جنسی بہاؤ بالکل نارمل ہو جاتا ہے جبکہ تیس سال کے بعد تو یہ ہارمونل تبدیلی واپس اپنی اُسی حالت میں جانا شروع کر دیتی ہے جہاں سے یہ پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ سینتیس سال کی عمر میں انسان جنسی عمل میں وہ رغبت اور کشش نہیں محسوس کرتا جو اکیس اور بائیس سال میں کیا کرتا تھا۔ ہمارے ہاں ایک قدیم زمانے سے یہ افسانہ بنا ہوا ہے کہ بچپن یا عین جوانی میں جنسی عمل انجام دینے سے انسان کی جنسی قوت میں زبردست کمی رونما ہونے لگتی ہے اور انسان جسمانی طور پر زبردست کمزوری کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ آج میڈیکل سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ محض ایک افسانہ ہے۔

میڈیکل سائنس یہ کہتی ہے کہ انسان بلوغت کے بعد اگر باقاعدگی سے جنسی عمل انجام دیتا رہے تو اِس کی جنسی قوت میں میں نوے سال تک کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ انسانی جسم کی یہ کیمیاء ہے کہ وہ جب تک استعمال میں رہتا ہے تو اُس کی کارکردگی اور مضبوطی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے جبکہ اگر انسان اپنے کسی جسمانی عضو کو کام میں لانا چھوڑ دے تو وہ قدرتی طور ناکارہ ہونے لگتا ہے جیسا کہ باقاعدگی سے واک کرنے والے نوجوان سو سال تک کی عمر میں بھی اُسی قوت کے ساتھ واک کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ طبی طور پر انسانی وجود کا سٹرکچر کچھ اِس طرح سے بنا ہوا ہے کہ وہ بلوغت کے بعد کسی بھی صورت جنسی عمل سے دور نہیں رہ سکتا۔ اب اِسے انسانی جسم کی مجبوری سمجھ لیں یا قدرت کی جانب سے رکھا گیا کوئی معمہ بہرحال اِس سے کوئی مفر نہیں۔ چنانچہ جب کسی طور مفر نہیں تو بہت ضروری ہے کہ بلوغت کے بعد ایک نوجوان کیلئے صحت منداور جائز جنسی عمل کا بندوبست کر دیا جائے تاکہ وہ جلد از جلد اِس مقام سے گزر کر جسمانی اور روحانی طور پر ایک مکمل انسان بن جائے۔

سدگرو اُوشو کی تمام تر تعلیمات کا بنیادی محور یہی تھا کہ ایک انسان جب تک جنسی رغبت سے مکمل طور پر فراغت نہیں حاصل کر لیتا تب تک وہ روحانی طور ایک کامل انسان نہیں بن سکتا۔

آپ فرماتے ہیں کہ ”کسی بھی وجہ سے اگر انسان کے اندر جنسی گھٹن باقی رہ گئی تو وہ کبھی بھی ایک مکمل انسان نہیں بن پائے گا بلکہ عمر بھر اُسی جنسی کشش کے حصار میں رہے گا گو کہ وہ بعد میں دس شادیاں بھی کیوں نہ کر لے، پچاس بچے کیوں نہ پیدا کر لے مگر اپنے مناسب وقت پر جنسی قوت کو دبا لینے سے وہ جس گھٹن اور اَدھورے پن کا شکار ہو گیا تھا وہی اَدھورا پن آخری عمر تک اُس کے ساتھ رہے گا“۔

سدگرو اُوشو کہا کرتے کہ اگر کسی بچے کو بلوغت کے فوری بعد ایک صحت مند جنسی عمل کی سہولت فراہم کر دی جائے تو وہ اگلے سات سال کے بعد یعنی بائیس سال کی عمر میں اُس ہارمونل تبدیلی سے تقریباً نوے فیصد تک باہر نکل آئے گا چنانچہ پھر اگلے سات سال مزید یعنی اُنتیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ مکمل طور پر جنسی رغبت سے باہر نکل کر جسمانی اور ذہنی طور پر سیراب ہو جائے گا۔

پس جیسے وہ جنسی رغبت سے سیراب ہو کر باہر نکلے گا ٹھیک اُسی وقت اِس کا سفر روحانی رغبت کی جانب شروع ہو جائے گا چنانچہ اگلے پانچ چھ سالوں میں وہ جسمانی اور روحانی دونوں لحاظ سے ایک کامل انسان بن جائے گا۔ اِسی جنسی حکمت عملی کو آپ سمبھوگ سے سمادھی کی اُور (Sex to super consciousness) سے تعبیر کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

کتاب بینی

Published on: www.murshidfoundation.org: 16.04.2019

کتاب جو بنیادی طور پر کسی بھی دوسرے انسان کے تجربات ومشاہدات کی پوٹلی ہوتی ہے دراصل ایک قاری کو صاحب کتاب کی حکمت و ذہنی استعداد سے آگاہ کرتی ہے۔ہمارے معاشرے میں اب کتاب بینی کا رواج نہیں رہا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ رواج صحیح معنوں میں کبھی پنپ ہی نہ سکا تو زیادہ معقول ہوگا۔

میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ قیامِ پاکستان کے دیگر تمام فوائد ایک طرف ،اِس کے برعکس جو واحد نقصان ہمیں اپنی دس ہزار سالہ علمی تاریخ سے کٹ جانے کا ہوا ،اُس کا ازالہ تو اب ہم کبھی کر ہی نہیں سکتے۔کیا آپ نے کبھی اَشٹاوکر کا نام سنا ہے؟۔یقیناً نہیں نہیں سنا ہوگا۔کیا آپ آدی شنکر آچاریہ کو جانتے ہیں؟۔یقیناً نہیں جانتے۔تو آپ کرشن جی کے بھگت رس خان سے تو لازماً واقف ہونگے؟۔نہیں۔چلیں آپ نے کبیر داس کا نام تو سنا ہی ہوگا نا۔نہیں سنا تو یہ نام گوگل کر لیں۔ دنیا کا کوئی بھی خطہ اپنی تہذیب اور تاریخ سے ہی پہچانا جاتا ہے چنانچہ تہذیب کے عناصر زرخیز اذہان اور تاریخ کے عناصر حکمران ہوتے ہیں۔ہم نے کسی حد تک حکمران تو رکھ لئے اپنے پاس لیکن زرخیز اذہان ہم سے چھوٹ گئے۔چھوٹ کیا گئے بلکہ ہم نے جان بوجھ کر اُن سے کنارہ کر لیا۔

کتاب کسی زمانے میں نوجوانوں کی رہنما اور بوڑھوں کے آخری وقت کا سہارا ہوا کرتی مگر آج تو نوجوانوں کے رہنما اور ضعیفوں کے سہارے ہی بدل گئے۔کتاب بینی جہاں اپنے اندر گوناگوں ذہنی فوائد رکھتی ہے تو وہاں انسان کو زندگی کے نشیب وفراز سے بھی آگاہ کرتی ہے بشرطیکہ کتاب بین ذہنی مشق کا حامل ہو۔عموماً کتاب تبھی فائدہ دے سکتی ہے جب انسان کا ذہن علمی مشاغل سے منسلک ہو ورنہ کتاب پڑھنا بڑے جوکھوں کا کام ہے۔کتاب کے ذریعے سے ہم انسانی شخصیت سے جڑے وہ حقائق جان لیتے ہیں جن تک رسائی بنا کتاب پڑھے شاید ہمیں کبھی حاصل ہی نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ایک کتاب بین ایک غیر کتاب بین سے زیادہ تجربہ کار،مشاق اور ذہین ہوتا ہے۔ہم نے اساتذہ سے سنا تھا کہ جوانی میں کتاب ایک بہترین دوست ہوتی ہے بلکہ بڑھاپے میں تو یہ دوستی مزید راسخ ہو جاتی ہے مگر آج کے جدید آئی فون دور میں ہماری نوجوان نسل کتاب کی جگہ سمارٹ فون کو اپنا دوست بنا چکی ہے۔

اِس میں بھی کوئی حرج نہیں اگر اِسی سمارٹ فون میں اِی بک کا مطالعہ کیا جائے اور ویسے بھی اب پرنٹنگ کا کام قریباً ختم ہو چکا ہے اور دنیا بہت تیزی کے ساتھ اِی بک کی جانب دوڑ رہی ہے بلکہ اب تو ایمازون ڈائریکٹ کنڈل پبلشنگ نے پرنٹنگ کا رولہ ہی ختم کر دیا۔ اپنا مسودہ ایمازون پر ڈال کر بے فکر ہو جاؤ۔ خریدنے والے گھر بیٹھے ایمازون کو کتاب کی قیمت ادا کر کے کتاب خرید لیں گے۔

ہمارے زمانے میں ایسی سہولتیں کہاں تھیں۔ مسودہ لئے کبھی ایک پرنٹر کے پاس تو کبھی دوسرے پبلشر کے پاس اور پھر کاغذ کی گرانی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک دم سے دبک کر بیٹھ جاتے۔ فزیکل بک ہو یا اِی بک بہر حال مطالعہ آج بھی اُتنی ہی افادیت رکھتا ہے جتنی آج سے ایک ہزار قبل رکھتا تھا۔ مطالعے کی عادت انسان کو نہ صرف ذہنی طور پر روشن کرتی ہے بلکہ اِس سے انسان اخلاقی طور پر بھی پراگندہ ہونے سے بچ جاتا ہے۔

اگر میں اپنی بات کروں تو مجھے انگریزی زبان میں میخائیل نعیمی کی دی بک اور آف میرداد، خلیل جبران کی دی پرافٹ، فریڈرک نطشے کی دس سپوک زاراتسرا، ہرمن ہیس کی سدھارتھا اور پائلو کوئیلو کی دی الکیمسٹ بہت پسند ہیں۔ اُردو میں مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات، مولانا ابوالکلام آزاد کی غبارِ خاطر، علامہ نیاز فتح پوری کی من و یزداں اور علی عباس جلالپوری کی خرد نامہ بے حد پسند ہیں۔ فارسی میں عمر خیام کی رباعیات، حضرت جلال الدین رومی کی مثنوی اور حافظ شیرازی کا منظوم کلام بے حد پسند ہے۔ عربی میں سبع المعلقات میرا رومانس ہے اور تادمِ حیات رہے گا۔

ہندی میں حضرت امیر خسرو کا منظوم کلام اور آدی شنکر آچاریہ کا فلسفہِ ویدانت میرے انتہائی پسندیدہ ہیں۔ پشتو میں عبدالرحمان بابا، گلستان بابا، حمزہ شنواری اور خاطر آفریدی کا منظوم کلام بے حد پسند ہے۔ سرائیکی میں علی حیدر ملتانی، خواجہ غلام فرید، احمد خان طارق اور شاکر شجاع آبادی کا کلام بہت پسند ہے۔ پنجابی میں تو دو یا تین شعراء کا نام لینا ہی ناانصافی ہوگی۔ پنجابی کا ہر شاعر اور پنجابی زبان میں لکھی گئی ہر کتاب میری پسندیدہ ہے۔

کتاب بینی ہمیشہ سے حساس اذہان کیلئے ایک انتہائی محبوب مشغلہ رہا ہے چنانچہ اپنے ذوقِ مطالعہ کا حال بتاتے ہوئے حکیم ابونصر الفارابی کہتے ہیں کہ تیل کے لئے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے میں رات کو چوکیداروں کی قندیلوں سے کھڑے کھڑے کتاب کا مطالعہ کر لیتا۔ امام زہری کے مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ اِدھر اُدھر کتابیں ہوتیں اور اُن کے مطالعہ میں ایسے مصروف ہوتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ بیوی اُن کی اس عادت سے سخت پیچ و تاب کھاتی۔

ایک دفعہ بیوی نے بگڑ کر کہا۔اللہ کی قسم یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں۔لارڈ میکالے کا قول ہے کہ وہ شخص نہایت ہی خوش نصیب ہے جس کو مطالعہ کا شوق ہے۔والٹیئر کہتا ہے کہ وحشی اقوام کے علاوہ تمام دنیا پر کتابیں حکمرانی کرتی ہیں۔رینے ڈیس کارٹیس کتاب بینی کے بارے میں کہتا ہے کہ تمام اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ماضی کے بہترین اشخاص کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

جدید ٹیکنالوجی نے جہاں انسانی زندگی کو ایک ربوٹ کی شکل دے دی ہے تو وہاں انسانی ذہن کو سست، کاہل اور سہولیت کا عادی کر بنا دیا ہے چنانچہ آج کا ذہن کتاب بینی کی بجائے کاپی پیسٹ پر زیادہ فوکس کر رہا ہے اور اِسی سبب اب وہ حقیقی ذہانت اور تابندہ وجدانی کیفیات چراغ لیکر بھی ڈھونڈنے سے نہیں مل رہیں۔کند ذہنی اور سست دماغی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے حتیٰ کہ اب تو انسانی ذہن مصنوعی ذہانت (AI) کا اِس قدر عادی ہو چکا ہے کہ تلاشِ حکمت کے لئے معمولی سی بھی مشقت گوارا نہیں کرتا اور انسان کا یہی رویہ بلاشبہ آنے والے وقتوں میں پوری انسانیت کیلئے ایک فکری المیہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سید المجاذیب خواجہ سید نعمان نیئر کلاچوی

صوبہ خیبر پختونخواہ کے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی ایک دور افتادہ تحصیل کلاچی کے باسی ہیں۔ آپ ایک جامع العلوم شخصیت ہیں۔ آپ بیک وقت مذاہب عالم، علم الکلام و فلسفہ، شعر و ادب، صحافت و ابلاغ، معاشرت و سیاست، نفسیات و روحانیت اور رقص و موسیقی پر غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ آپ ایک طویل عرصے سے مسلسل گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں اور دریں اثناء شب و روز مطالعہ و تحقیق میں منہمک رہتے ہیں۔ ماڈرن فلاسفی اور علم نفسیات پر آپ کا علمی کام اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں آج بھی انٹرنیٹ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر کتاب جس میں مصنف نے دنیائے علم و حکمت کے قریباً ہر اہم شعبہ پر طبع آزمائی کی دراصل پاکستان کے انتہائی معتبر اخبار روزنامہ" پاکستان " اور دیگر ملکی رسائل و اخبارات کیلئے لکھے گئے ان تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں مصنف نے مذہب، فلسفہ، سائنس، نفسیات، سماجیات، شعر و ادب اور رقص و موسیقی کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ پس آپ کتاب ھذا میں مصنف کی علمی و فکری ہمہ جہتی اور خالص تحقیقی اپج کا کماحقہ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آپ کا تعلق دنیائے علم و حکمت کے جس کسی شعبہ سے کیوں نہ ہو کتاب ھذا میں آپ کی دلچسپی پر مبنی کوئی نہ کوئی تحریر لازمی موجود ہوگی۔

مرشد پبلیکیشنز کلاچی

Web:www.murshidfoundation.org

Email:noman.kulachvi@gmail.com

ISBN 978 969 2228 00 8